

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
دسمبر 2018
شام کی حویلی میں













زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)------700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ----6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا---7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com





ستمبر 2018
جلد 33 شمارہ 1
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - [redacted]

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع ستمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

جاہ و منصب، اقتدار، دولت کی خواہش انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ ہر انسان کے دل میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے لیکن قدرت کا اپنا نظام ہے۔ اس نے ہر انسان کا درجہ اور مقام متعین کیا ہے۔ وہ اسی کے مطابق اپنے فرائض کی انجام دہی کرتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جتنا بڑا عہدہ یا منصب ہوتا ہے، اس کی ذمہ داریاں بھی اتنی بڑی ہوتی ہیں۔ کچھ عہدے یا منصب انسان کے لیے باعث توقیر ہوتے ہیں اور کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ عہدے اور منصب عزت پاتے ہیں جن پر وہ فائز ہوتے ہیں۔

اگر قدرت نے آپ کو کسی بلند منصب یا مقام سے نوازا ہے تو آپ کو حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔ اپنا انداز گفتگو اور رویہ اپنے منصب کے مطابق ہی رکھنا چاہیے۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ خود بھی عزت نہیں پاتے اور اپنے منصب کو بھی بے توقیر کرتے ہیں۔

عدم برداشت، غیر اخلاقی گفتگو، زبان اور غصے پر قابو نہ پانا ایسی صفات ہیں جو انسان کو بے توقیر کرتی ہیں خواہ وہ کتنے ہی بلند منصب پر فائز کیوں نہ ہو۔ جبکہ تحمل، برداشت، سنجیدگی، بردباری اور سوچ سمجھ کر بولنے سے انسان کی توقیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ طبیعت میں علم شامل ہو تو غصہ غالب نہیں آتا اور انسان کے لیے کامیابی، عزت، شرف اور ترقی و سربلندی کا ذریعہ بنتا ہے۔

زندگی میں کامیابی کے لیے حفظ مراتب کا خیال بہت ضروری ہے۔ بات ہمیشہ موقع محل، تمیز و تہذیب کے دائرے میں رہ کر کریں۔ غصے سے مغلوب ہو کر ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالیں جو تہذیب و اخلاق کے منافی ہوں۔

جاہ و منصب، عہدہ اور اقتدار یا دولت و شہرت، جو بھی آج آپ کو حاصل ہے ہمیشہ رہنے والا نہیں۔ ہر آغاز کا ایک انجام ہے اور ہر طلوع کے لیے غروب ہونا اٹل ہے۔

رخسانہ نگار کا ناول "شام کی حویلی میں"

رخسانہ نگار عدنان کا شمار ہماری ان مصنفین میں ہوتا ہے جن کی کسی بھی تحریر کو قارئین نے ناپسند نہیں کیا۔ انہوں نے جب بھی لکھا، قارئین سے پسندیدگی کی سند حاصل کی۔ رخسانہ کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ان کی کردار نگاری ہے۔ کردار نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے۔ انہوں نے بہت سے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں، جو ناقابل فراموش ہیں۔ کہانی پر مضبوط گرفت، زبان و بیان کی بے ساختگی اور روانی ان کی تحریر کو دو آتشہ کر دیتی ہے۔

اس ماہ سے ان کا ناول شروع کیا جا رہا ہے، پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔

- نیرہ ناز کا مکمل ناول - گردش ایام، ٭ بی تحر ملک کا مکمل ناول - مٹھی میں جگنو،
- منشاء محسن علی اور سبعہ سرفراز کے ناولٹ، ٭ خواب شیشے کا - عفت سحر طاہر کے ناول کی آخری قسط،
- رخسانہ نگار عدنان اور صائمہ اکرم چوہدری کے ناول،
- عطیہ خالد، افشین نعیم، شازیہ الطاف، ثمینہ گل، حمیرا درویش اور ماریہ یاسر کے افسانے،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک، ٭ شیف ذاکر سے ملاقات، تجھ سے ناتا جوڑا ہے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا ہر شمارہ ہمارے لیے خاص شمارہ ہوتا ہے، جسے ہم پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ ہم اپنی محنت میں کس حد تک کامیاب ہیں، خط کے ذریعے ہمیں ضرور بتائیے۔ ہم منتظر ہیں۔



نظر آتا نہیں لیکن ہر اک دھڑکن میں رہتا ہے
میرا اللہ میری سانس کے بندھن میں رہتا ہے

میری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے محسوس ہوتا ہے
مسلسل وہ میرے احساس کے آنگن میں رہتا ہے

مرے خوں کی حرارت اس کی ہی مرہون منت ہے
ہر اک تارِ نفس میں وہ مرے تن من میں رہتا ہے

تمیز اس نے بتائی ہے برائی اور بھلائی میں
مگر انسان خیر و شر کی ہی الجھن میں رہتا ہے

دیارِ آگہی کی حد سے بھی پھر ماورا ہو کر
بھٹک جاتا ہے جب انسان پاگل پن میں رہتا ہے

بڑائی اس کو زیبا ہے، وہی یکتا وہی قادر
وہ سارے عالموں کا رب ہے، ہر بندھن میں رہتا ہے

خورشید اقبال حیدر



میرے لب پہ نعت رسولؐ ہے میرے دل میں یاد حبیبؐ ہے
یہ مرے نصیب کی بات ہے رگ جاں سے بھی وہ قریب ہے

اے سفیرِ کشورِ لامکاں، اے سراپا رحمتِ دو جہاں
میرا سر ہو اور ترا آستاں یہی التجائے غریب ہے

تیری دید کی مجھے آرزو، ترے نقش پا کی ہے جستجو
تیرے نام سے ہے مری آبرو، تیرا عشق میرا نصیب ہے

کبھی نقش پا ترے عرش پر، سر ناز ہے کبھی فرش پر
یہ نیاز و ناز کا سلسلہ بخدا عجیب و غریب ہے

وہ چراغ جلوۂ طور ہے، وہ سراپا آیۂ نور ہے
دل و جاں کا وہ سرور ہے، غم دو جہاں کا طبیب ہے

میرا ہر نفس یہ کلام ہو، مری بندگی کو دوام ہو
صبح و شام اس پہ سلام ہو، جو خدا کا پیارا حبیب ہے

رشید طارق

پیارے نبی کی پیاری باتیں

وصیت سے متعلق احکام و مسائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ترکے میں) نہ کوئی دینار چھوڑا نہ درہم، نہ کوئی بکری نہ اونٹ اور نہ آپ نے کسی چیز کے بارے میں وصیت کی۔''

(مسلم)

فوائد و مسائل:

1- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں یہ فرمایا تھا: ''میرے وارث، دینار و درہم تقسیم نہیں کریں گے۔ میری بیویوں کے خرچ اور عامل کے اخراجات کے بعد جو بچے وہ صدقہ ہے۔''

(صحیح البخاری)

خلافت کی وصیت

حضرت طلحہ بن مصرف رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے کہا۔

''کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے بارے میں وصیت فرمائی تھی؟''

انہوں نے فرمایا: ''نہیں۔''

میں نے کہا: ''تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو وصیت کا حکم کیسے دیا؟''

انہوں نے فرمایا: ''آپ نے اللہ کی کتاب (پر عمل کرنے) کی وصیت کی تھی۔''

حضرت ہزیل بن شرجیل رحمتہ اللہ نے کہا:

''کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی کو (جو حضرت علی کو قرار دیا جاتا ہے) نظر انداز کر کے امیر بن سکتے تھے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو یہ چاہتے تھے کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کے حق میں وصیت مل جاتی، خواہ وہ ان کی ناک میں نکیل ہی ڈال لیتا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1- سائل کا سوال خلافت کی وصیت کے بارے میں تھا۔ حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے واضح کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی کوئی وصیت نہیں فرمائی۔

2- سائل کا دوسرا سوال ایک اشکال کا اظہار ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام مسلمانوں کو وصیت کا حکم دیا ہے تو خود بھی وصیت کی ہوگی، خصوصاً خلافت جیسے اہم معاملے میں ضرور فرمایا ہو گا کہ میرے بعد فلاں خلیفہ ہوگا تو جواب میں فرمایا گیا کہ۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن پر عمل کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ جس میں یہ حکم بھی ہے: واولی الامر منکم (النساء ۵۹) ''تم (مسلمانوں) میں سے جو صاحب امر ہوں ان کا حکم مانو۔''

3- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیرت مبارکہ کا سب سے اہم پہلو اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو خلیفہ متعین فرمائیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خود یہ منصب سنبھال لیں، بلکہ وہ تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے خلیفہ کی اطاعت میں آخری حد تک جانے کو تیار ہو جاتے۔

وصیت

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سانس اٹک رہا تھا، اس وقت آپ نے سب سے زیادہ یہ وصیت کی۔

''نماز اور تمہارے مملوک۔ (غلام)''

(احمد)

تاکید

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری کلام یہ تھا ''نماز اور تمہارے مملوک۔ (غلام)'' (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1- اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت نماز کی ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی نماز کی تاکید فرمائی۔

2- غلاموں کا طبقہ معاشرے کا ایک مظلوم طبقہ تھا جسے اسلام نے اتنی عزت دی کہ غلام بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے۔ خاندان غلاماں کی بادشاہت برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

3- یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے آخری الفاظ یہ تھے: اللھم الرفیق الاعلی ''اے اللہ! بلند مرتبہ ساتھیوں سے ملا دے۔''

(صحیح البخاری)

4- جس طرح ہم خاندانی معاملات کے بارے میں وصیت کرتے ہیں، اسی طرح دین کے احکام پر عمل کرنے کی بھی وصیت کرنی چاہیے۔

5- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت دین اور دنیا دونوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام میں دونوں کو برابر اہمیت حاصل ہے۔

وصیت کی ترغیب

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان کا یہ حق نہیں کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز موجود ہو جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ دو راتیں بھی اس حال میں گزارے کہ اس کی وصیت اس کے بارے میں لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1- وصیت ایسی چیز ہے کہ اس کا فائدہ اور ثواب مرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے، جب وصیت پر عمل کیا جاتا ہے۔

2- انسان کو اپنی موت کے وقت کا علم نہیں، ممکن ہے بندے کو اس حال میں موت آ جائے کہ اسے وصیت کرنے کا موقع نہ ملے، اس لیے بہتر ہے کہ وصیت ہر وقت تیار رکھی جائے۔

3- پہلے سے وصیت لکھ رکھنے کا یہ بھی فائدہ ہے کہ انسان اس میں حسب خواہش تبدیلی کر سکتا ہے۔

4- قرض اور امانت وغیرہ کی تفصیل ہمیشہ لکھ کر رکھنی چاہیے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''محروم وہ ہے جو اپنی وصیت کرنے سے محروم رہا۔''

فائدہ:

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص وصیت کیے بغیر فوت ہو گیا، وہ ان فوائد سے محروم رہ گیا جو اسے وصیت سے حاصل ہو سکتے تھے، مثلاً: صدقہ کرنے ک وصیت کرتا تو اسے بعد میں اس کا ثواب ملتا، قرض

ادائیگی کی وصیت کرتا تو وارث اس کا قرض ادا کر دیتے اور وہ بری الذمہ ہو جاتا۔ فوت ہونے کے بعد اس کوتاہی کی تلافی ناممکن ہے، اس لیے ایسا شخص بہت سی خیر سے محروم رہ گیا۔

وصیت کی تاکید

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس مسلمان کے پاس کوئی قابل وصیت چیز ہو، اسے یہ حق نہیں کہ دو راتیں بھی اس حال میں گزارے کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔" (بخاری)

انجام

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آدمی ستر سال تک نیک لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے، پھر جب (مرتے وقت) وصیت کرتا ہے تو وصیت میں ناانصافی کرتا ہے، اس طرح اس کا انجام برے کام پر ہوتا ہے، چنانچہ وہ جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اور ایک آدمی ستر سال تک برے لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے، پھر (مرتے وقت) وصیت میں انصاف سے کام لیتا ہے تو اس طرح اس کا انجام نیک کام پر ہوتا ہے، چنانچہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔"

(ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔

ترجمہ:- یہ حدیں اللہ کی (مقرر کی ہوئی) ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری کرے، اسے اللہ تعالیٰ جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی (مقررہ) حدوں سے آگے نکلے، اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے رسواکن عذاب ہے۔"

(سورۃ النساء......12-13)

زندگی میں بخل اور مرتے وقت فضول خرچی کی ممانعت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی

"اللہ کے رسول! مجھے بتائیے کہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں! قسم ہے تیرے باپ (کے رب) کی! تجھے ضرور بتاؤں گا۔ تیری ماں" (تیرے حسن سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔")

اس نے کہا: "پھر کون؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پھر تیری ماں۔"

اس نے کہا: "پھر کون؟"

آپ نے فرمایا۔ "تیری ماں"

اس نے کہا: "پھر کون؟"

آپ نے فرمایا: "تیرا باپ۔"

اس نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے میرے مال کے بارے میں بتائیے کہ میں اس میں سے کس طرح صدقہ کروں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں! قسم ہے اللہ کی! تجھے ضرور بتاؤں گا۔ (وہ اس طرح ہے کہ) تو اس وقت صدقہ کرے جب تو تندرست ہو اور مال سے محبت رکھتا ہو، تجھے زندہ رہنے کی امید ہو اور فقر کا اندیشہ ہو۔ (یہ صدقہ کا صحیح وقت ہے) اور موخر نہ کرنا حتی کہ جب تیری جان یہاں (حلق تک) پہنچ جائے، پھر تو کہے: میرا مال فلاں کو دے دینا، میرا مال فلاں کو بھی دے دینا۔ وہ تو ان ہی کا ہو چکا، اگرچہ تجھے یہ (حقیقت) ناگوار محسوس ہو۔"

(بخاری)

فوائد و مسائل:

1- اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے قسم کھانا جائز ہے۔

2- جواب دینے سے پہلے تمہید کے طور پر کوئی بات کہنے سے سائل جواب کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے، جیسے آپ کا یہ فرمانا: "میں تجھے ضرور بتاؤں گا۔"

3- قسم صرف اللہ کی ذات کی کھانا جائز ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے۔ ارشاد نبوی ہے: "اللہ تعالیٰ تمہیں باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، پس جو شخص قسم کھائے، وہ اللہ کی قسم کھائے، یا خاموش رہے۔" (صحیح البخاری)

اس لیے اس حدیث میں "باپ کی قسم" سے مراد "باپ کے رب کی قسم ہے۔ عربی زبان میں قرینے کی موجودگی میں الفاظ حذف کر دینا عام ہے۔ جیسے واسئال القریۃ "بستی سے پوچھیے۔" (سورہ یوسف ۱۲:۸۲) یعنی واسئال اھل القریۃ "بستی کے باشندوں سے پوچھیے۔"

4- حسن سلوک میں ماں کا حق زیادہ ہے کیونکہ وہ باپ کی نسبت زیادہ نرم دل اور زیادہ حساس ہوتی ہے، تاہم اگر ماں کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً ممنوع یا مکروہ ہو اور باپ اس غلط کام سے منع کرے تو باپ کا حکم ماننا ضروری ہے اور یہ ماں سے حسن سلوک کے منافی نہیں۔

5- صحت کی حالت میں صدقہ زیادہ افضل ہے کیونکہ اس وقت دل میں مال کی محبت زیادہ شدید ہوتی ہے اور اسے خرچ کرنا اس لیے بھی مشکل محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں حالات خراب ہونے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے موت کے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ اب میں اسے استعمال تو نہیں کر سکوں گا، لہٰذا صدقہ کر کے فائدہ حاصل کر لوں۔ اس وقت دل میں مال کی محبت نہیں رہتی۔

6- زندگی کے آخری ایام میں صدقہ کرنا یا وصیت کرنا شرعاً درست ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں بھی صدقے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

صدقہ کا وقت

حضرت بسر بن جحاش قریشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہتھیلی پر لعاب مبارک ڈالا، پھر اپنی سبابہ انگلی (اس کی طرف اشارے کے طور پر) رکھی اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آدم کے بیٹے! تو مجھے کیسے عاجز کر سکتا ہے، حالانکہ میں نے تجھے اس جیسی چیز سے پیدا فرمایا، پھر جب تیری جان یہاں پہنچ جاتی ہے، یہ کہتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حلق کی طرف اشارہ فرمایا، تب تو کہتا ہے: میں صدقہ کرتا ہوں۔ اب صدقے کا وقت کہاں ہے؟" (احمد)

فوائد و مسائل:

1- اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے، وہ ہر لحاظ سے بندے پر قدرت رکھتا ہے جب کہ بندہ ہر لحاظ سے اس کا محتاج ہے۔

2- یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے انسان کو ایک ناقابل ذکر حقیر چیز سے پیدا کر کے اسے اشرف المخلوقات بنا دیا۔

3- بعض مقامات پر صراحت کے بجائے کنائے کے الفاظ بولنا بہتر ہوتا ہے۔

تہائی ترکے کی وصیت

حضرت عامر بن سعد رحمتہ اللہ نے اپنے والد (حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ) سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا:

فتح مکہ کے سال میں بیمار ہو گیا حتی کہ موت کے کنارے پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرا مال بہت زیادہ ہے اور میری وارث میری صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کردوں؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''نہیں۔''

میں نے کہا: ''آدھا؟''

فرمایا: ''نہیں۔''

میں نے کہا: ''تہائی؟''

فرمایا: ''تہائی (جائز ہے) اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ تیرا اپنے وارثوں کو خوش حال چھوڑنا انہیں مفلس چھوڑ جانے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔'' (بخاری)

فوائد ومسائل:

1- بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کے حقوق میں شامل ہے اور یہ بہت بڑا نیک عمل ہے۔

2- جب انسان محسوس کرے کہ اس کا آخری وقت قریب ہے تو اس وقت اسے ترکے کے ایک تہائی حصے سے زیادہ صدقے کی وصیت نہیں کرنی چاہیے۔

3- اگر کوئی شخص تہائی حصے سے زیادہ کی وصیت کر کے فوت ہو جائے تو اس کی وصیت پر صرف تہائی ترکے تک عمل کیا جائے گا۔

4- بہتر یہ ہے کہ تہائی مال سے کم وصیت کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی کی اجازت دینے کے باوجود اسے ''زیادہ'' فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے۔

دنیا ایک آزمائش

حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے..... وہ بنو عامر بن لوی کے حلیف تھے اور رسول ﷺ کے ہمراہ غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے..... انہوں نے بیان کیا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بحرین روانہ فرمایا تا کہ وہاں (کے لوگوں) کا جزیہ لے کر آئیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین والوں سے صلح کی تھی اور ان پر حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا تھا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بحرین سے مال لے کر آئے۔ انصار کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے فجر کی نماز (مسجد نبوی میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں ادا کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوئے تو وہ لوگ آپ کے سامنے آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو مسکرا دیے، پھر فرمایا: ''میرا خیال ہے، تم نے سنا ہے کہ ابوعبیدہ بحرین سے کچھ لائے ہیں؟''

انہوں نے کہا: ''جی ہاں، اللہ کے رسول!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خوش ہو جاؤ اور خوشی والی چیزوں کی امید رکھو۔ قسم ہے اللہ کی! مجھے تم پر فقر کا اندیشہ نہیں۔ مجھے تو یہ خطرہ ہے کہ دنیا تم پر اسی طرح فراخ ہو جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی، پھر تم اس کے لیے ایک دوسرے پر رشک (اور مسابقت) کرو گے جس طرح تم سے پہلے لوگوں نے کیا، تو یہ (دنیا) تمہیں تباہ کر دے گی جس طرح اس نے تم سے پہلے لوگوں کو تباہ کر دیا تھا۔''

فوائد ومسائل:

1- دولت ایک آزمائش ہے۔ اس کی حرص کی وجہ سے ظلم اور گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے۔

2- مال حلال طریقے سے حاصل ہو اور اس پر قناعت کی جائے تو برا نہیں۔



دستک دستک دستک

شاہین رشید

آمنہ شیخ

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آمنہ شیخ ایک بہترین فنکارہ ہیں۔ کم آتی ہیں مگر بھرپور آتی ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آمنہ کا ہر ڈرامہ بہت ہٹ جاتا ہے۔''

''کیسی ہیں آپ؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''پروڈیوسر، پھر ڈائریکٹر (بچوں کے پروگرام) پھر اداکاری اور اب فلم کیسا رہا یہ سفر؟''

''بہترین..... جب انسان سیڑھی پر سیڑھی چڑھتا ہے تو اسے زیادہ کامیابی حاصل ہوتی ہے اور یہ دیرپا کامیابی ہوتی ہے اور میں نے یہی کام نہیں کیا۔ ہوسٹنگ بھی کی ہے۔ اور کئی کمپنیوں کی برانڈ ایمبیسیڈر بھی رہ چکی ہوں۔''

''جی..... بالکل معلوم ہے۔ اپنے مشہور ڈراموں اور ٹیلی فلمز اور فلمز کے بارے میں بتائیے؟''

''اللہ کا بڑا شکر ہے کہ جس فیلڈ میں قدم رکھا اللہ نے کامیابی نہیں بلکہ کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔ میرے یوں تو سارے ہی ڈرامے..... بہت پاپولر ہوئے لیکن جن کو بہت زیادہ پذیرائی ملی اور جو میری پہچان ہیں ان میں ''پاکیزہ''، ''میرا سائیں''، ''میں عبدالقادر ہوں''، ''اک ہاتھ میں حنا اک ہاتھ میں لہو''، ''تباہ''، ''دام''، ''مورا پیا''، ''دل ناداں''، ''مات'' شامل ہیں اور میری مشہور ٹیلی فلموں میں ''بھاگ آمنہ بھاگ''، ''بی بی جی''، ''بارش میں دیوار''، ''ایک جیسے خواب'' اور واپسی، جب کہ فلموں میں ''لو میں گم''، ''گڈ مارننگ کراچی''، ''ارمان''، ''جوش'' اور ''021-Seedling'' کافی پسند کی گئیں۔ ابھی کچھ عرصے پہلے فلم ''کیک'' ریلیز ہوئی تھی اس کا ریسپانس بہت اچھا رہا۔''

''کیک'' مختلف نام تھا..... لوگ دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کیا ہے۔ کچھ بتائیں اس کے بارے میں؟''

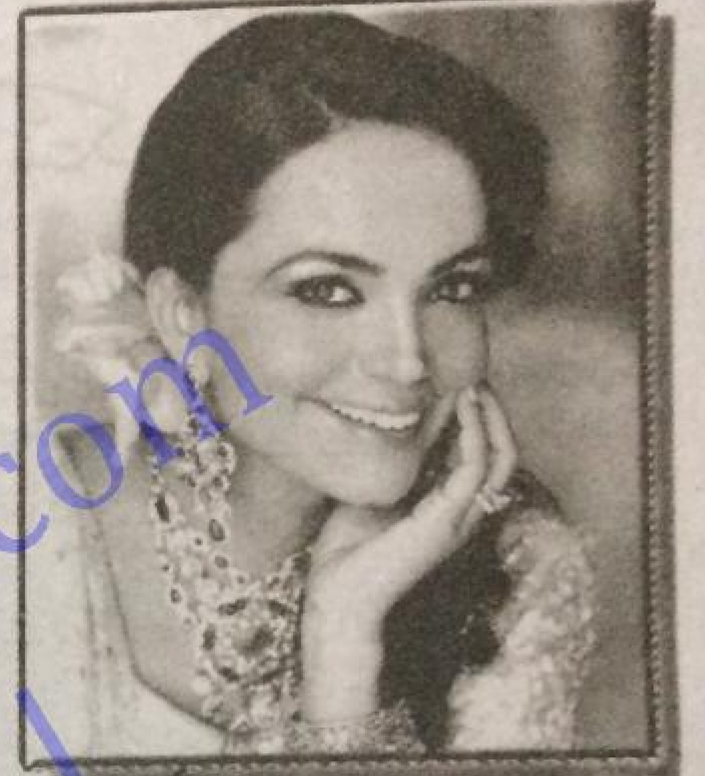
''ہاں..... مجھے لگتا تھا کہ شاید یہ فلم کامیاب نہیں ہوگی۔ اس وقت تک یہ خیال دل و دماغ میں گردش کرتا رہا جب تک میں نے اس کا اسکرپٹ نہیں پڑھ لیا۔ اسکرپٹ پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ اسے پسند کریں گے۔ کیونکہ کہانی میں کافی جان تھی۔''

''ڈائریکٹر بھی نیا تھا..... یہ خدشات بھی ہوں گے آپ کو؟''

''جی..... بالکل..... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر ہماری توقعات سے زیادہ اچھا ریسپانس ملا۔ اور یہ فلم ایشین فیسٹیول میں پیش کی گئی تو بین الاقوامی فنکاروں اور لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا یہ بڑی بات تھی۔ فلم اس لیے بھی پسند کی گئی کہ اس میں فنکاروں کی بھرمار نہیں تھی۔ مثلاً اس میں، میں، صنم سعید، عرفان ملک، محمد احمد اور میکال ذوالفقار تھے..... حیدرآباد سندھ سے جڑی یہ کہانی بہت عمدہ تھی۔''

''اتنے کم لوگ..... سب سے دوستیاں تو خوب ہوگئی ہوں گی؟''

''دوستیاں تو ہماری پہلے بھی تھیں۔ کیونکہ صنم سعید کے ساتھ میں ''دام'' میں کام کر چکی تھی۔ اس کا نیگیٹو رول تھا اور میرا پوزیٹو..... معصوم سی لڑکی اور محمد احمد تو سینئر فنکار ہیں جنھوں نے ہمیشہ والد کا



کردار کیا...... بہت اچھا لکھتے ہیں۔ بہترین ڈرامہ نگار بھی ہیں...... اور باقی سے بھی اچھی دوستی ہوگئی، یہ ایک ٹیم ورک تھا جس میں ہم کامیاب رہے۔"

"آج کل نوجوان لڑکے لڑکیاں میڈیا میں آنے کے لیے ایسی ہی یونیورسٹی میں داخلہ لیتے ہیں کہ جہاں ان کی ٹریننگ ہو...... میڈیا میں آنے کے لیے آپ بھی خواب دیکھتی تھیں؟"

"ارے نہیں...... میرے شوق تو وقت اور عمر کے ساتھ بدلتے رہے۔ زمانہ، طالب علمی میں "مصوری" کا شوق ہوا اور سوچا کہ "مصورہ" بنوں گی۔ سائنس میں اچھے نمبر آئے تو دل چاہا کہ ڈاکٹر بن جاؤں...... جب کالج میں اور پھر یونیورسٹی آئی تو فائن آرٹس کی طرف رجحان ہوا۔ پروڈکشن اور فوٹو گرافی نے اپنی کھینچا...... اور اس شوق کی خاطر میں نے انڈس وژن ٹی وی جوائن کیا...... جہاں سے میں بچوں کے پروگرام کیا کرتی تھی۔ اور بس پھر آہستہ آہستہ آگے آگے بڑھتی گئی۔"

"اس میں آپ کی محنت کا کتنا عمل دخل ہے۔ یا سب کچھ نصیب میں لکھا تھا؟"

"میرے خیال میں تو سب کچھ نصیب میں لکھا تھا۔ اگر میری محنت کا عمل دخل ہوتا تو میں مصورہ ہوتی یا پھر ڈاکٹر...... کچی عمر کے شوق تھے اور آپ کو پتا ہے کہ بچپن کے شوق میں بہت جنون ہوتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ قدرت میرے لیے راستے ہموار کررہی تھی...... ورنہ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا اس فیلڈ میں آنے کا۔"

"اور قدرت نے ہی محبت سے ملایا؟"

"قہقہہ......" یہ بھی قدرت کا ہی کام ہے...... ہم تو بہ حیثیت کولیگ کام کرتے تھے۔ کب، کیسے ایک دوسرے کے قریب آگئے، کب انڈراسٹینڈنگ ہوگئی۔ کچھ پتہ نہیں چلا...... اور ہم نے شادی کا فیصلہ کرلیا...... اللہ نے اپنی رحمت سے بہت دیر میں نوازا مگر الحمدللہ نواز دیا۔ ماشاء اللہ ہماری ایک بیٹی ہے اور ہم دونوں کو بہت پیاری ہے۔ اور اب تو اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ کمرشل میں بھی آئی ہے۔ بے بی فوڈ والا کمرشل آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس میں ہماری بیٹی ہے۔ ہماری شادی کے دسویں برس اللہ نے اولاد سے نوازا۔"

"میسا (Missa) نام ہے۔ کیا سوچتی ہیں اس کے بارے میں؟"

"بہت کچھ سوچتی ہوں۔ ایک مثالی ماں بن کے ایک مثالی بیٹی کے روپ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ بہت خواب سجائے ہیں میں نے اس کے لیے۔ بس دعا ہے کہ اللہ ان خوابوں کی تکمیل کرے۔"

"ان شاء اللہ آپ کے سب خواب پورے ہوں گے۔"

اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟ کچھ کہنا چاہیں گی آپ؟

"ہاں...... میں یہ کہنا چاہوں گی کہ لوگ تفریح کے لیے سینما ہاؤسز کا رخ کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے فلمسازوں کو چاہیے کہ ہلکے پھلکے موضوعات پر فلمیں بنائیں۔ میوزک پر خاص توجہ دیں اور گیتوں بھری کہانیاں ٹائپ کی فلمیں بھی بنائیں تو لوگ شوق سے سینما کا رخ کریں گے۔"

احسن خان

احسن خان جب اس فیلڈ میں نئے نئے آئے تھے تو کافی بات چیت رہتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ مصروفیات بڑھتی گئیں اور بات صرف ہیلو ہائے تک رہ گئی۔ بس ایسا ہی ہے کہ کبھی فون کرلیا تو بات ہوگئی ورنہ نہیں...... بہرحال جو تھوڑی بہت کبھی کبھار ہیلو ہائے ہوجاتی ہے وہ پیش خدمت ہے۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"اڈاری آج کل پھر "آن ایر" ہے، وہی ریسپانس مل رہا ہے کیا؟"

"جی اڈاری پھر ان آیئر ہے اور جنہوں نے نہیں دیکھا تھا وہ بہت شوق سے دیکھ رہے ہیں۔ ہم سب کی ہی اداکاری کو پسند کیا جارہا ہے۔"

"اس ڈرامے کے آن ایر جانے کے بعد کتنا عرصہ اس کی گرفت میں رہے۔"

"بہت عرصہ...... کردار تھا ہی اتنا جان دار کہ اس کے حصار سے نکلنا مشکل ہورہا تھا۔"

"اس کے بعد آپ نے گیپ بھی دیا۔ اور اسکرین سے دور رہے۔ وجہ؟"

"وجہ یہی تھی کہ یہی کردار۔ دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور اپنی ہی اداکاری پر گمان ہوتا تھا کہ جیسے میں اسے ہی پرفارم کررہا ہوں۔ بس اس لیے گیپ دیا۔ اور تقریباً چھ آٹھ مہینے ملک سے باہر وقت گزارا۔"

"کیوں؟ ملک سے باہر کیوں؟"

"اس لیے کہ جو بھی ملتا تھا اس کردار کی بات کرتا تھا۔ تو عجیب سی صورت حال ہوگئی تھی۔ اس لیے لندن چلا گیا تھا۔"

"آپ کی کوئی تحریر بھی تو اس سلسلے میں شائع ہوئی ہے اس کے بارے میں بتائیے؟"

"یہ ایک حقیقت پر مبنی ڈرامہ تھا اور ایسے



واقعات ہمارے گاؤں، دیہات میں بہت ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو پتا بھی نہیں چلتا جو کہ بہت خطرناک بات ہے۔ تو میں نے ایک تحریر اسی ٹاپک پر لکھی۔ اور اسے بہت اچھا رسپانس ملا اور مل رہا ہے۔"

"اڈاری میں کس چیز پر زیادہ فوکس کرنا پڑا؟"

"مجھے اپنے کردار پر زیادہ فوکس کرنا پڑا۔ کیونکہ مجھے اپنی اداکاری سے یہ ثابت کرنا تھا کہ میں کس طرح یعنی "باؤ امتیاز، کتنا گھٹیا اور نیچ انسان ہے۔ اور اس میں بہت زیادہ کامیاب ہوا۔ حالانکہ یہ کردار انتہائی مشکل تھا۔"

"کہا جارہا ہے کہ فلم "چھپن چھپائی" سے پہلے آپ نے پانچ یا چھ فلموں کی آفر کو ٹھکرا دیا؟"

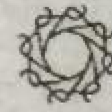
"جی ہاں...... اور اس آفر کو قبول کرنے کی وجہ اس کا ہلکا پھلکا اسکرپٹ تھا اور اس کا اسکرپٹ پڑھنے میں اتنا مزہ آیا تو میں نے سوچا کہ اسے پرفارم کرنے میں کتنا مزہ آئے گا۔ اور واقعی مزہ آیا اور اس نے اچھا بزنس کیا اور میری خواہش ہے کہ ہماری سب فلمیں بہت اچھا بزنس کریں تاکہ ہماری فلم انڈسٹری پھولے پھلے اور دوسروں کی فلموں پر ہماری نظریں کم ہوں۔"

"عموماً کوئی ڈرامہ ہٹ ہوجائے۔ کوئی فلم ہٹ ہوجائے یا کوئی کردار ہٹ ہوجائے تو وہ فنکار پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنا معاوضہ ڈبل کردیتا ہے۔ آپ کو بھی اوپر تلے کامیابیاں ملیں...... آپ نے بھی ایسا کچھ کیا؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں کیا۔ اور ہاں میں نے دیکھا ہے کہ کئی فنکار تھوڑا سا بھی ہٹ ہوتے ہیں وہ اپنا معاوضہ بڑھا دیتے ہیں یا پھر ان کے نخرے شروع ہوجاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے، میں نارمل رہتا ہوں کہ یہ شہرت، عزت ہمارے چاہنے والوں نے اور ہم سے کام لینے والوں نے اللہ کی رضا مندی سے دی ہے۔ تو ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔

"اور کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"نہیں...... بس یہی کہ جس طرح آپ سب نے میرے ہر کام کو سراہا ہے اس طرح اب میری آنے والی فلموں کو بھی آپ نے دیکھنا ہے اور میری آنے والی فلمیں "رہبر" اور ایک نئی فلم جس کا نام ابھی نہیں رکھا گیا وہ بھی سیٹ پر ہے۔ اور یہ دونوں فلمیں آپ کو پسند آئیں گی۔ بس آپ سب کی حوصلہ افزائی ہی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔



سرورق کی شخصیت

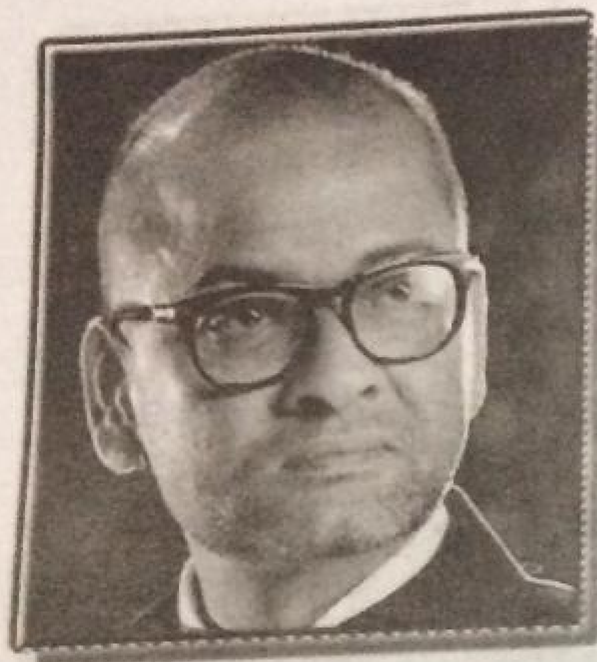
ماڈل .... رانیہ خان

میک اپ ... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ..... موسیٰ رضا

شیف ذاکر قریشی سے ملاقات

شاہین رشید



شیف ذاکر قریشی کو کون نہیں جانتا کوکنگ کے حوالے سے ہم ہر سال بقرعید کے موقع پر کسی نہ کسی شیف کا انٹرویو ضرور دیتے ہیں سو اس بار آپ کی ملاقات شیف ذاکر قریشی سے کرواتے ہیں۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

"میں کراچی میں پیدا ہوا۔ میری تاریخ پیدائش 16 فروری 1967ء ہے۔ میرے والد عبدالعزیز قریشی بھی اپنے دور کے بہترین اور معروف شیف تھے۔ اپنے والد کے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ میرے والد نے بطور شیف اپنے کیریئر کا آغاز 1980 سے کیا اور کراچی کے معروف ہوٹل "آواری ٹاور" اور پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں بھی کام کیا اعلیٰ تعلیم اور ٹریننگ کے لیے وہ "دبئی" سنگاپور اور ساؤتھ افریقہ اور بوسٹ وانا بھی گئے۔ میرے بھائی بھی شیف ہیں۔"

"گویا آپ کو یہ ہنر ورثے میں ملا ہے؟"

"بے شک یہ ہنر مجھے ورثے میں ملا ہے۔ مگر سچ پوچھیں تو مجھے کوکنگ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بلکہ میں تو آرمی میں جانے کی خواہش رکھتا تھا۔ مجھے تو زبردستی اس فیلڈ میں لایا گیا ہے۔ والد صاحب کی بھی خواہش تھی اور بھائی کی بھی۔ تو بس آنا پڑا۔"

"پچھتا رہے ہیں آپ؟"

"ارے نہیں......! میرے والد اور میرے بھائی نے جو فیصلہ میرے حق میں کیا بہترین تھا۔ شاید اس میں میرا رزق محفوظ تھا اور میرا نصیب انہیں اکسا رہا تھا کہ ذاکر کو اس فیلڈ میں لے کر آؤ۔ اب میں بہت خوش ہوں کہ مجھے جو عزت و شہرت اور پیسہ ملا اس فیلڈ سے ملا۔"

"کسی اور فیلڈ میں جاتے تو عزت اور پیسہ تو مل جاتا لیکن شاید شہرت نہ ملتی؟"

"جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں...... لیکن یہ سب میڈیا کی مرہون منت ہے کہ اب ہم لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ سکھاتے ہیں اور ناظرین ہماری ریسپی کو فالو کرتے ہیں۔"

"اس کو بزنس بنایا جاسکتا ہے؟"

"بالکل بنایا جاسکتا ہے اور میرا تو یہ بزنس ہی ہے...... اس وقت میرے دو ریسٹورنٹ چل رہے ہیں اور اس بزنس کو میں اور بڑا بیٹا ہینڈل کرتے ہیں۔ اور میں اللہ کا بہت شکر گزار ہوں اور ساتھ ہی اپنے والد اور بھائی کا کہ وہ مجھے اس فیلڈ میں



لائے۔"

"بیٹے کا آپ نے ذکر کیا جو کہ آپ کے ساتھ ہوتے ہیں باقی کے بارے میں بھی بتائیے؟"

"جی...... میرے دو بیٹے ہیں جو میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں یعنی ہم باپ بیٹوں کا بزنس ہے۔ اور میری دو بیٹیاں بھی ہیں ماشاء اللہ سے اور بیٹیاں پڑھ رہی ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کس فیلڈ میں جانا پسند کریں گی...... جو لائن وہ اپنانا چاہیں گی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"کتنے سال ہوگئے ہیں آپ کو اس فیلڈ میں؟"

"الحمد للہ 27 سال ہوگئے ہیں۔ اور میں نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے کیا۔ طویل عرصہ ملک سے باہر رہا اور مختلف جگہوں سے ٹریننگ حاصل کی۔ جابز کیں۔ مختلف ہوٹلز میں جابز کی۔ یہ میں ملک سے باہر کی بات کر رہا ہوں۔

پاکستان میں تو میں 1991 میں واپس آیا اور یہاں آتے ہی ایک کوکنگ ادارے سے وابستہ ہوگیا۔ اور میں آپ کو بتاؤں کہ صرف میری فیملی کے ہی لوگ اس بزنس سے وابستہ نہیں بلکہ میرے خاندان کے کافی لوگ اس بزنس میں ہیں۔"

"آج کل ہر کھانا پکانے والے کو شیف کا لقب مل جاتا ہے کیا دو چار کھانے پکانے والا بھی شیف کہلانے کا مستحق ہے؟"

"میں نے دیکھا ہے کہ جو دو چار ڈشز پکا لیتا ہے اس کے لیے شیف کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ شیف بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت لمبی ٹریننگ لینی پڑتی ہے اور 'پروف' کرنا پڑتا ہے کہ ہم اب اس قابل ہوگئے ہیں کہ اپنے نام کے ساتھ شیف کا لقب یا نام لگا سکیں۔ اس لیے چینل والے ہر کسی کے ساتھ شیف کا لفظ استعمال نہ کیا کریں۔"

"جی...... بس ہم یہی وضاحت چاہتے تھے۔ یہ بتائیے اس 27 سالہ کیریئر میں ایوارڈز سے بھی آپ کو نوازا گیا کہ نہیں؟"

"الحمد للہ......! پاکستان میں اور پاکستان کے باہر جب بھی مقابلے میں شریک ہوا مجھے بہترین شیف کا ایوارڈ ملا ہے اور میں کئی مقابلے جیت چکا ہوں۔"

"آپ خود بھی ٹی وی چینل پر کام کرتے ہیں۔ کچھ بتائیں گے اس بارے میں؟"

"دیکھیں ہر ہنر مند اور ہر اچھے شیف کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ٹی وی اسکرین پر اپنے کام کے حوالے سے نظر آئے...... اس لیے مجھے بھی کوکنگ چینل میں آنا اچھا لگتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چینل کے ذریعہ صرف دوسروں کو سکھانے کا موقعہ ملتا ہے بلکہ ہم لوگوں میں بھی جانے پہچانے جاتے ہیں...... اب تو اللہ کا بہت کرم ہے لیکن جب میں اپنے ابتدائی دنوں میں ٹی وی پر آتا تھا اور لوگ مجھے پہچان لیتے تھے تو مجھے ایک انجانی سی خوشی ہوتی تھی۔"

"ٹی وی والوں کا آپ کے ساتھ رویّہ کیسا رہا وہ عزّت ملی جس کے آپ خواہش مند تھے؟"

"جی...... اللہ کا شکر ہے کہ نہ صرف عزّت ملی۔

بلکہ میری اور میرے جیسے سینئر لوگوں کی بات بھی مانی جاتی ہے۔ مثلاً میں نے کہا کہ آپ ہر ایک کو شیف نہ لکھا کریں۔ تو میری یہ بات مانی گئی اور اب سب کو شیف نہیں بلکہ "کوکنگ ایکسپرٹ" لکھا جاتا ہے اور جو صحیح معنوں میں شیف ہیں، انہیں شیف ہی لکھا جاتا ہے۔"

"بقرعید کے حوالے سے کیا کہیں گے؟"

"بقرعید کی کوئی خاص ٹپس نہیں ہیں۔ سوائے اس کے کہ قربانی کا گوشت چکنا ہوتا ہے اس لیے بہت احتیاط کیا کریں اور "باربی کیو" کا مزہ لیں۔ تیل میں کھانا پکائیں اور گھی کا استعمال کم کریں۔"

"گوشت کتنے عرصے کے لیے فریز کریں؟"

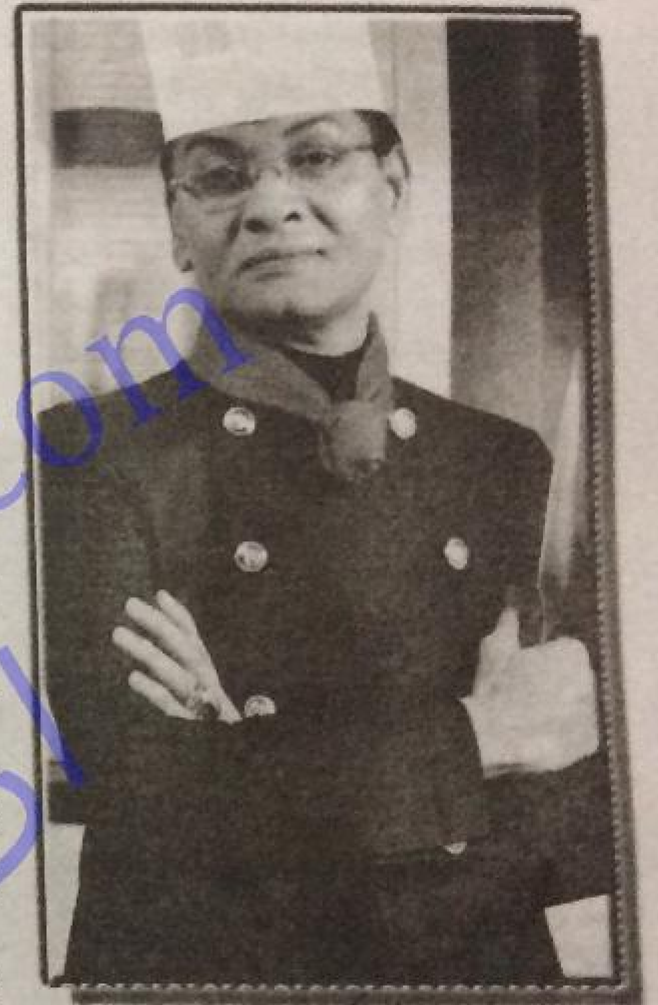
"بس ضرورت کا گوشت فریز کریں۔ زیادہ فریز کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ قربانی اللہ کی راہ میں کی جاتی ہے بہتر ہے کہ مستحق لوگوں میں بانٹ دیں...... اور جن کو بلڈ پریشر اور معدے کا مسئلہ ہے اور جن کو کولیسٹرول کا مسئلہ ہے وہ بقرعید کا گوشت کھانے میں بھی احتیاط کریں۔"

"سیلف میڈ رہے یا والدین کا تعاون حاصل رہا؟"

"میں سیلف میڈ رہا اللہ کا بڑا کرم ہے۔ اور والدین کی دعائیں میرے ساتھ رہیں اور ان کی دعاؤں نے مجھے یہ مقام عطا کیا۔"

"محنت کا صلہ ذرا دیر میں ملتا ہے۔ آپ کو جلدی ملا؟"

"بے شک محنت کا صلہ دیر سے ملتا ہے مگر پائیدار ملتا ہے پھر اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ انسان کبھی ترقی نہیں کرتا جو سونے کا نوالہ منہ میں لے کر پیدا ہوتا ہے یا جو بنے بنائے پر بیٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ اسے محنت کی عادت نہیں ہوتی ہے۔ بس جو آرہا ہے وہ ہی کافی سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو محدود کرلیتا ہے۔ میں نے جو کچھ حاصل کیا اپنی محنت اور انتھک محنت سے حاصل کیا ہے؟"



”ہاتھ کی لذّت کے بارے میں کیا کہیں گے؟“

”ہاتھ کی لذت ہوتی ہے اس وقت جب دل وجان سے اور بہت شوق کے ساتھ کھانا پکاتے ہیں۔ اگر جاب سمجھ کر یا مجبوری سمجھ کر کام کریں گے یعنی کھانا پکائیں گے تو پھر لوگ کھانا کھا تو لیں گے مگر واہ واہ نہیں کریں گے۔“

”جو لوگ اس فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں، ان کے لیے آپ کیا کہیں گے؟“

”جو اس فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہی کہوں گا کہ پیسہ کمانے کی نیت سے اس فیلڈ میں نہ آئیں۔ پھر ہاتھ میں لذت بھی نہیں رہے گی اور کمائی میں برکت بھی نہیں رہے گی۔ محنت کریں سیکھیں اور دل لگا کر کام کریں۔ آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔

تربیت حاصل کرنا بہت ضروری ہے اور عملی طور پر سب کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ دو چار ڈشز پر بھروسہ نہ کریں بلکہ دیسی بدیسی سب کھانے پکانا سیکھیں اس فیلڈ میں بہت گنجائش ہے۔ بہت وسیع فیلڈ ہے۔“

”اور خواتین کے لیے کوئی ہدایت، کوئی پیغام؟“

”خواتین کو میں دیکھتا ہوں کہ جب ان سے کوکنگ کے دوران کچھ غلط ہو جاتا ہے تو دل چھوٹا کر لیتی ہیں۔ تو میں ان کو کہوں گا کہ انسان غلطیوں سے ہی سیکھتا ہے۔“

”کیا کوکنگ کی کتابیں اور کوکنگ چینلز سے بھی سیکھ کر شیف بنا جا سکتا ہے؟“

آپ کتابیں پڑھیں اور کوکنگ چینلز ضرور دیکھیں مگر صرف دیکھنے کی حد تک نہیں بلکہ خود بھی گھر میں پکائیں۔ جو سکھایا جا رہا ہے ہوا سے عملی طور پر بھی کر کے دیکھیں کہ حقیقت میں آپ کتنا اچھا پکا سکتی ہیں۔ اور آپ بھی پکوان میں ماہر ہو سکتی ہیں۔“

”عموماً جو بہت اچھا پکاتے ہیں انہیں اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی چیزیں پسند نہیں آتیں، کیا آپ بھی ان میں شامل ہیں؟“

”نہیں ایسا کچھ نہیں کہ مجھے اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی چیزیں پسند نہیں آتیں...... مجھے اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی ہر چیز پسند ہے اور اپنے ہاتھ کے پکے دال چاول تو خاص طور پر پسند ہیں۔“

”فرصت کے اوقات مل جاتے ہیں؟“

”جی...... جی...... اللہ کا شکر ہے فرصت کے اوقات میسر آجاتے ہیں۔“

”پھر کیا کرتے ہیں ان اوقات میں؟“

”مجھے مطالعہ کا شوق ہے‘ اس لیے جب بھی وقت ملتا ہے میں مطالعہ ضرور کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت زیادہ شوق ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شیف ذاکر قریشی صاحب سے اجازت چاہی۔



جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ب۔ف۔ر

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیا چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے،
مت پوچھ کیا کیا چھوڑا ہے

بہت خوب صورت نظم جس کسی نے بھی لکھی ہے، بہت خوب صورت ترجمانی کی ہے ہم لڑکیوں کے جذبات کی۔ یہ سلسلہ مجھے بہت پسند ہے اور میرا بہت دل چاہتا تھا کہ میں اس میں لکھوں اور آج ہمت کر کے قلم اٹھا لیا ہے۔ امید ہے میرے جوابات آپ کو پسند آئیں گے۔

س: شادی کب ہوئی؟

ج: میری شادی 7 مئی 2004ء کو ہوئی۔

س: شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟

ج: شادی سے پہلے مشاغل تو کچھ خاص نہیں تھے۔ میں گھر میں بڑی تھی تو کام وغیرہ کرتی تھی اور ہاں کرکٹ دیکھنے کا بہت شوق تھا اور ڈائجسٹ پڑھنا۔

س: اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج: جی نہیں، اس رشتے میں میری بالکل مرضی شامل نہیں تھی بلکہ میں تو بہت خلاف تھی اور میں نے بہت کوشش کی تھی کہ یہ رشتہ نہ ہو۔ ہر وقت روتی رہتی

تھی، صدمے سے بیمار پڑ گئی تھی، راتوں کو اٹھ اٹھ کر تہجد میں دعائیں مانگتی تھی کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور یہ رشتہ ٹوٹ جائے مگر جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ میں آج بھی اپنے شوہر سے کہتی ہوں کہ آپ نے کون سا دم پڑھ کر میری ماں پر پھونکا تھا کہ ان کو اپنی بیٹی کے آنسو نظر نہیں آتے تھے بلکہ آپ نظر آتے تھے۔ بہر حال رشتے میں مرضی نہ ہونے کے باوجود میں آج بہت اچھی' پرسکون زندگی گزار رہی ہوں، اللہ کا شکر ہے۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی، فون پر کبھی بات ہوئی؟

ج: ہماری منگنی چھ ماہ رہی تھی اور فون پر بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بالکل غیر تھے۔

میری امی نے مجھ سے چھپ کر میری تصویر انہیں دے دی تھی اور انہوں نے جو تصویر دی تھی، وہ میں نے نہیں دیکھی تھی۔ اگر شادی ہو گئی تو پھر جیسا بھی ہوگا قبول ہوگا، بس میری یہی سوچ تھی۔

س: سسرال والوں کے بارے میں خیالات؟

ج: سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات ہونے تھے۔ یہ لوگ کیماڑی میں رہتے تھے اور میں پی اے ایف بیس مسرور میں پیدا ہوئی اور بڑی ہوئی۔ وہاں کا ماحول بہت اچھا تھا۔ بقول میرے (ہمارا چھوٹا اسلام آباد) ہریالی تھی، کھلی کشادہ سڑکیں اور کیماڑی کا تو آپ کو پتا ہی ہوگا یہاں کی آبادی کے بارے میں۔ اسی وجہ سے مجھے یہ رشتہ پسند نہیں تھا اور خیالات کیا تھے، بس یہی خیال تھا کہ رشتہ نہ ہو اور جب ہو گیا تو اسی فیصد لڑکیوں کی طرح میرا سسرال بھی تھا۔

س: شادی سے پہلے تعلیم چھوڑنی پڑی یا کوئی اور قربانی؟

ج: جی ہاں، شادی کے لیے تین قربانیاں دینی پڑیں۔ پہلی تو تعلیم' میں نے میٹرک کر لیا تھا اور فرسٹ ایئر کا پرائیوٹ داخلہ بھی لے چکی تھی مگر میرے شوہر نے اتنا شور مچایا شادی کے لیے کہ سب کچھ رہ گیا۔ انہوں نے کہا امتحان شادی کے بعد بھی دیے جا سکتے ہیں مگر (ہائے) کون سے امتحان اور کیسی تیاری۔ میں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا اور شادی کے مہینے بعد پیپر تھے۔ سو تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ویسے بھی ایک اور امتحان آ گیا تھا، سر پر شادی شدہ زندگی کا۔

دوسری قربانی جی ہاں ڈائجسٹ کی دینی پڑی۔ میں بہت ڈرپوک قسم کی لڑکی تھی۔ ساس کے غصے سے بہت ڈر لگتا تھا، حالانکہ وہ اپنی بیٹیوں کو ڈانٹتی تھیں، مجھے کچھ بھی نہیں کہتی تھیں مگر پھر بھی میں بہت ڈرتی تھی۔ ڈائجسٹ کا شوق میکے میں ہی رہ گیا۔ میری ہمت ہی نہیں تھی یہاں لانے کی۔ ہاں امی کے گھر جاتی تو ڈائجسٹ لے کر بیٹھ جاتی۔ میری دادی اس وقت زندہ تھیں، کہتیں...... مہینے ڈیڑھ کے بعد آتی ہو، کچھ اپنی سناؤ، کچھ ہماری سنو۔ مگر تم تو یہ کتاب ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتی ہو۔ میں شرمندہ ہو کر ڈائجسٹ رکھ دیتی۔ امی بہنوں کو ڈانٹتیں، خود بھی ہر وقت سپارا (ڈائجسٹ) لے کر بیٹھی رہتی ہو۔ وہ آئی ہے تو اسے بھی دے دیا کرو، بس اب میں لے کر چھت پر پھینک دوں گی (ہائے یہ ماؤں کی دھمکیاں)۔

ایک کہانی تین چار چکروں میں پوری ہوتی تھی۔ تب میں نے ہانیہ ابصار اور معیز والی کہانی پڑھی تھی۔ کوئی چھ مہینوں میں کہانی مکمل ہوئی تھی، خیر یہ تو اس وقت کی بات ہے۔

بعد میں' میں اور میرے سسرال والے گاؤں چلے گئے، نند کی شادی تھی۔ میں تو تین مہینے بعد شوہر کے ساتھ واپس آ گئی مگر وہ لوگ سال بعد واپس آئے۔ اس دوران میں محلے کے بچے سے ڈائجسٹ منگوانے لگی تھی۔ جب ساس واپس آ گئیں تو شروع میں چھپا کر پڑھتی تھی بعد میں چھوٹی نند بھی پڑھنے لگی تو میں نے بھی کھلم کھلا پڑھنا شروع کر دیا۔ ویسے بھی اب میں وہ ڈرپوک لڑکی نہیں تھی۔

تیسری قربانی کرکٹ کی دی۔ میں کرکٹ بہت شوق سے دیکھتی تھی، پاکستان کے ہارنے پر باقاعدہ آنسوؤں سے رونے والی۔ میرے سسرال

میں ٹی وی نہیں تھا۔ شروع میں بھائی فون پر بتاتا کہ آج میچ ہے، فلاں ملک کے ساتھ یہ ہو رہا ہے، وہ ہو رہا ہے مگر دیکھو نہ تو مزا بھی نہیں آتا۔ آہستہ آہستہ میری دلچسپی بھی ختم ہو گئی پھر وہ سب کھلاڑی بھی چلے گئے۔ اب جو نئی ٹیم ہے اس میں میں کسی کو جانتی ہی نہیں ہوں سوائے شاہد آفریدی اور شعیب اختر کے۔ ملک کا وہ دور وسیم اکرم، وقار یونس اور معین خان وکٹ کے پیچھے سے جس کی باتیں بہت مزا دیتی تھیں، یہاں یہ بھی بتا دوں کرکٹ کا شوق مجھے اپنی نانی کے گھر سے ہوا تھا، وہاں کرکٹ دیکھنے کا اپنا مزا تھا۔ میرے نانا اور ماموں باقاعدہ شرطیں لگا کر بیٹھتے تھے اور جس کی ٹیم جیت رہی ہوتی تھی اس کے قہقہے اور چیخیں آسمان تک جا رہی ہوتی تھیں۔ ایسے میں اگر آپ کو شوق نہ ہو تب بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ وہ کسی کو کمرے سے باہر جانے نہیں دیتے تھے اور جلدی آؤ چھکا لگ گیا، او بھاگ کے آؤ کلین بولڈ ہو گیا...... ہائے کیا کچھ یاد آ گیا۔ اب تو کچھ بھی نہیں ہے، میری نانی کا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا، چھ سال پہلے میری چھوٹی خالہ اچانک فوت ہو گئیں، اس کے بعد نانا ابو بھی چلے گئے۔ پھر میرے چھوٹے ماموں کو کسی نے ٹارگٹ کر کے گولی ماری۔ ماموں ریٹائرڈ فوجی تھے، بیوی بچوں کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستے میں ڈاکو نے مامی سے چوڑیاں اتروانے کے لیے ہاتھ پکڑا تو ماموں کو غصہ آ گیا۔ ماموں نے اسے مکا مارا، ماموں خالی ہاتھ تھے جبکہ اس کے پاس پسٹل تھا۔ اس نے فائر کر دیا، ایک ہی گولی جو سیدھی ماموں کے دل میں لگی اور اسی گولی پر ماموں کلمہ پڑھ کر شہید ہو گئے۔ اس واقعے کے آٹھ ماہ بعد میری نانی بھی سب کو چھوڑ کر جوان بیٹے کے پاس چلی گئیں۔ میری نانی کے گھر کو نجانے کس کی نظر کھا گئی۔

س: شادی بخیر وخوبی انجام پائی؟

ج: جی۔ شادی بخیر وخوبی ہوئی تھی، کوئی جھگڑا وغیرہ نہیں ہوا، نہ ہی کوئی رسمیں ہوئی تھیں۔ شادی سادگی سے، اسلامی طریقے سے ہوئی تھی۔ مہندی تک کی رسم نہیں ہوئی۔

س: شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج: ہائے، یہ کوئی ڈائجسٹ کی کہانی تھوڑی نہ تھی کہ میرا شوہر ساری رات میرے حسن کے قصیدے پڑھتا رہتا یا میرا ہاتھ تھام کر ساری رات گزار دیتا۔ یہ تو حقیقت تھی۔ میرے سسر حیات نہیں ہیں، شوہر سب سے بڑے ہیں تو بس یہ ہی نصیحت کی کہ میری ماں کا خیال رکھنا، بہنوں کا خیال رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔ ہاں دوسرے دن تعریف کی تھی کہ آج دن میں جب کسی کام سے گھر آیا، تم پر نظر پڑی تو حیران رہ گیا، بہت پیاری لگ رہی تھیں (آہم)۔

س: شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج: شادی کے بعد زندگی میں بہت تبدیلیاں

آئیں۔ ہمارے گھر کے اور ان کے ماحول میں بہت فرق تھا اور مجھے اس فرق کا اندازہ تھا، سو بس کمر کس لی۔ ظاہری اور باطنی طور پر بھی فرق آیا، نکھار بھی آیا اور اعتماد بھی آیا۔ میری ساس سب کے سامنے کہتی ہیں۔ جب تم آئی تھیں تو باتیں بھی کرنا نہیں آتی تھیں اور اب کسی کو بولنے ہی نہیں دیتیں۔

س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج: شادی کے آٹھ دس دن کے بعد کام شروع کر دیا تھا، ہمارے ہاں کھیر پکوائی کی رسم نہیں ہوتی تو بس گھر میں کوئی نہیں تھا تو برتن دھوئے تھے۔

س: میکے اور سسرال کے کھانے میں فرق؟

ج: کھانوں کا فرق تو لازمی بات ہے۔ میری امی کے ہاتھ کے کھانے سارے خاندان میں مشہور ہیں۔ میرے سسرال والوں کو بھی میری امی کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند ہیں اور کھانا سسرال میں بھی اچھا بنتا تھا اور اب میں خود بہت اچھا کھانا بناتی ہوں۔ میری نندوں کو میرے ہاتھ کے نوڈلز، شامی کباب، بریانی اور رس ملائی بہت پسند ہیں، فرمائش کر کے بنواتی ہیں۔

س: سسرال میں کن باتوں پر تنقید اور کن پر تعریف ہوئی؟

ج: تنقید کو تو رہنے دیں۔ وہ دور گزر گیا، چودہ سال ہو گئے شادی کو اور پانچ سال پہلے ہم الگ بھی ہو گئے تو اب تو راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ ہاں تعریف کرتے ہیں۔ ساس بھی بہت اور نندیں بھی میری تعریف کرتی ہیں۔

کچھ دن پہلے میری نند گاؤں سے آئی تھی، جب میں وہاں گئی تو وہ لیٹی ہوئی تھی۔ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

”میری دل دی بھرجائی آ گئی“

اسی طرح ساس بھی سب سے کہتی ہیں کہ ”میری بڑی بہو سب سے اچھی ہے۔ اس کے برابر ایک بھی نہیں ہے۔“

حالانکہ چھوٹی بہو سگی بھانجی ہے میری ساس کی اور میری دوسرے نمبر والی دیورانی کہتی ہے کہ......

”اس نے تم لوگوں کو پتا نہیں کون سا پانی دم کر کے پلایا ہے کہ سب اسی کی تعریفیں کرتے ہو۔“

جب گھر والے تعریف کرتے ہیں تو سارا خاندان ہی تعریف کرتا ہے (اللہ کا شکر ہے)۔

س: ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا؟

ج: تصور کوئی نہیں تھا بلکہ مجھے بھی حسنل کی طرح ایک گلوکار پسند تھا۔ حسنل کا کردار پڑھ کر تو میں حیران رہ گئی تھی۔ بالکل میرا والا حال تھا، اسی طرح میں بھی دعائیں کرتی تھی اور کہتی تھی اللہ سب کچھ کر سکتا ہے تو وہ مجھے یہ بھی دے گا۔ مگر ہائے قسمت نہ میں حسنل تھی، نہ ماہ رو۔ سو مجھے وہ گلوکار نہیں ملا۔ ہاں یہ دعا ضرور کرتی تھی کہ ”پڑھا لکھا“ سمجھ دار ہو اور شک نہ کرتا ہو اور اللہ کا شکر ہے میرے شوہر بہت سمجھ دار ہیں مگر غصے کے بہت تیز ہیں۔ پورے خاندان میں ان کا غصہ مشہور ہے۔

س: بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی کا بہت بڑا امتحان ہے، خصوصاً پہلا بچہ؟

ج: جب میری شادی ہوئی تو ایک مہینے بعد چھوٹی نند کہنے لگی ’میرے استاد جی کی تو شادی ہوئی تھی، ان کا تو بیٹا ہو گیا۔ گل لالہ جی کا بیٹا کیوں نہیں ہو رہا۔ اس کی بات سن کر سب حیران تھے۔ استاد جی کی شادی تو سال پہلے ہوئی تھی تو بیٹا ہو گیا جبکہ یہاں تو ابھی صرف مہینہ ہوا ہے‘ اتنی جلدی بچہ کیسے ہوگا۔

مگر خیر سال بعد مجھے اللہ نے بیٹا دیا تو سب خوش تھے، بہت زیادہ خوش تھے۔ میرے شوہر نے اسپتال میں ہی نفل پڑھے تھے، سارے محلے میں مٹھائی بانٹی تھی۔ میرے شوہر نے اپنے دوستوں کی ٹی پارٹی بھی کی تھی اور دو بکرے ذبح کر کے عقیقہ بھی کیا تھا۔ میں اس معاملے میں بھی بہت خوش قسمت ہوں۔ میرے بچوں کے نصیب میں بہت محبتیں ہیں اور عمر جو دادی اور نانی دونوں طرف سے پہلا بچہ تھا۔ نانی اور خالاؤں کی آنکھ کا تارا تھا تو دادی اور پھوپھیوں کا لاڈلا تھا۔

میری چھ نندوں میں سے پانچ اس وقت کنواری تھیں تو عمر کو میں فیڈ کروانے کے لیے گود میں لیتی تو ان کی لڑائی شروع ہو جاتی۔

”ابھی تک تمہارے پاس تھا، اب میں لوں گی۔ بھابی جان اس کو نہیں دینا، مجھے دینا۔“ دوسری آگے ہوتی۔ ”جی نہیں بھابی جان! مجھے دیں گی۔“ اور بے چاری بھابی کی جان مشکل میں پھنس جاتی۔

میرے ماشاء اللہ چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹی ایب نارمل ہے، اسپیشل بچی۔ میرے دونوں دیوروں کے بھی بچے ہیں مگر میری ساس اور نندیں میرے بچوں سے زیادہ محبت کرتی ہیں بلکہ میری ساس خود کہتی ہیں۔ بڑا بیٹا اور اس کے بچے مجھے بہت پسند ہیں۔ اس بات پر تم لوگ خفا نہیں ہو گے، یہ دل کی بات ہے اور دل پر کسی کا زور نہیں چلتا۔

س: آپ جوائنٹ فیملی سسٹم پسند کرتی ہیں یا اکیلے رہنا؟

ج: دیکھیں جی ہمارے اسلام میں تو جوائنٹ سسٹم کا کوئی تصور نہیں ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے یہاں زیادہ تر فیملیز جوائنٹ ہی رہتی ہیں اور بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے تو میں نے نو سال سسرال کے ساتھ گزارے تب بھی میں خوش تھی اور اب پانچ سال سے الگ ہوں تو اب بھی خوش ہوں مگر شروع میں بہت خفا ہوتی تھی کہ میں یہاں اکیلی ہوں اور وہ سب وہاں اکٹھے ہوں گے۔ میری ساس نے دو بیٹوں کو اسی گھر میں الگ کر دیا اور میرے شوہر نے ایک گھر چھوڑ کر اسی گلی میں گھر بنا لیا یہ سب کچھ باہمی رضامندی سے ہوا اور اب ہم سب الگ ہیں۔

س: آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی، کس حد تک کامیاب ہوئیں؟

ج: ایک باہر سے آئی ہوئی لڑکی ماحول بدل نہیں سکتی کیونکہ ہر کوئی اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتا ہے۔ میں نے کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہی مگر یہ سب کچھ ایک دم نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ سالوں لگ جاتے ہیں تبدیلی آنے میں۔ میری نندیں اور دیورانیاں بالکل ان پڑھ ہیں۔ میں نے ان کو گھر میں ٹیوشن پڑھانی شروع کی اور شکر ہے، وہ اردو لکھ اور پڑھ لیتی ہیں اور چھوٹی والی تو انگلش بھی پڑھ لیتی ہے۔ اب میری ساری نندوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھروں میں خوش ہیں اور میری چھوٹی نند کہتی تھی۔

”میں شادی کے بعد اپنے گھر میں ایسے رہوں گی جیسے بھابی جان رہتی ہیں۔“

یہ ان کی محبت ہے جو مجھے کسی قابل سمجھتے ہیں، میں اپنے آپ کو کسی قابل نہیں سمجھتی۔

س: نئی شادی شدہ لڑکیوں کے لیے پیغام؟

ج: کچھ دنوں پہلے (کرن) میں ایک کہانی پڑھی تھی (جندڑی) کے نام سے میں کہنا چاہوں گی، یہ کہانی پڑھیں اور اپنی جندڑی رول دیں۔

سب کچھ مل جاتا ہے انسان کو مگر صبر کرنا پڑتا ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، بہت میٹھا ہوتا ہے مگر یہ قسمت والوں کو ملتا ہے۔

شوہر کی ماں کو اپنی ماں نہ سمجھیں۔ شوہر کی ماں ہی سمجھیں۔ جب شوہر سے محبت ہے ماں سے کیوں نہیں، اسی طرح سارے رشتے ہیں۔ ہر رشتے سے اس کے مقام کے مطابق محبت کریں اور اپنے دل کو بڑا کریں۔ پانچ وقت کی نماز پڑھیں اور اللہ سے شوہر کی محبت اور عزت مانگیں۔ خدمت کو اپنا شعار بنا لیں۔ میرے شوہر کہتے ہیں، عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے اللہ ملتا ہے۔ اب تم خود سوچ لو تمہیں کیا چاہیے۔ (جنت یا اللہ) ظاہری بات ہے اللہ چاہیے۔

اللہ کے بندوں کو خوش رکھیں، سسرال میں جو بھی حالات ہوں، کبھی بھی اپنی ماں بہنوں کو مت بتائیں۔ گھر کے مسئلے گھر میں سلجھائیں۔ میکے جا کر نہ بیٹھ جائیں۔ ماں باپ کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ سے مدد مانگنی چاہیے بے شک وہ بیڑے پار لگانے والا ہے۔ سکون سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے، بس یہ نعمت اللہ سے مانگیں خود بھی خوش رہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھیں۔ ☆

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

ناظمہ زیدی۔ چوک اعظم

(1) شعاع کب سے پڑھ رہی ہوں یاد نہیں، ماضی کے جھروکوں میں جھانکوں تو ہلکی سی شبیہہ آتی ہے، شعاع اور میرا تب کا ساتھ ہے جب مجھے لفظ ''شعاع'' پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ گھر میں دو بڑے بھائی ٹارزن، عمرو اور عمران سیریز بہت شوق سے پڑھتے تھے سو میں بھی۔ امی ایک رسالا تصویروں والا پڑھتی تھیں۔ مجھ سے منگواتی تھیں۔

ایک دن دکان دار نے شعاع دے دیا کہ یہ بھی پڑھ کے دیکھیں۔ لا کر امی کو دیا' امی تو پھر ہر ماہ پڑھنے لگیں۔ رنگین تصاویر والا رسالا بھی آتا رہا (مجھے پسند تھیں تصویریں) خیر آہستہ آہستہ لطائف اور مختصر افسانے پڑھنے شروع کیے' کوئی پابندی نہیں تھی۔

میں پڑھائی میں اچھی تھی' شعاع کو بدنام نہ ہونے دیا' ہاں یہ ہوا کہ شعاع پڑھنے سے میری املا اور لکھائی بہت اچھی ہوگئی۔ اردو میں مضمون لکھنا ہویا محاورات کا استعمال۔ شعاع نے میری اردو کی کارکردگی پر مثبت اثر ڈالا۔ مجھے یاد ہے' شعاع اس وقت ہاتھ کی لکھائی سے لکھا (کتابت) ہوتا تھا۔ یہ شاید 98-99ء کی بات ہے۔

یہ تو تھا شادی سے پہلے کا دور' شادی کے بعد میرے صاحب مجھ سے بھی بڑے رسالوں کے رسیا نکلے (جاسوسی ادب) چلو جی ہماری تو چاندی ہوگئی۔ اب وہ اپنے رسالے لاتے اور ساتھ میرے بھی۔ ان کی جاب کی نیچر کچھ ایسی تھی کہ آدھی رات کو واپس آتے۔ سو تنہائی کی ان راتوں کو کاٹنے میں شعاع نے بہت ساتھ نبھایا۔ رات کو شعاع پڑھتی اور دن میں کہانیاں بُنتی۔ اس کا اینڈ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

خیر زمانے کی تخی اور گھر داری سکھانے میں شعاع کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

(2) دن کے آغاز و انجام کے بارے میں کیا لکھوں کہ

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

(3) کچھ تحریریں بھلائے نہیں بھولتیں۔ سحر سا طاری کر دیتی ہیں۔ مگر اب ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک تحریر ''ایک البیلی پگڈنڈی ہے۔'' بس وہ احساسات میں لفظوں میں نہیں ڈھال سکتی۔ تب میں چھوٹی تھی' مصنفہ کا نام یاد نہیں۔

ایک کہانی جس میں دادی اپنی پوتی کو گھر داری سکھاتی ہیں۔ اسٹور صاف کر کے دیتی ہیں۔ مجھے بہت پسند تھی۔

ایک اور افسانہ تھا۔ ہیرو بیمار، چھت پہ اوپر والے کمرے میں رہتا ہے، کہیں مہمان ہوتا ہے، ہیروئن پیچھے ہٹ جاتی ہے، ہیرو بک منگواتا ہے اس پہ ''بزدل'' لکھ کے بھیج دیتا ہے۔ یہ افسانے میری کچی عمر کا پہلا عشق ہیں۔ اگر کسی بہن کو پتا چل گیا ہو تو بتا دیں۔ میں ڈھونڈ لوں گی۔ کہیں نہ کہیں سے......

مطلب یہ کہ شعور آنے سے بھی پہلے شعاع اور خواتین ساتھ ہیں۔ پہلے خواتین میں طویل ناول زیادہ ہوتے تھے' مجھے بہت پسند تھے۔

کبھی سوچا نہ تھا کہ یوں شعاع کا حصہ بنوں گی کہ ہر ماہ شعاع اور خواتین میں میرا نام ہوگا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ چلو میں بھی کچھ لکھ کر بھیجوں پھر سوچا شاید مخصوص لوگ ہی شعاع کا حصہ بن سکتے ہیں، مگر پہلا خط بھیجا اور شائع ہوا۔ بہت خوشی ہوئی دیکھ کر۔ اب تو شہر کے لوگ پہچاننے بھی لگے ہیں۔ اچھا اچھا آپ ہیں جنہوں نے چوک اعظم کا تعارف لکھ کر بھیجا تھا؟

(4) خوبیاں اپنے منہ سے بتاتی کیا اچھی لگوں گی۔ بس اللہ کی بندی ہوں۔ ہاں ایک بات ہے مجھ میں امید مرتی نہیں۔

خامیاں خود کیسے بتاؤں' میرے جاتے ہی محفل میں یہ کام ہوجاتا ہے۔

(5) دلچسپ واقعہ...... شعاع کے حوالے سے بہت سے واقعات ہیں۔ جب میں فرسٹ ایئر میں تھی تو ''پیرِ کامل'' شائع ہوا۔ تب ساتھ ساتھ ہی پڑھا۔

بہت بعد میں جب کسی کلاس فیلو نے سنایا تو میں زیرِ لب مسکرا دی کہ میں تو ختم بھی کر چکی۔

مری میں ایک واقعہ ہوا کہ جب مری پہنچے تو سامنے ہی ''بک میلہ'' کا پوسٹر لگا تھا۔ سب گھومنے پھرنے میں مصروف اور میں وہ دوکان ڈھونڈنے میں، بالآخر آخری دن وہ دوکان ملی۔ 50% آف تھا ہر کتاب پہ۔ اتنی خوشی کہ بس میں بے حال۔ سب دوستیں مال روڈ پہ جیولری ڈسکس کر رہی تھیں۔

بہت دکھ ہوا جب اس ویران دکان کو دیکھا ساتھ والیاں ''پاگل ہو، اب تو ہر چیز نیٹ اور ٹی وی پر آگئی ہے'' ''چھوڑو کتابیں'' اور میرا جواب۔

''یار! تم لوگ جاؤ۔ میں جوائن کرتی ہوں۔''

واپسی کے سفر میں ایسا لگا کہ جیسے کوئی خزانہ ساتھ ہو وہاں پر نمرہ، عمیرہ، نگہت عبداللہ، عنیزہ سید، وغیرہ، وغیرہ کی کتابیں دیکھ کر ایسا حال ہوا جیسا کسی بچے کا مٹھائی کی دکان پہ جا کر ہو۔

روز و شب کا احوال

میری زندگی میرے بچوں سے شروع اور شعاع پر ختم ہوتی ہے۔ صبح اٹھ کے بچوں کے ساتھ مصروفیت اور رات کو بالکل تنہائی میں شعاع۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ ''جب محبوب کے ساتھ ہوں تو، کسی کی مداخلت اچھی نہیں لگتی'' سو مجھے بھی بہت محو ہو کے پڑھنا پسند ہے۔ گم ہو جاتی ہوں۔ بس میں اور میری تصوراتی دنیا۔

ٹی وی سے دلچسپی بہت کم ہے، جب کوئی رسالوں کے ساتھ میرا جنون دیکھ کے پوچھتا ہے تو ایک ہی جواب دیتی ہوں کہ ٹی وی ہمارے تابع نہیں جبکہ کتاب کو جب بھی اٹھاؤ گے' وہ جہان وہیں سے آباد ہو جائے گا جہاں چھوڑا ہے۔

مری میں میری چھوٹی بیٹی ''ام لیبا'' نے کہا ماما یہاں اللہ میاں تھوڑے پاس ہیں؟'' (مطلب پہاڑ پہ) میں ہنس پڑی۔

''جی بیٹا!''

''تو ماما اللہ سے دعا کریں ناں کہ آپ کی کہانی بھی چھپ جائے۔''

''اچھا بیٹا!''

ہمارا کام لکھ کے بھجوانا ہے۔ باقی ادارے کا۔ لکھنے والیاں مجھ سے اتفاق کریں گی کہ ''لکھ'' کے تسکین ملتی ہے، چھپنا اور پذیرائی تو بونس ہے۔

خیر' کسی نہ کسی طرح ہی سہی ہمارا نام بھی شعاع کی تاریخ میں امر ہو گیا ہے (خطوط کے ذریعے ہی سہی) ''تا تا'' دو مرتبہ لکھ کے بھیجا ہے ایک دفعہ امی کا اور ایک دفعہ اپنا، جنہیں بھی پتا تھا غور کیا ہو تو ''تا تا'' کے سوالات بھی میں نے تبدیل کیے تھے۔ (ادارے سے معذرت کے ساتھ) شوہر سے تعلقات، بہنوں کے نام کوئی پیغام، کوئی حسرت وغیرہ جیسے سوالات شامل نہ تھے۔ یہ سہرا عابدولت کے سر ہے۔

آج کل عمیرہ احمد کا ناول ''حسنہ اور حسن آرا'' زیرِ مطالعہ ہے۔ بہت دلچسپ ہے۔

(6) شعر اگر شعاع کے حوالے سے ہو تو یہ کہوں گی کہ شعاع اور خواتین کے بغیر زندگی کچھ ایسی ہوگی۔

تو کیا یہ طے ہے کہ اب عمر بھر نہیں ملنا
تو پھر یہ عمر ہی کیوں تجھ سے گر نہیں ملنا

چلو زمانے کی خاطر یہ درد بھی سہہ لیں
کہ اب کبھی جو گئے ٹوٹ کر نہیں ملتا

☆☆☆

ریحانہ چوہدری (مدوکے)

تجھ سے لفظوں کا نہیں روح کا رشتہ ہے میرا
تو میری سانسوں میں تحلیل ہے خوشبو کی طرح

شعاع کے ساتھ باقاعدہ تعلق تقریباً 2007ء سے استوار ہوا اس سے پہلے بھی ڈائجسٹ پڑھتی تھی لیکن زیر مطالعہ سسپنس، جاسوسی ڈائجسٹ وغیرہ اور ان ہی کی فیملی سے ریلیٹڈ فکشن اور عمران سیریز وغیرہ مگر جب سے شعاع اور خواتین کے ساتھ تعلق بنا بس جناب کچھ نہ پوچھیے بقول شاعر......

کھل گیاں سب زیراں . زبراں
جد ڈٹھے عشق منارے ہو

اب تو سانسوں کی تال کے ساتھ اگر کوئی سُر ساتھ دیتا ہے تو وہ نام شعاع اور خواتین کا ہے۔ ان ڈائجسٹوں کے سحر میں گرفتار کرنے والی رائیٹرز ہی نہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ ان رائیٹرز کو ہم سے متعارف کروانے والی انتظامیہ ڈائجسٹ کا بھی بہت بہت شکریہ۔ جنہوں نے ہمیں نمرہ احمد۔ عمیرہ احمد، سمیرا احمید، صائمہ اکرم چوہدری فرزانہ کھرل۔ نایاب جیلانی، ایمل رضا، سائرہ رضا، مصباح سید، نبیلہ عزیز اور دوسری بہت سی رائٹرز بھی جن کے نام لکھنے بیٹھوں تو شاید کئی صفحات درکار ہوں۔ متعارف کروایا۔ یہ وہ رائٹرز ہیں جنہوں نے اپنے قلم کی طاقت اور سحر سے ہمارے ذہنوں کو ہپناٹائز کیا ہوتا ہے۔

بہت سے ناول ہیں جن میں سیاہ حاشیہ، یارم بورشے، مصحف، پیر کامل، جنت کے پتے، آب حیات، نمل خاص طور پر اپنے نام ریمائنڈ کروا رہے ہیں۔ آپ کی رائٹرز، رائٹرز نہیں میری نظر میں ماہر نفسیات ہیں۔ جو اپنی قارئین کے ذہن کو دنیا کی پریشانیوں اور فکروں سے نکال کر کچھ دیر اپنے سنگ سفر کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور اس کا اہتمام کرنے پر ہمارا شعاع نہ صرف مبارک باد کا مستحق ہے بلکہ ایک کار خیر سرانجام دیتا ہے۔

شعاع نوجوان لڑکیوں سے لے کر عمر رسیدہ خواتین میں یکساں مقبول ہے شعاع کے مستقل سلسلے ایک ایسی چیز ہیں جنہیں ہم باقی کا مہینہ بار بار پڑھتے ہیں اور جی پھر بھی نہیں بھرتا' بیڈ کا سرہانہ کبھی ڈائجسٹ سے خالی نہیں ہوتا۔

صبح کا آغاز کب ہوتا ہے دن بھر کے کام؟

بھئی جہاں تک صبح کے آغاز کا تعلق ہے تو کیا بتاؤں' آج تو میری صبح ایک بجے یوں شروع ہوگئی کہ میری بیٹی سارہ چوہدری کو واش روم جانا پڑ گیا۔ اسے دوبارہ سے سلایا اور اب موقع غنیمت جان کر لکھنے بیٹھ گئی ہوں کہ صبح "دن ہے اتوار کا۔ گزرے گا پرمشقت۔ ہزاروں کام تقریباً دو ہفتوں کے پینڈنگ پڑے ہوئے ہیں۔

جی تو میں بتا رہی تھی کہ عام روٹین میں میری صبح چار بجے کا الارم سن کے ہوتی ہے۔ الارم بجتا ہے تو میں آرام سے اسے سن کر آف کرتی ہوں اور پھر سو جاتی ہوں کہ ایک منٹ میں اٹھ جاؤں گی مگر الارم دس منٹ بعد دوبارہ بجتا ہے تو اٹھنا پڑتا ہے ورنہ میں اور میری دوست کوثر نغمہ نے ایک دوسرے سے کہہ رکھا ہے کہ جو بھی پہلے اٹھے اسے دوسرے کو مس کال کرنا ہے۔ تو اکثر میں اس کے فون سے اٹھتی ہوں اور کبھی کبھار میں بھی اسے اٹھا دیتی ہوں۔ بس جی اللہ صحت دے تو پھر ہوگئی صبح شروع۔

اللہ کا نام لے کر نماز اور قرآن پاک کی تلاوت اور پھر تسبیحات کا ورد کرتے ہوئے سیدھا اپنے گھر کے دارالحکومت کچن میں۔ چائے کے لیے دودھ ایک چولہے پہ رکھا کہ پورے گھر میں دودھ پتی ہی پسند کی جاتی ہے اب ایک پاؤں کچن میں اور ایک کبھی اپنے بیڈ روم میں اور کبھی بیٹے اور شوہر صاحب کے بیڈ روم میں کہ وہ باپ بیٹے علیحدہ کمرے میں اور ہم ماں بیٹیاں علیحدہ کمرے میں ہوتے ہیں (اسی لیے تو پڑھنے اور لکھنے کا وقت مل جاتا ہے)

ان سب کو جگانے کے لیے آوازیں دیتی جاتی ہوں اور سب کی من پسند چیزوں والا ناشتہ تیار کرتی جاتی ہوں۔

اب ارجمند کو ناشتے میں فرائی انڈا چاہیے۔ سارہ اور ارسلان کو الگ الگ قسم کے آملیٹ' نور کا اور اپنا خشک پھلکا اور رات کا بچا ہوا سالن اور انسپکٹر صاحب (مجازی خدا) کا ناشتہ جو بننے سے پہلے تک تو خشک پھلکا لیکن بنتے بنتے مولی والے پراٹھوں یا میتھرے والے پراٹھوں جو دیسی گھی سے تر بتر ہوں۔ میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے اور ساتھ ارشاد فرمایا جاتا ہے کہ کبھی کبھی ذرا ہیوی ناشتہ کر لینا چاہیے۔ یہ الگ بات کہ یہ کبھی کبھی ہفتے میں دو تین مرتبہ ہو جاتا ہے۔

یہ سب ناشتے بنا کر سارہ کا لنچ بنا کر ان سب کو شاہراہ تعلیم پر روانہ کرنے کے بعد تقریباً 6:50 پہ کچھ دیر تو میں فارغ۔

چلیں آپ بھی میرے ساتھ۔ میں جا رہی ہوں واک کرنے۔ گیٹ سے قدم باہر رکھا جی یہ سامنے دور تک ہماری اپنی زمینیں ہیں۔ کوئی ڈر خطرے والی بات نہیں ہے' لمبے لمبے سانس لیتی تسبیح ہاتھ میں پکڑ زمینوں کی پگڈنڈیاں ہیں اور ہم ہیں دوستو۔ بہت مزہ آتا ہے شان کریمی کے جلوے ہر ہر رنگ میں آ رہے ہیں کچھ پکی فصلوں کی خوشبو ذہن کو معطر کر رہی ہے۔ تقریباً 30 منٹ کی واک کے بعد گھر آ چکی ہوں۔

اب پھر کچن میں صاحب بہادر کا ناشتہ جلدی سے ٹیبل پر اور خود کچن سمیٹتے ساتھ ہی بھاگ دوڑ میں ناشتہ کرتی ہوں۔ اف آٹھ بجنے میں 5 منٹ رہ گئے کافی ہیں' پانچ منٹ میں تیار ہو کر 8 بجے اسکول وین میں بیٹھ کر اپنے اسکول گورنمنٹ گرلز ہائی سکول رندھیر جو پانچ منٹ کی ڈرائیو اور 25 منٹ کے واکنگ ڈسٹنس پہ ہے پہنچ جاتی ہوں۔

صبح تیاری کے ساتھ اسکول میں پڑھانے والے اسباق ذہن میں چل رہے ہوتے ہیں تو سوا دو بجے چھٹی ہونے پہ گھر پہنچنے تک گھر کے کام ذہن پہ سوار ہوتے ہیں۔

تالا کھولا اور گھر پیارا گھر ہے اور ہم ہیں دوستو' اب پریشان کہ پہلے کیا کریں لیکن ٹھہریں میں ذرا بائیں باغ کے پچھواڑے میں رہنے والی عصمت کو آواز دے لوں۔ بھئی وہ میری ہیلپنگ ہینڈ ہے' ساتھ مدد کرواتی ہے۔

اب سارہ کے کھانے کو پلاؤ یا نوڈلز وغیرہ بنا کر تین دس پر اسے سڑک سے لینے جاتی ہوں جہاں کچھ دیر انتظار بھی کرنا پڑ جاتا ہے اور گاؤں کی کچھ عورتوں سے ہائے ہیلو بھی ہو جاتی ہے۔ پھر شام تک سب کی مرضی کے مطابق کھانے تیار کر کے ساتھ کپڑوں وغیرہ کی تیاری بھی چلتی رہتی ہے اور اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے رات بنائی' جونہی فارغ ہو کر لیٹتی ہوں پھر کچھ ہوش نہیں رہتا۔ بچے جانیں اور ان کے کام اور ان کے پاپا۔

خوبیاں اور خامیاں

ارے کہاں کی خوبیاں اور کیسی خوبیاں؟ ہمیں تو لگتا ہے کہ (اب ہو چلا یقین کہ برے ہم ہیں دوستو) کے مصداق ہر خامی ہمارے اندر بدرجہ اتم موجود ہے

کبھی بچپن میں اپنی امی جان مرحومہ (اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین) کی زبان سے اور اپنی بہنوں کی زبان سے بہت سی خوبیوں کا ذکر سنا کرتے تھے لیکن پھر تو ماشاء اللہ سسرال والوں کا اللہ بھلا کرے انہوں نے تو وہ وہ خوبیاں ڈھونڈیں کہ الحفیظ والا ماں (مذاق ہی سمجھے گا ورنہ ہے نہیں) ویسے میری کولیگز کو بھی کچھ کچھ خوبیاں نظر آ ہی جاتی ہیں ورنہ من آنم کہ من دانم یہ مجھے ہی پتا ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

بہت جذباتی ہوں' بات بات پہ رونا آ جاتا ہے۔ غصہ آتا ہے لیکن کوشش کرتی ہوں کہ پی جاؤں اسی لیے بلڈ پریشر ہائی کر لیتی ہوں اپنی غلطی ہو تو فوراً نادم ہو کر معافی مانگ لیتی ہوں' حساس اتنی کہ اگلے بندے کا لہجہ بدلا نہیں اور دل پہ چوٹ لگی نہیں۔ مجھے اچھے لوگوں کو سننا بہت اچھا لگتا ہے۔ اچھی کتابیں پڑھنے کا تو گویا نشہ ہے۔ اور ہماری ہیڈ مسٹریس میڈم بشریٰ کے بقول ہم گفتگو کے فن سے بھی کچھ نہ کچھ آشنائی رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ تو لذت بھی رکھی ہے اور کچھ میری مرحومہ مغفورہ ساس صاحبہ کی تربیت کا اعجاز بھی ہے کہ الحمد للہ سب میرے ہاتھ کا کھانا بہت پسند کرتے ہیں۔ سب ہی عزیز و اقارب' دوستیں اور خاص طور پر بہنوں کے سسرال والے بھی سب لوگ اپنے دل کی باتیں بے فکر ہو کر میرے دل کے لاکر میں جمع کرواتے ہیں جہاں ان کے دکھڑے ہمیشہ محفوظ رہنے کی گارنٹی انہیں خود ہی ہوتی ہے۔

موسم تو سارے ہی اچھے ہوتے ہیں کیونکہ بقول شاعر

"موسم تو انسان کے اندر ہوتے ہیں"

لیکن پھر بھی بہار اور برسات کا موسم مجھے بہت پسند ہے جب بادل گھر گھر کر آتے ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں' ہواؤں کے دوش پر فصلیں لہراتی ہیں تو اللہ کی حمد و ثنا زبان خود بخود کرنے لگتی ہے۔

اور جناب بارش کے آثار نظر آتے ہی بچوں اور بڑوں کی فرمائشیں شروع ہو جاتی ہیں کچھ کو پکوڑے اور کچھ کو میٹھے پورے گڑ کے بنے ہوئے چاہیے ہوتے ہیں اور میں بے چاری سب کی فرمائشیں پوری کرتے کرتے اپنے پسندیدہ ترین موسم سے لطف اندوز ہونے سے محروم رہتے ہوئے بھی سرشار رہتی ہوں کہ اپنی فیملی کی خوشی مجھے دنیا کی ہر چیز سے مقدم ہے۔ اپنا کیا ہے؟ کوئی گل نہیں۔

پسندیدہ اقتباس

"کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو دنیا تم میں نہ رہے کیونکہ کشتی جب تک پانی میں رہتی ہے' خوب تیرتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں آ جاتا ہے۔ تو وہ ڈوب جاتی ہے۔"

بھئی شعر تو میری کمزوری ہیں۔ برمحل شعر پڑھنا موقع کی مناسبت سے اسے بھی آپ چاہیں تو میری خوبی سمجھ سکتے ہیں۔ میری کولیگز کہتی ہیں کہ میرے بات کرنے سے پتا چلتا ہے کہ میں نے ایم اے اردو کیا ہوا ہے۔ بہت سے شعر پسند ہیں لیکن فار ا یور جو پسند ہیں درج ہیں۔

ایسے رہا کرو کہ کریں لوگ آرزو
ایسا چلن چلو کہ زمانہ مثال دے
کسی اور سے کرو نہ کبھی تم سلوک ایسا
جو کوئی اور کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

ایک پنجابی شعر ہے۔

ایس دنیا وچ دکھ فقیرا ایسا بین کھلون
کول ہوویں تے سن سارے ٹر جاویں تے رون

ترجمہ۔ (اس دنیا میں اپنا رویہ ایسا رکھو کہ موجودگی میں سب خوش ہوں اور غیر موجودگی میں پریشان)

بغیر اجازت شعاع کو اپنا سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ تعلق کو لفظوں کی زباں دے دی ہے۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

رخسانہ نگار عدنان

شام کی حویلی میں

لوئی لوئی بھرے کڑیے جے توں بھانڈا بھرناں
شام پٹی پن شام محمد گھر جا ندی نے ڈرناں
تہیں رات وچھوڑے والی، پل جھل سکھیاں بھانے
جو کوئی قید عشق دے اندر قدر اوہو کچھ جانے

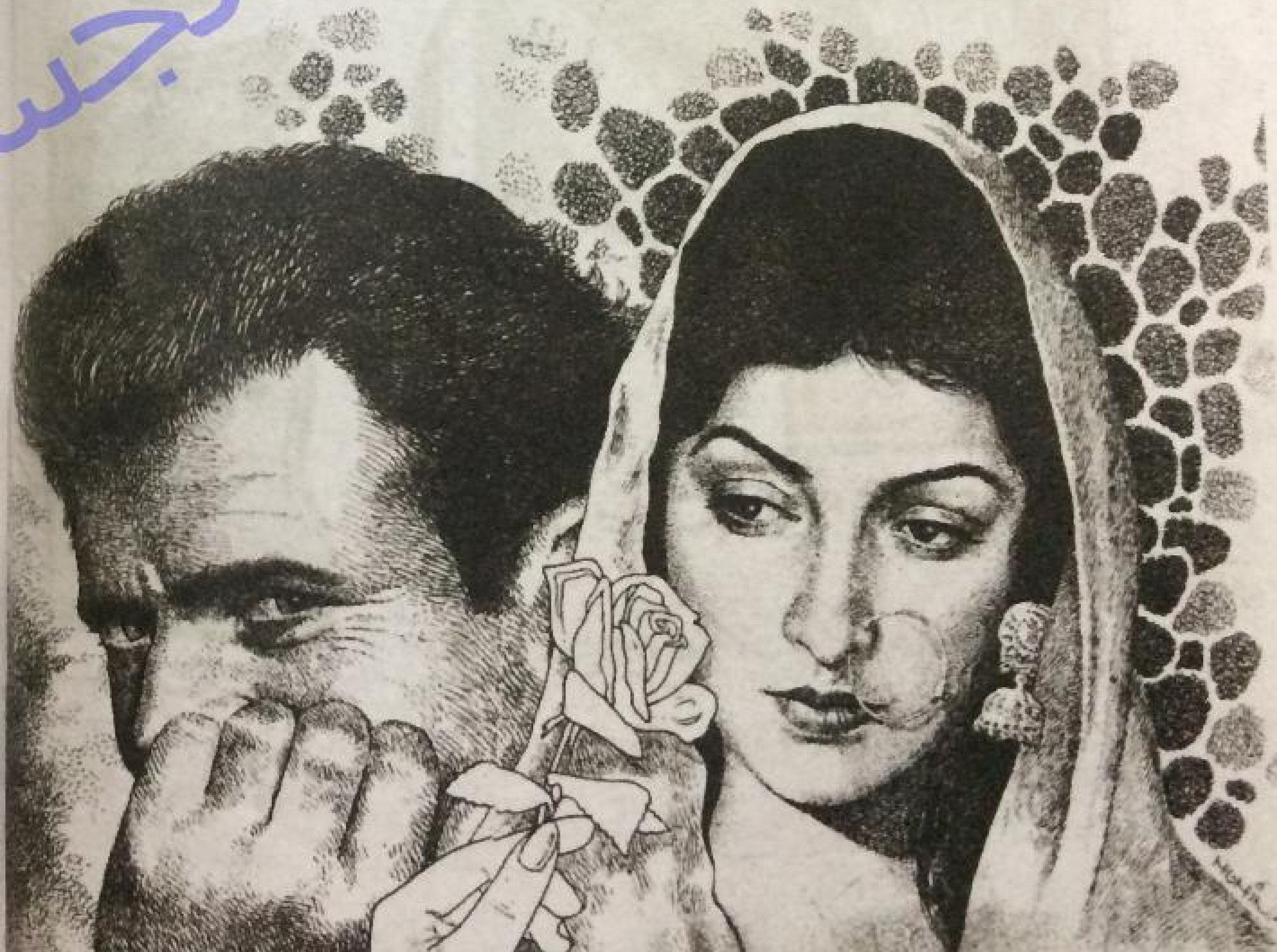
محمد بخش کا کلام بڑی دل سوزی سے پڑھتا اپنے دھیان میں گم ہوا، وقفے وقفے سے لاٹھی زوردار طریقے سے زمین پر مارتا گلیوں گلیوں پھرتا دین محمد دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی بھاری آواز کی گونج بھی فضا میں مرتعش ہوتی اب بالکل گم ہوتی جا رہی تھی۔

لوئی لوئی بھرے کڑیے جے توں بھانڈا بھرناں

اس کے اندر جیسے کوئی ہولے ہولے ان لفظوں کو بار بار دہراتا جا رہا تھا۔

ایک ہی لائن کی تکرار! اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی، پھر وہی لائن۔

وہ جھلا کر اٹھتے ہوئے بولی۔



”اس دین محمد کی نہیں سمجھ میں آتا جتنی بار مرضی سمجھا لو۔ اپنے دل کے پھپھولے اپنے دل تک رکھا کرو، سارے جگ کو سنانے، ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر وہ کہاں باز آنے والا ہے۔ اڑ گئی نیند۔“

نیند کی تو یوں بھی اس کے ساتھ بڑی پرانی دشمنی تھی۔

اب تو نیند کی گولیاں بھی اثر نہیں کرتی تھیں۔ اس نے بے بسی سے کمرے میں پھیلے اندھیرے کو دیکھا اسے عجیب سا احساس ہوا۔

جیسے بند دروازے، کھڑکیوں کو کوئی پورا زور لگا کر دھکے دے رہا ہو۔ اندر کی طرف دھکیل رہا ہو۔

فضا میں شور کریں بھرتی سر پھری ہوا کی آوازیں اس نے کان لگا کر سنیں وہ تیزی سے اٹھی۔

کھڑکی کھولی تو جیسے دھکے دیتی پوری طاقت سے زور لگاتی ہوا اندر کی طرف اسے دھکیلنے لگی۔ مٹی کی خوشبو کے ساتھ مرغولے بل کھاتے سارے میں جگہ گھیرنے لگے۔

دروازہ کھول کر باہر جاتے سارے کمروں کی کھڑکیاں، دروازے بند کرتے ہوئے اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔ اوپر والے برآمدے میں گھپ اندھیرا تھا۔

شام سے جو دیا وہاں جلایا جاتا تھا، وہ ہوا اور آندھی کے زور سے جانے کب کا بجھ چکا تھا۔

اسے لگا جیسے کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں لے لیا ہو۔ وہ وہیں صحن کی سیڑھیوں کے قدموں میں بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور یہ کوشش فضول ہے بالکل فضول یوں دیا جلانا اور اسے ہوا کے سپرد کر کے اس کے جلتے رہنے کی امید رکھنا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے، ساتھ ہی آسمان سے ٹپ ٹپ گرتی بوندیں ایک تواتر سے اس پر برسنے لگیں۔

☆☆☆

اندرون شہر میں صبح بہت جلدی اور بڑے ہنگامی انداز میں ہوتی ہے۔ باہر سے آنے والے مسلسل شور، ریڑھی فروشوں، خوانچے والوں کی گلا پھاڑ کر صبح سویرے بوہنی کمانے کے لیے سودا بیچنے کا شور اسے مسلسل کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اونچی چھت کے بنے کمرے میں بڑی بڑی پرانی طرز کی کھڑکیاں جن میں لگے رنگ دار شیشوں سے سرخ، سبز، قرمزی، نیلی شعاعیں اسے بار بار اٹھ جانے کی ترغیب دے رہی تھیں۔

کھڑکیوں کے آگے پردے لگے تھے مگر کھڑکیوں سے اوپر بھی روشن دان تھا۔ رنگین شیشوں کی خوب سجاوٹ کی گئی تھی۔ جو بھی شیشہ گلی میں کھیلنے والے بچوں کی کرکٹ بال سے شہید ہوتا تو اس کی جگہ کشف کے لاکھ شور مچانے کے باوجود زینب پورے شہر میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر ویسا ہی یا ملتا جلتا شیشہ لگوا لیتی پھر سے۔

”قسم سے آنی! آپ کو تو محکمہ آثار قدیمہ کا سرپرست اعلا ہونا چاہیے آئی مین چیئر مین ٹائپ کی کوئی چیز۔“

”محکمہ آثار قدیمہ کا سرپرست اعلا۔ اردو تو تمہاری بڑی شان دار ہوتی جا رہی ہے بھئی گریٹ۔“ زینب الٹا اس کا مذاق اڑاتی۔

”پتا نہیں کیوں آپ اس صدیوں پرانے قومی ورثے کو سینے سے چمٹائے دودھ پیتے بچے کی طرح سنبھالے جا رہی ہیں اب تو اس کھنڈر میں رہتے ہوئے بھی خوف آنے لگا ہے قسم سے۔“

کشف بہت بے زار ہو چکی تھی اس پرانے عمر رسیدہ گھر سے۔

”تم نے خود ہی جواب دے دیا۔ قومی ورثہ...... تو میری جان جو قومیں اپنے قومی ورثے کی حفاظت نہیں کرتیں، دودھ پیتے بچے کی طرح اسے سینے سے نہیں لگا کر رکھتیں۔ ان کے زوال کی کہانی آنے والے لوگوں کے لیے صرف ایک داستان عبرت میں بن کر رہ جاتی ہے۔“

زینب کے پاس کشف کی ہر چڑچڑاہٹ کا ایسا ہی مزید چڑا دینے والا جواب تیار ہوتا تھا۔

”فار گاڈ سیک، نہ مجھے ہسٹری سے کوئی عشق ہے اور نہ داستان عبرت وغیرہ بننے یا سننے کا۔“ وہ واقعی میں وہاں سے چڑ کر چلی جاتی۔

”یہ مچھلی منڈی کا شور مجھے نہیں سونے دے گا۔“ اس نے جھلا کر چادر ایک طرف پھینکی۔ آنکھیں ابھی بھی نیند سے بھاری تھیں۔ اس نے تکیے کے نیچے پڑا فون اٹھا کر وقت دیکھا۔

دیوار پر لگا وال کلاک پچھلے ایک ہفتے سے سوا بارہ بجے پر رکا تھا۔ سیل لانا دونوں ہی بھول جاتیں۔

”افوہ ابھی تو ساڑھے سات بھی نہیں ہوئے۔ کیا مصیبت ہے یار۔“ اس نے جھلا کر تکیہ سیدھا کر کے پھر سے سونے کی کوشش کی۔ آنکھیں بند کر کے وہ کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی، صرف سونا چاہتی تھی کچھ دیر اور!

”آڑو لے لو آم لے لو چمن کا انگور قندھاری انار سیب ہے۔“ زوردار آواز میں پھل فروش کی آواز سے وہ بے ساختہ ڈر کر ہلکی سی چیخ مارتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا مصیبت ہے۔ مر جائیں اللہ کرے سارے جو اس گلی سے گزرتے ہیں۔ آسمان تک دیواریں چنی جائیں۔ ان کے آگے راستے بند ہو جائیں سارے ان کے اللہ کرے ان کے گلے بیٹھ جائیں۔ منحوسوں کی آوازیں بند ہو جائیں۔ گونگے ہو جائیں یہ سارے۔“ غصے بے بسی اور رنج میں وہ اونچی اونچی بددعائیں دینے لگی تھی بس جیسے ابھی رونے لگے گی۔

تکیہ چادر ایک طرف پھینک کر بالوں پر ہاتھ پھیرتی وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کے سیل فون میں چڑیا کے چہکنے کی آواز سنائی دی۔

”بس ہو گا کسی منحوس کا فارورڈ مصنوعی دعاؤں سے لبریز میسج، سارے دوسرے کی بھلائی کی خاطر دہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ اتنا خلوص ہونے لگا ان دوستوں اور رشتوں میں تو نہ معلوم ہمارا معاشرہ جنت گم گشتہ ہی نہ بن جائے پھر تو کوئی بہشت کی آرزو بھی نہ کرے۔ ہونہہ۔“ کہہ کر اس نے سیل فون اٹھا کر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسری دیکھا پھر بے زار ہو کر فون واپس پٹخ دیا۔ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی پھر چپل پیروں میں اڑستی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

سونیا نے گرم چائے لا کر بھرے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی۔

طاہرہ بیگم نے ایک نظر سونیا کو اور انہماک سے ناشتہ کرتے آزر کو دیکھا۔

”پھر کیا سوچا تم دونوں نے ”آزر۔“ انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے ذرا رعب دار لہجے میں کہا اگرچہ اس کی ضرورت کبھی نہیں تھی کہ جتنا رعب ان کے شان دار سراپے سے جھلکتا تھا پہلی بار ان سے ملنے والا بھی خوامخواہ رعب میں آ جاتا تھا۔

وہ بات بھی بہت نپے تلے انداز میں کرتی تھیں۔ اس لیے سونیا نے ایک اصول بنا لیا تھا کہ جب بھی ان کی ساس آزر کی موجودگی میں اس سے بات کریں گی تو وہ زبان دانتوں تلے دبا کر خود کو بالکل خاموش رکھے گی۔ آزر ہی کو پہلے بولنا پڑتا۔ سو آج بھی یہ ہی احتیاط سونیا کے کام آ گئی۔

”کون سی بات اماں جان؟“ آزر کو یوں بھی آفس جانے سے پہلے گھر کا ہر نرم گرم معاملہ بھول جایا کرتا تھا۔

حسب توقع طاہرہ بیگم کے ماتھے پر ناگواری کی شکن ابھری تھی۔ اور سونیا جان چکی تھی ان کا اشارہ کس بات کی طرف ہے لیکن آج بھی اس نے اپنا تیر بہدف نسخہ ترک نہیں کیا۔

سر جھکا کر خاموشی سے شوہر اور ساس کے مگوں میں گرم چائے انڈیلتی رہی۔

''جوان بیٹیوں کے باپ ہو آزر! اب تمہیں یہ لاپروائی زیب نہیں دیتی۔'' ان کا فہمائشی انداز آزر کو بے اختیار کھٹکا گیا۔ تیزی سے ناشتہ کرتے ان کے ہاتھ وہیں تھم گئے۔ ایک سوالیہ سی نظر سونیا کی طرف ڈالی اور جیسے معاملہ سمجھ کر ہلکا سا سر جھٹکا۔

''لیکن ایک بات آپ بھی بھول جاتی ہیں اماں جان! آپ نے تو ابھی تک مجھے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ میں اب بڑا ہو چکا ہوں بچہ نہیں رہا۔'' مسکرا کر داد طلب نظروں سے ماں کی طرف دیکھا جہاں ہنوز سنجیدگی طاری تھی۔

''ظاہر ہے ہمیں کچھ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں اور رمشا کے بارے میں آخری فیصلہ تو آپ ہی کا ہوگا بلکہ حمزہ کا اختیار بھی آپ ہی کو ہوگا۔ کیوں سونیا! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔'' آخر میں بڑا زور دینے والا انداز تھا جیسے سونیا انہیں ان سارے معاملات کا اختیار اپنی اماں جان کو تفویض کرنے کا فیصلہ بہ رضا و رغبت کر چکی ہے۔

''جی......'' پھر سے اپنے تاثرات کو چھپاتے ہوئے سونیا نے رخ پھیر کر یونہی پیچھے دیکھا تھا کہ ساس اس کی آنکھوں میں نہ جھانک لیں۔

''خیر...... آخری فیصلہ تو تم دونوں کو کرنا ہے بہر حال ماں باپ تو تم ہی ہو اور میں کوئی عمر خضر لکھوا کر نہیں آئی کہ سب کچھ یونہی چلتا رہے گا۔ اور میں تم لوگوں کے سروں پر بیٹھی رہوں گی۔'' ہمیشہ کی عادت تھی یہ عابدہ بیگم کی۔ جوتا ہمیشہ سامنے والے کو مخمل میں ہی لپیٹ کر مارتی تھیں بلکہ کوئی بھی بڑے سے بڑا فعل وہ تہذیب کے دائرے میں رہ کر کرنا معتبر سمجھتی تھیں۔

''میری پیاری اماں جان! میری تو دعا ہے حضرت خضر بھی آپ سے عمر کے کچھ سال ادھار مانگنے آئیں۔ آپ کو میری ہم سب کی عمر بھی لگ جائے۔'' آج تو آزر نے لاڈ کی انتہا ہی کر دی۔ چائے اتنی کڑوی نہیں تھی جتنا سونیا کا حلق کڑوا ہوا۔ آزر نے اٹھ کر بڑے اہتمام سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر باقاعدہ انہیں پیار کیا تھا۔

طاہرہ بیگم تو جی جان سے نہال ہو گئیں مگر حسب عادت کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔

ہلکا سا پیار کرتے ہوئے بیٹے کی تسلی کی اور یوں ہی بھر آنے والی آنکھوں کے گوشے ٹشو سے صاف کرنے لگیں۔

''ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے تمہارا پھر کہو گے آفس سے دیر کروا دی۔'' وہ اکثر بڑے طریقے سے کسی بھرپور جذبے کو کسی اور جذبے میں ڈھال دیا کرتی تھیں۔ پیار کو پروا اور فکرمندی میں شدید غصے اور نفرت کو پریشانی اور ان دیکھے اندیشوں میں بدلنے میں انہیں کوئی ہرا نہیں سکتا تھا۔

''یہ بچے کہاں رہ گئے ہیں ناشتہ بھی ٹھنڈا ہو رہا ہے اور پھر شور مچائیں گے تینوں کہ انہیں دیر ہو رہی ہے۔'' وہ ایک بار پھر بڑی صفائی سے موضوع بدل چکی تھیں۔

''میں دیکھ کر آتی ہوں۔ ردا تو تیار ہو رہی تھی۔ رمشا اٹھنے میں بہت سست ہے حمزہ کی شاید آج کلاس نہیں تو وہ ہو سکتا ہے آف کرے۔'' وہ کہتی ہوئی جانے لگی پھر رک گئی۔

ردا پیچ اور پنک کلر کی خوبصورت کٹ کی شارٹ شرٹ اور پرپل کلر کے لائٹ ایمرائیڈڈ ٹراؤزر میں اتنی کھلی

اتنی روشن لگ رہی تھی کہ سونیا کو بے اختیار اس سے نظریں چرانی پڑیں۔

ردا کو دیکھ کر برسوں پہلے کے بہت سے منظر اکثر ہی اس کی آنکھوں میں کسی ان دیکھی تتلی کے رنگوں کی طرح آ بیٹھتے تھے۔ وہ لاکھ آنکھیں جھپکتی، نہ سوچنا چاہتی نہ پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتی مگر پھر بھی...... کچھ کھو دینے کا احساس بڑھتا ہی جاتا تھا۔

ردا باپ اور دادی سے گرم جوشی سے مل کر اب اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ چکی تھی۔

سونیا ان ہی قدموں پر گم صم کھڑی تھی کہ رمشا کالج یونیفارم میں مسکراتا چہرہ لیے ماں سے آ کر لپٹ گئی۔

گہرا سانس لیتے ہوئے سونیا بے ساختہ مسکرائی تھی۔ رمشا ہمیشہ ایسے ہی کسی موقع کہیں سے بھی اچانک اس کے ساتھ آ کر کھڑی ہو جاتی تھی اس کا ان دیکھا سہارا بن کر۔ وہ تو اسے بازو پکڑ کر بٹھا بھی چکی تھی۔

''میرا کارن فلیکس کدھر ہے ماما۔'' رمشا نے شور مچایا۔

''فارگاڈ سیک رمشا کب تک بچی بنی رہو گی؟ ردا نے اسے ٹوکا۔

''اونہوں ہمارے گھر کا سب سے چھوٹا بچہ ہے یہ ردا اور ہم تو چاہیں گے یہ ہمیشہ اس طرح ہنستی مسکراتی رہے تتلی کے جیسی خوشی بھری اڑانیں بھرتی رہے۔ طاہرہ بیگم کو بھی اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔''

انہیں، رمشا اور حمزہ سے زیادہ ردا سے پیار تھا۔ یہ سچ بھی تھا۔

''سویٹ گرینی! آپ میری سب سے بڑی سپورٹ ہیں ورنہ تو یہاں کوئی مجھے کھل کر سانس نہ لینے دے۔'' وہ بھی دادی کی محبت پر پھیل گئی۔ سونیا اس کے لیے کارن فلیکس لا کر اس کے آگے رکھ چکی تھی۔

''تم کالج سے لیٹ ہو رہی ہو رمشا جلدی کرو۔'' سونیا کا انداز تنبیہی تھا۔

''پاپا مجھے ڈراپ کر دیں گے آفس جاتے ہوئے۔ بھائی تو ابھی سوئے پڑے ہیں مزے سے۔'' وہ بے فکری سے بولی۔

آزر اپنا آفس بیگ چیک کر رہا تھا۔

''ردا تم اسے ڈراپ کر جانا آفس جاتے ہوئے میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ بیگ لے کر کھڑا ہو گیا۔

''سوری پاپا! میری تو ایگزیکٹ نائن او کلاک بورڈ میٹنگ ہے آفس میں، میں تو آج ذرا بھی لیٹ ہونا افورڈ نہیں کر سکتی۔ پلیز آج تو آپ ہی کو اسے ڈراپ کرنا پڑے گا۔''

ردا نے فوراً انکار کرتے ہوئے جوس کا ادھ پیا گلاس رکھا۔ ٹشو سے ہونٹ صاف کرتی اٹھ کر جاتے ہوئے ماں اور دادی سے مصافحہ کر کے جانے لگی۔

''ردا آپی بہت غضب ڈھا رہی ہو۔ بورڈ میٹنگ میں سب اس طرح تیار ہو کر آئیں گے تو خاک میٹنگ کریں گے سب۔'' رمشا اس کے نازک سراپے پر سجے اسٹائلش فٹ لباس کو دیکھتے ہوئے ستائش بھرے انداز میں بولی تو سونیا کے ساتھ ایک نظر آزر نے بھی ردا کو جیسے دوبارہ سے دیکھا تھا۔ کچھ ایسی ہی نظر طاہرہ کی بھی ردا کی طرف اٹھی تھی لیکن دوسرے لمحے ان کا انداز بدل چکا تھا۔

''ادھر آؤ میری بچی! آیت الکرسی پڑھ کر پھونک ماروں اپنی بچی کو۔ کسی کی بری نظر نہ پڑے۔ ہر شر سے محفوظ رہے میری گڑیا۔'' دادی نے پاس بلا کر آیات پڑھ کر پھونکیں۔ سونیا عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

کشف نے باہر آکر صحن میں لگے پنجروں میں شور مچاتے طوطوں کے جوڑے کو جھانک کر دیکھا۔ ان کے پنجرے کو دو تین گول چکر دیئے۔ دوسرے لمحے بے زار ہو کر آسمان پر اڑتے کبوتروں کی ڈار کو دیکھا نیچے والوں کے جگنو نے چھت پر کئی درجن کبوتر پال رکھے تھے۔ سو دن بھر ان کے صحن سے نظر آتا آسمان کئی بار ان کبوتروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور ان کی چھاؤں میں گھرا نظر آتا۔ اور وہ سارا دن چھت پر چڑھا آؤ، آؤ کی آوازیں لگاتا ان کی سماعتوں میں خراش کرتا رہتا۔

زینب کچن میں کھڑی ناشتہ بنا رہی تھی۔ یہ کھڑے چولہے کی بھی ایک الگ کہانی تھی کہ جس طرح کشف نے پیچھے پڑ کر ضدیں کر کے اور دو وقت کی بھوک ہڑتال کے بعد صدیوں پرانے چولہے سے جان چھڑائی تھی۔

زینب تیار حلیے میں تھی اور شاید لیٹ بھی ہو رہی تھی۔

"اٹھ گئیں تم میں سمجھی آج تمہیں جانا ہی نہیں۔" زینب ناشتہ بناتے مصروف لہجے میں کشف کو دیکھ کر بولی جواب دہیں اپنے کمرے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی صحن کا سرخ اور کالے بارڈر والا فرش دھلنے کے بعد خوب چمک رہا تھا۔

"آپ نے صفائی کرلی۔ رہنے دیتیں مجھے آج دیر سے جانا تھا میں خود ہی کر لیتی بعد میں صفائی۔"

اس نے کچھ مروتاً اور کچھ ہمدردی میں زینب سے کہا۔

"صبح نماز کے بعد کافی ٹائم ہوتا ہے تمہیں اپنے بھی دس کام دیکھنے ہوتے ہیں۔ یوں بھی صبح صفائی کرو تو بالکل پتا نہیں چلتا نہ گرمی کا نہ تھکاوٹ کا۔ آجاؤ جلدی سے، منہ ہاتھ دھولیا ہے تو، میں نے ناشتہ تیار کر لیا ہے۔"

وہ وہیں باورچی خانے کے کونے میں رکھی چھوٹی سی میز پر ناشتہ رکھتے ہوئے بولی۔ کشف اٹھ کر اندر آگئی۔ کونے میں رکھے فریج سے پانی کی بوتل نکال کر میز پر رکھے گلاس میں پانی نکالنے لگی۔

"ہم یہ گھر بدل نہیں سکتے آنی۔" زینب کا منہ کی طرف نوالہ لے کر جاتا ہاتھ بے ساختہ رکا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر لقمہ واپس رکھ دیا۔ چند لمحے یونہی خاموش بیٹھی رہی پھر خاموشی سے نوالہ اٹھا کر کھانے لگی۔ کشف کو اس کے اتنے سرسری ردعمل پر لپک کر غصہ آیا تھا۔

"میری بات آپ کے نزدیک کوئی بھی وقعت نہیں رکھتی۔" بہت مشکل سے غصہ کنٹرول کرتی وہ تیز آواز میں بولی تھی۔

"تمہارا لاسٹ سمیسٹر اسٹارٹ ہونے والا ہے نا کشف۔" وہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے ٹھنڈے پانی کا گھونٹ بھر کر بے تاثر لہجے میں بولی۔

"آنی! یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" وہ جھلا کر بولی۔

"تمہارے سوال ہی میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔" وہ پھر سے مگن انداز میں رات کے سالن کے ساتھ سادہ روٹی کا نوالہ یوں توڑ کر کھا رہی تھی جیسے اس کے سامنے من و سلویٰ رکھا ہو۔

"میرے لیے یہاں رہنا دن بدن مشکل ہوتا جارہا ہے مجھے اس گھر سے، اس گھر تک آتی تنگ و تاریک آبادی سے لبریز گلیوں سے نفرت ہو چکی ہے مجھے یہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔" وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"میں بھی نہیں۔" زینب نے اسی طرح لہجے کو بے تاثر رکھا تھا۔

"پلیز آنی! جب میں گھر کی طرف آرہی ہوتی ہوں۔" کہتے ہوئے اس کی آواز گھٹ سی گئی آنکھوں میں تیرتی نمی نے زینب کو بے اختیار چونکا دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

"اس گھر کو رینٹ پر دے کر ہم کہیں بھی اچھے مناسب علاقے میں اچھا سا گھر یا اپارٹمنٹ کرائے پر لے

سکتے ہیں۔ مجھے مزید اب اس کھنڈر میں نہیں رہنا۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ بس۔" وہ آنکھیں صاف کرتی قطعی انداز میں بولی۔ زینب اب بہت آہستہ آہستہ اپنی روٹی ختم کر رہی تھی۔ چند نوالے چھوڑ کر وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔

"ٹھیک ہے نا آنی! میری ایک فرینڈ کے فادر اسٹیٹ ایجنٹ ہیں آج ہی ان سے بات کرتی ہوں دیکھیے گا دو چار دنوں میں وہ ہمیں کوئی اچھا سا گھر دکھا دیں گے۔" وہ اس کی خاموشی کو نیم رضامندی سمجھی تھی اس لیے جوش میں بولتی جارہی تھی۔ زینب بہت دل جمعی سے چائے پی رہی تھی۔ جیسے وہ کشف کی بات پر بہت گہرائی میں غور و خوض کر رہی ہو۔

"کشف تمہارے سمیسٹر کی فیس ڈیپازٹ کروانے کی لاسٹ ڈیٹ کیا ہے۔" وہ چائے کا کپ تقریباً خالی کر چکی تھی جب بہت نرم لہجے میں کچھ اس طرح سے بولی جیسے دونوں میں پچھلے دس منٹ سے یہی بات چل رہی ہو۔ کشف لمحہ بھر کو ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔

"آنی! میں آپ سے کچھ بات کر رہی تھی۔" وہ ضبط بھرے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ زور دے کر بولی۔

"میری جان! کیا میری بات کم اہمیت والی ہے۔ مجھے لاسٹ ڈیٹ معلوم ہونی چاہیے۔" وہ پھر سے اسی طرح بولی۔

"ابھی ہیں دن بیس بائیس۔" وہ کوشش کے باوجود اکتاہٹ کو چھپا نہیں سکی تھی۔

"کشف میری جان! یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خود کو۔" وہ نرمی سے سمجھانے جارہی تھی جب کشف ضبط کھو بیٹھی۔

"نہیں ہے یہ چھوٹی بات بالکل بھی اور میرے لیے۔ میرے لیے یہ کسی گھٹن زدہ پنجرے کسی سیلن زدہ قید خانے کے سیل سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ آپ سمجھتی ہیں جس طرح آپ ہر تکلیف و غم سے عاری ہو چکی ہیں مجھے بھی ایسا کچھ فیل نہیں ہوتا۔" وہ پھولے سانس کے ساتھ جذباتی انداز میں بولتی چلی گئی۔

"تمہیں یہ گھر پسند نہیں ہے اور تم یہاں نہیں رہنا چاہتیں، جانا چاہتی ہو ناں یہاں سے۔" وہ تحمل بھرے لہجے میں ٹھہر کر بولی۔

"مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے یہاں سے۔ اپنے آپ کو مجھ سے الگ مت کیا کریں۔" وہ بڑی ہوشیاری سے جیسے اس کی چال سمجھ کر تیزی سے بولی تھی۔ زینب بے اختیار مسکرادی۔

"میری جان اولاد کبھی ماں سے جدا نہیں ہو سکتی لیکن بیٹیوں کو ایک نہ ایک دن جدا ہونا پڑتا ہے یہ تو پیدائش کے ساتھ بیٹیوں کے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے ناں بیٹی کی ازلی جدائی۔" وہ بھی اس کی طرح جذباتی انداز میں بولنے لگی۔

"فار گاڈ سیک آنی۔ مجھ سے یہ ایموشنل باتیں نہیں کریں میں نہیں جارہی کہیں بھی آپ کو چھوڑ کر۔" وہ غصے بھرے لہجے میں تیزی سے بولی۔

"خیر یہ تو ممکن نہیں، ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی ہے اور میں پوری کوشش کروں گی، میری بیٹی کی جان جلد از جلد اس گھر سے چھوٹ جائے اور میری پرنسس کے لیے کسی عالی شان محل کا در کھلے جہاں میری پری پرنسس بن کر جائے اور ملکہ بن کر راج کرے۔" کہہ کر اسے پیار کرتی جلدی سے برتن سمیٹتی کچن سنبھال رہی تھی۔

"آنی! آپ مجھے یوں بہلا نہیں سکتیں، میں اب بچی نہیں ہوں۔" وہ مڑ کر ترش سے بولی۔

''میرے لیے وہی ہو جب پہلے دن تم میری گود میں آئی تھیں وہ تو جیسے کھوسی گئی تھی ان لمحوں میں۔

''میں مگر فیصلہ کر چکی ہوں کہ اب ہمیں اس ماہ میں یہ گھر بدل لینا ہے بس'' وہ ماں کو یوں کھوتے ہوئے دیکھ کر فوراً حتمی انداز میں بولی تھی۔

زینب نے جلدی سے سنک میں اپنے ناشتے کے برتن دھوئے۔

''افوہ! میں دھولوں گی نا آپ لیٹ ہو رہی ہیں ساری چھینٹیں پڑ رہی ہیں کپڑوں پر، چھوڑ دیں بس۔'' اس نے آگے بڑھ کر ٹونٹی بند کر دی زینب تولیے سے ہاتھ صاف کرتی خاموشی سے باہر جانے لگی۔

''کشف ایک فیصلہ میرا بھی ہے۔ میں اس گھر سے مر کر ہی نکلوں گی۔ امید ہے تم میرے فیصلے کا احترام ضرور کرو گی اور چند ماہ مزید میری خاطر اس گھٹن زدہ قید خانے میں گزار لو گی۔ ان شاءاللہ تمہارے لیے آگے بہت روشن گھر، بہت روشن زندگی منتظر ہے۔ مجھے آج واپسی پر دیر ہو جائے گی۔ تم دوپہر کا کھانا کھا لینا...... فی امان اللہ۔''

کہہ کر وہ کشف کا جواب سنے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی کشف ان ہی قدموں پر کھڑی ماں کو جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

ردا آفس میں بیٹھی برق رفتاری سے کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے وقفے وقفے سے سائیڈ پر پڑا کافی کا مگ اٹھا کر لبوں سے لگاتی اور گھونٹ بھر کر واپس رکھ دیتی۔ یک دم اس کی تیزی سے چلتی انگلیاں ٹھٹک کر رک گئیں۔ اس نے گہرا سانس لیا اور مڑ کر دیکھے بغیر ہلکا سا مسکرائی۔

''ویسے یہ تمہاری بڑی گندی عادت ہے تم بغیر بتائے خاموشی سے پیچھے آکھڑے ہوتے ہو۔'' وہ بولتے ہوئے پھر سے کام کرنے لگی تھی۔

''ایکسکیوزمی میں تمہارے پیچھے نہیں تمہارے برابر کھڑا ہوں، تمہارے بالکل پاس، اور تمہیں پھر بھی پتا نہیں چلا۔'' وہ شکایتی انداز میں کہتا اس کے سامنے آکر ٹیبل سے کمر ٹکا کر اسے والہانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''پتا نہ چلے مجھے تمہارے پاس ہونے کا، کیا ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔'' وہ شرمیلی سی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بغیر دیکھے بولی۔

''اگر ایسا ہو گیا تو......'' اس کا سوال بہت چبھتا ہوا تھا۔

ردا نے بے اختیار ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تو سمجھ لینا تمہارے خلوص، تمہاری چاہت میں ہی کچھ کمی رہ گئی ہو گی۔'' وہ کچھ جتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''لگتا ہے۔ تم نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔'' وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کچھ جتا رہا تھا۔

''سچ کہا تم نے، آئینے کی اب ضرورت نہیں رہی جب سے تمہاری آنکھوں میں اپنا چہرہ دیکھنا شروع کیا۔ لگتا ہے جیسے سب آئینے جھوٹ بول رہے ہوں۔'' وہ رک، رک اپنے دل کے سارے جذبے عیاں کر گئی تھی اور اب جیسے منتظر سی بیٹھی تھی۔

''تو پھر بے یقینی سی کیوں ہو۔ جو تمہیں میری چاہت میں کمی محسوس ہونے لگی ہے۔'' وہ بھی جواباً پچھلا حساب چکانے لگا۔

''پلیز جبران!'' وہ اس کی وارفتگی سے جزبز ہو کر کہتی تھی۔

''میں تمہیں سب کچھ بتا چکی ہوں اب مزید دیر کی گنجائش نہیں ہے پھر شاید ہم دونوں کے پاس سوال جواب کا بھی وقت نہیں بچے۔'' وہ لمحہ بھر خاموش رہ کر آہستگی سے کچھ جتاتے ہوئے بولی۔ جبران ایک دم سے خاموش ہو گیا۔

''کیا اس کے پاس میری بات کا جواب نہیں ہے۔'' ردا نے بے چین ہو کر دیکھا۔

''ردا میری مجبوری۔'' وہ بولنے لگا تھا۔

''پلیز ایسی کوئی بات نہیں کرنا جس کا اختتام محبت کے اختتام پر ہو۔'' وہ تڑپ کر بولی تھی۔

''میں کوشش کر رہا ہوں نا مجھے صرف چند دن اور چاہئیں، وہ ملتجی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ردا اس کے چہرے کو کھوجتی نظروں سے دیکھتی جیسے سچائی تلاش کر رہی تھی۔

''اگر دیر ہو گئی تو۔'' اس کے لہجے میں اندیشے لرز رہے تھے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے چھٹی کے لیے اپلائی کر دیا ہے۔ میں گھر جا کر امی سے، بھائی سے بات کروں گا۔'' وہ رک کر تفصیل بتانے لگا۔

''مگر تمہارا بھائی تو ملک سے باہر ہے اس سے تو تم یہاں سے بھی بات کر سکتے ہو۔ بلکہ اس سے بات کرنے کی ضرورت شاید اتنی نہیں جتنی تمہاری امی...... اگر صرف وہی آجائیں تو......'' وہ رک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''امی سے میں ڈائریکٹ بات نہیں کر سکتا۔ بھائی ہی امی سے بات کریں گے۔'' وہ شاید اسے اصل بات سمجھا نہیں پا رہا تھا۔ ردا نے الجھ کر اسے دیکھا اور کمپیوٹر کی اسکرین پر آتا کوئی پیغام دیکھنے لگی۔

''پھر بات کرتے ہیں۔'' وہ کہہ کر تیزی سے چلا گیا تھا۔ ردا خالی خالی نظروں سے اسکرین کو دیکھتی جا رہی تھی۔

''کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔''

وہ سر جھٹک کر تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگی۔

☆☆☆

''آ آ آ......'' بہت اونچی آواز میں کبوتروں کو بلاتے ہوئے جگنو بلا واسطہ انداز میں اب کچھ اور بھی معنی خیزی سے بولنے لگا تھا۔ کشف جھلاہٹ بھرے انداز میں تاروں پر لٹکے چند کپڑے جلدی جلدی ہاتھ مار کر اتارتی جا رہی تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ یونیورسٹی کے لیے نکلنے لگی تھی، زینب کا تاکیدی فون آگیا تھا کہ اوپر چھت پر کپڑے سوکھنے کے لیے ڈالے تھے برسات کا موسم ہے کسی بھی وقت بادل آسکتے ہیں تو وہ جانے سے پہلے کپڑے اتارتی جائے۔

اور اب اس کے کپڑے اتارنے کے دوران وہ جگنو بالکل ہی جیسے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

اس کا آخری کپڑے پر ہاتھ تھا، ٹوکری بھر چکی تھی۔

''سنو کشف۔'' وہ لحاظ اور تکلف کی ساری دیواریں پھلانگ کر دونوں چھتوں کے درمیان موجود چھوٹی سی منڈیر کے بالکل پاس کشف کی پشت کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دھیان میں اچھل کر رہ گئی تھی۔

''بادشاہو! ایسا بھی کیا غرور، مانا بڑا حسن ہے۔ بڑا جوبن ہے۔ ہم جیسوں کو کیوں منہ لگائیں گی۔'' وہ اس کی خاموشی کی شہ پا کر مزید پھیلا تھا۔ کشف نے کپڑے ٹوکری میں زور سے ٹھونسے۔

گلے کا قیمتی ہار۔۔۔بنا رشتوں میں دراڑ

یہ کہانی پرانی روایات میں بندھے ایک ہی خاندان کے افراد کے گرد گھومتی ہے جن کو اپنی خاندانی حویلی کے بڑوں کی ضد، ہٹ دھرمی، غلطی، نفرت، سازش اور بے حسی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ خاندان کے ان بڑوں میں سب سے گھناؤنا کردار ممتاز اور نور جہاں ادا کرتی ہیں، جو رشتے میں نند بھاوج ہیں۔ دونوں خواتین حویلی کے وارث اکبر علی کو خاندانی وراثت میں ملے سو سال پرانے ہار "نولکھا" کے عشق میں گرفتار ہیں۔ اس ہار کے حصول کی ضد اور تسلط کے چکر میں یہ دونوں خواتین اپنے اگلی نسلوں کی محبتوں اور رشتوں کو برباد کرنے سے بھی نہیں چوکتیں حویلی کا انتظام اکبر علی نے بصد احترام اپنے سب سے بڑے بھائی انور علی کے سپرد کیا ہوا ہے جو باقی افراد کے درمیان آگ لگا کر اسے ہوا دیتا ہے تاکہ وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو سکے۔ زین علی اکبر علی کا اکلوتا لاڈلا بیٹا ہے جو اپنی پھوپھی زاد کزن تحریم کو پسند کرتا ہے۔ تحریم ایک سلجھی ہوئی لڑکی ہے جو دقیانوسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ وہ بھی دل ہی دل میں زین کو پسند کرتی ہے۔ زین کی پھوپھو ممتاز بھی دونوں کی شادی کی خواہاں ہے لیکن اس شادی کو اپنے خاندانی ہار کے حصول و تسلط کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ زین کی چچا زاد کزن شفق زین کی دلہن بننے کے خواب بچپن سے ہی دل میں بسائے ہوئے ہے۔ دراصل شفق کی ماں نور جہاں نے شفق کی آنکھوں میں یہ خواب سجائے ہیں کیوں کہ اس کی پیدائش کے بعد نور جہاں کے سسر منظر علی (مرحوم) نے اپنے اکلوتے پوتے زین سے بچپن میں ہی شفق کی بات پکی کر دی تھی۔ نور جہاں کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے لیکن حویلی میں بہت رتبہ حاصل ہے۔ نور جہاں شفق کے ذریعے اس خاندانی ہار کا حصول چاہتی ہے۔ کیوں کہ روایت کے مطابق "نولکھا" زین کی بیوی کو ملے گا۔ شفق اور تحریم میں بہت اچھی دوستی اور پیار ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتیں لیکن دونوں نے ہی زین سے متعلق اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے چھپائی ہوئی ہے۔ دونوں میں بہنوں جیسا پیار ہے جو ان دونوں کی ماؤں کو کھٹکتا ہے۔ نور جہاں اور ممتاز ایک دوسرے کو اپنا ازلی دشمن سمجھتی ہیں۔ دل کی بات بتانے میں پہل شفق کرتی ہے تو تحریم کو احساس ہوتا ہے کہ زین سے شادی کر کے وہ شفق کے حق پر ڈاکہ ڈالے گی۔ تحریم شادی سے انکار کر دیتی ہے تو زین اپنی ضد پر اڑ جاتا ہے۔ شفق کو زین کے ارادوں کا پتہ چلتا ہے تو تحریم کی طرف سے اس کے دل میں بال آ جاتا ہے۔ شفق اور تحریم میں بہت دوریاں آ جاتی ہیں۔ زین کی حالت خراب ہوتی ہے تو شفق اپنے دل پر پتھر رکھ کر تحریم کو زین سے شادی کرنے پر راضی کرتی ہے۔ تحریم کی زین سے شادی کی صورت میں نولکھا ہار ممتاز کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔ نور جہاں ہر ممکن کوشش کرتی ہے وہ ہار حویلی میں واپس آ جائے لیکن بے سود۔۔۔ تحریم دل کے ہاتھوں مجبور ہے مگر شفق کا حق مارنے کا پچھتاوا اسے ہر دم رہتا ہے۔ شفق اور تحریم میں دوریاں کم نہیں ہو پاتیں۔ رقابت کے جذبے تلے دونوں اپنی اپنی ماؤں کی طرح ایک دوسرے کو اپنا ازلی دشمن سمجھنا شروع کر دیتی ہے۔ نولکھا ہار کو حاصل کرنے کے لیے یہ خاندان تمام انسانی قدروں کو بھول کر بری طرح منتشر ہونے لگتا ہے۔ خون میں خون کے خلاف زہر ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ دوستیاں دشمنی میں بدل جاتی ہیں۔ بدگمانی کے ناگ سر اٹھاتے ہیں اور انسانیت ذلت کے گڑھے میں گرنے لگتی ہے ایسے میں کہانی میں ایک زبردست موڑ آتا ہے جہاں سے کہانی ایک ناقابل فراموش انجام تک پہنچتی ہے۔

نولکھا ہار کس کی قسمت میں لکھا ہے؟

آخرکار زین کو جیتنے میں کون کامیاب ہوگا۔۔۔ شفق یا تحریم؟

’’یہ بکواس کس سے کر رہے ہو تم بولنا ذرا پھر سے۔‘‘ طیش بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک طرف پڑی آدھی ٹوٹی اینٹ اسے مارنے کے لیے اٹھائی تھی۔ وہ کشف سے اس رد عمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

’’ارے...... ارے کیا ہو گیا۔ میں نے ایسا کیا کہہ دیا تمہیں جو یوں پاگلوں کی طرح مجھ پر اینٹیں برسانے لگی ہو۔‘‘ وہ برق رفتاری سے درمیان کی منڈیر سے پیچھے ہٹا۔

’’کبھی کچھ ایسا ویسا کہنے کی سوچنا بھی نہیں یہ سمجھ کر کہ میں کمزور ہوں یا لڑکی ہونے کے خوف سے تمہارا لحاظ کر جاؤں گی۔‘‘ وہ اینٹ ابھی بھی پکڑے ہوئے تھی غرا کر بولی۔

’’اچھا کیا...... کر لو گی بھلا۔‘‘ وہ کمینے پن سے اسے آنکھ مار کر بولا تھا۔ اس کی اس حرکت پر کشف کا غصہ اس کے قابو سے باہر ہو گیا۔ اس نے شدید طیش میں اس کی طرف پوری طاقت سے اینٹ ماری تھی وہ بالکل بھی اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے تیزی سے اچھلا۔ اس کا سر اور گردن تو بچ گئی۔ اینٹ اس کے پاؤں پر پورے زور سے لگی تھی۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھلتا منہ سے تکلیف بھری آوازیں نکالتا پیر پکڑ کر زمین پر جھکتا چلا گیا تھا۔

’’آئندہ ایسی کوئی بھی گھٹیا حرکت کرنے سے پہلے ہزار بار نہیں تو پانچ سات سو بار ضرور سوچ لینا میں ان تنگ گھٹی گلیوں میں رہنے والی کوئی پیار محبت کو ترسی تھرڈ کلاس ان پڑھ ہیروئن نہیں ہوں۔‘‘ وہ غصے میں آواز اونچی ہونے کی پروا کیے بغیر بولی تھی۔

جگنو زمین پر بیٹھا پیر ہاتھوں میں دبائے ابھی بھی تڑپ رہا تھا۔ دوسرے لمحے کشف کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ جگنو کے پیر سے خون تیزی سے بہہ کر زمین پر اکٹھا ہو رہا تھا۔

’’مائی گاڈ! یہ تو سچ مچ زخمی ہو گیا۔‘‘

اس نے جلدی سے کپڑوں کی ٹوکری اٹھائی اور چھت سے نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگائی۔

پھر خیال آیا اس نے دروازہ تو بند کیا ہی نہیں۔ ٹوکری وہیں رکھ کر تیزی سے آ کر چھت کے دروازے کو کنڈی لگا کر اندھیری سیڑھیاں پھلانگتی گرتی پڑتی نیچے کی طرف بھاگ گئی۔

جگنو کی ماں اس محلے کی سب سے لڑاکا عورت تھی اب اس کا لاڈلا یہ زخمی پاؤں لے کر ماں کے پاس گیا تو وہ عورت شام تک کشف اور زینب کا اس محلے میں اشتہار لگا دے گی۔

’’پھر تو آنی مجھے چھوڑیں گی نہیں اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے، خالہ بتول کے شور شرابے اور گھٹیا پن سے بھاگنے کے لیے آنی واقعی یہ محلہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔

’’آئیڈیا۔‘‘ اس نے جوش میں خود ہی چٹکی بجائی تھی۔

کپڑوں کی ٹوکری کمرے میں پھینک کر اپنے بیگ میں ضروری چیزیں ڈالتے ہوئے وہ جوش میں خود ہی پلان کرنے لگی۔

’’اگر میں اس طرح کے دو چار پنگے اور لے لوں ان منحوس محلے والوں سے تو۔ آنی تو کیا یہ محلے والے خود ہمیں یہاں سے نکالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔‘‘ اس کے چہرے پر جوش کی سرخی تھی۔

ایک نظر آئینے میں خود کو آخری بار دیکھ کر دوپٹہ اوڑھتے ہوئے بیگ کندھے پر، ہاتھ میں کتاب پکڑے وہ باہر جانے لگی۔

’’اف، یار چابی تو پکڑی نہیں۔‘‘ وہ عجلت میں مڑ کر چابی لینے باہر کی طرف لپکی اور دروازہ کھولتے ہی دھک سے رہ گئی۔

☆☆☆

’’ایٹھ اے واٹ پرابلم ود یو...... پلیز کیپ کوائٹ...... بی سائیلنٹ 8th اے۔‘‘ اسے اپنی عادت کے برخلاف گلا پھاڑ کر چیخنا پڑ رہا تھا۔

اسکول میں داخل ہوتے ہی اسے پرنسپل کا بلاوا آ گیا تھا۔ ابھی کلاس کی حاضری لینے کے لیے اس نے رجسٹر کھولا ہی تھا کہ پرنسپل کے بلانے پر اسٹوڈنٹس کو منت اور رعب دونوں کے انداز میں خاموش رہنے اور اپنا ٹیسٹ دہرانے کی تاکید کر کے وہ باہر نکلی تھی۔ اور اب برآمدے ہی سے بچوں کے شور، آوازوں سے پورا کاریڈور جیسے ہل رہا تھا۔ وہ جتنی دیر تک کلاس میں پہنچی، راستے میں آتی پانچویں کلاس کی ٹیچر نے اسے ناراض فہمائشی نظروں سے گھورا تھا۔ اس کا موڈ پہلے ہی آف تھا۔

زندگی کہیں بھی رعایت نہیں دے رہی تھی۔

حالانکہ اس نے زندگی سے ایسی کوئی بھیک مانگی بھی نہیں تھی لیکن اکثر ہی یہ خواہش منہ زوری کے ساتھ دل میں ہمکتی کاش کہیں تو اسے بھی رعایت ملے۔ کوئی اسپیشل رویہ، کوئی خاص محبت، کسی کی عنایت بھری تھپکی، ستائش بھری توصیف کچھ تو اس کے حصے میں آئے۔

پرنسپل نے اس کے محض آج لیٹ آنے پر جس طرح اس کی سرزنش کی تھی۔ وہ زینب کی پچھلی ساری شان دار کارکردگی اس کی پنکچویلٹی سب یک جنبش قلم نظر انداز کر دی تھی۔ سچ میں اس کا دل رو رہا تھا۔

کشف کا رویہ...... ایک ہی بیٹی اور وہ بھی اس سے خوش نہیں تھی اس کے ساتھ زندگی نے بہت درمیانے درجے کا بلکہ اس سے بھی کمتر رویہ روا رکھا تھا۔ وہ دوسرے تیسرے درجے پر تو کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ پہلے درجے کی خواہش نہیں تھی لیکن جس طرح اس کی محنت، اس کے خلوص، اس کی بے ریا محبت کو دنیا نے ٹھوکروں میں رکھا تھا اب تو وہ ہر چیز سے بیزار ہو چلی تھی۔

وہ اب زور سے ڈیسک بجا رہی تھی۔ حاضری کا رجسٹر کھول رہی تھی جب کہیں سے اڑتا ہوا کاغذ کا جہاز اس کی پیشانی سے آ کر ٹکرایا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے تیر مارا ہو۔ رجسٹر زور سے بند کرتی وہ سر جھکا کر بیٹھی بظاہر شریف یا ادب بنی تھرڈ لاسٹ لائن کے سر پر جا پہنچی۔

یہ گروپ کلاس میں سب سے شرارتی تھا۔

’’کس کا جہاز تھا یہ۔‘‘ وہ ان کے سر پر جا کر گرجی۔ وہ پانچوں سر یوں جھکائے بیٹھے تھے جیسے اب کبھی سر اٹھائیں گے نہیں۔

’’اوکے! کوئی نہیں بولے گا تو میں آپ پانچوں کو پرنسپل کے پاس لے کر جاتی ہوں۔ پھر تو تم پانچوں بولو گے فر فر۔‘‘ غصہ ضبط کرتے، کرتے وہ جیسے پھٹ کر بولی۔ ان پانچوں نے نیچی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

’’سوری میم۔‘‘ وہ یک زبان بولے تھے۔

’’Whose Plan was that‘‘ (یہ کس کا پلان تھا) وہ معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

’’سوری میم۔‘‘ انہوں نے بھی ڈھٹائی میں ماسٹرز کر رکھا تھا۔ زینب نے ہونٹ کچلتے ہوئے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

’’آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ پرامس میم۔‘‘ وہ بس انہیں گھورتی رہی۔

’’تو تم نہیں بتاؤ گے، یہ گھٹیا حرکت کس کی تھی؟‘‘

’’میم! یہ ریان نے پھینکا تھا آپ کی طرف...... میں نے خود دیکھا تھا۔‘‘ فرسٹ رو سے عروہ بولی تھی۔ دونوں کی دشمنی فور کلاس سے چلی آ رہی تھی دونوں کے باپ بھی کاروباری رقیب تھے۔ ریان کو پرنسپل کے پاس

اولاد تھا۔
لے جانے کا مطلب شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے برابر تھا۔ وہ امیر باپ کی بگڑی
"نیکسٹ ٹائم ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے ورنہ پھر میں بالکل لحاظ نہیں کروں گی۔ سن لیں آپ پانچوں۔"
یہی تھا وہ کمزوری وارننگ دے کر واپس مڑ گئی۔
زینب کے پاس جان چھڑانے کا واحد طریقہ
وہ جانتی تھی جس طرح ریان نے عروہ کو منہ پر ہاتھ پھیر کر دھمکی لگائی ہوگی اور اب بریک میں جو کچھ ہوگا۔
"تھینک گاڈ میری بریک میں ڈیوٹی نہیں ہے بھاڑ میں جائیں میری طرف سے یہ سارے۔" وہ دل میں
تنفر بھری بیزاری سے کلاس کی رول کال لینے لگی۔

☆☆☆

"خیر یہ تو میں نہیں مان سکتی کہ تمہاری آزر سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی ہو۔" سونیا نے جلدی
جلدی فروٹ کاٹ کر چھوٹے سے پیالے میں رکھا اور اس پر کالی مرچ چھڑکتے ہوئے طاہرہ بیگم کے آگے کیا۔
انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں شک کا اظہار کیا تھا۔
"اماں جان! آپ کے کہنے پر میں نے خود آزر سے بات کی تھی۔" وہ محتاط لہجے میں بولی۔ آزر کی غیر
موجودگی اسے ہمیشہ مشکل میں ڈالتی تھی۔ وہ اس کو بغور دیکھتے ہوئے ذرا سا فروٹ ٹھونگنے لگیں۔
"کیا کہا آزر نے۔" وہی حکم بھرا انداز۔
"اسی طرح سے ٹال گئے پہلے آفس کے کام میں مصروف رہے پھر انہیں نیند آگئی۔ کہنے لگے صبح بات کرنا اور
صبح جس طرح آپ کے سامنے وہ بات کر رہے تھے۔" سونیا نے جان چھڑانے والے انداز میں صفائی پیش کی۔
طاہرہ بیگم سر ہلاتے ہوئے خاموشی سے فروٹ کھانے لگیں۔
"دوپہر کے کھانے میں آپ کے لیے کیا بنواؤں۔" وہ جلدی سے ان کے پاس سے اٹھ کر چلی جانا چاہتی تھی۔
"اور خود تمہاری اپنی کیا رائے ہے۔" انہوں نے ڈائریکٹ اس سے سوال کر ڈالا۔
"میں کیا کہوں اماں جان۔" وہ مبہم انداز میں کچھ بے بسی سے بولی۔
"کیوں بیٹی کو بیاہنا نہیں۔ تعلیم مکمل ہوگئی جاب بھی خیر سے کرنے لگی روز صبح کو باپ کی طرح آفس کے
لیے تیار ہو کر نکل جاتی ہے، ہاتھ میں گاڑی ہے جہاں دل چاہے چلی جائے، کوئی روک ٹوک نہیں۔ کیا اتنی آزادی
مناسب ہوتی ہے لڑکیوں کے لیے۔" سونیا ان کے اس لیکچر کی بہت دنوں سے منتظر تھی جب سے ردا نے جاب کی
تھی، سو آج ان کے ہاتھ یہ موقع آ ہی گیا۔
"اماں جان۔" اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا جواب میں کیا دلیل پیش کرے۔
"اور اب یہ نہیں کہنا کہ زمانہ بدل گیا ہے لڑکیوں کے لیے، عورتوں کے لیے زمانہ کبھی نہیں بدلتا وہ اسے فوراً
ٹوک کر بولیں۔" اور سونیا سے بہتر یہ کون جان سکتا تھا کہ عورت کے لیے نہ زمانہ کبھی بدلتا ہے نہ زمانے کے اصول
اور ضابطے!" وہ سرد آہ سی بھر کر رہ گئی۔
"کوئی اعتراض ہے تمہیں سلیمان کے رشتے پر۔" وہ اب براہ راست موضوع پر آگئیں۔
"خدانخواستہ مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا سلیمان کے رشتے پر۔" اب بھی خاموش رہتی تو طاہرہ بیگم سارا
ملبہ اس پر ڈال دیتیں کہ سونیا ہی نہیں چاہتی بیٹی کا یہاں رشتہ ہو۔
"شائستہ میری بھتیجی ہے۔ سلیمان، اس کا ایک اکلوتا بیٹا ہے باہر کے ملک کا پڑھا لکھا شروع سے لندن میں
رہائش۔ اس کے باوجود جس طرح شائستہ نے اس کی پرورش کی ہے۔ میں پچھلے سال عمرے سے واپسی پر بائیس
دن رکی تھی شائستہ کے پاس۔ اس بچے کے نیک اطوار، مشرقی آداب دیکھ کر تو میرا وہیں دل باغ باغ ہو گیا تھا،

صرف منہ سے خود نہیں بولا تھا ورنہ میں پچھلے سال سے اسے ردا کے لیے پسند کر چکی تھی۔ وہ تو میرے اللہ نے
میری لاج رکھی۔ شائستہ نے خود ہی ردا کے لیے جھولی پھیلا دی۔" وہ جوش میں بولتی چلی گئیں۔
"جی...... آپ نے بتایا تھا۔" سونیا ان کی سوال کرتی خاموشی پر یہی کہہ سکی۔
"ٹھیک ہے۔ آج رات تک آزر سے بات کرو اور مجھے ہاں میں جواب دو، ورنہ کل میں شائستہ کو اپنی
طرف سے ہاں کر دیتی ہوں وہ اس مہینے آ رہی ہے سادگی سے منگنی ہوگی اور ساتھ ہی شادی کی ڈیٹ رکھ لیں گے۔
وہ مہینے بھر کے لیے آئے گی کہہ رہی تھی، پھپھو میں ردا کو ساتھ ہی رخصت کروا کے لے جاؤں گی بار بار آنا مشکل
ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے بھلا۔ ٹھیک ہے نا۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ سونیا کے منہ سے ابھی
ہاں نکلوا لیں۔
"ٹھیک ہے میں آزر سے بات کرتی ہوں۔ آپ بھی کر لیجیے گا پھر جو وہ کہیں گے تو...... ٹھیک ہوگا وہی۔" وہ
رک گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ فوراً کیا بولے۔
"ہاں، مجھے بات تو آزر ہی سے کرنی ہے، تم سے تو میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم بیٹی کی ماں ہو اپنے انداز
میں ردا سے کہہ دو کہ آج کل میں نوکری سے استعفیٰ دے اور گھر بیٹھے بیاہ سر پر آ گیا ہے۔ اس طرح دفتروں
سڑکوں پر ماری ماری پھرتی رہی تو شادی پر خاک روپ آئے گا اس پر۔"
تو گویا وہ سب کچھ طے کر چکی تھیں۔
اور یہ تو سونیا کو اندازہ تھا کہ ردا کو یہ جو ملٹی نیشنل کمپنی میں اتنی اچھی جاب ملی ہے، وہ اتنی آسانی سے تو نہیں
چھوڑے گی۔
اور شادی کے بعد ملک سے باہر جانا...... پتا نہیں کیوں سونیا کو لگتا تھا شاید ردا نہ مانے۔
اور یہ تو طے ہے، طاہرہ بیگم جو ٹھان لیتی تھیں ہوتا تو وہی تھا۔ ردا کو اعتراض ہوگا بھی تو وہ بے فائدہ ہوگا۔
اماں جان ٹھیک کہتی ہیں عورت کے لیے زمانہ کبھی بھی نہیں بدلتا، وہ بے دلی سے کچن میں کام کرنے لگی۔

☆☆☆

کشف گلی سے گزرتی اور پھر ان کے دروازے کے آگے کھڑی بتول خالہ کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔
"یہ جگنو منحوس اتنی جلدی سیڑھیاں اتر کر آ بھی گیا زخمی پاؤں کے ساتھ۔ مرا ابھی نہیں رستے میں۔"
وہ بتول سے نظریں چرا کر رخ پھیر کر دروازے کو لاک لگانے لگی۔
"ماں چلی گئی تمہاری اسکول؟" وہ پاٹ دار درشت آواز میں پوچھ رہی تھی۔
"جی...... چلی گئی۔" وہ مڑے بغیر بولی۔
"اور تم کہاں جا رہی ہو ماں کی غیر موجودگی میں یوں بن ٹھن کر۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھے بڑی تنقید بھری
نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔
کشف کو تو لگا اس کے پورے دماغ میں آگ سی لگ گئی۔
"یونیورسٹی جا رہی ہوں خالہ اور پلیز بولنے سے پہلے کچھ سوچ لیا کریں۔" بمشکل طیش ضبط کرتے کرتے
بھی وہ کھردرے پن سے کہہ گئی۔
"اب تم سکھاؤ گی مجھے کیا بولنا ہے اور کیا نہیں۔" اور خالہ بتول کو تو صرف حرف یا نقطے کی ضرورت ہوتی
تھی۔ باقی کی پوری کتاب تو وہ بس چٹکیوں میں کھڑے کھڑے چھاپ لیتی تھی۔
اور بدقسمتی سے کشف اسے یہ ابتدائیہ فراہم کر چکی تھی۔

...ہے تو کیا محلے والے بھی اس کی خبر نہیں رکھیں گے... ان کے جانے کے بعد یوں تیار ہو کر پراسرار انداز
محاذ کھل چکا تھا اور تین گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے کھل رہے تھے۔ ایک بار تو کشف کو پسینہ آ گیا مگر ڈرنے کا مطلب تو کچھ اور تھا۔

"محلے والے میرے باپ لگتے ہیں جو میرے آنے جانے کی خبر رکھیں۔" وہ بھی دوبدو چلا کر بولی۔

"ارے تمہارا باپ ہوتا تو رونا ہی کاہے کا تھا خود تو اللہ جانے کہاں منہ چھپا کسی کونے کھدرے میں جا چھپا، زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ یا جھوٹ نہ بلوائے اللہ تو...... بتول کی پاٹ دار آواز اب اردگرد گھروں کے پچھلے کمروں اور کوٹھڑیوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔

"انیس سال کم نہیں ہوتے جو کوئی پلٹ کر خبر نہ لے۔ کوئی تو بھید بھاؤ ہوگا ناں۔ اس کے غائب ہونے میں۔ تیری ماں تو گونگی بنی اندھی بنی لوگوں کو پاگل بناتی بلکہ سمجھتی دیواروں سے لگی لگی شام ڈھلے آتی ہے اور گھر میں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔"

وہ بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہی تھی۔ کشف کا جسم شدید غصے اور جذباتی پن میں کانپنے لگا تھا۔

"تو جائیں ناں دفع ہو جائیں، آپ بھی اپنے گھر۔ میں آپ کا گھر نہیں کوئی جو آوارہ کتوں کی طرح گلیوں میں پھرتی لوگوں کے دامن کھینچتی رہتی ہیں۔ اور کوئی پتھر مارے تو بلبلاتی ہیں۔"

کشف نے بھی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بتول کا منہ کھلے کا کھلا اور آنکھیں جیسے باہر ابلنے کو تھیں۔ بتول کی پچاس سالہ آوارہ گرد مہم میں کسی نے انہیں ایسی گالی تو کبھی نہیں دی تھی۔

"کشف! آ جاؤ بھئی۔" پتا نہیں بلال کہاں سے فرشتہ بنا اس کی مدد کو آیا پیچھے کھڑا پکار رہا تھا۔

کشف کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے کے ساتھ کچھ تارے سے ٹمٹما رہے تھے اس سے پہلے یہ تارے یا اندھیرا پوری طرح سے اس کے دماغ کو سن کر دیتا وہ جمع ہوتی عورتوں کو پرے دھکیلتی ان میں سے رستہ بناتی تیزی سے بلال کی طرف لپکی تھی۔

اور پھر مڑ کر بلال کو بھی دیکھے بغیر اندھا دھند رش بھری ٹوٹی پھوٹی تجاوزات سے بھری گلیوں میں تقریباً بھاگنے لگی تھی۔

"ارے ٹھہر، رک، آج تو میں تجھے بتاؤں گی میں کون ہوں ان گلیوں کی۔ تجھے اس ساری بکواس کا مزہ نہ میں نے چکھایا تم دونوں ماں بیٹی کو تو میرا نام بدل دینا۔

بتول پیچھے سے پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔

"تم کیا ان سب کو اکٹھا کر کے بندر کا تماشا دکھا رہی تھیں جو یہ بھیڑ لگا رکھی تھی۔" بلال بھاگتا اس کے ساتھ چلتا پوچھ رہا تھا اور کشف کے پاس نہ رکنے کا وقت تھا نہ جواب دینے کا۔

☆☆☆

دن میں بے تحاشا رش تھا۔ اس نے جس طرح رش میں گھس کر بس میں سیٹ حاصل کی تھی وہی جانتی تھی۔ بس یوں تو ایئر کنڈیشنڈ تھی مگر اس کا اے سی جانے کہاں کولنگ کر رہا تھا۔ حبس اور گرمی کی وجہ سے اتنے لوگوں کی موجودگی ناقابل برداشت تھی۔ جیسے ہی بس اس کے مطلوبہ اسٹاپ پر رکی۔ باہر تیز دھوپ کے باوجود اسے کھلی سڑک پر آنا اچھا لگا تھا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر گہری چھایا تھی۔ وہ دھوپ میں کھڑی آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا کیے چھاؤں والے کنارے کو دیکھ رہی تھی۔

بچپن میں اس کے کھیل کی دیوانگی کا سب سے بڑا حصہ یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل تھا۔ برسات کے دنوں میں جب وہ سکھیوں کے ساتھ گلیوں میں کھیلتی تو دور گلی کے آخری کونے پر چھاؤں ہوتی۔ وہ لوگ بھاگ کر چھاؤں تک پہنچتے تو دھوپ چالاکی سے ان سے پہلے پہنچ جاتی اور جہاں سے وہ بھاگ کر آتے تھے وہاں بادل کا ٹکڑا چھایا کر چکا ہوتا تھا۔

اتنی تیز چمکتی دھوپ میں کھڑے بھی بچپن کی اس معمولی یاد کو یاد کرتے اس کے ہونٹ بے اختیار مسکرا اٹھے۔

سڑک کی دوسری طرف حیدر بھائی کا آفس تھا۔

چونکہ اخبار کا آفس تھا تو پارکنگ علیحدہ ہونے کے باوجود گاڑیاں اور بائیکس سڑک کے جنگلے تک پارک کی گئی تھیں۔ وہ رش میں محتاط انداز میں چلتی ریسپشن سے ہو کر حیدر بھائی کے آفس تک پہنچی وہاں پہلے سے کچھ لوگ بیٹھے تھے وہ وہیں سے پلٹ آئی۔ ایک طرف پڑے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ کر سوچنے لگی پتا نہیں حیدر بھائی نے اسے دیکھا بھی ہے یا نہیں ورنہ ان کے یہ فارغ مہمان تو دن بھر بیٹھے رہیں گے وہی سیاست کے نہ ختم ہونے والے قصے اور وہی لمبی لمبی گپیں۔

وہ بے زاری سی بیٹھی رہی۔ پیون اسے جانتا تھا، فوراً چائے کا پوچھنے آیا تو اس نے منع کرتے ہوئے اسے "حیدر بھائی کو اس کے آنے کا بتا دے جا کر" کہہ کر اندر بھیج دیا۔ وہ ذرا دیر میں باہر نکل کر کچھ بتائے بغیر دوسری طرف جاتی سیڑھیوں سے اوپر چلا گیا۔

"کیا مصیبت ہے اور کتنا انتظار کرنا ہوگا مجھے خود ہی تو میسج کر کے بلوایا تھا۔" اس نے جھلا کر حیدر کو میسج کیا۔

"آپ کو سر اندر بلا رہے ہیں۔" تھوڑی دیر بعد ان کا اسسٹنٹ آ کر کہہ رہا تھا وہ گہرا سانس لے کر اپنا حلیہ ٹھیک کرتی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھی۔ اس کی خلاف معمول خاموشی پر بلال بھی کچھ ٹھٹکا۔

"رو رہی ہو تم۔" اس نے چھیڑنے کو کہا۔

"یہ منظر دیکھنے کے لیے تمہیں قیامت تک جینا ہوگا۔ مسٹر بلال!" وہ فوراً تڑخ کر بولی۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"ہاں تو وہاں تو خوب مجمع لگا کر داد وصول کر رہی تھیں۔" وہ پھر باز نہیں آیا کشف کے چہرے پر سایہ سا گزر گیا۔

"یار! جاہل لوگ ہیں، مت ان سے الجھا کرو۔" ذرا دیر بعد اپنی غلطی کا احساس ہونے پر وہ نرمی سے بولا۔

"خیر، اتنے بھی جاہل نہیں ہیں۔" سوال تو بولتے ہوئے رک گئی۔

"سوال کیا۔" بلال منتظر لہجے میں بولا۔

"کچھ نہیں۔ تم آج مجھے لینے کیسے آ گئے۔ آفس نہیں گئے کیا۔" وہ صفائی سے موضوع بدلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"آفس کے کام سے ہی ادھر سے گزر رہا تھا سوچا، تمہارے ہاتھ کی چائے ہی پی لیتا ہوں۔" وہ جتا کر بولا۔

"بکواس۔" وہ زیر لب بولی۔

"کیا تمہیں چائے نہیں بنانی آتی۔" وہ پھر چھیڑ کر بولا۔

"مت بھولو، تم نے ابھی جاب کی ٹریٹ نہیں دی جو چائے کی فرمائش کر رہے ہو۔"

اس کا نام بھی کشف تھا۔ وہ بھولنے والوں میں سے نہیں تھی۔

"یہ تو سمجھو پارٹ ٹائم ہے میں نے جسٹ ایکسپیرینس گین کرنے کے لیے کی تھی۔" وہ بھی بلال تھا۔

"بے وقوف کسی اور کو بنانا۔" وہ ہوا میں مکھی اڑا کر بولی۔

"ایک بن گئی کیا یہ کافی نہیں۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔

"کون...... کون بن گئی تم سے بے وقوف۔ نام بتاؤ مجھے فوراً اس کا ابھی۔" وہ بے صبرے پن سے بولی۔

"اس کا نام تو میں اپنی اماں کو بتاؤں گا۔ تمہیں کیوں بتاؤں بھلا۔" وہ اس کے بے صبرے پن کا مزہ سا لے کر بولا۔

"ٹھیک ہے اماں کو ہی بتانا اور جو کوئی تم نے اونگی بونگی لڑکی پسند کرلی تو پھر جوتے بھی خود ہی کھانا۔" وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں نے کوئی لڑکی پسند کرلی ہے۔" وہ فوراً پینترا بدل کر بولا۔ کشف نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ایک مشورہ دوں، تم بڑے کچے کھلاڑی ہو ڈبل گیم تو کیا کھیلو گے بہتر ہے صرف اس کام پر فوکس کرو جو تم کرسکتے ہو ورنہ......"

"ورنہ...... کیا بھلا۔" وہ گاڑی روکتے ہوئے بولا۔

"ورنہ منہ کے بل گرو گے۔" کہہ کر وہ اسے منہ چڑاتی گاڑی سے اتر کر چلی گئی۔

☆☆☆

اے سی کی خنک ہوا میں اس کا پسینہ بھی خشک ہوچکا تھا اور مزاج بھی بہتر ہوچکا تھا۔

حیدر بہت مصروف تھا۔ کچھ بہت اہم نیوز اس کے پاس ایڈٹ کے لیے آئی تھیں وہ انہی میں جتا تھا۔

"کیا مطلب اور کتنی دیر میں بھلا۔" وہ چائے کا گھونٹ بھر کر کچھ خفگی سے پوچھنے لگی۔

"تم نے میرا میسج شاید پورا نہیں پڑھا۔" وہ ہنوز کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے مصروف تھا۔

"پڑھا تھا تو آئی ہوں نا۔" وہ بے زاری سے کہہ کر بیگ سے فون نکال کر چیک کرنے لگی۔

"اور پلیز، یہ بھی دیکھ لو۔ میں مسودہ بھی ساتھ لے آئی ہوں۔" وہ ایک بڑے سے پھولے ہوئے لفافے کو اس کی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

حیدر نے چونک کر لفافے کو دیکھا اور پھر سے گردن موڑ لی۔

"ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی زینب۔" وہ سرسری لہجے میں بولا۔

"بھئی کیوں ضرورت نہیں تھی۔ پبلشر سے بات ہوگئی ہے تو کیا خالی ہاتھ کانٹریکٹ کرنے جائیں گے۔" وہ کہتے ہوئے فون پر حیدر کا آیا میسج چیک کررہی تھی۔

"شام میں...... یہ ہی تم نے لکھا تھا کہ شام میں جائیں گے۔" وہ میسج نکال کر غور سے پڑھتے ہوئے چونکی۔

"ہاں ناں۔ میٹنگ کا ٹائم شام چھ بجے کا ہے۔" حیدر اسی طرح مصروف لہجے میں جتا رہا تھا۔

"اسکول میں تمہیں پتا تو ہے کتنی ٹف روٹین ہوتی ہے پھر جیسے ہی سیل فون نکالو۔ پتا نہیں اس کھڑوس پرنسپل کو کون سی ہوائی چیزیں باخبر کرتی ہیں فوراً سر پر پہنچ جاتی ہے۔ بس اسکول ٹائمنگ میں سیل فون ہاتھ میں لینا کسی کی گردن چھری سے کاٹ دینے سے بھی بڑا جرم ہے اس خبطی بڑھیا کے سامنے۔" زینب سخت بیزار تھی پرنسپل سے۔

حیدر کا کام مکمل ہوگیا۔ اس نے کرسی کا رخ اس کی طرف موڑ لیا۔ تھکی تھکی پژمردہ سی زینب کے چہرے کو ایک مکمل نظر سے دیکھا۔

اور اس طرح دیکھنا ہمیشہ اس کو مشکل میں مبتلا کرتا تھا۔ اس نے بدقت خود کو سنبھال کر زینب کا لفافہ یوں ہی کھسکا کر دیکھنا شروع کردیا۔

نیند آئی اور خواب میں تم کو دیکھا
میں نے اس طرح خواہش کو روبرو دیکھا

تھوڑی سی بلند آواز میں پڑھتے ہوئے حیدر نے اسے یوں لاتعلق سا بیٹھے ہوئے دیکھا جیسے وہ کسی اور کے اشعار پڑھ رہا ہو۔

تم ہمیں پاؤ یا نہ پاؤ
دونوں صورتوں میں
ہم
تمہیں بے قرار کردیں گے

"اتنا یقین تھا تمہیں۔" وہ بوجھل آواز میں بے ساختہ بولا تھا۔

"جی!" زینب نے بے اختیار اسے چونک کر دیکھا۔

"کچھ نہیں" وہ نظریں چرا گیا۔

"اتنی اچھی شاعری کس کے لیے کرتی ہو زینب۔" وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

"شاید اپنے لیے۔" وہ کافی دیر بعد سوچ کر بولی تھی۔

"اتنے سال ہوگئے مگر تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آیا۔" وہ صاف جتا کر بولا۔

"سچ بول کر بھی تو کچھ حاصل نہیں ہوا۔" وہ شکست بھرے لہجے میں ہاتھ کی لکیروں کو گھورتے ہوئے بولی۔

"پچھتا رہی ہو نا اب۔" وہ اس سے جانے کیا اگلوانا چاہ رہا تھا۔

"اب تو نہیں جا کر ان پچھتاووں سے پیچھا چھوٹا ہے حیدر بھائی۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کھل کر مسکرائی تھی۔

اس سارے وقفے کے دوران پہلی بار وہ اس کی آنکھوں میں جھانکی تھی حیدر کو پھر سے نظریں چرانی پڑ گئیں۔

"ہم چھ بجے سے پہلے نہیں مل سکتے۔" کچھ دیر بعد وہ لجاحت سے بولی۔

"زینب! سرفراز صاحب نے مجھ سے یہی ٹائم طے کیا ہے۔ ہم ساڑھے پانچ بجے نکلیں گے تو چھ بجے تک پہنچ جائیں گے۔" وہ لفافہ پھر سے بند کرتے ہوئے سرسری لہجے میں بولا۔

"لیکن ابھی تو صرف تین دس ہوئے ہیں کشف بھی گھر پہنچ گئی ہوگی، وہاں بھی ہمیں کافی وقت لگ جائے گا۔" وہ فکرمندی سے ذہنی حساب کتاب میں لگی تھی۔

"دیکھو اب یہ تو ضروری ہے پچھلے پبلشر نے ایک تو قیمت اتنی کم دی تھی تمہاری کتاب کی پھر بے منت بھی رورو کر کی۔ یہ سرفراز صاحب کی ایک تو سرکولیشن بہت اچھی ہے پھر بک بہت باعزت طریقے سے مارکیٹ میں لے کر آتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر رائلٹی کے معاملے میں بہت صاف ستھرے اور کھرے انسان ہیں۔"

پھر حیدر کم ہی کسی کی تعریف کرتا تھا یقیناً اس نئے پبلشر کی شہرت اچھی ہوگی زینب نے سوچا۔

"بلکہ میں نے سوچا ہے، تمہارے افسانوں کی کتاب دوبارہ سے اور پچھلی شاعری کی کتاب "تم بن" سرفراز بھائی سے دوبارہ پبلش کروائیں گے۔ پچھلا کانٹریکٹ تو تمہارا ختم ہوچکا ہے نا اس باجوہ سے" وہ پرجوش سا تھا اور اس کے خلوص پر تو اسے کبھی بھی شک نہیں ہوا۔

"جی اس مہینے ختم ہوجائے گا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"گریٹ یہ تو اچھا ہوگیا میں کرلوں گا بات سرفراز بھائی سے۔" وہ اسی جوش سے بولا۔

"حیدر بھائی یہ پیسے تو اچھے دے دیں گے نا وہ بھی ان ٹائم۔" وہ آس بھرے لہجے میں کچھ جھجک کر پوچھ ہی بیٹھی۔

"امید تو بڑی ہے آگے اللہ بہتر کرنے والا ہے۔" وہ اسے امید دلا کر بولا۔

”ایکچولی کشف کی سمسٹر فیس جانی ہے پھر میں سوچ رہی تھی کہ کوئی سیکنڈ ہینڈ اچھی کنڈیشن میں گاڑی مل جاتی۔ پبلک کنوینس میں بہت خواری ہے پھر گھر کی مینٹیننس کے لیے بھی کچھ رقم چاہیے تھی۔“ اسے کشف کے ساتھ صبح والی بدمزگی یاد آئی تو وہ چپ کر گئی۔

”ہوں میں بھی سمجھتا ہوں جس طرح تم محنت کر رہی ہو۔ گھر چلانا پھر بچی کی تعلیم کے اخراجات بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہم مرد گھبرا جاتے ہیں گھر کی گاڑی کو دھکا لگاتے، اکثر تم تو...... خیر اچھا ہی ہوگا میرا دل کہتا ہے۔“

وہ سر جھٹک کر پھر سے اسے امید کا سرا پکڑاتے ہوئے بولا۔

”لیکن ابھی دو ڈھائی گھنٹے ہیں۔ میں گھر چلی جاؤں پھر۔“ وہ متذبذب تھی۔

”گھر جانے میں تمہیں گھنٹہ لگ جائے گا پھر آنے میں یہ نہ ہو، میٹنگ میں پہنچ ہی نہ سکیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”یہاں میں اتنی دیر بیٹھ کر کیا کروں گی۔“ وہ تھک بھی بہت چکی تھی۔

”آپ بات کرلیں اگر وہ لوگ چار پانچ بجے کا ٹائم دے دیں تو اچھا ہو جائے گا۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی۔

”ٹھیک ہے بات کر کے دیکھ لیتا ہوں۔“ وہ بمشکل راضی ہو کر نمبر ملانے لگا دوسری طرف سلام دعا کے بعد بات ہونے لگی۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے سورج کو اپنا سفر پورا کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ ایک اور دن ڈھل رہا ہے۔ ایک اور دن گزر رہا ہے ایک اور کالی رات سر پر آ کھڑی ہوگی جسے میں دن نکلنے کی آس میں قطرہ قطرہ کاٹوں گی تو ایک اور پہاڑ سا دن سر اٹھائے میرے سامنے کھڑا ہوگا۔“ اس کے دل میں ان کہی اداسیاں پنجے گاڑ رہی تھیں۔

آج پھر دل بیزار تھا آج پھر دل کو سمجھانا تھا۔ اسے بری طرح رونا آ رہا تھا مگر ہونٹ بھینچے وہ بالکل سپاٹ چہرے سے بیٹھی تھی۔

”پتا نہیں اب یہ اچھا ہوا ہے کہ برا۔“ وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔

”جی۔“ وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے چونکی تھی۔

”آج سرفراز صاحب کو اچانک آؤٹ آف سٹی جانا پڑ گیا۔ کل مارننگ یا ایوننگ تین بجے کے بعد جس وقت مرضی چلے جائیں۔ وہ موجود ہوں گے۔“ حیدر بتا رہا تھا اور زینب کا چہرہ بجھ رہا تھا۔

”کم آن! مایوس نہیں ہوتے۔ میری ان سے بات ہو چکی ہے۔ وہ بات سے پھرنے والے نہیں۔ ان شاء اللہ کل ہی کانٹریکٹ ہو جائے گا ان سے۔ تم پریشان نہیں ہو۔“ وہ اس کا بجھا چہرہ دیکھ کر دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

”ہوں...... یقیناً اس میں بھی اللہ کی طرف سے کچھ بہتری ہوگی۔“ وہ بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے خود کو سنبھال کر بولی۔

”اب کہاں چل پڑیں۔ میں ڈراپ کروا دیتا ہوں تمہیں بلکہ میرے ساتھ گھر چلو۔ پلیز اماں تمہیں کئی دنوں سے یاد کر رہی ہیں۔“ حیدر ہمیشہ کی طرح اس کے یوں اچانک جانے کے لیے کھڑے ہونے پر بے قرار ہو رہا تھا۔

”میرا سلام کہیے گا انہیں بس یہ ایک دو جھمیلے کم ہوتے ہیں تو میں خود ان سے ملنے کے لیے آؤں گی۔ کل آپ مجھے فون کر کے بتا دیجیے گا۔ میں اسکول سے سیدھی آ جاؤں گی۔“ وہ اب رکنے کے بالکل بھی موڈ میں نہیں تھی۔

”زینب! رکو تو کچھ دیر اور۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ وہ اشارے سے ہاتھ ہلاتی چلی گئی۔

☆☆☆

دونوں اس کافی شاپ میں کافی دیر سے یوں ہی بیٹھے تھے۔

دونوں کے درمیان کچھ تناؤ کی کیفیت تھی۔

گلاس ونڈو سے بھاگتی دوڑتی زندگی وقت کی عجلت پسندی ظاہر کر رہی تھی مگر انہیں لگ رہا تھا جیسے وقت دونوں کے درمیان ٹھہر سا گیا ہے۔

”اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں میں۔“ کافی ٹائم کے بعد وہ کچھ تلخی سے بولا تھا۔

”کیا وجہ بھی مجھے ہی بتانی ہوگی جبران، یونیورسٹی کے ٹائم سے ہم دونوں ساتھ ہیں میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔“ ردا کے لہجے میں شکایت تھی۔

”کیا میں تم سے جھوٹ بولتا رہا ہوں۔“ وہ بھی ترشی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تھا۔

”ہم یہاں صرف گلے شکوے کرنے یا لڑنے کے لیے بیٹھے ہیں۔“ فون پر بجتی میسج ٹون نے ردا کو یاد کرایا کہ اس کا آفس ٹائم ختم ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے اور سونیا اس کا انتظار بے چینی سے شروع کر چکی ہوگی۔

”پلیز بتاؤ، ہم کیا کر سکتے ہو۔“ وہ بات نپٹانے کی غرض سے عجلت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”دعا کرو میرے پر نکل آئیں...... میں اڑ کر چلا جاؤں۔ بلکہ ان ہی پروں کے ساتھ امی کو بھی باندھ کر لے آؤں وہ فوراً سے پہلے رشتہ ڈالیں اور تمہاری فیملی کا ہاں ناں کا انتظار کیے بغیر تمہیں ان ہی پروں میں لپیٹے رخصت کرا کے لے آئیں اب تو یہی ممکن ہو سکتا ہے صرف۔“

وہ چڑ کر بولتا چلا گیا۔ اس کی طنز بھری ناراضی اور اپنی بے بسی پر ردا کو ایک دم سے رونا آ گیا اگرچہ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

رونا تو بالکل بھی نہیں چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھوں کے کٹورے شفاف پانیوں سے لبریز ہو گئے۔

جبران نے یونہی باہر دیکھتے ہوئے اسے دیکھا تو چونک گیا۔ پھر محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی بھری منت کی۔

”پلیز ردا! اس طرح مت کرو یار...... پلیز آئی ایم ویری سوری...... ایکسٹریملی سوری یار...... تمہیں میں نے نہیں بتایا کہ آج باس کے بچے کے ساتھ میری لڑائی ہوتے ہوتے بچی ہے صرف اس خیال سے میں صبر اور ضبط کے گھونٹ بھر کر رہ گیا کہ اگر شاندار جاب بھی میرے ہاتھ سے چلی گئی تو میں کس طرح تمہاری فیملی کے سامنے کھڑے ہو کر تمہارا ہاتھ مانگ سکوں گا وہ تو شاید مجھے اپنے گیٹ کے اندر بھی نہیں گھسنے دیں گے۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ ردا نے آہستگی سے ٹشو سے اپنی آنکھیں نرمی سے تھپتھپا کر خشک کی تھیں۔

”تھینک یو۔“ وہ وارفتگی سے اسے دیکھ کر بولا۔

”تو بتاؤ میں کیا کروں۔ مجھ سے سب کچھ ہینڈل نہیں ہوتا۔“ وہ بے چارگی سے ہتھیار ڈال کر بولی۔

”یار! صرف دو سے ڈھائی ہفتے انیس بیس دن کے لیے تو سنبھال ہی سکتی ہو۔ وہ کمینہ مجھے پندرہ کے بعد ایک ویک کا آف دے رہا ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔

”اگر اس کی بات نہیں مانتا تو کیا کرتا۔“ وہ سوالیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

”ناراض ہو گئیں۔“ وہ پریشان ہو کر بولا۔

”جب پچھلے دنوں اماں کی بھانجی کے بیٹے کا پرپوزل نہیں آیا تھا اس وقت تم اپنی مدر کو لے آتے جبران تو آج سچویشن بالکل اپوزٹ ہوتی۔“ وہ رک رک کر بول رہی تھی۔

”سچویشن ابھی بھی مختلف ہوگی ان شاء اللہ میرا دل کہتا ہے تم بس اپنی ماما کا مائنڈ سیٹ کروا، اپنے فادر سے اور اپنی بہن اور بھائی سے بات کرو وہ تم سے پیار کرتے ہیں۔ تمہاری بات کو سمجھیں گے۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”ہم پانچوں کے ووٹ ایک طرف اماں جان کی ہاں یا ناں ایک طرف میں تمہیں کاش سمجھا سکتی۔“ اس کی آواز آخر میں رندھ گئی تھی۔

”یو مین، وہ انکار کر دیں گی۔“ وہ چونک کر بولا۔ وہ کچھ نہیں بول سکی۔

”یار!“ وہ اپنے ہی ہاتھ پر مکا مار کر کچھ اذیت اور کچھ بے بسی سے بولا۔

”یہ پیار محبت...... ہمیشہ امیر اور غریب کے بیچ کیوں ہوتی ہے۔ ہر رومانس کے بیچ میں یہ ہائی کلاس کیوں آجاتی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں رنج غصہ اور بہت سی تکلیف تھی ردا اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

”حمزہ۔“ سونیا نے ٹینس کٹ پہن کر تیار حلیے میں باہر جاتے حمزہ کو دیکھ کر کاریڈور ہی میں روکا۔

”ماما! کوئی کام ہے تو سوری۔ میرا آج بہت امپورٹنٹ پریکٹس سیشن ہے۔ آپ کا کام بعد میں۔“ وہ عجلت بھرے انداز میں جان چھڑاتے ہوئے بولا۔

”حمزہ! باہر موسم کافی خراب ہو رہا ہے۔“ وہ کچھ فکر مندی بولی۔

”سو وہاٹ! مجھے گاڑی میں جانا ہے اور پریکٹس کورٹ کے اندر ہے۔ مام ڈونٹ وری۔ میں بھیگوں گا نہیں۔“ وہ مذاق بھرے انداز میں ان کے دونوں کندھوں کو محبت سے دبا کر بولا۔

”پلیز حمزہ! آج نہیں جاؤ۔ تمہیں پتا ہے نا ایسے موسم میں میرا دل کتنا گھبراتا ہے۔“ وہ نروس سی ہو رہی تھی۔

اور آپ چاہتی ہیں آپ کے تینوں بچے آپ کے سرتاج اور گھر کے سارے فیملی ممبرز آپ کے سامنے دست بستہ بیٹھے رہیں یقیناً آپ نے پاپا کو بھی کال کر دی ہوگی۔“ وہ ماں کے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر چھیڑ رہا تھا۔ ”مت اتنی ٹینشن لیا کریں کچھ نہیں ہوتا ایسے موسم سے۔ معلوم نہیں آپ کے دل میں کیا خوف بیٹھا ہوا ہے۔“ وہ اب کے ذرا نرمی سے بولا تھا۔

”ردا بھی ابتک آفس سے نہیں آئی۔ میں نے اسے دوبارا کال کی ہے وہ میرا فون ریسیو نہیں کر رہی تمہارے پاپا نے تو کہہ دیا ہے کہ وہ میٹنگ میں ہیں رات سے پہلے گھر نہیں آئیں گے انہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے پلیز نہیں جاؤ حمزہ۔“ وہ واقعی پیلی پڑ رہی تھیں۔

”کم آن ماما کیسے بچوں کی طرح ڈر رہی ہیں آپ۔ اوکے، میں نہیں جاتا۔ کہیں بھی نہیں جاتا آپ کے پاس یہیں بیٹھا ہوں۔ پلیز ریلیکس ہو جائیں۔“ وہ ماں کے ساتھ بیٹھ کر نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگا تھا۔

”ردا نے کبھی اتنی دیر نہیں کی۔ دیکھو، باہر اندھیرا سا ہو رہا ہے۔ ابھی تو چھ بھی نہیں بجے۔“ وہ کھڑکی سے باہر پھیلتی تاریکی کو دیکھ کر متوحش لہجے میں بولی۔

”آپی رستے میں ہوں گی۔ ٹھہریں میں انہیں کال کرتا ہوں۔“ وہ اپنے فون پر ردا کا نمبر ملانے لگا۔

دوسری طرف بیل جاتی رہی مگر کال ریسیو نہیں ہوئی۔

”مجھے لگتا ان کا فون چارجڈ نہیں ہے۔ آجاتی ہیں وہ کچھ دیر میں۔ اچھا اب مجھے گھر میں روک لیا ہے تو موسم کو دیکھتے ہوئے مزیدار گرما گرم پکوڑے ہی بنوا دیں۔ ساتھ چائے اور کباب۔“ وہ ماں کی توجہ دوسری جانب مبذول کروا رہا تھا۔

”ہاں بنواتی ہوں بلکہ رمشا کو کہہ کر آئی تھی وہ صغریٰ کے ساتھ مل کر کباب اور چائے بنا لے مگر ردا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔ کبھی اپنا فون چارجنگ کے بغیر نہیں رکھتی تم پھر ٹرائی کرو۔“ اس کا دماغ ادھر ہی اٹکا تھا حمزہ پھر نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

ردا جبران سے رخصت ہو کر نکلی تو اس نے موسم کی تبدیلی کا نوٹس نہیں لیا جب گاڑی اس کے آفس کے مین روڈ سے دور نکل آئی اور اپنے خیالوں میں گم تھی تو اچانک بادل گرجے اور بجلی چمکی۔ وہ بری طرح سے چونکی۔

”یہ موسم کیسے ایک دم سے اتنا خراب ہو گیا مجھے پتا بھی نہیں چلا۔“ وہ پریشان سی رش والے روڈ کو چھوڑ کر شارٹ کٹ کے لیے دو تین چھوٹی سڑکوں کے بعد ایک کافی ویران سڑک پر نکل آئی تھی اِتنے میں بارش پوری رفتار سے برسنے لگی تھی۔

اس نے پریشانی میں کسی شیڈ یا پناہ گاہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک طرف گاڑی موڑی تو اچانک کوئی گاڑی کے آگے آیا تھا اس کے منہ سے زور سے وحشت بھری چیخ نکلی تھی۔

☆☆☆

”یا اللہ آنی کہاں رہ گئیں۔ فون بھی نہیں اٹھا رہیں۔ موسم بھی اتنا خراب ہو گیا ہے۔ انہوں نے اتنی دیر تو کبھی بھی نہیں لگائی۔“ کشف بڑھتے ہوئے اندھیرے، کڑکتی بجلی اور بادلوں کی گرج سے خوف زدہ فون ہاتھ میں لیے بار بار زینب کا نمبر ملا ــــ رہی تھی۔

اسی وقت لائٹ چلی گئی۔

ہر طرف گھپ اندھیرا ہو گیا۔ کشف کو لگا مارے ڈر کے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہے جب باہر کا دروازہ کوئی پاگلوں کی طرح پیٹنے لگا تھا۔

★★★

وہ اس کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر یونہی خالی بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح آتی تھی اور گئے وقت کی طرح اچانک سے چلی جاتی تھی مسودے کا لفافہ ہاتھ میں لیے سوچتا رہا۔ ”کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا زینب۔“ وہ افسردہ سا سوچتا رہا تھا۔

☆☆☆

رش اتنا زیادہ تھا تین بسوں میں اسے جگہ نہیں ملی۔ حبس اتنا تھا جیسے دم ہی گھٹ جائے گا اس کی طبیعت بھی کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔

رک رک کر چکر سے آ رہے تھے۔ جب اس نے رکشہ لینے کا پکا ارادہ کر لیا تو خالی بس اس کے پاس آ کر رک گئی جو چند ہی منٹوں میں بھر گئی۔

وہ جیسے ہی اندرون شہر کی ان بھول بھلیوں جیسی گلیوں کے باہر اسٹاپ پر بس سے اتری تو اترتے ہوئے ایک لمحے کو چکرا گئی۔

ابھی اس کے دونوں قدم پوری طرح سے زمین پر جمے بھی نہیں تھے کہ تابڑ توڑ آسمان سے موٹے موٹے اولوں جیسے قطرے بارش کی شکل میں برسنے لگے۔ وہ سڑک کے درمیان میں بھاگتی ہوئی پہنچی۔

ایک دم سے سارے میں تاریکی ہو گئی تھی۔

تیز ہوا اور بارش کا شور...... سڑک پر رش اور ٹریفک ایک دم سے بڑھ گیا تھا نہ جانے اسے چکر کیوں آ رہے تھے۔ وہ جلد سے جلد کسی سائے یا شیڈ کی تلاش کے لیے سڑک پار کرنے کے لیے بھاگی۔ اس کا جوتا پھسلا اور جیسے کسی نے پوری قوت سے اسے سڑک پر دھکا دے دیا ہو۔ اس کے منہ سے زوردار چیخ نکلی اور بے شمار گاڑیوں کے ٹائر چرچرائے۔ بارش بے نیازی سے اس پر برستی جا رہی تھی اور وہ ہر ستم سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

میری بھابھی

عطیہ خالد

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے لیے جو سب سے قیمتی ہوتا ہے وہ کوئی چیز نہیں بلکہ انسان ہوتا ہے۔ ایسا انسان جو جب پاس ہوتا ہے تو غیر اہم سا لگتا ہے۔ لیکن جب واقعی غیر حاضر ہو جاتا ہے تو پھر محسوس ہوتا ہے کہ سارا خزانہ تو بس وہی ایک انسان تھا۔ ساری دولت، ساری خوشی، سب کچھ......وہ اتنا کچھ تھا کہ وہ نہ رہا تو سمجھو کچھ نہ رہا۔

میری سہیلیاں جب اپنی اپنی بھابھیوں کی باتیں کرتی ہیں تو ان کے انداز طنزیہ اور استہزائیہ ہو جاتے ہیں۔ اچھی اچھی بھابھیوں میں بھی دس بیس خامیاں نکل ہی آتی ہیں۔ کوئی کہتی کہ میری بھابھی بہت اچھی ہیں لیکن بھابھی تو بھابھی ہی ہوتی ہے نا، کتنی بھی اچھی ہو، اپنا آپ دکھا ہی دیتی ہیں۔ چال چل ہی جاتی ہیں۔ لیکن میری تو اس لفظ "بھابھی" سے ہی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

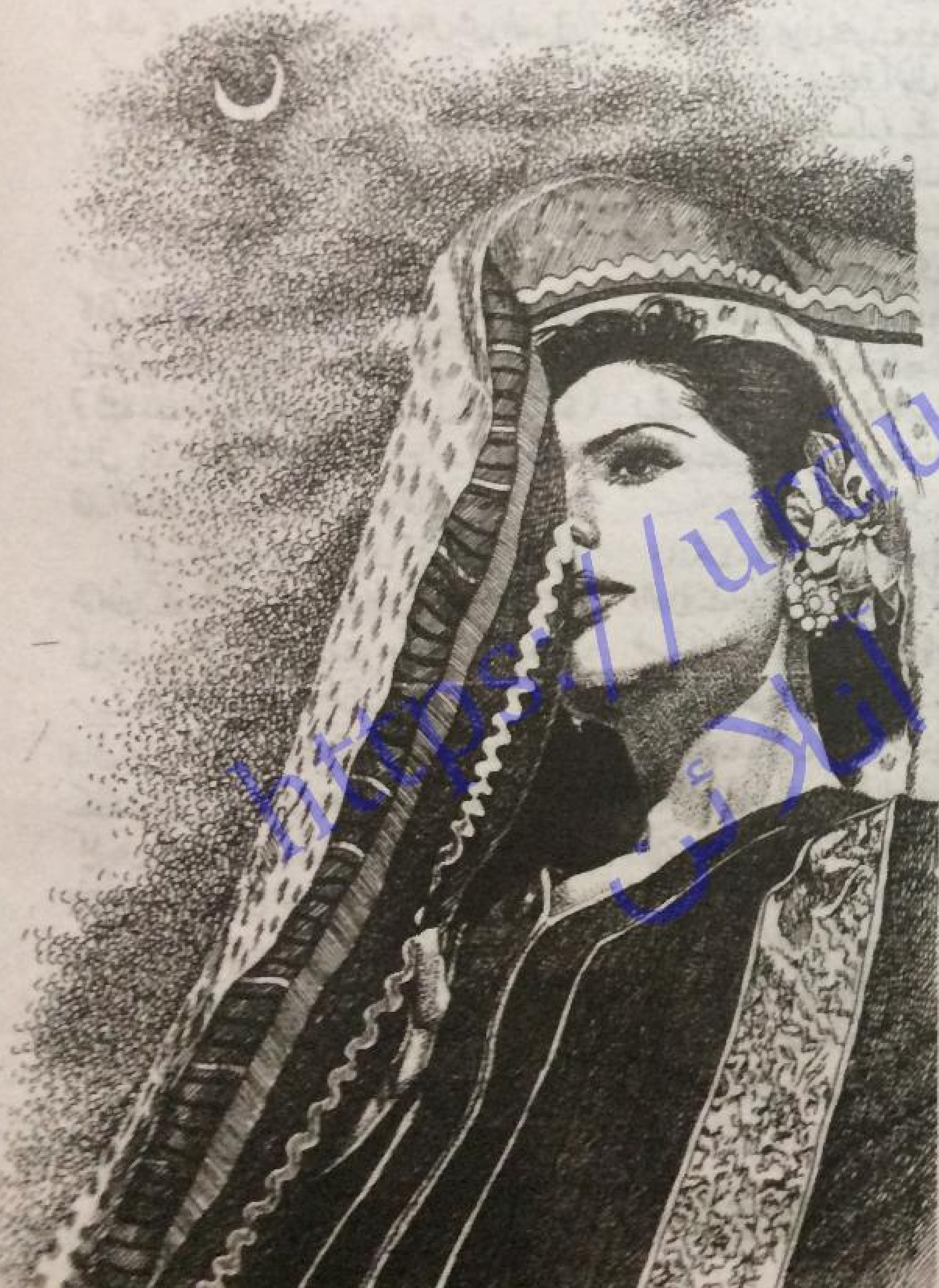
بھابھی عابدہ چودہ سال کی عمر میں بھائی شوکت کی بیوی بن کر ہمارے گھر آئی تھیں۔ میں نو سال کی تھی۔ مجھ سے بڑا ایک اور بھائی تھا، اور باقی بہن بھائی مجھ سے چھوٹے تھے۔ بھائی شوکت مشکل سے سولہ سال کا ہوگا۔ اماں کو فالج ہو گیا تھا۔ بستر سے لگ گئی تھیں۔ ہاتھ پیر نہیں ہلا سکتی تھیں، گھر کیسے سنبھالتیں۔ گاؤں والوں نے کہا بیٹے کی شادی کر دو۔ ابا بھائی شوکت کو ساتھ لے گئے اور دور پرے کے رشتے داروں کی لڑکی کو بہو بنا کر گھر لے آئے۔ میرا بھائی بہت خوب صورت تھا۔ لوگ پٹھان کہتے تھے اسے۔ اور بھابھی......توبہ توے کی طرح کالی سیاہ......پوری ڈائن لگتی تھی۔ ابا عقل اور آنکھوں دونوں کا اندھا نکلا تھا۔ خالہ نے بھابھی کو دیکھا تو اپنا سر پیٹ لیا۔ بڑا روئی دھوئی تھیں وہ۔ بھابھی چپ چاپ سارا تماشا دیکھتی رہی تھی۔ اماں اتنی پریشان ہو گئیں کہ ابکائیاں کرنے لگیں۔ بھابھی جلدی سے آگے بڑھی اور اپنے سرخ دوپٹے سے اماں کا منہ پونچھنے لگی۔ اس کی کلائیوں کی چوڑیاں چھنکتی جاتی تھیں اور وہ گیلا کپڑا لے کر اماں کا منہ صاف کر لی جاتی تھی۔

بھائی سمیت، کسی کو بھی بھابھی پسند نہیں تھی۔ وہ بھی شاید ہمیں پسند نہیں کرتی تھی، اسی لیے ہم سے بات ہی نہیں کرتی تھی۔ چپ چاپ اپنے کاموں میں لگی رہتی تھی۔ اماں تو مہینوں سے بستر پر تھیں، جیسے تیسے ابا ہمیں کچی پکی پکا کر دے دیتا تھا۔ میں چھوٹے موٹے کام تو کر لیتی تھی لیکن مجھ سے لکڑیوں کا چولہا نہیں جلتا تھا۔ آٹا گوندھ لیتی تھی لیکن روٹی نہیں پکتی تھی۔ اب صبح صبح پراٹھے مل جاتے تھے۔ دھلے دھلائے کپڑے، صاف بستر......صحن اور دیواروں پر لیپ بھی ہو گیا تھا۔ بھابھی لقمہ لقمہ بنا کر اماں کو کھانا کھلاتی تھی۔ اماں کی صحت اچھی ہونے لگی تھی۔ پھر بھی ہم پانچ بہن بھائیوں کو وہ زہر لگتی تھی۔ جب وہ ہنستی تھی تو اس سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ بال کھول لیتی تو پوری چڑیل لگتی تھی۔

آہستہ آہستہ وہ ہمیں چھوڑنے اسکول بھی جانے لگی تھی۔ ہماری استانیوں سے باتیں کرتی، ہمارے اسکول کے کام کی کاپیاں نکال نکال کر انہیں دکھاتی تھی۔ ان سے پتا نہیں کیا کچھ پوچھتی رہتی تھی۔ واپسی پر کھیتوں سے سبزی توڑ کر لاتی اور ہمارے اسکول سے آنے سے پہلے ہانڈی روٹی تیار کر کے رکھتی تھی۔ گرمیاں ہوتیں تو ہمیں گلاس بھر بھر کر ستو یا گڑ کا شربت پلاتی۔ سردیاں ہوتیں تو ساگ پر مکھن کے پیڑے رکھ، رکھ کر دیتی تھی۔ ہمارے گھر تو کوئی گائے بھینس بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں وہ مکھن کہاں سے لاتی تھی۔ خود ہم نے اسے کبھی مکھن کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہم سر دائی پینے سے منع کرتے تو وہ ہمارے منہ پکڑ لیتی تھی اور زبردستی پلاتی تھی۔ کہتی تھی "کھاؤ گے نہیں تو پڑھو گے کیسے؟"

شام ہوتی تو کھیت کھلیانوں میں بھاگ بھاگ کر ہمیں اکٹھا کرتی اور پڑھنے کے لیے بٹھا دیتی تھی۔ چھوٹے ارسلان کو ڈھونڈنے تو وہ بے چاری دور اینٹوں کے بھٹے تک جاتی تھی۔ وہ بھابھی کو آتے دیکھتا تو چھپ جاتا تھا۔ پر بھابھی بھی ہار نہیں مانتی تھی، جب تک اسے ڈھونڈ کر، گھسیٹ کر گھر نہیں لے آتی تھی، چین سے نہیں بیٹھتی تھی۔ گاؤں والے کہتے "بڑی بے حیا عورت ہے، مردوں کی طرح آوازیں دیتی پھرتی ہے۔"

ہمیں اس سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ ہمیں مارتی تو نہیں تھی لیکن جب وہ ہمیں گھورتی تو ہماری جان ہی نکل جاتی تھی یا کبھی ہمارے کان مروڑ دیتی تھی۔ جب تک ہم پڑھتے رہتے تھے وہ ہمارے سروں پر سوار



رہتی تھی۔ وہیں بیٹھ کر سبزی بناتی، سلائی کرتی۔ اکثر بھائی شوکت آ کر روٹی روٹی چلانے لگتا تھا لیکن وہ ہمارے پاس سے ہلتی نہیں تھی۔ ہم ایک ایک کر کے اسے اپنا کام دکھاتے۔ وہ اس کام کا ایک ایک لفظ آنکھوں کے سامنے لے جا کر اچھی طرح سے دیکھتی۔ پھر کہیں ہماری خلاصی ہوتی اور رات کی روٹی ملتی۔

جمعہ کو ہم سب کو باری باری نہلا کر، صاف کپڑے پہنا کر، قینچی سے ہمارے ناخن کاٹتی تھی۔ بھائیوں کو جمعہ پڑھنے کے لیے بھیج دیتی تھی۔ ہم دونوں کو اپنا ساتھ کھڑا کر کے نماز پڑھواتی تھی۔ اماں کو بھی نہلا دھلا کر، صاف کپڑے پہنا کر درخت کی چھاؤں میں بٹھا دیتی تھی۔ آس پڑوس کی عورتوں کو آواز دیتی کہ اماں کے پاس آ کر بیٹھ جائیں۔ خود وہ پنکھا جھل جھل کر مکھیاں اڑاتی رہتی۔ ایسے اماں کا دل لگا رہتا۔

لیکن پھر بھی وہ ہمیں اچھی نہیں لگتی تھی۔ میری سہیلیاں میرا مذاق اڑاتیں۔ وہ مجھے تنگ کرتی تھیں کہ گاؤں کی ایک چڑیل پیپل کے درخت پر رہتی ہے اور ایک سونیا کے گھر۔ میں تو رونا ہی لگ جاتی تھی۔ گھر آتی تو غصے سے عابدہ کو گھورتی کہ نہ وہ ہوتی، نہ ہمارا اتنا مذاق بنتا۔ بھائی شوکت بھی اسے منہ نہیں لگاتا تھا۔ اٹھا اٹھا کر کھانے کے برتن مارتا تھا۔

ایک دن پتا نہیں کس کی آئی تھی، جو بھائی شوکت کے سر آ گئی۔ کام سے واپس آتے ہوئے اس کی موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور بے چارا مرتے مرتے بچا۔ ایک طرف اماں، ایک طرف بھائی...... بھابھی تہجد سے پہلے بھی اٹھتی تو بھی اس کے کام ہی پورے نہیں ہوتے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں یہاں وہاں بھاگتی دوڑتی پھرتی تھی۔ ہفتے میں دو دن بھائی شوکت کو لے کر شہر جاتی۔ سارا دن لگ جاتا تھا وہاں۔ ابا بھائی کو لے کر شہر جاتا تو پھر کما کر کون لاتا۔ پیچھے گھر کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے وہ اسکول سے چھٹی کرنے نہیں دیتی تھی۔ دوپہر کی روٹی پکا کر رکھ کر جاتی تھی۔ اپنی روٹی باندھ کر ساتھ لے جاتی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر کبھی کبھی بہت ترس آتا تھا۔ بھائی شوکت تھوڑا ٹھیک ہونے لگا تو وہ بھی خود بخود ٹھیک ہونے لگی تھی۔

بھابھی کی ماں بہت بیمار تھی۔ بھائی لینے آیا کہ ماں بہت یاد کر رہی ہے، بس ساتھ ہی چلو۔ بھائی شوکت کی وجہ سے بھابھی نو مہینوں سے گھر نہیں گئی تھی۔ اب دوپہر کے قریب نکلی تو عشاء کے وقت دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی۔ کڑاکے کی سردیاں اور طوفانی بارش۔ ابا نے دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گئے۔ بجلی کی طرح بھابھی گھر کے اندر کود گئی۔

"آج کی رات وہاں رہ لیتیں تو قیامت آ جاتی۔" پیچھے بھائی غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔

"ہاں میرے لیے تو آ جاتی قیامت۔"

بھابھی نے لپک کر کوئلے دہکائے اور بھائی شوکت کی چارپائی کے قریب رکھے۔ بھائی شوکت تو چپ کا چپ ہی رہ گیا تھا۔ ہم سب کو ہی چپ لگ گئی تھی۔ رضائی کا کونا سرکا کر بھابھی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور جلدی سے گرم دودھ کا گلاس اور دوا بھائی کی طرف بڑھائی۔ دودھ کے گلاس کی طرف اٹھے بھائی شوکت کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جانے سردی سے یا جذبات سے۔ پھر وہ ایک دم سسکنے لگا۔

☆☆☆

میں نے میٹرک بورڈ میں پوزیشن لی تو گاؤں والوں نے ساری مبارک باد بھابھی کو دیں۔ مجھے بڑا غصہ آیا کہ محنت کی میں نے اور مبارک باد بھابھی کو مل رہی ہیں۔ جن دنوں میرے بورڈ کے امتحان تھے، ان دنوں انہوں نے اپنی بارہ جماعت پاس بھانجی کو گھر میں بلا کر رکھ لیا تھا۔ اب وہ بھانجی اور بھابھی ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی تھیں۔ امتحان سے ایک ہفتہ پہلے پتا نہیں بھانجی نے بھابھی سے کیا کہا کہ بھابھی نے چادر لی، بھائی شوکت کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شہر گئی اور پھر اگلے دن مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئی۔

گاؤں سے ذرا دور، شہر کی طرف ایک چھوٹا سا اسکول تھا، شام کو وہاں ٹیوشن سینٹر ہوتا تھا۔ مجھے لے جا کر بھابھی نے وہاں بٹھا دیا اور میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر، ہاتھ میں پکڑا میرا رجسٹر کھول کر ٹیچر کے سامنے رکھ دیا۔

"سر جی! سونیا کو یہ، یہ سوال نہیں آتے۔ ویسے بہت لائق ہے لیکن یہاں پھنس گئی ہے۔"

چھ سات نشانیاں لگے صفحے کھول کھول کر وہ سر کو بتا رہی تھی۔ میں حیران ہکا بکا رہ گئی کہ یہ کیا پاگل ہو گئی ہے۔ مجھے وہ سوال نہیں آتے تھے لیکن کیا فرق پڑتا تھا۔ ضروری تو نہیں تھا کہ وہی سوال پیپر میں آتے۔ لیکن بس میری بھابھی پر تو بھوت سوار ہو جاتا تھا۔ کسی کی نہیں سنتی تھی پھر۔ رات تک میرے ساتھ وہیں بیٹھی رہی۔ میں نے سوال سمجھ لیے، اس نے ٹیچر کا سر کھا لیا تو ہم گیارہ بجے گھر واپس آ گئے۔

ان چھ سوالوں میں سے دو سوال امتحان میں آئے تھے۔ جس دن میں پرچا دے کر گھر آئی تھی، اس دن پہلی بار میں نے رک کر ایک نظر بھابھی کو دیکھا تھا جو میرے چھوٹے بہن بھائیوں اور اپنی دو بیٹیوں کو پاس بٹھا کر پڑھا رہی تھی۔ وہ انگلش کے دو لفظ ٹھیک سے پڑھ نہیں سکتی تھی، پھر بھی کوئی بچہ کسی کلاس میں فیل نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں اسے کیسے پتا چل جاتا تھا کہ ارسلان اردو میں کمزور ہے۔ نعمان کو الجبرا سے چڑ ہے۔ فاریہ کو انگلش کا مضمون لکھتے موت پڑتی ہے۔ بھابھی کو بڑی نفرت تھی کہ کوئی کم نمبروں سے پاس ہو جائے۔ وہ بار بار ہمیں کہتی تھی کہ امتحان کا رزلٹ ایسا آئے کہ بس جی خوش ہو جائے۔

مجھے پڑھنے کے لیے شہر جانا تھا، ابا نے تو صاف منع کر دیا لیکن اس نے اپنا زیور بیچ دیا اور صاف کہہ دیا کہ میں شہر کے بڑے کالج جاؤں گی تو ہی وہ سب کا کھانا پانی دیکھے گی ورنہ ناراض ہو کر میکے چلی جائے گی۔ ابا کو بڑی ہنسی آئی۔ "جو مرضی کر عابدہ!" ابا بھی کون ہوتے تھے انہیں منع کرنے والے۔ بھابھی نے اپنے بھتیجے کو بھیج کر میرا ایڈمیشن کروا دیا۔ ہاسٹل کا انتظام بھی ہو گیا۔

یونیورسٹی کے آخری سمسٹر تک مجھے کبھی یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ غربت کے مارے میرے اس گھر سے میری تعلیم کا خرچا کہاں سے نکلتا تھا۔ میں گھر جاتی، حالات دیکھتی تو سوچتی کہ اگلے سال ایڈمیشن نہیں لوں گی۔ واپس گاؤں آ جاؤں گی۔ بھابھی کے بچے اچھے کپڑوں کو ترس گئے تھے، میں ان کا حق کھا رہی تھی۔ لیکن بھابھی، وہ میری کوئی بات سنتی ہی نہیں تھی۔ میرا رزلٹ آتا نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی پیسے میرے ہاتھ پر رکھ کر، اپنی قسم دے کر مجھے پھر سے شہر واپس بھیج دیتی تھی۔

اماں، ابا، بھائی شوکت، کوئی مجھے کچھ نہیں کہتا تھا۔ ایک بار اماں نے کہا کہ پڑھائی چھوڑ کر کوئی جاب کر لو شہر میں، عابدہ کا سب کچھ بک گیا ہے۔ جہیز کے پیتل کے برتن تک اس نے بیچ دیے ہیں تو بھابھی چیل کی طرح اماں کی طرف لپک کر آئی۔

"ایک وعدہ لیا تھا آپ سے کہ کسی سے کچھ نہیں کہیں گی آپ۔ وہ وعدہ بھی پورا نہیں کر سکیں آپ۔"

اماں تو چپ کی چپ رہ گئیں۔ میری چپ بھی بہت ہفتوں بعد ٹوٹی۔ میں اچھے نمبر لے رہی تھی تو بھابھی بھی اپنا ہاتھ نہیں کھینچ رہی تھی۔ بار بار کہتی تھی کہ میری بڑے اونچے گھر میں شادی کریں گی۔ اونچے گھر جتنا جہیز نہ ہو تو پڑھائی تو ہو۔ میں ہنس دیتی۔ ایک بار وہ میرے ہاسٹل آئی تو بڑی حیران نظروں سے ادھر ادھر لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔

"یہاں کی لڑکیاں تو بہت اچھے کپڑے پہنتی ہیں سونیا۔"

"ہاں بھابھی! یونیورسٹی میں فیشن کی بھرمار رہتی ہے۔"

"اچھا......" ان کی آواز بڑی اداس سی تھی۔

مجھے نہیں پتا تھا کہ بھابھی کی نظر اتنی تیز ہو گی۔ اس نے جانے کیسے تین دن گزارے تھے کہ چوتھے دن چھوٹا بھائی مجھے پیسے دینے آ گیا تھا۔

"بھابھی نے کہا ہے کہ بازار چلی جانا۔ اچھے فیشن والے کپڑے لینا۔ اچھا پڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اچھا نظر بھی آنا چاہیے۔"

سردیوں کی اس رات، میرا بھائی شوکت سسک پڑا تھا، سردیوں کے ایک دن میں سسک اٹھی تھی۔ پتا نہیں اب میری کس بھتیجی کا حق مارا تھا بھابھی

نے۔ کون سی کمیٹی تھی جو میرے نام کر دی تھی۔ اپنے جہیز کی کس چیز پر ہاتھ صاف کیا تھا انہوں نے۔

یونیورسٹی میں میری کلاس فیلو حریم میری بڑی پکی سہیلی تھی۔ اکثر مجھے اپنے ساتھ گھر لے جاتی تھی۔ ہم مل کر پڑھ لیتے تھے۔ وہ گاؤں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ضد کی بہت پکی تھی۔ پریشان ہو کر میں نے بھابھی کو فون کیا۔

''اتنی پریشان نہ ہو سونیا۔ دس دن بعد حریم کو اپنے ساتھ گاؤں لے آنا۔''

میں پورے سولہ دنوں بعد گاؤں گئی تھی۔ حریم کا بھائی اپنی کار میں ہمیں چھوڑ گیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ واپس چلا گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ بھابھی ہر فن مولا ہے، وہ بہت کچھ کر لیتی ہے۔ لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کچے پکے گھر کو، جس میں سامان کے نام پر چارپائیاں، پیٹیاں، صندوق، موڑھے اور ایک لکڑی کی میز کو وہ اتنا سجا سنوار دے گی۔ ایک کمرے میں صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ شیشے کی میز نئے پردے اور کارپٹ بچھا تھا۔ اپنا کمرہ بھابھی نے حریم کے لیے سیٹ کیا تھا۔ جہیز کا بیڈ بیچ دیا تھا اور ایک نیا بیڈ رکھا تھا۔ لوہے کی الماری کا پتا نہیں کیا کیا تھا، اب اس کی جگہ لکڑی کی الماری رکھی ہوئی تھی۔

صحن کی بھی کانٹ چھانٹ کی ہوئی تھی۔ مٹی کا لیپ ہوا تھا۔ پھولوں والے گملے لا کر رکھے ہوئے تھے۔ برآمدے میں نئی چقیں ڈلوائی تھیں۔ نئے برتن، کپ پلیٹیں آگئی تھیں۔ میں اپنا ہی گھر دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

حریم کا ارادہ تو بس ایک دو دن رہنے کا تھا لیکن وہ پورے دس دن رہ کر گئی تھی۔ بھابھی نے اسے ہاتھ کی کڑھائی کے تین سوٹ دیے تھے۔ جاتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر مہندی لگوائی، چوڑیاں پہنوائیں۔ وہ ہمارے گھر، گاؤں اور بھابھی کی مہمان نوازی سے کچھ اتنی خوش ہوئی تھی کہ سمسٹر ختم ہونے کے بعد اس نے اپنے ڈاکٹر بھائی کا رشتہ میرے لیے بھجوا دیا تھا۔

''اپنا سب کچھ بیچ کر ہمیں کھلا دیا بھابھی۔ یہ حصہ تو اپنے پاس رکھ لیتیں۔ اپنے لیے کچھ بنوا لیتیں۔'' جب میں حریم کے ساتھ واپس شہر جانے لگی تھی تو ایک بار پھر سسک اٹھی۔ بھابھی کو اپنے بھائیوں کی طرف سے حصہ ملا تھا۔ یہی دو ڈھائی تین لاکھ ہو گا۔

''اپنے لیے ہی تو بنایا ہے...... تمہارا گھر...... بیٹی ہو تم میری۔ سکھی رہو گی تو مجھے بھی بہت سکھ ملے گا۔''

اپنے ڈاکٹر شوہر کے گھر میں بہت سکھی رہی تھی۔ کیا نہیں تھا اس گھر میں۔ پھر بھی یہ گھر، میری بھابھی کے گھر جیسا نہیں تھا۔ ہمارا کچی اینٹوں کا وہ گھر بھابھی کی بنائی جنت تھا۔ میری کالی بھابھی نے ہم سب بہن بھائیوں کا نصیب جگمگا دیا تھا۔ ارسلان کویت چلا گیا تھا۔ چھوٹی فاریہ ایم بی اے کر رہی ہے۔ نعمان اسکالرشپ پر یوکے میں پڑھ رہا ہے۔

بھابھی بھی ہم سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اپنے بھائی کے گھر سے واپس آتے ہوئے اس کی کوچ کی ٹرک کے ساتھ ٹکر ہو گئی تھی۔ بھابھی اور چھوٹے جبران کی موقع پر ہی موت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد بھائی شوکت مسجد کا ہو کر رہ گیا۔ میں سوچتی ہی رہ گئی کہ اب بھابھی کے لیے کچھ کروں گی، اب کچھ دوں گی اور بھابھی ہمارے لیے سب کچھ کر کے چلی گئی۔ نہ اس نے کبھی کوئی شکوہ کیا تھا نہ صلہ مانگا۔ پتا نہیں وہ اللہ لوک تھی یا سائیں ملوک......

اپنی بھتیجیوں آمنہ اور بتول کو میں اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی ہوں۔ ان کے لیے الگ الگ کمرے سیٹ کیے ہیں۔ انہیں پڑھنے کے لیے اچھے اسکول اور کالج میں بھیج رہی ہوں۔ ابھی سے ان کی شادیوں کی فکر کرنے لگی ہوں۔ میں بھابھی جیسی بننے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن میں جانتی ہوں میں اس جیسی نہیں بن سکتی۔ اس کی گھٹی میں محبت تھی، وہ بے لوث تھی۔ میں نے ان کا خلوص، خدمت، محبت سمیٹ کر اپنا دل گداز کیا ہے۔ اسے بدلے میں ہم سے کچھ نہیں چاہیے تھا اور ہم نے اس سے سب لے کر پھر اسے اپنایا تھا۔ بس اسی لیے جب جب کوئی کہتا ہے ''میری بھابھی'' تب تب میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور میں کہنا چاہتی ہوں۔

''میری بھابھی...... وہ...... وہ صرف بھابھی ہی تو نہیں تھی......''

☆



قصہ ایک شہزادی کا

سمیرا فنراز

شاہ تاج کی شادی اس گھر کا سب سے بڑا مسئلہ تھی حالانکہ وہ خود کسی کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ تعلیم یافتہ، رنگ وروپ میں یکتا، ناز وانداز اس کے سب شہزادیوں جیسے تھے۔

وہ اپنے والدین اور تایا کی فیملی کے ساتھ ایک ہی گھر میں مقیم تھی۔ ایک پھوپھو تھیں جو اپنی فیملی کے ساتھ لندن میں رہتی تھیں۔ والدین نے اس کی تعلیم کے معاملے میں ہمیشہ غیر معمولی سنجیدگی دکھائی تھی۔

وہ بے حد ذہین تھی، ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کرتی، انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لینا اس کا خواب تھا۔ جس میں وہ بالآخر کامیاب ہوگئی تھی۔ خوش لباس، خوش شکل اور با اعتماد سی شاہ تاج بہروز جب یونیورسٹی کی راہ داریوں سے گزرتی تو کئی دل ایک ساتھ دھڑکتے، کئی نگاہیں پلٹنا بھول جاتیں مگر ادھر ناز کا یہ عالم تھا کہ ایک نگاہ غلط سے بھی نوازنا گوارا نہ کرتی۔

پھر یوں ہوا کہ انجینئرنگ کے آخری سال میں اس کے سینئر شیراز مصطفیٰ نے ہمت کر کے اسے پرپوز کر دیا۔ وہ اچھے خاندان کے چشم و چراغ تھے، اپنا کاروبار تھا، ڈگری اضافی خوبی کے طور پر حاصل کرلی تھی۔ مناسب قد وقامت اور چہرے پر سیاہ داڑھی رکھے، وہ اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے شاہ تاج کو کچھ ایسے برے بھی نہ لگے، پھر وہ رشتہ لانے کی اجازت مانگ رہے تھے۔

دوستی کی پیش کش ہرگز نہیں کر رہے تھے، وہ کوئی دبو لڑکی تو تھی نہیں جو گھبرا کر ستون کی اوٹ میں چھپ جاتی۔

''اپنا فون نمبر دیجیے، گھر پر بات کر کے انفارم کردوں گی۔'' سپاٹ چہرے اور بے نیاز سرمئی آنکھوں سے انہیں تکتی ہوئی وہ شیراز مصطفیٰ کو بڑی غیر روایتی سی لگی مگر وہ اسے کئی سالوں سے دیکھتے آرہے تھے۔ سو دل میں کوئی بھی غلط خیال نہ آیا۔ وہ نمبر لے کر پلٹ گئی، دو دن کے صبر آزما انتظار کے بعد وہ انہیں گھر آنے کا عندیہ دے چکی تھی۔ بقول تایا ابو بی بی میرب کے۔

''اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو روایتی لڑکیوں کی طرح کمرہ بند کر کے منہ پر لیپا پوتی کرنے کے بجائے شاہ تاج صاحبہ اپنی 95 کی مارگلہ میں شہر کے سب سے اچھے بیکرز سے چائے ناشتے کا سامان لینے گئی تھیں اور اس لمحے شیراز کی امی ڈرائنگ روم میں ''لڑکی'' کے دیدار کی منتظر تھیں۔ لڑکی اس لمحے سامان سے لدی پھندی باہر سے اندر داخل ہوئی تھی۔

''سوری بابا! پہلے بیکری پر پھر پیٹرول پمپ پر ازحد رش تھا۔ پورا ایک گھنٹہ ضائع ہوگیا میرا۔ آپ کو تو پتا ہے آنٹی! آج کل شہر میں گاڑی چلانا جہاد پر جانے جتنا ہی مشکل ہوگیا ہے۔'' مشترکہ سلام جھاڑ کر، ماں باپ کی گھوریوں کی پروا کیے بنا۔ وہ بے حد

نارمل انداز میں باتیں کرتی ہوئے شیراز کی امی کے برابر میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ جتنا بھی حیران ہوتیں کم تھا۔

”گھر کا سودا سلف آپ ہی لاتی ہیں بیٹا؟“ انہوں نے ایک جتاتی نگاہ شیراز پر ڈال کر شاہ تاج سے سوال کیا۔

”نہیں، ایسی بات نہیں ہے بہن! بس وہ آج ذرا احمر گھر پر نہیں تھا تو اس لیے۔“ بابا نے گھبرا کر وضاحت دی۔ کیا کہتے، بیٹی کو خود ہی ہر جگہ سینگ پھنسانے کی عادت ہے، وہ کسی دوسرے سے مدد لینا گناہ سمجھتی ہے۔

”بات یہ بھی نہیں ہے آنٹی! میں اپنے ذاتی کام کسی سے نہیں کرواتی۔ احمر بھائی میرے کزن ہیں، میرے نوکر نہیں اور میرے اپنے بھائی کو آپ نے دیکھا ہے۔ وہ مینٹلی تھوڑا اسلو ہے، باہر کے کام نہیں کر سکتا اور بابا کی صحت اب اس قابل نہیں کہ میں ان پر یہ ذمہ داریاں ڈالوں۔ چند سال پہلے ان کی ایک ٹانگ تقریباً ضائع ہو گئی تھی، ان کی جاب کی وجہ سے۔“ وہ سچ بولتی تھی اور بلا جھجک بولتی تھی۔ اس کے بابا چند سال پہلے تک بالکل نارمل تھے، وہ کم پڑھے لکھے آدمی تھے۔ فیکٹری میں مشینوں پر کام کرتے تھے، ایسے ہی ایک مشین کی چیکنگ کے دوران ان کی ایک ٹانگ حادثاتی طور پر چلتی مشین کے اندر آ گئی تھی۔ وہ کٹی تو نہیں تھی مگر چلنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی سو اب وہ گھر پر رہتے تھے۔ شکر تھا، گھر اپنا تھا، بڑے بھائی بہت اچھے تھے اور کچھ انہوں نے اپنے اوپر کے تین کمرے کرائے پر دے رکھے تھے سو گزر ہو رہا تھا۔ شاہ تاج ٹیوشنز دیتی تھی، ایک ہی بیٹا تھا جو یوں تو بالکل ٹھیک تھا مگر پری میچور پیدائش کے سبب دماغ کے کچھ خلیے صحیح طرح بن نہیں سکے تھے، باتیں دیر سے سمجھتا تھا۔ جیسے تیسے پڑھ رہا تھا مگر وہ جانتے تھے کہ اس کا مستقبل کچھ نہیں تھا۔ شیراز مصطفیٰ کی قسمت تھی کہ ان کی ماں کو شاہ تاج کی صاف گوئی بھا گئی تھی۔ جلد منگنی کی رسم ادا کر دی گئی، شادی پڑھائی ختم ہونے کے بعد طے پائی تھی۔

آخری سمسٹر چل رہا تھا سو چند مہینوں بعد وہ بھی تمام ہوا مگر شاہ تاج کے دماغ میں کوئی اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ اسے بہت اچھی فرم میں جاب آفر ہو گئی، اس نے بنا کسی سے مشورہ کیے جاب قبول کر لی۔ شیراز کے گھر مٹھائی پہنچا کر اب وہ بابا اور تایا ابو کے نرغے میں تھی۔ ایک طرف احمر ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔

”تمہیں کس بات کا خوف ہے؟ اگر تم یہاں سے چلی گئیں تو ہم چاچو کو گھر سے نکال دیں گے یا خدانخواستہ انہیں فاقے کی نوبت آ جائے گی؟“ احمر نے بمشکل غصہ قابو کر رکھا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ اس نے جاب بنا بتائے کر لی تھی مگر وہ معلومات لے چکا تھا، فرم کی شہرت اچھی تھی اور شاہ تاج کی سیلری بھی۔

”احمر بھائی پلیز، میں ایسا ہرگز نہیں سوچتی مگر یہ میرا فرض ہے آپ لوگوں کا نہیں۔ مجھے کچھ سیونگز کرنے دیں بابا اور پہلاج کے لیے۔“ وہ بہت اعتماد سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی۔

”مگر بیٹا! ہم نے شیراز کی امی سے بھی طے کیا تھا کہ تمہاری تعلیم مکمل ہوتے ہی شادی کی تاریخ دے دیں گے۔“ تایا ابو نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا۔

”تایا ابا میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی، سال چھ مہینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اتنا تو انہیں بھی میرے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔“ اس کی اپنی منطق تھی، اگلے دن شیراز کو بلایا گیا۔ وہ بے چارہ وہاں ماں کی سن کر آ رہا تھا، یہاں شاہ تاج کا فیصلہ سنا تو اس کو حق پر سمجھتے ہوئے پھر ماں کو ہی منانے لگ گیا۔ یہ معاملہ بھی نمٹا تو شاہ تاج کی نوکری چل پڑی۔ ایک سال میں ہی اس کی تنخواہ احمر کے برابر ہو گئی، گھر کے حالات بہت بہتر ہو گئے۔ تایا ابا بھی اس کی ترقی سے خوش تھے تو بابا اور امی بھی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے۔

امی کو بچت کی عادت تھی، کئی کمیٹیاں ڈال دی تھیں۔ کبھی نیا کارپٹ آتا، کبھی نئی الماری، بابا کو چھوٹا سا جنرل اسٹور بھی کھلوا دیا۔ وہ بھی مصروف رہنے لگے۔ سال سے اوپر ہو گیا تھا۔ شیراز کی امی عمرہ کرنے جا رہی تھیں، جاتے جاتے بابا کے کان میں شادی کی بات ڈال گئیں جو وہ اپنی واپسی کے فوری بعد کرنا چاہتی تھیں مگر یہاں وہ ہو گیا جس کا گمان بھی نہ تھا۔

امی کو ایک دن موسمی بخار نے آ لیا۔ وہ سیدھی سادی عورت تھیں، اپنی زمین سے جڑی رہنے والی۔ بنا کسی کو بتائے محلے کے مشہور ڈاکٹر کے پاس چلی گئیں کہ بقول ان کے، اس کی دوا انہیں موافق آتی تھی۔ ڈاکٹر نے نئی نئی آنے والی کوئی اینٹی بائیوٹک انہیں بھی ٹکا دی، جو وہ آج کل سب ہی مریضوں کو دے رہا تھا۔ بخار دو دن اتر کر پھر چڑھ گیا اور اب کی بار گردے کا انفیکشن بھی ساتھ لے آیا تھا۔ طبیعت زیادہ بگڑی تو انہیں اسپتال میں داخل کروایا گیا مگر وہاں مزید کچھ پیچیدگیوں کا انکشاف کیا گیا۔

امی کی رنگت تانبے جیسی ہوتی جا رہی تھی اور جسم غبارے کی طرح پھول رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو لوگوں کے مشورے سے بڑے اسپتال لے گئے جہاں انہوں نے انکشاف کیا کہ اول اول جو دوا انہوں نے کھائی تھی یہ اسی کے مضر اثرات ہیں۔ انہوں نے ایڈمٹ تو کر لیا مگر مکمل علاج وہ بھی نہ کر سکے۔ امی کا جسم اتنا پھول چکا تھا کہ پلنگ پر لیٹتیں تو پلنگ چھپ جاتا، گھر تتر بتر ہو کر رہ گیا۔

شاہ تاج نوکری دیکھتی یا گھر کہ بابا اور بھائی ایک حد سے زیادہ اس کے کسی کام کے نہ تھے۔ تائی امی کا پورشن الگ تھا پھر بھی وہ ہر ممکن حد تک مدد کرتیں مگر گھر کا نظام گھر کی عورت ہی چلا سکتی تھی۔ اسپتال کا خرچ بہت زیادہ تھا اور وہ سفید پوش لوگ، تایا ابا اور احمر بھائی کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ گھر کی ساری بچت ٹھکانے لگ گئی، شاہ تاج نے آفس سے چھٹی لے رکھی تھی مگر امی کی طبیعت سنبھل کر نہ دی۔ وہ انہیں چھوڑ کر کیسے جاتی، آخر نوکری سے فارغ کر دی گئی۔ اسے غم نہیں تھا بس اس کی ماں بچ جاتی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک دو مہینے کی بھاگ دوڑ میں وہ یوں چٹ پٹ ہوئیں کہ کسی کو یقین نہ آتا تھا۔

”اپنے بابا اور بھائی کا خیال رکھنا تاج! تم میری اچھی والی بیٹی ہو۔“ ماں کے آخری الفاظ اس کے سینے میں کھب گئے تھے، اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا تھا۔ لوگ روتے ہوئے اسے گلے لگاتے تو وہ ایک لمحے میں بدک کر پیچھے ہو جاتی، اسے کمزور ہونے سے ڈر لگتا تھا اور وہ کمزور نہیں تھی۔ شیراز اچھی فطرت کا انسان تھا، جس طرح اور جتنا ممکن ہوتا اسے سہارا دیتا۔ وہ اس کی پسند تھی، وہ اسے اپنے نام کی انگوٹھی پہنا چکا تھا مگر یہ سچ تھا کہ ایک مخصوص فاصلہ تا حال ان کے درمیان تھا۔

شاہ تاج بہروز اپنی حدود آپ طے کرتی تھی اور اسے پار کرنے کی اجازت اس نے اب تک شیراز کو بھی نہیں دی تھی۔ شیراز کی والدہ جو عمرے سے واپسی پر اس کی شادی کی تیاریوں کا سوچ رہی تھیں، یہاں کی کایا پلٹ پر حیران پریشان رہ گئیں۔ امی کے انتقال پر سب نے انہیں شاہ تاج کی دل

جوئی کرتے دیکھا تھا اور سب ہی بابا کو جلد اس کی رخصتی کا مشورہ دے کر گئے تھے۔ کچھ دن ان سب کو سنبھلنے میں لگ گئے۔ ہوش آیا تو احساس ہوا کہ اب نہ گھر چلانے والی ہے، نہ سنبھالنے والی۔ شاہ تاج کی نوکری ختم ہو گئی تھی، گھر داری اسے خاک نہیں آتی تھی۔ جب سے اب تک تائی امی ہی پکا کر بھیج رہی تھیں مگر کب تک؟

گھر کی صفائی اور برتن وغیرہ پہلاج کر لیتا تھا کیونکہ وہ پہلے بھی امی کے ساتھ ان کاموں میں لگا رہتا تھا۔ وہ کچھ دن تک سب معاملات پر غور کرتی رہی پھر جو پہلا کام سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ اس نے پھر نوکری کی تلاش شروع کر دی اور اس بار کسی نے اسے نہیں روکا۔ سب جانتے تھے کہ وہ بالکل خالی ہاتھ ہو چکے ہیں۔ اُدھر شیراز کی امی نے مہینہ بھر صبر کر کے پھر اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ ان کے دل کو کھٹکا لگ چکا تھا، یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہ آتا تھا۔

''آنٹی! آپ دیکھ رہی ہیں، میرے گھر کے حالات۔ میں کس کے سہارے چھوڑ دوں اپنے باپ بھائی کو؟'' وہ بے یقینی سے انہیں تکنے لگی۔

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو بیٹا جیسے تمہارے ابا سڑک پر بیٹھے ہیں، خیر سے اپنے گھر میں ہیں اور تمہارے تایا بڑے اچھے انسان ہیں۔ وہ دیکھ لیں گے سب۔'' شیراز کی امی کا لہجہ اس بار اکتاہٹ لیے ہوئے تھا۔

''میں نے امی سے وعدہ کیا تھا کہ میں بابا اور پہلاج کا خیال رکھوں گی اور اپنے گھر کے حالات میں کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر جانتی ہوں۔'' شیراز کی امی کے ماتھے کے بل دگنے ہو گئے۔ اس کا صاف، مضبوط اور اٹل لہجہ انہیں سراسر ہٹ دھرمی لگا۔

''اپنے بابا کو بلاؤ۔'' وہ جو ڈرائنگ روم میں ان کے ساتھ اکیلی بیٹھی تھی چونک گئی۔ کسی انہونی کے احساس سے وہ انہیں غور سے دیکھتی ہوئی بابا کو بلانے چلی گئی۔

''معاف کیجیے گا بہن! مجھے علم نہیں تھا کہ آپ آئی ہیں۔'' بابا اندر آ کر آداب میزبانی نبھانے لگے۔

''برامت مانیے گا بھائی صاحب! میں صاف بات کرنے آئی ہوں۔ منگنی کے ایک ڈیڑھ سال میں، میں نے آپ کی بیٹی کی ہر بات مانی ہے کیونکہ یہ میرے بیٹے کی پسند تھی۔ میں مانتی ہوں آپ پر کڑا وقت ہے مگر کبھی آپ بھی تو میری جگہ خود کو رکھ کر سوچیں۔ مجھے بھی آگے جواب دینا ہوتا ہے، میرے بھی خاندان والے ہیں اور کتنا آپ مجھے ذلیل کریں گے؟'' وہ شدید بے زار تھیں۔ شاہ تاج کی ''نہ'' نے انہیں شدید ٹھیس پہنچائی تھی۔

''اللہ نہ کرے بہن! آپ کیوں ایسی باتیں کر رہی ہیں؟'' بابا گھبرا گئے۔ بیٹی کے سسرال کا معاملہ تھا۔

''اور کیسی باتیں کروں؟ ڈیڑھ سال میں آپ اپنی بیٹی کو شادی کے لیے آمادہ نہیں کر سکے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اگر اسے شادی کرنی ہی نہیں تھی تو میرے بیٹے کو کیوں پھنسایا۔'' وہ آج پھٹ پڑی تھیں۔

''معاف کیجیے گا آنٹی! میں نے آپ کے بیٹے کو نہیں پھنسایا، وہ خود میرے پاس پیغام لے کر آئے تھے۔'' شاہ تاج کی تو انا بلبلا اٹھی تھی۔

''تاج! تم چپ رہو۔'' بابا کو غصہ آنے لگا۔

''بس آج اس معاملے کو آر یا پار کریں، میرے بیٹے کو لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ آپ لوگوں کے مسئلے ساری عمر ختم نہ ہوئے تو میں کیا ساری عمر اپنے بیٹے کو بٹھائے رکھوں گی۔'' آج گویا ہر حجاب اٹھ گیا تھا۔ شاہ تاج نے ٹھنڈی گہری سانس بھری۔ بابا کو کسی کی منتیں کرتے دیکھنا اسے ہرگز گوارہ نہ تھا۔

''تو ٹھیک ہے آنٹی! یہ لیجیے۔'' اس نے ان کے سامنے دوزانو ہوتے ہوئے انگوٹھی انگلی سے اتار کر ان کے آگے رکھ دی۔ ایک پل کو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ بابا کو تو سکتہ ہوا ہی، شیراز کی امی کو بھی چپ لگ گئی۔

''جو شخص میرے آج میں میرا ساتھ نہیں دے سکتا، میں اسے اپنے کل کا ساتھی بھی نہیں چن سکتی۔ میں جانتی ہوں آپ غلط نہیں ہیں، آپ کو پورا حق ہے اپنے بیٹے کی خوشیاں دیکھنے کا مگر میرے لیے خوشی کا مطلب صرف شادی نہیں ہے، آئی ایم سوری۔'' وہ مضبوط لہجے میں کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ شیراز کی امی کو صرف ایک لمحے کے لیے افسوس نے گھیرا مگر یہ بے عزتی ان کے لیے زیادہ بڑی تھی کہ ان کے اتنے قابل بیٹے کی ایک لڑکی ایسے ناقدری کرتی کہ خود انگوٹھی اتار کر ان کے ہاتھ پر رکھ گئی تھی۔

''آپ کی خاموشی اس بات کی گواہ ہے کہ آپ اپنی بیٹی کے ہم نوا ہیں۔'' بابا کے جھکے سر پر مزید خاک انڈیل کر وہ یہ دہلیز پار کر گئی تھیں، پھر کبھی نہ پلٹنے کے لیے۔

''چین پڑ گیا نا تمہیں، میری معذوری کا تماشا لگا کے۔ اس دن کے لیے اتنا پڑھایا تھا کہ ساری دنیا کو اپنے پیروں تلے روند دو۔ میری محبت اور اعتماد کا خوب ناجائز فائدہ اٹھایا ہے تم نے تاج! آج سے پہلے میں نے خود کو کبھی اتنا لاچار محسوس نہیں کیا۔'' بابا اس کے کمرے کے وسط میں کھڑے برس رہے تھے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے امی سے وعدہ کیا تھا کہ آپ دونوں کا خیال رکھے گی مگر لگتا تھا اب زبان سے ایک لفظ نہیں نکلے گا۔ جتنا اور جو کچھ کہنا تھا وہ شیراز کی امی کے سامنے کہہ چکی تھی۔ شام کو تایا ابو، تائی امی اور احمر بھائی آ گئے تھے۔

''اسی دن سے ڈرتا تھا میں، ایک بار لڑکی کے قدم باہر نکل گئے پھر وہ کبھی نہیں رکتی۔'' یہ تایا ابو تھے۔

''ایسی بھی کون سی آفت پڑ گئی تھی جو تم نے رشتہ ہی توڑ دیا۔ کوئی اور بات تھی تو پہلے ہی بتا دیتیں۔'' یہ تائی امی تھیں، اس نے سب کی لعن طعن سن لی تھی خلاف عادت۔ احمر کو اس کی خاموشی بہت محسوس ہوئی مگر وہ ہمت نہیں کر سکا کہ کوئی سوال کرتا۔

کئی دن یوں ہی بے کیفی میں گزر گئے۔ شاہ تاج کو ایک بہت اچھے اور مشہور ادارے سے لیٹر موصول ہو گیا۔ اس نے بنا تامل نوکری شروع کر دی۔ ایک دن شام میں آفس سے نکلتے ہی اسے اپنے راستے میں حائل شیراز مصطفیٰ نظر آ گیا۔ وہ نظر انداز کر دینا چاہتی تھی مگر نہیں کر سکی۔

آنکھوں میں لکھی تحریر نافہم نہیں تھی، وہ خاموشی سے ایک طرف چل دیا تو شاہ تاج بھی کسی احساس کے تحت اس کے پیچھے ہو لی۔

''زیادہ وقت نہیں لوں گا تمہارا، بس اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ اتنے عرصے میں اتنا بھی اعتماد نہیں کر سکیں مجھ پر کہ رشتہ ختم کرنے سے پہلے مجھے انفارم ہی کر دیتیں؟ میں نے کب تمہارا ساتھ نہیں دیا شاہ تاج؟ تمہاری طرف سے کبھی کوئی پیش رفت نہ ہونے کے باوجود بھی میں ہمیشہ پُرامید رہا۔ کبھی تمہیں غلط نہیں سمجھا مگر تم نے ثابت کر دیا کہ تم آج بھی مجھ سے اتنے ہی فاصلے پر کھڑی ہو جتنی اول روز تھیں۔ تمہاری ہر مشکل میں ساتھ دیتا مگر مجھے ہم سفر تو رہنے دیتیں۔'' وہ بہت سنجیدہ تھا، شاہ تاج سے ایک لفظ نہ کہا گیا۔ یہ سچ تھا کہ وہ اس شخص کی لاکھ اچھائیوں کے باوجود اس سے محبت نہیں کر سکی۔

''خیر! میں جانتا ہوں تمہارے پاس کہنے کو کچھ نہیں، میں بھی تمہیں مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔ چلتا ہوں، خیال رکھنا اپنا اچھی لڑکی۔'' وہ نپے تلے قدم اٹھاتا لمحوں میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اسے ماننا پڑا کہ وہ ایک اچھا انسان، واقعی اس کے نصیب میں نہیں تھا۔

تائی امی نے میرب کے لیے ایک رشتہ دیکھا تھا، تایا ابا کے کسی پرانے دوست کا بیٹا تھا۔ پولیس میں تھا اور بڑے اچھے عہدے پر تھا۔ میرب اس سے تین سال چھوٹی تھی، گریجویشن کر کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اچھے مزاج کی لڑکی تھی مگر شاہ تاج کے لیے دیے رویے کے سبب اس سے کلوز نہیں ہو سکی تھی۔

امی کے انتقال کو آٹھواں مہینہ تھا۔ پچھلے ماہ شیراز مصطفیٰ کی شادی کا کارڈ انہیں ٹی سی ایس سے موصول ہوا تھا جو یقیناً یہ جتانے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ ان کے بیٹے کو واقعی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

شاہ تاج نے بے تاثر چہرے کے ساتھ وہ کارڈ دیکھا تھا اور اپنی فائلوں پر جھک گئی تھی۔

"واقعی بڑے کم ظرف لوگ تھے، یہ کارڈ بھیج کر تو انہوں نے اپنی اوقات بتادی۔" یہ احمر بھائی کے ریمارکس تھے۔

"بس اب بھول جاؤ، جو ہوا۔ آئندہ یہ ذکر کوئی نہ کرے، کچھ معاملات نصیبوں سے بھی جڑے ہوتے ہیں۔" تایا ابا نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ محجوب سی ہوگئی۔

"چلو آصفہ! اب تم بھی بچی کو گلے لگالو۔" تایا ابا نے تائی امی کو مخاطب کیا۔

"میں نے کب اس سے بیر لگایا ہے، یہی ہمیں اپنا نہیں سمجھتی۔ دیکھو ناڑی پن میں اپنے کتنے ہاتھ جلا لیے اس نے۔ مجھ سے کہتی تو کیا میں منع کردیتی مگر وہی اس کی نام نہاد انا۔" تائی امی کی جھاڑ میں اپنائیت تھی، سب کی نظر بے ساختہ اس کے ہاتھوں پر گئی۔

واقعی وہ اتنے دنوں سے آفس سے آکر کچھ نہ کچھ پکانے کی کوشش کرتی رہتی تھی، حالانکہ اکثر میرب دوپہر کو کھانا دے جاتی تھی مگر اسے نجانے کیوں یہ بھی احسان لگتا تھا۔ بابا کو اس پر بے طرح پیار آتا مگر اس کو سزا دینے کے خیال سے اتنے ماہ سے اس کے ساتھ رویہ سخت رکھا ہوا تھا۔ آج خود کو روک نہ سکے اور بڑھ کر سینے سے لگالیا۔ وہ منہ پکا کیے ہر آنسو اپنے دل پر گراتی رہی، بس ایسی ہی تھی وہ۔

مطلع صاف ہوا تو تائی امی نے باہر کی کئی ذمہ داریاں اسے سونپ دیں یعنی میرب کی شادی کی شاپنگ وغیرہ۔ اس نے کھلے دل سے قبول کرلیں۔

ان ہی دنوں پھوپھو کی آمد کا غلغلہ اٹھا۔ وہ میرب کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آرہی تھیں، گھر میں نئی ہل چل مچ گئی۔ شاہ تاج کو جاب نے الجھا رکھا تھا، اس سے فراغت ملتی تو تائی امی کے سونپے کام نبٹاتی رہتی۔ یوں بھی وہ لوگوں سے، ہجوم سے گھبراتی تھی سو پھوپھو کے آنے کی کم از کم اسے کوئی خوشی نہیں تھی۔

جس دن پھوپھو کی فلائٹ تھی اس دن وہ چند اہم میٹنگز کی وجہ سے ایسی مصروف ہوئی کہ سر اٹھانے کی بھی فرصت نہ مل سکی۔ آفس سے نکلی تو شام کے سائے لمبے ہوچکے تھے، گھر پہنچنے تک اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اس کی گاڑی کا ہارن سن کر میرب چلی آئی تھی۔

"تم یہیں ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جی، وہ کھانا لے کر آئی تھی، امی نے بھجوایا تھا اور آپ کے اوپر والے کمروں کی صفائی وغیرہ کروارہی تھی۔" وہ اس کے پیچھے گیٹ بند کرتی ہوئی کہنے لگی۔

"اوپر کی صفائی کیوں؟ ابھی تو کرائے داروں کے جانے کے بعد بابا نے کلر وغیرہ کروایا تھا۔" اس کی حیرت دوچند ہوگئی کہ اس وقت اوپر کے کمروں کا کیا ذکر۔

"وہ پھوپھو یہیں رکیں گی، شادی تک تو چاچو نے ہی کہا تھا کہ اوپر کے کمرے ان کے لیے تیار کردوں۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی، یوں بھی وہ شاہ تاج کے مزاج سے خائف رہتی تھی اور جب سے اس کا رشتہ ختم ہوا تھا، وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہوچکی تھی۔

"بابا نے کہا ہے تو ٹھیک ہے۔" وہ سینڈل اتار کر لاؤنج میں ہی ڈھیر ہوگئی۔ میرب دوبارہ جاچکی تھی، بابا اور پہلاج بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ خود اتنی تھکی ہوئی تھی کہ کسی کی بھی خبر لیے بغیر سیدھی اپنے کمرے میں آکر بے خبر سوگئی تھی۔

صبح اس کی آنکھ ایک شور سے کھلی، کوئی بری طرح اس کے کمرے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ وہ دیر تک سونے کے موڈ میں تھی، یہ شور اسے جتنا ناگوار گزرا، وہی جانتی تھی۔ الماری کے لاک پر اٹکا دوپٹہ کھینچ کر گلے میں ڈالتے ہوئے وہ ایک عالم طیش میں دروازے کی طرف بڑھی مگر دروازہ کھلتے ہی ایک اجنبی صورت نے اسے حیران کردیا تھا۔

"سنو، تم جو کوئی بھی ہو مجھے یہ جاننے میں بالکل دلچسپی نہیں۔ بس مجھے کچھ کھانے کو دے دو، میں بھوک سے مر رہا ہوں۔" ایک تو صورت اجنبی، اس پر اس کی فرمائش۔ وہ اسے جتنا برا لگ سکتا تھا، لگا۔

"دیکھو، مجھے پتا ہے میں بہت ہینڈسم ہوں۔ کوئی بھی لڑکی مجھے پہلی بار دیکھ کر ایسے ہی کھو جاتی ہے، مگر مجھے پہلے ناشتا دے دو، پھر جب تک چاہو مجھے دیکھتی رہنا۔ میں اب یہیں ہوں۔" اس کی خاموشی سے دیکھنے پر وہ پتا نہیں کیا سمجھا۔ شاہ تاج کو جون میں آنے میں بس ایک لمحہ لگا۔

"آپ کی تعریف؟" شدید ناگواری سے اس نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

"اوہ بھئی، کرلینا تعریفیں بھی، مگر پہلے مجھے ناشتا......" اس جنم جنم کے بھوکے نے اسے عاجز ہی تو کردیا تھا۔

"اوہ شٹ اپ! میری طرف سے مرجاؤ بھوک سے۔ میں تمہاری نوکر ہوں؟ نہ جان نہ پہچان، صبح صبح آفت کی طرح نازل ہوگئے۔ دفع ہوجاؤ یہاں سے۔" وہ پھٹ پڑی اور دھاڑ سے دروازہ اس کے منہ پر بند کردیا۔ شاہ زین چونک کر پیچھے ہٹا۔ ایک مبہم مسکراہٹ اس کے لبوں پر رینگ گئی، جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا تھا۔ جب ہی سیڑھیوں سے میرب نے شکل دکھا کر اسے اشارے سے پوچھا تھا، شاہ زین مصنوعی خوف سے کان کو ہاتھ لگاتا اس کے پیچھے اوپر آگیا۔ شاہ تاج کی نیند اڑ چکی تھی۔ وقت دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ اپنے حساب سے نیند پوری کرکے اٹھی تھی۔

گیارہ بج رہے تھے مگر بہرحال اسے اس طرح اٹھائے جانے پر جو غصہ تھا وہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اسے تو گھر میں کبھی بابا تک کام کے لیے نہ اٹھاتے تھے، اس اجنبی کو اس کمرے کا رستہ کس نے دکھادیا تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی گئی تھی کہ وہ لندن سے آئے نمونوں میں سے ایک ہے مگر اتنا بدتمیز

اور منہ پھٹ۔ سارے لندن کی تہذیب پر لعنت بھیج کر وہ اپنے کپڑے نکال کر واش روم میں بند ہو گئی۔

☆☆☆

"کیسی رہی اپنی کزن سے پہلی ملاقات؟" اوپر آتے ہی احمر نے اشارے سے اس سے پوچھا۔

"زبردست بے عزتی کروا کر آرہے زین بھائی!" میرب نے فوراً سارا قصہ احمر کے گوش گزار کر دیا۔

"میں نے کہا تھا تم سے، اس کی نیند کوئی خراب کردے تو وہ آگ لگا دینے کے درپے ہو جاتی ہے مگر تمہیں ہی شوق ہو رہا تھا اسے چھیڑنے کا۔" احمر نے اسے جتاتے ہوئے کہا۔

"چلو یار! کوئی بات نہیں۔ پہلی ملاقات تھی، حساب پھر برابر کرلیں گے۔" شاہ زین نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"تم کہاں تھے جب سے؟ بھائی جان تمہارا پوچھ رہے تھے۔" جب ہی پھوپھو وہاں آنکلیں۔

"وہ امی میرا فون نہیں مل رہا تھا تو وہی ڈھونڈ رہا تھا نیچے۔" اس نے جلدی سے بہانہ گھڑا۔ احمر اور میرب ہنسی چھپانے لگے۔

"یہ شاہ کب تک اٹھے گی میرب! اسے تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ رات فلائٹ اتنا لیٹ تھی کہ تب تک وہ سو چکی تھی۔ کیا سوچتی ہوگی بچی کہ میں نے اس کی ماں کا پرسہ تک نہیں دیا اسے۔" پھوپھو بڑی خوش مزاج اور گھلنے ملنے والی تھیں۔ چند گھنٹوں میں ہی یہاں ایسے ایڈجسٹ ہوئیں گویا ہمیشہ سے یہاں رہتی آئی ہوں۔

"کل وہ رات آئی بھی لیٹ تھی پھوپھو! میں جا کر دیکھتی ہوں ابھی۔" میرب سعادت مندی سے کہتی ہوئی نیچے آگئی۔ شاہ تاج فریش سی نکھری کچن میں چائے کا پانی چڑھا رہی تھی۔

"رہنے دیں آپی! چائے مت بنائیں، میں نے آپ کا ناشتا اوپر تیار کر دیا ہے۔" میرب نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

"کیوں بنایا تم نے؟ میں نے تو نہیں کہا تھا۔" اس کا مزاج اب بھی برہم ہی تھا۔ اوپر سے سنائی دیتی وہ شناسا سا آواز اسے برابر غصہ دلا رہی تھی۔

"یہ بات نہیں ہے آپی! امی نے پھوپھو کی وجہ سے ناشتے پر خاصا اہتمام کروایا تھا۔ سب نے ساتھ ہی ناشتا کیا ہے، چاچو اور پہلاج بھی اوپر ہی ہیں۔ پھوپھو بھی کئی مرتبہ آپ کا پوچھ چکی ہیں، اسی لیے میں آپ کو بلانے آئی تھی۔" میرب نے نرمی سے وضاحت دی۔

"کون کون آیا ہے لندن سے؟" اس نے چائے کے برتن واپس رکھتے ہوئے پوچھا۔ میرب نے سر نیچا کر کے مسکراہٹ روکی۔

"بس پھوپھو اور ان کے بیٹے شاہ زین بھائی۔"

"اور کوئی نہیں آیا؟ ان کے تو دو بچے اور بھی تھے نا۔" اس نے جیسے ذہن پر زور ڈالا۔

"تھے نہیں، ہیں الحمدللہ۔ مگر بڑے بیٹے پہلے ہی اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے باہر گئے ہوئے ہیں اور بیٹی کا سمسٹر چل رہا ہے اس لیے وہ انکل کے ساتھ وہیں ہے تو بچ گئے پھوپھو اور زین بھائی۔"

"اچھا اچھا بس، تم تو ان کی فیملی کی آفیشل اسپوک پرسن لگ رہی ہو، اب چلو بھی۔" اپنے مخصوص مغرور انداز میں اسے لتاڑتی ہوئی وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"السلام علیکم!" ایک مشترکہ سلام جھاڑ کر وہ سیدھی پھوپھو کی طرف بڑھی جو اسے دیکھ کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ لائٹ گرین کلر کے پرنٹڈ لان کے کرتے اور وائٹ ٹراؤزر میں اس کا دمکتا رنگ جیسے روشنیاں بکھیر رہا تھا۔ سرمئی آنکھوں اور شہد رنگ بال پشت پر بکھرائے وہ کسی شہزادی جیسی لگ رہی تھی۔ اس کی چال میں عجب بے نیازی تھی، چہرے پر حد درجہ خود اعتمادی، نگاہ اٹھا کر بات کرتی وہ انہیں مختلف تو لگی تھی مگر بے باک نہیں۔

"ماشاء اللہ، جیتی رہو۔" بے اختیار اس کی پیشانی چوم کر اسے ساتھ لگا لیا۔

"معاف کرنا بیٹا! میں تمہاری ماں کی وفات پر کوشش کے باوجود نہیں آسکی۔ لندن میں ان دنوں بم دھماکوں کی وجہ سے کسی غیر ملکی کو ویزہ جاری نہیں کر رہے تھے، بس وہاں اکیلی تڑپتی رہی۔" وہ آب دیدہ ہوگئیں۔ شاہ تاج نے بے تاثر چہرے سے انہیں دیکھا۔

"اٹس او کے پھوپھو! میں سمجھتی ہوں۔" انہیں کندھے سے لگا کر اس نے بالکل نارمل انداز میں کہا تھا کیونکہ اسے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ان کے آنے یا نہ آنے سے۔ وہ لوگوں سے امیدیں نہ رکھنے کی قائل تھی، سو اسے دکھ بھی کم ہی ہوتا تھا۔ اپنا ناشتا ٹرے میں سجا کر جس لمحے اس نے لاؤنج میں قدم رکھا، نظر سیدھی سامنے بیٹھے شاہ زین سے ٹکرائی۔ ان کٹارے نینوں والی حسینہ کو دیکھ کر ایک پل کو وہ ٹھٹک ہی تو گیا۔ اس نے جن تیز نظروں سے شاہ زین کو گھورا تھا، وہ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ 'غصہ ابھی باقی ہے میرے دوست' مگر کسی بھی رویے کا اظہار کیے بغیر وہ اس کے عین سامنے ناشتا رکھ کر بیٹھ گئی۔ سکے ہوئے سلائس پر مکھن اور جیم کی تہہ جما کر وہ کانٹے اور چھری سے آملیٹ توڑ کر کھانے لگی۔ شاہ زین سیدھا ہو بیٹھا۔ احمر کے آگے سے ریموٹ اٹھا کر نیوز چینل لگانے اور پھر احمر کے ساتھ ہونے والی خالص تجارتی اور کاروباری گفتگو نے اسے پوری آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ احمر نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا، وہ امپریس ہونے والے انداز میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔ اپنا ناشتا ختم کر کے وہ گھڑی میں وقت دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیا بے نیازی تھی کہ سامنے بیٹھا لمبا چوڑا، اچھا خاصا خوش شکل بندہ اس نے یوں نظر انداز کیا تھا کہ پراپر تعارف تک حاصل کرنا ضروری نہ سمجھا تھا۔

"بابا میں جا رہی ہوں کچھ اور منگوانا ہو تو بتا دیں۔" بہروز صاحب کے پاس رک کر اس نے عجلت میں استفسار کیا۔ شاہ زین دلچسپی سے اس کی ہر حرکت دیکھتا رہا۔

"نہیں بیٹا! بس جلدی آجانا۔" انہوں نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔ وہ سر ہلاتی آگے بڑھ گئی۔

"تم کہاں چلیں بیٹا؟ ذرا دیر میرے پاس بھی تو بیٹھو۔" پھوپھو حیرت سے اس کے پیچھے لپکیں۔

"بس کچھ گروسری کرنی ہے پھوپھو! اور ہفتے کے کچھ ضروری کام نبٹانے ہیں۔" اس نے دوبارہ گھڑی دیکھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

"اچھا۔" پھوپھو بس اسی قدر کہہ سکیں۔

"میں آجاؤں گی جلدی پھر آپ سے باتیں ہوں گی، اوکے۔" اس نے ان کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا حالانکہ ایسی رواداریاں نبھانی اسے ہرگز نہ آتی تھیں۔ پھر لمحے کی بھی دیر کیے بنا وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

"یہ کیا ماجرا ہے بھئی۔" شاہ زین نے احمر کو گھورا۔ وہ دونوں ہم عمر تھے اور ہمیشہ سے رابطے میں رہے تھے سو بے تکلفی بھی ایسی ہی تھی۔

"وہ بہت خوددار ہے، وہ خود کو چاچو کا بیٹا سمجھتی ہے سو مردوں کی طرح نوکری کرتی ہے، بلز جمع کراتی ہے۔ سودا سلف لاتی ہے، سارے شہر میں گاڑی دوڑائے پھرتی ہے۔ اسے لگتا ہے یہ گھر اس کے کندھوں پر چلتا ہے۔" احمر کے انداز میں ہلکی طنز کی آمیزش تھی مگر وہ تلخ نہیں تھا بلکہ دھیما دھیما مسکرا رہا تھا۔ شاہ زین سمجھ نہیں سکا سو کندھے اچکا کر ٹی وی میں مگن ہوگیا۔

شام چار بجے اس کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ پھوپھو اور شاہ زین اس وقت نیچے بابا کے ہی ساتھ تھے۔ تایا ابا اور تائی امی احمر کے ساتھ شادی کے کارڈ بانٹنے نکلے ہوئے تھے کیونکہ احمر کی بھی آج ہی چھٹی تھی اور دور رہنے والے رشتہ داروں کے ہاں گاڑی کے بغیر جایا نہیں جا سکتا تھا۔ دروازہ شاہ زین نے ہی کھولا تھا، وہ حیران ہوتی ہوئی گاڑی اندر لے آئی۔

"آپ نے کیوں تکلیف کی، پہلاج کہاں ہے؟" اسے بولتے ہی بنی۔

"دیکھ لیں، آپ نے تو مجھ پر دروازہ بند کر دیا

تھا مگر میں اپنے دل...... مطلب گھر کے دروازے سب کے لیے کھول دیتا ہوں۔" اسے دیکھ کر خود بخود شاہ زین کی زبان پھسل گئی تھی مگر ادھر بھی وہ کون سا کم تھی۔ ذرا بھی گھبرائے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ تو اور بھی بری بات ہے کیونکہ دل اور گھر کے دروازے سب کے لیے نہیں کھولے جاتے۔" سرمئی آنکھوں کی چمک شاہ زین کو لاجواب کر گئی۔ وہ پچھلی سیٹ سے سامان نکال رہی تھی جب وہ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"دراصل شاہ......! میں تم سے سوری کرنا چاہتا ہوں، صبح کے لیے۔ بس وہ یوں ہی مذاق میں......" وہ کسی سے بگاڑ کر رہ نہیں سکتا تھا اور یہ لڑکی تو یوں بھی اسے ہر پل مائل کر رہی تھی۔

"اٹس اوکے۔" وہ مختصراً کہہ کر شاپرز سنبھالتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"بس آپی! سب نصیب کی باتیں ورنہ لڑکا برا نہیں تھا۔ تاج کو پسند کرتا تھا، اب تو یہی کہوں گا کہ تاج کا جوڑ نہیں لکھا تھا اس کے ساتھ۔" دہلیز پر قدم رکھتے ہی یہ الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے، قدم خود بخود رک گئے۔ پیچھے سے آتے شاہ زین نے بھی سب سن لیا تھا، وہ تو یوں بھی اس قصے سے واقف ہو چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے ماموں نے امی کو سب بتا دیا تھا۔

"کیا ہوا، رک کیوں گئیں؟ چلو اندر، چائے تیار ہے۔" وہ یوں معمول کے انداز میں بولا جیسے ہمیشہ سے ان کے درمیان ایسی ہی بے تکلفی ہے اور جیسے ابھی کچھ لمحوں پہلے اس نے کچھ نہ سنا ہو۔ شاہ تاج بنا کوئی جواب دیے، متضاد کیفیات میں گھری اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"ارے آ گئیں تم، میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی بہروز اور میں تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔" اس کی شکل دیکھتے ہی پھوپھو یوں آگے بڑھیں کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ دونوں ماں بیٹا عجیب لوگ تھے، ان کی بے تکلفیاں دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کل رات آئے پردیسی مہمان ہیں، جن کی ابھی ٹھیک طرح خاطر تواضع بھی نہیں کی گئی ہے۔ وہ فریش ہو کر آئی تو پہلاج چائے کی ٹرے اٹھائے چلا آیا۔ ساتھ وہ چیزیں بھی تھیں جو وہ خود لے کر آئی تھی۔

"چائے کیا میرب دے کر گئی ہے؟" اس نے آہستہ آواز میں پہلاج سے پوچھا۔ پھوپھو مہمان تھیں اور وہ خود میزبان ہو کر سارا دن باہر گزار کر اب لوٹی تھی۔

"میرب کیوں لائے گی چائے، پہلاج نے بنائی ہے بھئی۔ اتنی زبردست چائے بناتا ہے یہ کہ میں تو صبح سے دو کپ بنوا کر پی چکا ہوں۔" جواب شاہ زین کی طرف سے آیا۔ شاہ تاج نے پہلے اسے پھر پہلاج کو یوں دیکھا جیسے وہ مذاق کر رہا ہو۔ دوسری طرف پہلاج کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

"پہلاج اور چائے...... مذاق کر رہے ہیں؟" اس نے قدرے برا مانتے ہوئے شاہ زین کو گھورا۔

"ایک طرف گھر سنبھالنے کا دعویٰ دوسری طرف گھر والوں سے ایسی بے خبری؟" شاہ زین منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ مگر شاہ تاج نے سن لیا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مجھے حیرت ہے کہ تمہیں یہ نہیں پتا کہ تمہارا بھائی نہ صرف گھر کے سارے کام کر لیتا ہے بلکہ چائے بھی بہت اچھی بناتا ہے۔ ماموں بتا رہے تھے کہ کل اس نے ان کو ناشتا بھی بنا کر دیا۔" شاہ زین کی دی گئی معلومات اس کے لیے واقعی نئی تھیں۔

"واقعی پہلاج؟" وہ اب بھی بے یقین تھی۔

"آپی...... چا...... چا...... چائے......"

پہلاج بولنے میں بھی تھوڑا ہکلاتا تھا۔

مگر اس وقت وہ بے حد خوش تھا کیونکہ موضوع گفتگو اس کی ذات تھی اور ذکر خیر ہو رہا تھا۔ چائے واقعی مزے کی تھی، شاہ تاج خوشی اور حیرت سے مسکرانے لگی۔ شاہ زین کو دیکھا، اس کے چہرے پر "دیکھا میں نے کہا تھا ناں" والے تاثرات تھے۔

پہلاج چلا گیا تو زین نے اسے مخاطب کیا۔

"پہلاج آگے پڑھ نہیں سکتا تو تم اسے کسی کورس میں ایڈمیشن کیوں نہیں دلوا دیتیں۔" شاہ تاج نے ٹی وی سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

"جب وہ پڑھ ہی نہیں سکتا تو کورسز کیسے کرواؤں؟"

"کوئی بھی ہنرمندی کے کورسز جیسے اس کا کچن میں انٹرسٹ ہے، تم اسے ہوٹل مینجمنٹ یا محض کھانا پکانے کے کورسز کروا سکتی ہو۔ وہ دلچسپی سے یہ کام کرے گا اور اللہ نے چاہا تو آگے اس کے کام بھی آ سکتا ہے۔" وہ حیرت سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

"لگتا ہے آپ اس کی چائے سے متاثر ہو کر اتنی دور کی سوچ رہے ہیں۔ پہلاج اتنا سب ہینڈل نہیں کر سکتا شاہ زین صاحب!" اس کا انداز شاہ زین کو قدرے روکھا لگا۔

"ہاں میں تو اس سے متاثر ہو گیا ہوں مگر شاید تم اپنے سوا کسی سے متاثر نہیں ہوتیں اور جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، تم پہلاج کو بہت زیادہ انڈر اسٹیمیٹ کرتی ہو جبکہ وہ بالکل نارمل ہے۔" اس نے جس طرح پہلاج کی حمایت کی، شاہ تاج سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"کل کو تم یہاں نہیں رہیں تو اس کی اور ماموں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ وہ کس طرح زندگی گزاریں گے جب انہیں زندگی کا کوئی ڈھنگ ہی معلوم نہ ہوگا؟" وہ اس کی خاموشی پر مزید کہنے لگا۔

"میں کہاں جاؤں گی؟" وہ بے اختیار بولی۔

"کیوں؟ شادی نہیں ہوگی کل کو تمہاری؟ تب بھی تو یہ دونوں اکیلے ہی رہیں گے نا؟" اس نے براہ راست اسے گھور کر کہا۔

"میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔" اس کے پرعزم انداز پر شاہ زین کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

"تم تو بالکل بچی ہو بھئی، بے کار میں سب نے تمہیں سر پر چڑھا رکھا ہے، نری احمقانہ باتیں۔" وہ سراسر اس کا مذاق اڑاتا ہوا وہاں سے چلا بنا۔ پیچھے وہ منہ کھولے اپنی ایسی عجیب بے عزتی پر کھولتی رہ گئی۔

☆☆☆

"کیا بات ہے صاحب زادے! آپ تو نیچے کے ہی ہو کر رہ گئے، غالباً آپ یہاں میری بہن کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔" احمر نے اسے دوسرے دن گھیر لیا تھا۔

"اور غالباً آپ نے مجھے ایک اور کام کے لیے بھی بلایا تھا۔" اس نے بھی فوراً حساب برابر کیا۔

"ہاں......" احمر نے ہاں کو لمبا کھینچ کر سانس لیا۔ شاہ زین نے بغور اس کا انداز دیکھا۔

"تو پھر کیسا پایا تم نے اسے؟" احمر نے براہ راست اسے دیکھا۔ وہ دونوں اس وقت رات کے کھانے سے فراغت کے بعد چھت پر ٹہل رہے تھے، دونوں کی انگلیوں میں آدھا سگریٹ دبا تھا۔ شاہ زین نے دھواں ہوا کے سپرد کرتے ہوئے جیسے اس کی بات کو سوچا۔

"ابھی کافی محنت کرنی پڑے گی۔" احمر اس کا جواب سن کر ہنس دیا۔

"ویسے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟ اگر تمہاری نظر میں وہ اتنی ہی اچھی تھی تو تم خود کیوں نہیں اسے پسند کر لیتے؟" شاہ زین کا سوال متوقع تھا، احمر بالکل بھی حیران نہیں ہوا۔ اس کے سب جاننے والوں نے شاہ تاج سے مل کر یہی سوال اس سے کیا تھا۔

"وہ مجھے پسند ہے مگر ایک کزن کی حیثیت سے، وہ میرے ساتھ پل کر بڑی ہوئی ہے زین! میں اسے بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور جب ہی میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں اسے بیوی کے طور پر افورڈ نہیں کر سکتا۔ وہ بہت انا پرست ہے، بہت اصولوں والی، وہ ٹوٹ جائے گی مگر جھکے گی نہیں اور میں نہ اسے جھکانا چاہتا ہوں، نہ توڑنا چاہتا ہوں جبکہ مجھے پتا ہو کہ وہ صحیح ہے۔ رہا سوال بیوی کا تو ہم پاکستانی مردوں کو لڑکی وہی بھاتی ہے جو ہم سے شرمائے، ہماری محبت کا دم بھرے اور ہم جب جتنا چاہیں اسے بدل ڈالیں۔ یہی معصوم سی خواہشیں میری بھی ہیں۔" اس کی معصوم خواہشوں پر

شاہ زین نے منہ بنایا۔

"بہت خبیث شخص ہو تم، ویسے میری گردن پر یہ چھری پھیرنے کا مطلب؟" احمر زور سے ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ شاہ زین اسے گھورتا رہا۔

"ویسے تو مجھے اس "چھری" کے لیے ہمیشہ سے تمہاری ہی گردن پسند تھی مگر بیچ میں شیراز مصطفیٰ آگیا۔ میں نے سوچا تاج کی خوشی بھی شاید اسی میں ہوگی مگر پھر جو ہوا وہ تمہارے بھی علم میں ہے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے وہ شیراز میں انٹرسٹڈ نہیں تھی؟" شاہ زین کو یہ بات پہلے دن سے چبھ رہی تھی۔

"نہیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ یہ منگنی کبھی نہیں توڑتی یا کم از کم شیراز کو اعتماد میں ضرور لیتی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں اس سے ملا تھا، یہ رشتہ سراسر شیراز کی پسند سے ہوا تھا۔ تاج کی اس میں کوئی انوالومنٹ نہیں تھی۔" احمر کا یقین شاہ زین کو بھی شانت کر گیا۔ رہا سوال شاہ تاج کا تو وہ سرمئی آنکھوں والی گلابی لڑکی اسے پہلے دن ہی بھا گئی تھی۔ آنکھوں میں کچی نیند کا خمار لیے، چہرے پر سنہرے بال بکھرائے وہ جتنی خفا تھی، زین کو اتنی ہی پیاری لگی تھی مگر وہ اسے پہلے جان لینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شاہ تاج اپنے دل کے دروازے خود اس کے لیے وا کرے اور وہ تب تک انتظار کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اس دن پھوپھو کوفتے بنا رہی تھیں۔ بابا کو بہت پسند تھے اور شاہ تاج کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیسے روکے۔ وہ تو تائی امی کے کھانا بھیجنے پر ہی کوفت کا شکار ہو جاتی تھی۔ وہ نوالے اس کے حلق سے رک رک کر اترتے تھے، کہاں یہ کہ کوئی اس کے کچن میں کھڑے ہو کر اس کی فیملی کے لیے کھانا پکائے۔ دو دن بعد میرب کا مایوں تھا، گھر میں خوب افراتفری تھی کاموں کی۔ شاہ تاج نے آج سے چھٹیاں لے لی تھیں، وہ صبح سو کر اٹھی تو پھوپھو فریزر میں منہ دیے گوشت کے پیکٹ کھنگال رہی تھیں۔

"سوری بیٹا! تم کہو گی میرے فریج سے کیا چوری کر رہی ہیں پھوپھو مگر بیٹا! بہروز نے فرمائش کی تو مجھ سے رہا نہیں گیا اور یوں بھی اتنے دن سے فارغ بیٹھے بیٹھے میری ہڈیوں میں درد ہونے لگا ہے۔" وہ شاہ تاج کے یوں دیکھنے پر عاجزی سے کہنے لگیں، شاہ تاج پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"ایسا مت کہیں پھوپھو! آپ کا اپنا گھر ہے بس مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ یہاں کام کریں، میں بنا لوں گی، آپ بتا دیں کیا پکانا ہے۔" اس نے جس طرح کہا، پھوپھو مسکرا دیں۔ اس کی ناکارہ کوکنگ کے قصے وہ یہاں سب کی زبانی سن چکی تھیں۔

"ارے آج تم میرے ہاتھ کا کھانا کھاؤ پھر بتانا پھوپھو کیسا پکاتی ہیں۔ میرا بھی دل رہ جائے گا اپنے بچوں کے لیے کچھ کروں گی تو۔" انہوں نے شاہ تاج کی کمر سہلاتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو گئی مگر اندر پھر بھی شور برپا رہا۔

"چلو ایک کام کرو، تم کچن میں میری ہیلپ کرو اور سیکھ بھی لینا کہ میں کیسے پکاتی ہوں۔ اب تو ٹھیک ہے؟" وہ جیسے اس کا چہرہ پڑھ چکی تھیں، شاہ تاج مسکرا دی۔

"پھوپھو آپ کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ لندن میں رہتی ہیں۔" وہ پھوپھو کے بول چال اور کام کرنے کے انداز سے متاثر ہوئی تھی، پھوپھو ہنس دیں۔

"ارے بیٹا! ساری عمر تو یہیں گزر گئی، مطلب بچپن سے جوانی پھر شاہ زین اور عیشا کی پیدائش تک پاکستان میں ہی تھی۔ تمہارے انکل باہر رہتے تھے پھر عرصے بعد انہیں فیملی کا ویزا ملا۔ تب ہم یہاں سے گئے اور پھر ایک بات کہوں بیٹی! پردیس میں ہم اقلیت میں رہتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ ہماری شناخت مٹ جائے گی تو ہم اور مضبوطی سے خود کو تھامے رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے بچوں کو پابند کیا کہ وہ باقاعدگی سے نماز اور قرآن پڑھیں گے اور گھر میں اردو کے سوا کسی زبان میں بات نہیں ہوگی حالانکہ شاہ زین تو انگریزی اور فرنچ بھی بہت اچھی بول لیتا ہے مگر میں نے اسے بھی پابند کیا کہ دفتر سے آ کر گھر میں صرف اپنی زبان بولے۔" پھوپھو مشاقی سے کوفتے بنا بنا کر بھنے مسالے میں ڈالتی رہیں۔

"جی میں نے نوٹ کیا کہ شاہ زین کی اردو بہت اچھی اور صاف ہے۔" وہ یوں ہی دھیان آنے پر بولی۔

"اس کی ایک وجہ اس کی نوکری ہے، وہ لندن کی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس میں کام کرتا ہے، جہاں وہ اردو اور فرنچ کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کرتا ہے۔ یہ اس کا اپنا شوق ہے ورنہ اس کے پاپا نے اسے اپنے آفس میں بڑی اچھی جاب دلوائی تھی مگر اس کا دل کتابوں میں ہی اٹکا رہا، ہم نے بھی زبردستی نہیں کی۔ شاہ ویز کا بھی اپنا اسٹور ہے اور عیشا گریجویشن کے آخری سال میں ہے۔" وہ کام کرتے کرتے اسے سب کے بارے میں بتانے لگیں۔

"میں تو سوچ رہی ہوں اس بار آئی ہوں تو شاہ زین کو بھی ٹھکانے لگاؤں۔" انہوں نے شوربے کا دم لگاتے ہوئے بات مکمل کی۔

"ٹھکانے لگاؤں؟" شاہ تاج خاک نہ سمجھی۔

"اوہو بھئی، مطلب اس کی شادی کر دوں۔" پھوپھو جیسے اپنی ہی بات کا مزا لے کر ہنسنے لگیں تو وہ بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

شام میں اسے تائی امی کا بلاوا آ گیا، وہ اوپر گئی تو وہ میرب پر کسی بات پر خفا ہو رہی تھیں۔

"آپ نے بلایا تھا تائی اماں!" وہ وہیں اندر آ گئی۔ باہر لاؤنج میں شاہ زین بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا، احمر اب تک نہیں لوٹا تھا۔

"دیکھ بیٹا! اس لڑکی کی لاپروائیاں، اس کا شادی کا جوڑا جو ہم دے کر آئے تھے بوتیک میں، یاد ہے نا؟" انہوں نے تصدیق چاہی، شاہ تاج نے جھٹ گردن ہلا دی۔

"اسے کل تک جوڑا گھر پہنچا دینا تھا اور وہ نہیں آیا، اسے کہا تھا فون کر کے معلوم کر لینا مگر اس نے نہیں کیا۔ اب فون کر رہے ہیں تو مل نہیں رہا، رو رو کر حشر کر لیا ہے اس نے کہ میرا جوڑا نہیں آیا تو کیا پہنوں گی۔ ان لوگوں نے بھی حد کر دی لاپروائی کی۔ اب بتاؤ کیا کروں؟ احمر بھی نہیں لوٹا اب تک کہ اس کے ساتھ چلی جاتی، کل دکان بند رہے گی۔" وہ از حد پریشان تھیں۔

"اچھا، آپ پریشان نہ ہوں، مجھے کارڈ دیں میں جا کر پتا کرتی ہوں۔ بوتیک تو میں گئی تھی آپ کے ساتھ۔" اس نے جیسے ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔ شام چار بجے کا وقت تھا، تائی امی نے رسید اور بقیہ پیسے اسے تھما دیے۔ شاہ زین نے سب سنا اور دیکھا تھا۔

"سنو شاہ!" وہ جانے لگی تو شاہ زین نے اسے پکار لیا۔ یہ دوسری بار تھا کہ اس نے اسے "شاہ" کہہ کر پکارا تھا۔ سارا گھر اسے تاج کہتا تھا۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

"دراصل مجھے بھی اپنی شاپنگ کرنی ہے اور احمر ابھی گھر نہیں آیا ہے اور کل بھی اس کی چھٹی نہیں ہوگی۔ تم جا رہی ہو تو کیا میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں کیونکہ مجھے نہ یہاں کے راستوں کا علم ہے نہ شاپنگ ایریاز کا، اگر تم مائنڈ نہ کرو تو......" اس نے اتنی نرمی سے کہا کہ اس سے انکار نہ ہوا۔ البتہ ماتھے پر کئی بل پڑ گئے تھے۔

"اوکے پندرہ منٹ میں تیار ہو کر نیچے آ جائیں۔" وہ اسے آرڈر دیتی ہوئی چلتی بنی۔ شاہ زین مسکراہٹ دباتا ہوا فوراً ہی پیچھے چل دیا۔

تقریباً پون گھنٹے میں وہ تھکا دینے والے ٹریفک کے رش سے نکل کر مطلوبہ جگہ پہنچے تھے، شاہ تاج نے بوتیک والوں کی ٹھیک ٹھاک خبر لی تھی۔ ان پر احسان رکھ کر، جس وقت وہ لوگ میرب کا سوٹ لے کر وہاں سے نکلے، دھوپ ڈھل چکی تھی۔ ایک مشہور مال چند قدم کے فاصلے پر تھا، وہ دوبارہ پارکنگ سے نکلنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ شاہ زین انجان نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیتا ہوا جیسے اسی کا منتظر تھا۔

"وہ سامنے مال ہے، آپ اتنا پیدل چل لیں گے؟" وہ رخ اس کی طرف موڑے پوچھنے لگی۔

پیازی رنگ کے کُرتے پر وائٹ ٹراؤزر پہنے، پرنٹڈ دوپٹہ گلے میں لپیٹے، وہ گویا اس پر طنز کر رہی تھی، شاہ زین مسکرا دیا۔

"پتا نہیں یہ پاکستانی کیا سمجھتے ہیں کہ ہم وہاں لندن میں بگھیوں میں گھومتے ہیں۔ انہیں کیا پتا کہ روز ایک گھنٹہ پیدل چل کر میں اپنے آفس پہنچتا ہوں، یہ چار قدم تو میں چار سیکنڈ میں طے کرلوں گا۔"

وہ سوچ کر مسکرایا اور بنا کوئی جواب دیے اس سے بھی پہلے قدم بڑھا دیے۔ شاہ تاج جو اس کے منتظر تھی، اب اس کی رفتار کا مقابلہ کرنے میں ہانپنے لگی۔

"تھوڑا سلو چلیں گے آپ؟" وہ پھولی سانسوں سمیت بمشکل بولی۔ زین نے ایک تجاہل عارفانہ سے ذرا ئی ذرا اس کی سمت دیکھا۔

"کیا ہوا؟ تھک گئی ہو؟ لگتا ہے پیدل چلنے کی عادت نہیں ہے تمہیں۔" اس نے موقع دیکھ کر وار کیا تھا۔ شاہ تاج کو شدید برا لگا۔

"ظاہر ہے مجھے کیوں ہونے لگی عادت، میرے پاس میری گاڑی ہے۔" اس کے بچکانہ سے غرور پر شاہ زین زور سے ہنسا، وہ روڈ پار کرنے کے لیے فٹ پاتھ کے کنارے پر کھڑا تھا۔ پیچھے سے آتی شاہ تاج کو اس نے فوری ہاتھ دکھا کر روکا۔ سامنے سے تیز رفتار گاڑی گزر رہی تھی، اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی، شاہ زین نے مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ کر تیزی سے روڈ پار کروا دیا۔ وہ جیسے اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔

"ہاں تو تمہارے پاس اپنی گاڑی ہے؟ امیر ہو بھئی۔ میرے پاس نہیں ہے۔ میں مسلسل پیدل چلتا ہوں۔" اس کی کلائی چھوڑ کر دوبارہ اس سے آگے چلتے ہوئے وہ پھر بولنے لگا۔ وہ حیران پریشان اسے سننے پر مجبور تھی، اعتراض بھی نہ کرسکی۔

مال میں داخل ہوکر وہ اسے سب سے اچھے مردانہ کپڑوں کے برینڈ کے آؤٹ لیٹ پر لے آئی تھی، اس برانڈ اسٹور کے صوفے میں دھنسی وہ خود کو پرسکون کرنے لگی۔ شاہ زین سیلز مین کی معیت میں اپنے لیے کپڑے پسند کرتا رہا۔ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر بند آنکھوں کے پیچھے اس کا قہقہے لگاتا چہرہ ابھر آیا تھا۔

"تمہارے پاس اپنی گاڑی ہے؟ امیر ہو بھئی، میرے پاس نہیں ہے۔" اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے اس لندن کے غریب کی آؤ بھگت میں سارے عملے کو مصروف پایا۔ غور کیا تو احساس ہوا کہ وہ گورا چٹا، شان دار سا مرد، کوئی پردیسی ہی لگتا تھا اور اسی لیے وہ سب اس کے آگے بچھے جا رہے تھے۔

دکان میں چاروں طرف دیوار گیر شیشے نصب تھے اور ہر شیشے میں اس کا عکس نمایاں تھا۔

"کیسا لگ رہا ہوں شاہ؟" اس کے پکارنے پر وہ چونکی۔ اپنی پیچ کلر کی ڈینم پر سیاہ خوب صورت کوٹ پہنے وہ واقعی بہت جچ رہا تھا۔ وہ تعریف کرنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کی محویت شاہ زین کو باغ باغ کرگئی۔

"چلو یہی اچھا لگ رہا ہے۔" اس نے جھٹ کوٹ اتار کر سیلز مین کے حوالے کیا پھر کچھ اور پسند کرنے لگا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ وہاں سے فارغ ہوئے تو شاہ زین ایک لیڈیز بوتیک کے آگے رک گیا۔ وہاں ڈسپلے پر کئی دیدہ زیب سوٹ جگمگا رہے تھے، وہ بلا جھجک اندر گھس گیا اور ایک سوٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ کس کے لیے لے رہے ہیں؟" اسے تعجب ہوا۔

"اب اگر مجھے میرب کی شادی میں کوئی لڑکی پسند آ گئی تو؟" اس نے مگن سے انداز میں جواب دیا۔ شاہ تاج چپ سی ہوگئی۔

"تم بتاؤ نا، اچھا لگ رہا ہے یا نہیں؟" شاہ تاج نے لمحے میں خود کو کمپوز کیا تھا۔

"بہت اچھا ہے۔" جواب دے کر وہ شاپ سے باہر نکل گئی۔ شاہ زین نے خود کو داد دی اور سوٹ پیک کروا کر اس کے پیچھے نکل آیا۔

"اپنے شہر کا کچھ اچھا سا کھانا تو کھلواؤ یار! امی اتنی تعریف کرتی ہیں یہاں کے ذائقوں کی۔" وہ گاڑی نکال کر مین روڈ پر لائی تو شاہ زین نے اس کے سنجیدہ چہرے کو گرفت میں لے کر کہا۔ اس کا کسی چیز کو دل نہیں کر رہا تھا مگر پتا نہیں کیوں وہ اس شخص کے ہر کہے کو پورا کر رہی تھی۔ ایک مشہور کھانے پینے کی جگہ پر بمشکل گاڑی پھنساتے ہوئے اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ وہ گاڑی سے نہیں اترے تھے، ویٹر کو وہاں کا مشہور کباب فرائی آرڈر کرتے ہوئے اس نے یوں ہی اندر نظر آتے، کھانا پکاتے لڑکوں کو دیکھا تو ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"اس دن آپ پہلاج کو کورس کروانے کی بات کر رہے تھے، میں نے غور کیا تو آپ کی بات صحیح لگی مجھے۔ ہم کیا کرسکتے ہیں اس سلسلے میں۔" شاہ زین جو پہلے ہی اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں کھویا ہوا تھا، چونک گیا۔ وہ اتنی جلدی مان جائے گی اسے اندازہ نہیں تھا۔

"میں نے احمر سے بھی ذکر کیا تھا، وہ کچھ اچھے اداروں کے نام لے رہا تھا جو اس قسم کے کورسز آفر کرتے ہیں۔ تم کسی دن اس کے ساتھ جا کر معلومات لے آنا اور مناسب لگے تو پہلاج کو داخل کروا دینا۔ اسے تھوڑا سا اعتماد دینے کی ضرورت ہے شاہ! وہ بالکل نارمل ہے۔" اس نے بہت رسان سے اسے سمجھایا۔

"آپ نے احمر بھائی کو اس میں انوالو کیوں کیا؟ میں خود دیکھ لیتی سب۔" اسے اتنی ساری باتوں میں بس یہی سمجھ میں آیا تھا۔ شاہ زین کو بیچ میں غصہ آ گیا۔

"خود کو سب کا گاڈ فادر سمجھنا چھوڑ دو شاہ تاج بی بی! کچھ کام مردوں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ انہیں ہی کرنے دو۔" شاہ تاج کو اس کی بات نے چنگاری دکھا دی۔

"ویسے آپ بھی اندر سے کم پاکستانی نہیں ہیں، وہی مرد ہونے کا غرور۔" شاہ زین نے اچنبھے سے اسے گھورا۔

"ادھر دیکھو، یہاں کتنی گاڑیوں میں تمہیں مرد عورت کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں؟ کتنی عورتیں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ویٹر کو آرڈر کر رہی ہیں؟" اس نے چٹکی بجا کر اس کی توجہ اردگرد نظر آتی گاڑیوں کی طرف دلوائی۔

"اور اب ادھر دیکھو، صرف یہ مرد بقول تمہارے پاکستانی مرد، تمہاری فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہے اور بہت خوش بھی ہے کیونکہ اسے بالکل برا نہیں لگتا اگر اس کی ماں، بہن، بھابھی یا بیوی گاڑی چلائے، نوکری کرے۔ اپنی ایک شناخت بنائے مگر ہاں اسے اچھا لگتا ہے اپنی عورتوں کی حفاظت کرنا، انہیں دنیا کے سرد و گرم سے بچانا، ان کی چھوٹی چھوٹی مشکلوں کو حل کرنا۔ انہیں اپنے ہونے کا احساس دلانا، تو کیا وہ غلط ہے؟"

"تو کیا میں غلط ہوں؟" آخری بات اس نے براہ راست ان سرمئی آنکھوں میں ڈوب کر کہی تھی۔ وہ جو بے حد حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی، کوئی جواب نہ دے سکی، کچھ پل یوں ہی ایک دوسرے کو تکتے ہوئے گزر گئے۔ ویٹر نے شیشہ بجایا تو دونوں جیسے ہڑبڑا کر ایک دوسرے کے سحر سے پیچھا چھڑا پائے تھے۔

☆☆☆

مایوں والے دن آسمان صبح سے ہی سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، دھوپ ان سے لڑ لڑ کر تھک چکی تھی۔ شاہ تاج کی پر بڈ لگی ہوئی تھی، تائی امی مایوں کے معاملے میں بڑی "کٹر" تھیں۔ احمر کہہ کہہ کر تھک گیا تھا مگر انہوں نے ہال میں انتظام کرنا گوارا نہ کیا تھا کہ مایوں کا تقدس پامال نہ ہو جائے مگر گھر بھی کوئی ایسا کشادہ اور عالی شان نہ تھا کہ یہاں زیادہ لوگوں کو بلایا جا سکتا سو بڑی بحث و مباحثے کے بعد وہ گھر کے سامنے والے پارک کے لیے راضی ہوئی تھیں۔ وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ رسم ہوتے ہی میرب کو فوراً گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ میرب کی مایوں میں اوڑھی جانے والی سادی پیلی چنری پھوپھو کو بالکل نہیں بھائی تھی سو جھٹ پٹ بازار سے میچنگ گوٹا ستارے منگوائے گئے۔

"پھوپھو یہ اب کوئی نہیں لگاتا۔" میرب منمنائی۔

”مگر...... بیٹا شادی ایک بار ہوتی ہے اور ہر جگہ کے اپنی رسم ورواج ہوتے ہیں جن کے بغیر خوشی کا روپ ادھورا رہتا ہے۔ گوٹے ستارے، ناک کی نتھ، چوڑی دار پاجامے کھسہ، ہاتھوں میں گجرے، یہ سب ہماری پاکستانی شادیوں کی پہچان ہے۔ دیکھو گورے آج بھی اپنی شادیاں چرچ میں کرتے ہیں اوران کی دلہنیں آج بھی وہی سفید لباس پہنتی ہیں سو ہم کیوں اپنی روایتوں کو بدلتے تقاضوں کی مٹی تلے دفن کریں۔“ پھوپھو کی بات میں وزن تھا سو میرب اور شاہ تاج دونوں قائل ہوگئیں۔

پھوپھو نے شاہ تاج کو بھی ساتھ لگالیا، ایک دو اناڑی ٹانکوں کے بعد اسے بھی اس کام میں مزا آنے لگا۔ دوپٹے سے فارغ ہوکر وہ یوں ہی ٹیرس پر آکر کھڑی ہوگئی۔ دوپہر کا وقت تھا مگر دھوپ نہ ہونے کے سبب صحیح وقت کا اندازہ کرنا ناممکن ہورہا تھا۔ سامنے پارک میں قناتیں لگ چکی تھیں، اب شاید اندر کام ہورہا تھا، وہ بھی ایسے ہی تیاریاں دیکھنے وہاں چلی آئی۔ مزدوروں کے ساتھ شاہ زین لگا ہوا تھا، اسے دیکھا تو بھرپور انداز میں مسکرایا۔ اس رات کے بعد دونوں ہی دانستہ ایک دوسرے کو نظر انداز کررہے تھے مگر آج پھر وہ آمنے سامنے تھے اور شاہ زین کی مسکراہٹ نے جیسے وہ بے وجہ اُمڈ آنے والی جھجک کو ختم کردیا تھا۔ وہ اسے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی، کچھ لمحوں بعد وہ بھی اس کے ہم قدم تھا۔

”تم کیا یہاں مزدوروں پر نظر رکھنے آئی ہو۔“ اس کے لہجے میں کچھ تو تھا جو شاہ تاج کو محسوس ہوا۔

”نہیں میں تو بس یوں ہی......“ وہ نظریں چرانے لگی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے قناتوں کی پچھلی طرف نکل آئے۔ یہ پارک کی فٹ پاتھ تھی جس کے کناروں تک میخیں گڑی ہوئی تھیں۔

”پھوپھو کو پسند آگیا آپ کی برائیڈ کا سوٹ؟“ اس نے یوں ہی شاہ زین سے پوچھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ کنارے پر چل رہے تھے۔

”پھوپھو کو تو برائیڈ بھی پسند آگئی۔“ وہ پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

”کیا؟“ شاہ تاج کی بیس فیصد سمجھ میں آگیا تھا۔

”کچھ نہیں، میں کہہ رہا تھا کہ تمہیں بارش پسند ہے؟“ اس نے فوراً بات بدلی۔ موسم بھی تو کس غضب کا ہورہا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے منہ بنا کر یک لفظی جواب دیا۔

”کیوں؟“ شاہ زین کو حیرت ہوئی۔

”بھگو دیتی ہے، مجھے بھیگنا پسند نہیں۔“ اس کے جواب پر وہ پھر ہنسا تھا۔ جیسے کسی بچے کی باتوں پر ہنسا جاتا ہے۔

”یہ کیوں نہیں کہتی ہو کہ ہار ماننے سے ڈرتی ہو، ہار جانے سے ڈرتی ہو۔“ وہ اس کی طرف رخ موڑے الٹا چلنے لگا۔ شاہ تاج نے اس روشن چہرے کو حیرت سے دیکھا۔

”ہارنا کیسا؟“

”بارش ہرا دیتی ہے، ضدی ہے، من مانی کرتی ہے، وہ سب کو بھگو دیتی ہے۔ مرضی نہیں پوچھتی کسی کی۔“ اس کے عجیب سے فلسفے پر شاہ تاج اسے دیکھتی رہ گئی اور بس وہی ایک لمحہ تھا۔ سرمئی بادلوں کا ملاپ ہوا تھا اور ابر باراں ٹوٹ کے برسا تھا۔ شاہ تاج لمحے میں قنات کے اندر جا چھپی تھی اور وہ دونوں ہاتھ کھولے خود کو بارش کے سپرد کیے بھیگ رہا تھا۔ اس کی سفید براق شرٹ بالکل بھیگ گئی تھی، نیلی جینز کے پائنچے چڑھاتے ہوئے اس نے شاہ تاج کو ڈھونڈا تھا جو سامنے قنات کے سائے میں کھڑی چہرے سے شدید پریشان لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ وہ فوراً اس کے پاس آیا تھا۔

”میں بھیگنا نہیں چاہتی۔“ وہ اس لڑکی کے پاگل پن پر سر ہلا کر رہ گیا۔

”آؤ تمہیں، اندر چھوڑ آؤں۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

”نہیں، میں بھیگ جاؤں گی۔“ وہ متذبذب تھی۔

”نہیں بھیگنے دوں گا، وعدہ۔“ اس نے کچھ اس یقین سے کہا کہ شاہ تاج نے خود بخود ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیے۔ وہ اسے فٹ پاتھ کے کنارے قناتوں کے سائے تلے بے بی اسٹیپس میں چلانے لگا، اس کے دونوں ہاتھ شاہ زین کے ہاتھوں میں دبے تھے اور وہ خود اس کے سامنے اس کی طرف رخ کیے بھیگتا چلا جارہا تھا۔ شاہ تاج یک ٹک اس کے روشن خوب صورت چہرے کو دیکھتی رہی۔ وہ پوری طرح بھیگ چکا تھا، اس کے گہرے براؤن بال روشنی میں سنہری جھلک دکھلاتے تھے، اس کی ناک بڑی مغرور سی تھی اور اس کی آنکھیں...... شاہ زین نے جیسے اس کی محویت محسوس کرکے براہ راست اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرمئی تھیں، شاہ تاج پر ایک انکشاف ہوا تھا۔

وہ گہری سرمئی آنکھوں کا مالک تھا، گھر میں بابا اور تایا ابا دونوں کی آنکھیں سرمئی تھیں، ان کے بعد صرف شاہ تاج کے حصے میں یہ وراثت آئی تھی اور یہ تو اسے آج ہی پتا چلا تھا کہ وہ اکیلی اس کی حق دار نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں نجانے کیا تھا کہ شاہ زین سے پھر نگاہ پھیری نہ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے۔ وہ اس کے مکمل سہارے پر بھی شاہ تاج کا دل پھسل رہا تھا، کھنچ رہا تھا اور اسے اختیار نہیں تھا۔ وہ کب کس طرح اسے قناتوں سے درختوں کے سائے میں لیے گھر کی چھت تلے لے آیا تھا، اسے خبر نہیں ہوسکی تھی۔ خبر تھی تو بس یہ کہ اس نے اسے بھیگنے نہیں دیا تھا۔

”کہا تھا نا، بھیگنے نہیں دوں گا۔“ اس کے ہاتھوں کو اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔ وہ سوکھا تن اور بھیگا من لیے اپنے ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح داخل ہوگئی تھی۔

محبت میں پھسلنے کی نہیں ہے
سمجھ لو دھوپ ڈھلنے کی نہیں ہے
محبت کرچکی ہے کام اپنا
طبیعت اب بہلنے کی نہیں ہے

محبت کی آؤ بساط بچھاؤ
کہ دیکھو ہاتھ ملنے کی نہیں ہے
محبت کھیل ہے تو آؤ کھیلیں
مگر ساتھی بدلنے کی نہیں ہے

بارش ایک گھنٹے میں رک گئی تھی۔ تیز ہوا کے باعث قناتیں بھی سوکھ گئی تھیں۔ پنڈال سج گیا تھا، مہمان آنا شروع ہوگئے تھے۔ تقریب کی گہما گہمی عروج پر تھی، موسم نے سب کا موڈ خوش گوار کردیا تھا۔ میرب بہت خوش تھی، شاہ زین کی گنگناہٹوں سے سب محظوظ ہورہے تھے۔

”لگتا ہے چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں بارش میں۔“ احمر اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ کیا کہتا کہ کسی کی نظروں نے اس کے دل کو پر لگادیے ہیں، ہاں وہ اڑ رہا تھا ہواؤں میں۔ وہ خوش تھا اور اپنی خوشی اسے ہمیشہ سے شیئر کرنے کی عادت تھی اور ایک وہ تھی جس کا بس نہ چلتا تھا کہ خود کو سب سے چھپالیتی۔ وہ بالکل بھی اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی جو اسے کمزور کررہا تھا، وہ سچ کہتا تھا کہ وہ ہار ماننے سے ڈرتی تھی۔ جس بات پر اسے خوش ہونا چاہیے تھا اس بات سے وہ خوف زدہ تھی۔ پھوپھو اسے بلانے آئی تھیں اور وہ تیار نہیں تھی، بس کپڑے بدل لیے تھے۔

”کیا بات ہے بیٹا! تیار کیوں نہیں ہوئیں؟“ پھوپھو اسے دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔

”بس پھوپھو! طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”مگر تم تو بالکل بھی نہیں بھیگی تھیں بارش میں۔“ پھوپھو حیران ہوئیں، ساتھ اس کا ماتھا چھوا۔ وہ بالکل نارمل تھی، بس انداز میں بہت سستی تھی۔

”چلو اٹھو شاباش! گھر کی شادی ہے سب پوچھ رہے ہیں تمہارا۔“ انہوں نے خود ہی اٹھ کر اسے تیار کرنا شروع کردیا پھر اسے ساتھ لے کر ہی باہر آئیں۔ پیاری تو وہ یوں بھی بہت تھی اور آج تو زرد رنگ میں گلابی اداس چہرہ الگ ہی چھب دکھا رہا تھا۔

”دیکھ تیرا کیا رنگ کردیا ہے، خوشبو کا جھونکا تیرے سنگ کردیا ہے۔“ پنڈال میں فل آواز میں یہ

گانا بج رہا تھا اور وہ پردیسی شہزادہ مست ہو کر ناچ رہا تھا۔ وہ پھوپھو کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی جہاں اسٹیج کے آگے شاہ زین احمر کے ننھیالی کزنز کے ساتھ مست تھا۔ اس پر نظر پڑی تو قدم ست ہوئے مگر چہرے کی رونق دگنی ہو گئی۔ وہ دانستہ نظریں چرا گئی' وہ کیسے ان آنکھوں کا سامنا کر سکتی تھی جن میں اس کا اپنا عکس بہت روشن تھا، کس غرور سے اس نے کہا تھا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔ امی سے وعدہ کیا تھا اس نے کہ وہ بابا اور پہلاج کا ہمیشہ خیال رکھے گی۔ وہ اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی، وہ جان بوجھ کر وہاں سے ہٹ گئی تاکہ شاہ زین کو نظر انداز کر سکے مگر جب رسم کے بعد وہ میرب کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر واپس آ رہی تھی تو وہ اسے سیڑھیوں پر ہی مل گیا۔

''تم مجھ سے بھاگ رہی ہو شاہ؟'' وہ اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔ سفید کرتا پاجامہ اور شفاف پیروں میں کولہاپوری چپل پہنے وہ بالکل دیسی مرد لگ رہا تھا۔

''میرا نام شاہ تاج ہے۔'' اس نے دانستہ نظریں نیچی رکھیں۔

''ہوا کرے، میں تو شاہ ہی کہوں گا۔ میری بات کا جواب دو۔'' وہ بھی — ڈھیٹ تھا۔

''میں آپ کو جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔ آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ مجھ سے سوال جواب کرے۔'' وہ جان بوجھ کر سخت انداز اپنا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، نہیں کرتا سوال جواب۔ بس ایک بار مجھ سے نظر ملا کر بات کرو جیسے ہمیشہ کرتی ہو۔'' وہ اتنی جلدی ہار ماننے والا نہ تھا۔

''اب ٹھیک ہے؟'' بس ایک لمحے کے لیے اس نے سرخ ڈوروں والی ہلکی سرمئی آنکھیں اوپر اٹھائی تھیں اور شاہ زین فخر پر اپنا ہر بھید عیاں کر گئی تھیں۔ وہ جا چکی تھی اور وہ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

میرب کی رخصتی والی رات پھر بادل چھائے تھے اور وہ اور احمر رات گئے چھت پر اپنا شغل پورا کر رہے تھے۔

''پاگل ہے وہ، سمجھتی ہے وہ کہے گی اور میں مان لوں گا۔ میں جانتا ہوں وہ جھوٹ بول رہی ہے، جان بوجھ کر مجھے اگنور کر رہی ہے۔'' شاہ زین ڈپریس تھا۔

''تم سیدھے پھوپھو سے بات کرو نا۔'' احمر نے مشورہ دیا تھا۔

''کر چکا ہوں، وہ تو خود یہی ارادہ کیے بیٹھی ہیں مگر میں چاہتا ہوں شاہ تاج مجھے دل سے قبول کرے۔'' اس کی آنکھوں میں آج پہلے والی چمک نہیں تھی۔

''میرے کام کا کیا ہوا۔'' اس نے احمر سے پوچھا۔

''سب اوکے ہے۔ میں نے چاچو سے بات کر لی ہے، وہ تو بے چارے خود گھر میں رہ رہ کر تھک گئے ہیں، فوراً راضی ہو گئے۔''

''بس ٹھیک ہے پھر کل میں خود انہیں جگہ دکھانے لے جاؤں گا۔ خرید تو پہلے ہی لی تھی شاہ ویز بھائی کے سالے نے، بس اس کی رینوویشن ہو رہی تھی۔ اب شکر ہے کہ وہ بھی ہو گئی ہے، بس بہروز ماموں جا کر اکاؤنٹس سنبھال لیں تو ہماری فکر ختم۔'' شاہ زین نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔

''ہاں یار! تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے اتنا سوچا ان کے لیے ورنہ شاہ تاج نے تو انہیں بالکل ہی لاچار بنا رکھا تھا۔ اب گھر سے نکلیں گے تو مصروف بھی رہیں گے اور ان کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔'' احمر بہت مشکور تھا۔

''نہیں یار! شکریہ کیسا، شاہ ویز بھائی کو یہاں ایک برانچ کھولنی تھی اپنے اسٹور کی اور اس کے لیے ایک قابل بھروسا شخص درکار تھا — جب میں نے بہروز ماموں کا ذکر کیا تو وہ فوراً راضی ہو گئے۔ ان کا بھی کام ہو گیا اور میرا بھی۔'' آخری بات پر اس نے احمر کو آنکھ ماری۔

''خبیث...... اور وہ تمہاری ''چھری'' اس کو کون سمجھائے گا۔ اس کی انا پر تو تازیانہ پڑ جائے گا یہ بات سن کر۔'' احمر کو اچھی طرح شاہ تاج کے ری ایکشن کا علم تھا۔

''فیصلہ اس بار بھی وہی کرے گی احمر! میں نے اپنے طور پر اس کی راہ میں حائل ہر اس مشکل کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے نیچے وہ اپنی خوشیاں دفن کرنے کا ارادہ کیے بیٹھی ہے۔ میرے جانے میں بہت کم دن رہ گئے ہیں، اچھا ہے مجھے بھی پتا چل جائے گا کہ اس کے دل میں اور زندگی میں شاہ زین فخر اور شیراز مصطفیٰ کے مقام میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔'' شاہ زین جیسے ہر بات کے لیے تیار تھا۔ احمر کو پہلی بار محسوس ہوا کہ بات اب مذاق سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ وہ تاج کے لیے ازحد سنجیدہ تھا، اس نے شاہ زین کے کندھے پر اپنا ہاتھ کا دباؤ ڈال کر جیسے اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا۔

☆☆☆

''تم اس کے باپ ہو بہروز! فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ وہ بچی ہے، اسے کیا پتا اپنے بھلے برے کا۔ اس نے اپنی عقل اور جذبات کے لحاظ سے جو صحیح سمجھا وہ کیا اور اسے ہمت تمہاری کمزوری نے دی۔'' پھوپھو اور تایا ابا بابا کو قائل کر رہے تھے۔ پھوپھو نے بابا کو شاہ زین کا پرپوزل دیا تھا شاہ تاج کے لیے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا! میں کم پڑھا لکھا آدمی تھا۔ پڑھی لکھی اولاد کے رعب میں آ گیا پھر میری معذوری کے بعد اس نے جس طرح گھر کو سنبھالا، میں اس پر انحصار کرنے لگا تھا۔ آپ صحیح کہتی ہیں، لڑکی ذات کو ساری عمر تو نہیں بٹھا سکتا اور پھر جہاں اللہ نے اتنا کرم کیا ہے آگے بھی کرے گا۔'' وہ جیسے تھک گئے تھے، بہن بھائی کے آگے دل کا بوجھ ہلکا کر کے وہ خود کو بہت مضبوط محسوس کرنے لگے تھے۔

''کرنے کو تو لوگ بیٹیوں پر زور زبردستی بھی کرتے ہیں مگر اتنا پڑھا لکھا کر ہم بیٹی سے جاہلوں جیسا سلوک کر کے اسے بدگمان نہیں کرنا چاہتے لیکن اس کا بھلا برا سوچنا بھی تو ہمارا ہی فرض ہے نا۔'' تایا ابا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''میرا یقین کرو بہروز! میں اسے بیٹی بنا کر رکھوں گی، شاہ زین کے ساتھ وہ بہت خوش رہے گی بس اب اسے قائل کرنا تمہارا کام ہے۔'' پھوپھو نے بابا کے ہاتھ پر حوصلہ افزا انداز میں دباؤ ڈالا تو بابا بھی سوچ میں پڑ گئے۔

☆☆☆

وہ تنہا چھت پر کھڑی تھی، شام ڈھل رہی تھی۔ ڈھلتے سورج کے نارنجی سائے اس کے وجود پر اپنی چھاپ چھوڑ گئے تھے۔ آج پہلاج کا اکیڈمی میں ایڈمیشن ہو گیا تھا اور وہ بے حد خوش تھا۔ بابا نے اسے اپنی نئی نوکری کے بارے میں بتایا تھا، وہ بہت خوش تھے، انہوں نے اسے پھوپھو کے پرپوزل کے بارے میں بھی بتایا تھا۔

''شیراز کے معاملے میں، میں نے تم پر کوئی زبردستی نہیں کی تھی کیونکہ مجھے اس کی ماں کا رویہ پہلے ہی کھٹک گیا تھا لیکن شاہ زین کے معاملے میں میرا دل پر سکون ہے۔ میں تم سے کوئی زبردستی اب بھی نہیں کروں گا تاج! بس اتنا یاد رکھنا، خوش بختی اور محبت بار بار دستک نہیں دیتی۔ دروازے بند ملیں تو لوٹ بھی جایا کرتی ہے۔'' اس نے زور سے آنکھیں میچیں، وہ خوش ہونا چاہتی تھی مگر وہ خوش نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی اس کا دل اس شخص کی طرف پلٹ چکا ہے جو اس کا ہر مسئلہ اس کے کہے بغیر، اس سے زیادہ بہتر طریقے سے حل کر چکا تھا، جو اس کے اور اپنے درمیان حائل ہر عذر کو ختم کر چکا تھا۔ جو اسے صاف صاف چیلنج دے چکا تھا کہ وہ اب اس کی محبت سے نظریں پھیر کر دکھائے۔ مگر وہ اس کی محبت کو احسان ہی سمجھ رہی تھی۔ اسے ایک ترس کھائی ہوئی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''ارے ابھی سے رو رہی ہو، ابھی تو رخصتی نہیں ہو رہی تمہاری۔ ابھی تو بس یہ......'' اس کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی، وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر وہی برائیڈل ڈریس اٹھائے کھڑا تھا۔

باریک چیک کی شرٹ پر جینز پہنے وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ شاہ تاج نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں موجود جوڑے کو دیکھا پھر اس کی مسکراہٹ کو اور اگلے پل رخ موڑ کر آنسو صاف کرنے لگی۔

''سنو شاہ......!'' وہی دل کھینچتا لہجہ......

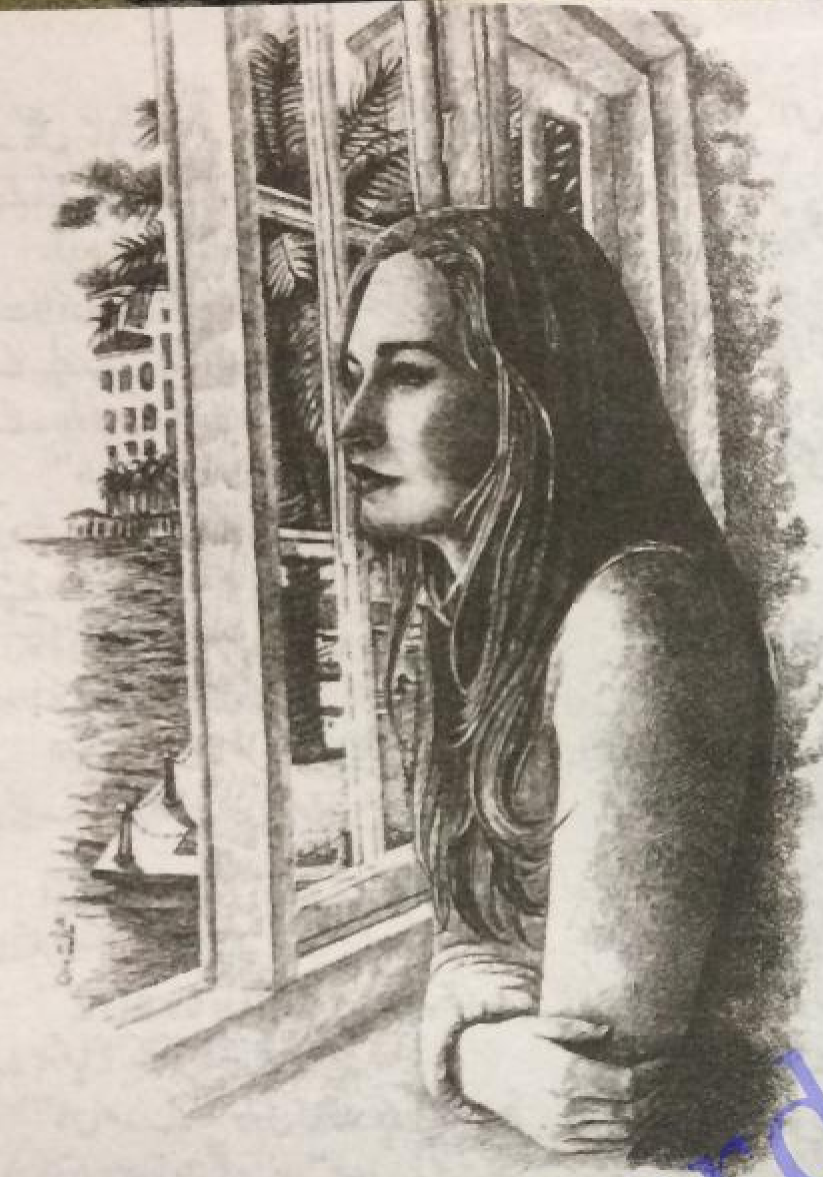
''کیوں کر رہے ہیں یہ سب آپ؟ مجھے اور میرے خاندان کو اپنے احسانوں تلے دبا کر کیا خوشی حاصل ہوگی آپ کو؟'' جو اتنی دیر سے ذہن میں پک رہا تھا ایک دم ہی زبان پر آ گیا۔ شاہ زین چہرے پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ وہ اب بھی وہیں کھڑی تھی جہاں سے چلی تھی۔ اس نے جوڑا ایک طرف رکھا اور بالکل اس کے روبرو آ گیا۔

''اپنوں پر احسان نہیں کیا جاتا شاہ! ان کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ میں نے بھی بس وہ ہی کیا ہے، ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ اگر احمر اور بڑے ماموں تمہارے معاملات میں بولتے ہیں تو یہ ان کی محبت اور فکر ہے، دخل اندازی نہیں۔ اگر ممانی تمہارے لیے کھانا بھیجتی ہیں تو یہ ان کی محبت ہے، احسان نہیں۔ اگر میرب اور احمر تمہاری بری بھلی سن کر بھی تمہارا خیال رکھتے ہیں تو یہ ان کی محبت ہے کوئی غرض نہیں اور یہ......'' اس نے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میری محبت تھی لیکن لگتا ہے محبت کرنے سے پہلے تمہیں رشتوں کی قدر کرنا سکھانا چاہیے تھا۔'' شاہ تاج خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی، اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ سچ کہہ رہا تھا۔

''میں جا رہا ہوں، دو دن بعد میری فلائٹ ہے۔ اسے جلا دینا یا پھینک دینا۔ یہ تمہارا تھا اور تمہارے لیے ہی تھا۔ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا کیونکہ میں تمہاری طرح منافق نہیں ہوں کہ اپنے احساسات پر مصلحتوں کے خول چڑھا کے زندگی کے نفع و نقصان میں الجھا رہوں۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور میں یہ اعتراف تمہاری جھولی میں ڈال کر جا رہا ہوں۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ شاہ تاج کی نظروں میں زمین و آسمان گھوم گئے تھے۔ اسے لگا کسی نے اس کا دل نوچ کر پھینک دیا ہو، تکلیف اتنی تھی کہ اس کے لبوں سے آہ بھی نہ نکل سکی۔ وہ جا رہا تھا اور اس کا ہر اٹھتا قدم اسے خاک کر رہا تھا، وہ ایک آئینہ اس کے روبرو رکھ گیا تھا۔ وہ اسے اس قدر گہرائی تک جان چکا تھا کہ اس کی ہر سوچ، اس کا ہر خوف بمعہ اپنے اعتراف محبت کے، اس کے منہ پر مار گیا تھا۔

مردوں کو اتنا سہل بیاں بھی نہیں ہونا چاہیے، وہ سب کہہ کر اسے خالی کر گیا۔ ایک بے چینی تھی جو اس کے وجود میں چکرا رہی تھی۔ وہ چلا گیا تو وہ کیا کرے گی؟ وہ دھول بن جائے گی جو آوارہ ہواؤں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، جہاں چاہے اڑا لے جائے۔ ادراک کا ایک لمحہ تھا جو شاہ تاج بہروز کے قلب پر اتر گیا تھا۔ اگلے لمحے وہ جوڑا اٹھائے سرپٹ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ دیوانوں کی طرح اسے ہر کمرے میں تلاش کرتی ہوئی، بال بکھر گئے تھے، آنکھوں لہو ہو رہی تھیں۔ دوپٹہ گلے میں جھول گیا تھا اور پھر وہ اسے ایک کمرے میں تنہا نظر آ گیا، اس کی طرف پشت کیے وہ اپنے سوٹ کیس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی تلاش جیسے ختم ہوگئی۔ کمرے کا دروازہ اپنی پشت پر بند کر کے وہ اس کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس نے پلٹ کر نہ دیکھا تھا۔ شاہ تاج نے روتی آنکھوں سے اس کے دراز قد کو ٹٹولا تھا اور تھک کر اس کی پشت سے سر ٹکا دیا تھا۔ اس کا یوں ٹوٹ کر رونا شاہ زین سے برداشت نہیں ہوا تو نرمی سے اسے خود میں سمیٹ کر اس نے اس انا پرست لڑکی کو ''اعتراف'' کی ہر دقت سے بچا لیا تھا۔



اے دل دار

انشین نعیم

''عادل! اوئے اٹھ جا یار! یہ لے تھوڑی سی یخنی پی لے۔'' احسن نے یخنی کا پیالہ سائیڈ پر رکھ کر عادل کا چہرہ تھپتھپایا۔

پچھلے دو دن سے عادل کو بخار تھا۔

آج بخار تو نہیں تھا پر نقاہت بہت زیادہ تھی۔

سر ایک طرف ڈالے نیم جان سا پڑا تھا۔

احسن آفس سے واپسی پر، اس کے لیے یخنی لیتا ہوا آیا تھا۔

عادل نے بامشکل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ سر نفی میں ہلایا۔ ''دل نہیں کر رہا۔''

''تیرے دل کی ایسی کی تیسی، پورے سو روپے کا یہ ایک پیالہ آیا ہے یخنی کا۔ جلدی منہ کھول ورنہ سر پر انڈیل دوں گا پورا پیالہ۔'' احسن نے پیالے سے چمچ بھر کر اس کے منہ کے قریب کیا۔ عادل نے بادل نخواستہ منہ کھولا۔

ایک چمچ پینے کے بعد ہاتھ سے ''اور نہیں'' کا اشارہ کیا۔ بولنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''دیکھ...... میں تیری بیوی ہوں نہ محبوبہ۔ جو یہاں بیٹھ کر تیرے نخرے اٹھاؤں۔ دو دن سے مردوں کی طرح پڑا ہے۔ کچھ کھائے پیے گا تو اٹھے گا

نا۔ چل شاباش، اٹھ، یہ تھوڑی سی یخنی اور پی لے۔" اسے زبردستی تھوڑی سی یخنی اور پلائی۔

آدھ پونے گھنٹے میں محب اللہ آگیا۔ وہ آفس سے واپسی میں ڈبل روٹی اور دودھ لیتا آیا تھا عادل کے لیے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد حیدر اور انس آگئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پھلوں کے شاپر تھے۔

"واہ بھئی واہ، آج تو ہم رات کے کھانے میں فروٹ پارٹی کریں گے۔" احسن نے پھل کے شاپر اچکتے ہوئے کہا۔

"خبردار! یہ صرف مریض کے لیے ہے۔" حیدر نے جھٹ شاپر واپس جھپٹے۔

اور وہ، جس کی خاطر یہ سب اہتمام ہو رہا تھا، وہ ہر چیز سے بے زار نڈھال پڑا تھا۔

ایک نظر تمام چیزوں پر ڈالی، ہمت کر کے تھوڑا اٹھا۔ کمر تختہ ہو رہی تھی۔

"کیوں لائے ہو اتنی چیزیں؟ خواہ مخواہ اتنا پیسہ برباد کیا۔" بمشکل آواز نکلی۔

"ماں صدقے! مولوی! ذرا بچے کی نظر اتار دے۔ دو دن بعد آواز نکلی ہے۔" حیدر نے محب اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"عادل بھائی! ہمیں راستے میں باؤلے کتے نے کاٹ لیا تھا۔ تب ہی اتنی چیزیں لیتے آئے۔" انس نے ترنت جواب دیا۔

"ویسے کہتا تو ٹھیک ہے اپنا یار۔ اتنا پیسہ ہی برباد کیا۔ ایک موٹر سائیکل تو آ ہی سکتا تھا، ان پیسوں میں۔" حیدر نے جملہ مکمل کر کے انس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"بالکل ٹھیک......!" احسن نے حصہ ڈالا۔ "یہ جو میں یخنی کا پیالہ لایا ہوں نا، اتنے میں تو پورے مہینے کا راشن آجانا تھا۔" بات ختم کر کے خود ہی ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جو محب اللہ بھائی سامان لائے ہیں۔" ہاتھ سے ڈبل روٹی اور دودھ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں چھوٹا موٹا ایک مکان تو ہم خرید ہی سکتے تھے۔"

انس نے کہہ کر فخریہ انداز میں حاضرینِ محفل کو دیکھا۔

"اوئے بچے کو بھی بولنا آگیا ہے۔" حیدر نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے احسن کو دیکھا۔ (انداز ایسا تھا گویا "بی مینڈکی کو بھی زکام ہوا" دیکھو)

"شکریہ، شکریہ۔" انس نے آداب بجالانے والے انداز میں کہا۔

"بس یار! ہماری صحبت کا اثر ہے ورنہ۔"

"اچھا خاصا معقول انسان تھا جب آیا تھا۔" احسن کا نامکمل جملہ محب اللہ نے مکمل کیا۔

احسن، بس اسے گھور کر رہ گیا۔

محب اللہ عصر کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ واپس آیا تو عادل کے سرہانے بیٹھ کر آیات کی تلاوت کر کے اس پر دم کرنے لگا۔ "خیال سے مولوی۔ کہیں مکھی بنا کر دیوار سے نہ چپکا دینا بچے کو۔" احسن نے محب اللہ کو پھونکیں مارتے دیکھا تو چوٹ کی۔

جواباً، حیدر نے ڈانٹ دیا۔

"اللہ کا کلام پڑھ کر پھونک رہا ہے۔ ہر وقت مسخرے پن کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

☆☆☆

اتوار کا دن تھا، آج عادل کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ ہلکا پھلکا سا ناشتہ بھی کر لیا تھا۔ چہرہ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا۔

محب اللہ اور احسن نے مل کر مشین لگائی ہوئی تھی۔ انس خط بنوانے گیا ہوا تھا۔

"کہاں کی تیاری ہے لاڈلے......؟"

حیدر کی آواز پر احسن نے اندر جھانکا تو عادل، کہیں جانے کی تیاری کرتا نظر آیا۔

"ٹیوشن پڑھانے جانا ہے، دو دن سے چھٹی ہو رہی ہے۔ پرسوں سے ان کے فون پر فون آ رہے ہیں۔

بچوں کا پیپر ہے کل۔"

احسن، کپڑے چھوڑ کر اندر آگیا۔ "کوئی قیامت نہیں آجائے گی ایک دن اور چھٹی کر لے گا تو، چہرہ دیکھو اپنا، کیسا مایوں کی دلہن جیسا پیلا پھٹک ہو رہا ہے۔ آرام سے گھر بیٹھ۔"

"نہیں یار، پیپر ہے کل بچوں کا۔" کہتے کہتے ایک دم بیٹھ گیا۔ کمر میں درد کی لہر سی اٹھی تھی ایک دم۔

محب اللہ بھی ان کا مکالمہ سن کر اندر آگیا۔

"احسن ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہاں سے عسکری چار جانا، پھر واپس آنا۔ تیری حالت نہیں ہے ایسی۔"

"تو کیا کروں......؟" بے بسی سے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ کمر میں ایک دم ہی شدید تکلیف ہوئی۔ تکیہ، دیوار کے ساتھ لگا کر کمر تکیے کے سہارے ٹکائی۔

"سب سے پہلے تو یہ عورتوں کی طرح مکر کرنا بند کر۔" حیدر کی بات پر عادل نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"اس کے بعد یہ نازنینوں کی طرح ادائیں دکھانا، مطلب مجھے نظروں کے تیروں سے گھائل کرنا چھوڑ دے۔" اس جملے کا کوئی فائدہ نہ ہو سکا کیوں کہ اب عادل کی گھوریوں میں غصہ بھی شامل ہو چکا تھا۔

"چل خیر ہے۔ گھورتا رہ، تو بیمار ہے نا، اس لیے معاف کیا۔ اب اس کے بعد کرنل کے گھر کا ایڈریس سمجھا احسن کو، تیری جگہ یہ چلا جائے گا بچے پڑھانے۔"

احسن ایک دم بدکا۔ "میں کیوں جاؤں گا......؟ میں تو کپڑے دھو رہا ہوں۔"

"کپڑے میں دھلوا دوں گا مولوی کے ساتھ۔ اصل میں نا، میں چلا جاتا، پر مجھے بچے پڑھانے سے زیادہ بچے بھگانے کا تجربہ ہے۔ میں اکثر ہی کلاس سے بھاگ جایا کرتا تھا، سو تجھے ہی جانا پڑے گا۔" حیدر نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

احسن نے مدد طلب نظروں سے محب اللہ کی طرف دیکھا۔

"چلا جا یار، بات نیکی کی ہو تو زیادہ سوچتے نہیں ہیں، بس کر گزرتے ہیں۔" محب اللہ نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اچھا......" احسن نے ہتھیار ڈالے۔ "ایڈریس سمجھا دے۔"

"آجا، سمجھاؤں، پھر ان کو فون بھی کر دیتا ہوں کہ میری جگہ کوئی اور آ رہا ہے۔" اب کے عادل بولا تو آواز کافی بہتر تھی۔

☆☆☆

کالونی کے گیٹ پر کھڑی سیکیورٹی نے احسن کا شناختی کارڈ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔

"واہ بھئی واہ۔ بڑی جگہوں کی بڑی باتیں۔"

احسن سر دھنتے آگے بڑھا۔ ڈھونڈتا، ڈھونڈتا مطلوبہ ایڈریس تک پہنچ گیا۔

گرے کلر کے بڑے سے آہنی گیٹ کے دونوں طرف اونچے، لمبے درخت تھے۔

درختوں کو دیکھتے دیکھتے احسن نے بیل بجائی۔ دروازہ کھولنے والا کوئی ملازم تھا۔

"یہ کرنل صاحب کا گھر ہے؟" احسن نے تصدیق ضروری سمجھی۔

"جی......!" ملازم نے سر ہلایا اور احسن کو لے کر اندر آگیا۔

"بیگم صاحبہ! یہ بندہ آگیا ہے۔"

ایک ادھیڑ عمر قدرے فربہی بیگم صاحبہ نے سر سے پیر تک احسن کو گھور کر دیکھا۔

(یا اللہ، یہ میرا ایکسرے کیوں کر رہی ہیں......؟)

"خاصے معقول انسان لگ رہے ہو۔" اپنے خیالات کو زبان بھی دے دی۔

(تو یہ کیا کسی نامعقول انسان کی توقع کر رہی تھیں......؟ حد ہوتی ہے بھئی۔)

"بس جی، اللہ کا کرم ہے......" اتنا ہی کہہ پایا۔

"اچھا......!" اچھا کو خاصا کھینچا۔ "تو، کیا لو گے تم......؟"

"جی......؟" احسن تھوڑا گڑبڑایا۔ فوراً ہی خود کو

سنبھالا۔
''نہیں جی، شکریہ، ناشتہ کر کے آیا ہوں۔''
''میں پیسوں کی بات کر رہی ہوں۔'' نخوت سے ناک چڑھاتے کہا۔
(ہیں......؟ عادل روز کے روز پیسے لیتا ہے؟ یا اوور ٹائم کی بات کر رہی ہیں؟)
''بس جی، جو مناسب سمجھیں، دے دیں۔''
''نہیں، تم خود بتا دو۔''
''میں خود......؟ جی، اچھا......'' (عادل لیتا ہے اٹھارہ ہزار مہینہ، مطلب ایک دن کے بنے چھ سو جلدی سے دل میں حساب کتاب جمع تفریق کی۔)
''چھ سو دے دیں۔''
''نہیں، بھئی، چھ سو زیادہ ہیں۔ تین سو بالکل مناسب ہیں۔''
(چلو، جانے آنے کا کرایہ تو نکل ہی آئے گا۔)
''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ فوراً رضا مند ہو گیا۔
وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔
''آ جاؤ۔'' اس کو اشارہ کرتی خود آگے بڑھ گئیں۔
وہ، ان کی تقلید میں چلتا، جس کمرے میں آیا وہ بیڈ روم لگ رہا تھا۔ پر وہاں کسی بچے کا نام و نشان تک نہ تھا۔
''وہ رہا باتھ روم۔'' انہوں نے ہاتھ سے کمرے کے آخری سرے پر بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''جی؟'' اس نے کچھ نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔
''وہ سامنے ہے باتھ روم۔ وہاں چلے جاؤ۔'' اب کے انہوں نے کچھ جھنجھلا کر کہا۔
''نہیں جی شکریہ۔ میں گھر سے فارغ ہو کر آیا ہوں۔''
''اف......!'' انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔
''یہ کس عجوبے کو بھیج دیا ہے مصطفیٰ نے؟''
''مصطفیٰ......؟'' احسن نے با آواز بلند یہ نام دہرایا۔ ''مصطفیٰ کون......؟''
''جس نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔''
''مجھے تو عادل نے بھیجا ہے۔''
''مصطفیٰ نام ہے اس کا۔''
''اچھا......!'' سر کھجایا (تو، اتنے عرصے سے ہمیں عادل بن کر دھوکا دے رہا ہے۔)
''اب چلے بھی جاؤ۔ بائیں ہاتھ والا نلکا لیک کر رہا ہے وہ ٹھیک کرنا ہے۔''
''نلکا ٹھیک کرنا ہے۔ (یا اللہ! عادل یہ کام بھی کرتا ہے۔)
''مگر مجھے تو نلکا ٹھیک کرنا نہیں آتا۔''
''تو پھر یہاں کرنے کیا آئے ہو......؟''
''بچے پڑھانے۔''
''کس کے بچے......؟''
''کرنل صاحب کے۔''
''اف میرے اللہ، کرنل صاحب کے بچے پڑھے لکھے ہیں اور سب باہر سیٹ ہیں۔''
''بیگم صاحبہ! باہر کوئی آدمی آیا ہے۔ کہہ رہا ہے مصطفیٰ صاحب نے بھیجا ہے۔'' ملازم نے آ کر اطلاع دی۔
''تو تمہیں کس نے بھیجا ہے؟'' احسن کی جانب گھومیں۔
''بتایا تو تھا عادل نے۔'' نظر باتھ روم کے دروازے پر جمی تھی۔
☆☆☆
''او میرے بونگے سجن! یہاں چار سو دو میں کوئی بچہ نہیں ہے ٹیوشن والا۔'' اس نے باہر آتے ہی عادل کو کال ملائی۔
''چوول آدمی، چار سو تو کہا تھا میں نے۔ دوبار فون آ چکا ہے ان کا۔''
''لگتا ہے بخار اتر گیا ہے۔ تب ہی زبان تیز

گام کی رفتار سے چل رہی ہے۔''
''ہاں اور اتر کر تیرے دماغ کو چڑھ گیا ہے۔''
''پر یار، گھر تو وہ چار سو دو بھی کسی کرنل ہی کا تھا......؟''
''ابے گھامڑ! تو کرنلوں کی کالونی میں کھڑا ہے۔ وہاں ہر دوسرا گھر کرنل کا ہے۔''
''اوہ، آئی، سی۔'' احسن کے ہونٹوں سے سیٹی سی برآمد ہوئی۔
''اب چلا جا کہ میں خود آؤں۔''
''جا رہا ہوں، جا رہا ہوں۔''
مہد، احد اور اسجد، تینوں ہی خاصے لائق بچے تھے۔ سو احسن کو انہیں پڑھانے میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔
تین، ساڑھے تین گھنٹوں کے دوران یہ کوئی تیسری ٹرے تھی جو ملازم، لے کر، ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔
سب سے پہلے اس کو سافٹ ڈرنک پیش کی گئی تھا۔
کوئی گھنٹہ، سوا گھنٹہ بعد فروٹ کا نذرانہ، سلامی کی صورت وصول کیا بلکہ قبول کیا۔
بظاہر مہد کی کاپی پر جھانکتے کن اکھیوں سے ٹرے کا جائزہ لیا۔
چائے بسکٹ، کیک اور پیسٹریز۔ (ماشاء اللہ، سبحان اللہ، بمشکل رال کو ٹپکنے سے روکا۔)
بظاہر انتہائی سنجیدگی اور متانت سے بچوں کا کام ختم کروانے پر توجہ مرکوز کیے رکھی۔
بچوں کا کام ختم ہوا، ان کو چھٹی دے کر اب وہ تسلی سے چائے اور دیگر لوازمات سے انصاف کر رہا تھا۔
''یار، اتنی زیادہ ٹنکی فل ہو گئی ہے، اب تو ہلنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ بس اب کرنل صاحب ایک تکیہ بھجوا دیں، سر کے نیچے رکھ کر ادھر ہی پڑ کر سو جاؤں۔''
ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے کرنل صاحب نمودار ہوتے دکھائی دیے۔
''ارے، یہ تو شیطان سے بھی زیادہ پہنچی ہوئی شے لگ رہے ہیں، وہ تو نام لینے پر حاضر ہوتا ہے، یہ تو سوچنے پر ہی سامنے آ گئے۔''
احسن، انہیں دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔
''بیٹھیے پلیز۔'' اس کو اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئے۔
''کیا نام بتایا تھا آپ نے......؟'' انہوں نے احسن کو مخاطب کیا۔
''کوئی نام وام نہیں بتایا تھا میں نے آپ کو۔'' بمشکل کہنے سے خود کو باز رکھا۔
''جی، احسن۔''
''اچھا! تو ایسا ہے احسن صاحب کہ ڈرائیور آپ کو گھر تک ڈراپ کر دے گا۔'' کرنل صاحب نے بات شروع کی۔
خوشی کے مارے احسن کی باچھیں یہاں سے وہاں تک چر گئیں۔
''مطلب، کرایہ کی بچت، نو ویگن، رکشہ چخ چخ چخ چخ......''
''وہ، بچے عادل صاحب کی عیادت کرنا چاہ رہے تھے۔ کچھ کارڈز، پھول وغیرہ لے کر آئے تھے۔ تو اچھا ہے، آپ کے ساتھ ہی چلے جائیں گے، گھر ڈھونڈنے کی دشواری سے بچے رہیں گے۔''
احسن کی مسکراہٹ، سمٹتے سمٹتے بالکل ختم ہو گئی۔
چشم تصور میں، اس نے کرنل صاحب کے بچوں کو اپنی تنگ و تاریک سی گلی میں گھستے اور نالی کم نالہ چھلانگ لگا کر پار کرتے دیکھا۔
اس کے بعد، گھر میں داخل ہوتے ہی باتھ روم کے دروازے پر جھولتا کم لٹکتا زیادہ جابجا سوراخوں والے پردے کا معائنہ کرتے پایا۔ بس، اس سے زیادہ، وہ کچھ تصور نہیں کر سکتا تھا۔
کرنل صاحب اٹھ کر جا چکے تھے۔ ان کے

جاتے ہی تینوں بچے اندر آ گئے۔

"چلیں سر......؟"

تینوں بچے ہاتھ میں کارڈز پکڑے، پھولوں کے گلدستے اٹھائے منتظر کھڑے تھے۔ یہ سب اس قدر اچانک ہوا کہ وہ ان کو روکنے کی کوئی تدبیر ہی نہ کر پایا۔

لے، جاتے ہی بنی۔

اب، راستے میں وہ میسج کر کے عادل کو مطلع کر رہا تھا کہ اس کے ہونہار شاگرد اس کی عیادت کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

حسبِ توقع، عادل بھڑک اٹھا۔ "تو اپنے ساتھ ان کو کس لیے لاد کر لا رہا ہے......؟"

"انہیں لاد کر نہیں لا رہا، ان کی گاڑی میں لد کر آ رہا ہوں۔" ساتھ ہی ایک سمائلی بھیجی۔

جس کے جواب میں عادل نے مکا بھیجا۔

"یار، ان کو کسی بھی طرح روک۔" عادل کا میسج آیا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر ہیں۔" ایک دم سے موبائل پر خاموشی چھا گئی۔

"صدمے میں چلا گیا ہے بے چارہ۔" احسن نے موبائل کی بے جان اسکرین کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

بس چند منٹ کی بات تھی، پھر وہ اپنے علاقے میں داخل ہو جاتے۔ تب ہی ایک بیپ کی آواز کے ساتھ موبائل کی سکرین روشن ہوئی۔

"یار، وہ ہماری کالونی شروع ہونے سے پہلے جو اپارٹمنٹس (appartments) ہیں وہاں پر جو نئے فلیٹس بنے ہیں۔" (اچھی طرح جگہ کی نشان دہی کر دی) "ان کے پاس گاڑی رکوا۔ میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔"

"ہم آگے آ چکے ہیں۔" فٹافٹ جوابی میسج بھیجا۔ اس بار کوئی جواب نہیں آیا۔

"مطلب، وہ گھر سے نکل رہا ہوگا، اب موبائل نہیں دیکھے گا۔"

موبائل جیب میں ڈال کر ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"سنیں، وہ آگے کام ہو رہا ہے۔ ذرا گھوم کر جانا پڑے گا۔ آپ گاڑی ریورس کر لیں۔"

ڈرائیور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی روک دی۔ دوسری نظر دور تک جاتی صاف شفاف سڑک پر ڈالی جہاں کسی کنسٹرکشن (construction) کا کام دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ احسن نے دانستہ ڈرائیور کی جانب دیکھنے سے احتراز برتا۔

"کہاں جانا ہے سر......؟" وہ گاڑی ریورس کر کے اب منتظر نظروں سے احسن کو دیکھ رہا تھا۔ احسن نے ہاتھ سے دور بنے اپارٹمنٹس کی طرف اشارہ کیا۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی روک دی جہاں اک شان سے نئے، خوب صورت فلیٹس سر اٹھائے کھڑے تھے۔

"سر، آپ کا گھر کون سا ہے......؟" احسن نے اس کا سوال دانستہ نظر انداز کیا۔

اس کا پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ دور دور تک کہیں عادل کا نام و نشان نہیں تھا۔

وہ، گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور اب چاروں طرف عادل کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا۔

اس کی تقلید میں بچے بھی نیچے اتر آئے۔

"سر، آپ کا گھر کون سا والا ہے......؟" امجد نے اپنا سوال دہرایا۔

"بیٹا! آپ کے سر، جاگنگ کے لیے گئے ہوئے ہیں، بس وہ آتے ہی ہوں گے۔ وہ آ کر آپ کو خود بتائیں گے کہ ہمارا گھر کون سا والا ہے۔"

"لیکن! سر، جاگنگ کے لیے کیوں گئے ہیں؟ وہ تو بیمار ہیں۔" اب بچوں کو نئی پریشانی نے گھیر لیا۔

احسن نے ماتھے پر چمکتے پسینے کے قطرے صاف کیے۔

"بیٹے، نئی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ بیماری میں جاگنگ انسان کی صحت کے لیے خاصی مفید ہے۔" احسن نے بچوں کی معلومات میں اضافہ کیا۔

تب ہی کافی دیر سے خاموش کھڑے مہد کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

"سر، آپ تو ہمیں کافی آگے لے کر جا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آگے کام کی وجہ سے راستہ بند ہے۔ جبکہ آپ کا گھر تو ادھر ہے۔" تینوں جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

(کدھر مر گیا ہے، اب آ بھی جا)

"بیٹا، وہ اصل میں......" ابھی وہ کوئی بات بنانے ہی لگا تھا کہ عادل آ گیا۔ سانس بری طرح پھول رہا تھا۔

پسینے پسینے ہوا وہ ان لوگوں تک پہنچا۔ (احسن کو ترس اور غصہ ایک ساتھ آیا۔) بچے، سارے سوال جواب بھول بھال اب جوش سے عادل سے مل رہے تھے۔ انہوں نے کارڈز اور بوکے اسے پیش کیے۔

"آؤ بیٹے! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" اس نے بچوں کو اشارہ کیا۔ ساتھ ہی ایک فلیٹ کی سمت قدم بڑھائے۔

احسن کو لگا، اس کا دماغ چل گیا ہے۔

"پتا نہیں کس سے مار کھانے کا ارادہ ہے اس کا......؟" عادل کو فلیٹ کی جانب بڑھتا دیکھ کر احسن نے سوچا۔

اسی وقت ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکالا۔

"صاحب کو کہیں ضروری کام سے جانا ہے، بول رہے ہیں جلدی واپس پہنچو۔ آپ لوگ بیٹھو آ کر گاڑی میں۔" وہ بچوں سے مخاطب تھا۔

"ابھی تو، ہم ٹھیک طرح سے ملے بھی نہیں ہیں۔" مہد منہ بنا کر بولا۔

"بیٹا، ملتے تو ہم بعد میں بھی رہیں گے نا۔ ابھی آپ لوگ چلے جاؤ، دیر ہو گئی تو بابا غصہ کریں گے۔" عادل نے سمجھایا۔ تینوں برے برے منہ بناتے واپس گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ان کے رخصت ہونے کے بعد احسن نے سکون کا سانس لیا۔ عادل وہیں نیچے ایک طرف گھاس پر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی احسن بھی آ کر بیٹھ گیا۔

"تو نے، کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی میری عزت دو کوڑی کی کرنے میں۔ ان کو ادھر ہی کسی طرح ٹرخا دیتا۔" عادل نے خفگی سے احسن کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں، اور جو کسر رہ گئی تھی وہ ابھی تیری وجہ سے پوری ہو جاتی۔ یہ کس کے فلیٹ میں گھس رہا تھا؟ بچوں کو لے کر......؟"

"یہ، تیرے کرنل کا فون امداد غیبی بن کر نہ آ جاتا، تو تیرے ساتھ ساتھ بچوں کی بھی دھلائی ہوتی۔" احسن نے جوابی وار کیا۔

عادل ہنسنے لگا۔ "یہ خالی فلیٹ ہے۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے چابی گم ہو جانے کا ناٹک کرنا تھا۔" اس کی بات سن کر احسن کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

"تو ٹنکی ہے تو بھی پورا۔"

"بس جی صحبت کا اثر ہے۔" عادل کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر ایک آدھ گھنٹہ سکون کا سانس لیا ہوگا کہ حیدر باہر سے گھبرایا ہوا آیا۔

"یار! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

انس اور محب اللہ تو باہر کہیں گئے ہوئے تھے۔ گھر میں بس احسن اور عادل ہی تھے۔

"کیا ہوا......؟" دونوں الرٹ ہوئے۔

"خالو، خالہ کو لے کر آ رہے ہیں، یہاں میری طرف۔"

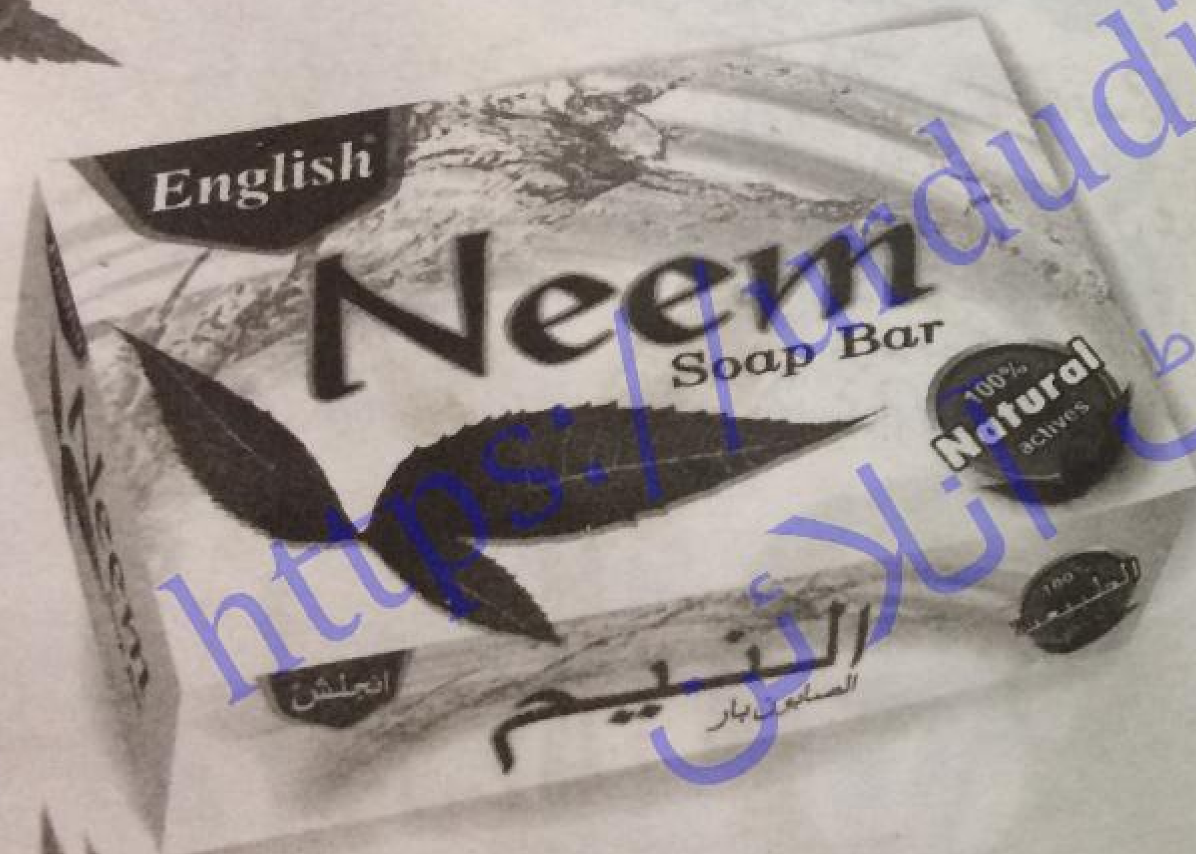
"ہیں......؟ یہاں......؟" حسن کو تو گویا بچھو نے ڈنک مارا۔ فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ عادل کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"یار، تکلیف کیا ہوئی ہے آخر تیرے خالو کم سسر کو......؟" احسن نے حیدر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

حیدر، سر دونوں ہاتھوں میں پکڑے بیٹھا تھا۔

"لگژری فلیٹ اور لاکھوں کی گاڑی دیکھنا چاہ رہے ہوں گے۔" حیدر پچھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

احسن اور عادل تو چپ کے چپ ہی رہ گئے۔ بس، ایک نظر، ایک دوسرے کو دیکھا پھر نظریں



جھکالیں۔

"یار، ہم نے تو تیرا بھلا ہی کرنے کو جھوٹ بولا تھا نا......؟" عادل نے کچھ ایسی بے چارگی سے کہا کہ حیدر کا دل پسیج گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر، اب کیا کریں......؟" حیدر کچھ نرم پڑ کر بولا۔

"تو پہلے پوری بات بتا......؟" احسن بولا۔

"پوری بات......" حیدر نے کچھ سوچا۔

"ابھی، کوئی آدھ گھنٹہ پہلے، خالو کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے حیدر بیٹا، دل بہت مچل رہا ہے تم سے ملنے کو۔ بس میں اور تمہاری خالہ آ رہے ہیں۔ سات بجے تک گھر سے نکلیں گے، تو، ساڑھے نو بجے تک ان شاء اللہ تمہارے پاس ہوں گے، رات کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔ زیادہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو دن رکیں گے، اس سے زیادہ گھر سے دور نہیں رہ سکتے۔"

حیدر نے خالو کی گفتگو، من و عن گوش گزار کر دی۔

"دو دن کیوں......؟ ان سے کہو، مہینہ، دو مہینہ تو ٹھہریں۔" احسن جل کر بولا۔

عادل کی نظر گھڑی پر تھی۔ "اس وقت پانچ بجے ہیں۔ ان کو سات بجے نکلنا ہے۔ دو گھنٹے ہیں ہمارے پاس۔" تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

ایک گھنٹہ سوچ بچار کے باوجود کوئی قابل عمل منصوبہ ذہن میں نہ آ سکا۔

"یار، بس ایک ہی ترکیب رہ گئی ہے۔" عادل جمائی لیتے ہوئے بولا۔

"مولوی سے کہتے ہیں کوئی تعویذ دے۔ جس کو پہن کر ہم دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔"

"تعویذ ہوگا یا سلیمانی ٹوپی، جس کو پہن کر ہم نے غائب ہونا ہے۔" احسن نے چوٹ کی۔

"تو نظروں سے اوجھل ہونے سے کیا ہوگا بھلا......؟" حیدر کی پریشانی چہرے پر لکھی نظر آ رہی تھی۔

"ہم غائب ہو جائیں گے۔ تو مزے سے رہنا اپنے خالہ، خالو کے ساتھ اس لگژری فلیٹ میں دو دن۔" عادل نے بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"میں مکا مار کر تیرے دانت توڑ دوں گا۔ اندر کر بتیسی۔" حیدر سچ مچ تپ گیا تھا، اس کی بکواس پر۔

عادل نے جلدی سے دانت اندر کیے۔

ساڑھے چھ ہو چکے تھے، حیدر کی شکل پر بارہ بجے ہوئے تھے۔ "میں ذرا کچھ کھانے پینے کا بندوبست دیکھتا ہوں۔" وہ کہتا ہوا باہر نکلا۔

نو بج چکے تھے۔ حیدر کو گئے کافی ٹائم ہو گیا تھا۔ واپسی کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔

محب اللہ حیرت سے ان دونوں کے اترے ہوئے چہرے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تم دونوں کو......؟" رہا نہیں گیا تو پوچھ بیٹھا۔

"کچھ نہیں، حیدر کا انتظار کر رہے ہیں، کافی دیر ہو گئی ہے واپس نہیں آیا ابھی تک۔"

"وہ نہیں آئے گا گھر چلا گیا ہے۔ فون آیا تھا میرے پاس۔ کہہ رہا تھا تم دونوں کو بتا دوں، مجھے یاد نہیں رہا۔" محب اللہ نے تفصیل سے بتایا۔

"گھر کیوں چلا گیا......؟" احسن نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کے خالو کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ تشویش ناک حالت ہے۔" محب اللہ کہتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"یاہو......شکر ہے۔" احسن نے نعرہ لگایا۔

عادل کی بھی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"شکر ہے......؟" محب اللہ نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ "نہیں، میرا مطلب تھا۔"

"شکر ہے۔ جان بچ گئی۔" جلدی سے بات بنائی۔

"ابھی تو سیریس حالت ہے دیکھو کیا بنتا ہے۔" محب اللہ بولا۔

"ہماری تو جان بچ گئی نا۔" عادل نے احسن کے کان سے منہ جوڑ کر کہا۔ محب اللہ بس حیرت سے ان کے کھلتے ہوئے چہرے دیکھ کر رہ گیا۔ ☆

مکمل ناول

نعیمہ ناز

گردش ایام

گھر آتے ہی سارا تام جھام اتار کر وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ ایک بھرپور شاور نے ساری تھکن دور کر دی تھی۔ لان کا نیا مگر آرام دہ جوڑا پہنے وہ بال خشک کر رہی تھی جب شہیر کا فون آ گیا۔

''کیسی ہو؟''

''کئی بار تم نے ہی بتایا ہے کہ بہت اچھی ہوں۔'' شبینہ مسکرائی۔

''سو تو ہے، پھر...... کیسا رہا آج کا دن؟''

''انٹرسٹنگ...... مگر تھکن سے بھرپور۔'' شبینہ نے بولتے بولتے تولیہ اسٹینڈ پہ لٹکایا۔

''شوٹ کیسا رہا؟''

''بہت اچھا، بہت مزا آیا۔''

''اگلی آفر کے لیے تیار ہو پھر۔''

''جی نہیں، اب اتنا بھی اہم نہیں ہے یہ کام، میرے لیے سب سے پہلے میرا ناول ہے، اسے مکمل کرنا ہے۔'' شبینہ آئینے کے سامنے کھڑی برش اٹھا رہی تھی۔

''اچھا چلو، یہ بتاؤ، ڈنر کا پروگرام ہے آج؟'' شہیر نے موضوع بدل دیا۔

''ہاں، ہے تو سہی، مگر اپنے گھر پر۔'' شبینہ بالوں میں برش پھیرنے لگی۔

''آنٹی آ گئیں؟''

''بتایا تو تھا تمہیں، آج صبح کی فلائیٹ تھی ممی کی۔''

''اچھا، میں بھول گیا شاید، آج کل میں بھولنے بہت لگا ہوں۔'' شہیر نے حیرت سے کہا۔

''یہ تو کوئی اچھی علامت نہیں ہے، خدا جانے آنے والے دنوں میں تم کیا کیا بھول جاؤ۔'' شبینہ



کے لبوں کو ایک ہلکی سی مسکان نے چھوا۔

"تم مت ڈرو، ایسا کچھ نہیں بھولوں گا۔ جو تمہارے لیے تکلیف دہ ہو۔" شہیر نے اسے یقین دلایا۔

"دیکھنے میں تو بڑے میچورڈ اور سنجیدہ قسم کے بندے لگتے ہو تم، باتیں بھی کبھی ایسی کرتے ہو جیسے۔"

"جیسے؟"

"جیسے رومیو اور فرہاد کے جانشین۔"

"اطلاعاً عرض ہے محترمہ، جن ہستیوں کے آپ نے نام لیے ہیں، وہ سنجیدہ لوگ ہی تھے، سنجیدہ تھے اپنے معاملات میں، تب ہی تو آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔"

"اچھا پلیز، اب تم اتنے سنجیدہ نہ بنو اور آج کا ڈنر ہمارے ساتھ کرو۔"

"ٹھیک ہے، آجائیں گے۔" شہیر مسکرایا۔

موبائل ایک طرف رکھ کر وہ اپنے بال سلجھانے لگی اور ہمیشہ کی طرح جھنجلا بھی رہی تھی سیاہ، چمک دار بال، گھنیرے بہت تھے اور اتنے ہی گھنگھریالے بھی...... انہیں سلجھاتے سلجھاتے گھنٹہ بھر تو لگ ہی جاتا، کتنی بار اس نے ارادہ کیا کہ ری بونڈنگ کروالے مگر پہلے پہل جب اس نے یوں ہی شہیر سے باتیں کرتے کرتے تذکرہ کیا تو وہ اک دم قطعیت سے بولا۔

"نہیں۔"

"کیا مطلب؟" شہیر کے یوں ردعمل پر اسے حیرت ہوئی۔

"اتنے خوب صورت بال ہیں انہیں خراب مت کرو۔"

"اتنی مشکل سے سلجھتے ہیں، تنگ آگئی ہوں اس جھاڑ جھنکار سے۔" شبینہ سچ بیزار تھی۔

"مجھے یہ جھاڑ جھنکار ہی پسند ہے، تم پلیز، انہیں ایسے ہی رہنے دو، جیسے ہیں۔" شبینہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر مسکرادی۔

"اتنی بے چاری شکل بنا کر التجا کر رہے ہو، غور تو کرنا ہی پڑے گا۔"

اس کے شرارتی انداز پہ شہیر اپنے بالوں پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا وہ شبینہ کو پسند کرتا تھا۔ یہ بات شبینہ جانتی تھی بلکہ دونوں کے گھر والے بھی جانتے تھے اور دونوں گھرانوں کو اس پر کوئی خاص اعتراض بھی نہیں تھا۔ بلکہ خاص کیا عام بھی نہیں تھا۔ اس رشتے پہ سب خوش تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے خالہ زاد تھے۔

ڈائننگ ٹیبل پر معمول سے زیادہ اہتمام تھا۔ شبینہ نے خانساماں کو ہدایت دے کر شہیر کا پسندیدہ چائنیز کھانا بنوایا تھا۔ شہیر بہت دیر میں آیا تھا، عین ڈنر ٹائم پر۔

"آئم سوری، ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا۔" آتے ہی اس نے معذرت کی۔ جدید فیشن کے قمیص شلوار میں وہ خاصا ہینڈسم اور چارمنگ لگ رہا تھا۔

"ویسے میں چائنیز کا سن کر سمجھ گئی تھی کہ تمہاری تشریف آوری ہو رہی ہے۔"

خالہ نے مسکرا کر بھانجے کو دیکھا۔ خالہ کاسنی رنگ کی شرٹ، ٹراؤزر میں ملبوس شانوں تک کے ہیئر اسٹائل اور ہلکے سے میک اپ میں خاصی فریش لگ رہی تھیں۔ ویسے بھی وہ ایک اچھی خاصی خوب صورت خاتون تھیں اور انہیں اپنی خوب صورتی کا خیال رکھنا بھی آتا تھا۔ کچھ شوق بھی تھا اور کچھ مجبوری پروفیشن ہی ایسا تھا جس میں خود کو فٹ اور شاداب رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

شبینہ ان کی طرح نہیں تھی، ایسی خوب صورت اور طرح دار۔ ہاں اس میں کچھ دلکشی و سادگی کچھ معصومیت اور کچھ حساسیت تھی، جنہوں نے مل ملا کر اس کی شخصیت کو خوب صورت بنا دیا تھا۔ ایک باصلاحیت اور کامیاب ماں کی باصلاحیت بیٹی تھی۔ مگر دونوں کی صلاحیتوں کا آسمان الگ الگ تھا۔

ماں کاغذ پہ لکھے ہوئے کرداروں کو خود پہ طاری کر کے اسکرین پہ نمودار ہوتی تو ان میں جان ڈال دیتی، وہ امر ہو جاتے اور بیٹی ہاتھ میں قلم تھام کر کرداروں کو کاغذ پر رقم کرتی۔ کچھ ماہ پہلے ہی اس کا پہلا ناول شائع ہوا تھا۔ اب وہ دوسرے ناول پہ کام کر رہی تھی۔ شہیر رغبت سے ڈنر اور باتوں میں مصروف تھا۔ شبینہ اور ممی دونوں ہی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

"ارے ہاں......" ممی کو اچانک کچھ یاد آیا اور انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ "ہاشمی کا فون آیا تھا، ڈرامہ لکھوانا چاہ رہا ہے تم سے۔"

"ڈراما؟" شبینہ ٹھہر کر سوچنے لگی پھر نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی تو میں اپنے اگلے ناول میں بزی ہوں، یہ مکمل ہو جائے پھر دیکھوں گی۔"

"ناولز کو اب کون پوچھتا ہے؟ ڈرامہ لکھو ڈائریکٹ، انکم بھی ہے اور فیم بھی۔" ممی نے کھیرے کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔

"یہ دونوں چیزیں تو آل ریڈی میرے پاس ہیں، آپ اور ڈیڈ ٹھیک ٹھاک پیسہ کما رہے ہیں اور آپ کے حوالے سے، پھر میرے ناول کے حوالے سے لوگ مجھے جانتے بھی ہیں۔" شبینہ نے بے نیازی سے بولتے ہوئے پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے۔

"دولت اور شہرت جتنی ہو، کم ہی لگتی ہے۔" ممی نے کندھے اچکائے۔

"ہاں، کہا تو یہی جاتا ہے مگر...... مجھے شاید ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" شبینہ نے بولتے بولتے شہیر کو دیکھا جو خاموشی سے دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

"بور ہو رہے ہو؟"

"نہیں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ تمہارے اور آنٹی کے خیالات اور ترجیحات میں کتنا فرق ہے، کتنا فاصلہ ہے۔"

"کیا اسے جنریشن گیپ سمجھا جائے؟" ممی نے سوالیہ انداز میں اپنے دونوں ابرو اکٹھے کیے۔

"نہیں، میرے خیال میں یہ نیچر ہے جو ہر انسان کی الگ الگ ہوتی ہے، چاہے ان میں کتنا ہی گہرا اور قریبی رشتہ کیوں نہ ہو۔"

شبینہ کے کچھ بولنے سے پہلے شہیر نے جواب دے دیا۔ شبینہ کھاتے کھاتے مسکرادی۔ وہ بھی تو کچھ اسی قسم کی بات کہنا چاہتی تھی۔

کسی سے دل مل جائے، خیال مل جائے تو اپنا آپ معتبر لگنے لگتا ہے، زندگی حسین لگنے لگتی ہے۔ شبینہ کے لیے بھی زندگی خوب صورت ہو گئی تھی، پہلے سے بھی کہیں زیادہ۔

شبینہ اپنی اسٹڈی میں بیٹھی بڑی تن دہی سے لکھنے میں مگن تھی۔ خیالات کا ایک ریلا تھا، لفظوں کا ایک ہجوم تھا جو گزر رہا تھا اور وہ تیزی سے اسے اپنی گرفت میں لے رہی تھی، ریلا گزر گیا، ہجوم چھٹ گیا۔ لکھتے لکھتے دماغ یوں خالی ہو گیا جیسے کسی نے ایک دم بٹن بند کر دیا ہو۔

قلم رکھ کر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور آنکھیں موند لیں۔ کچھ دنوں سے یہی ہو رہا تھا، لکھتے لکھتے وہ اٹک جاتی، ٹھہر جاتی، سوچنے لگتی اور پھر سوچتی ہی رہتی کہ آخر کیا رکاوٹ آجاتی ہے جو یوں خیالات کا دریا بہتے بہتے رک جاتا ہے۔

اس موضوع پہ لکھنے کے لیے اس نے اپنی دانست میں خاصا ہوم ورک کیا تھا۔ اس موضوع پر ٹھیک ٹھاک مطالعہ بھی کیا تھا۔ مگر پھر بھی لکھنے کے دوران اسے ہر بار کچھ کمی سی محسوس ہوتی اور وہ لکھتے لکھتے رک جاتی اور سوچنے لگتی۔ شاید یہ تجربے کی کمی ہے، جو کچھ میں لکھ رہی ہوں، وہ میں نے دیکھا نہیں، جھیلا نہیں، شاید یہی کمی مجھے بری طرح محسوس ہو رہی ہے۔

"مگر ہر تحریر تجربہ تو نہیں ہوتی، وہ مشاہدہ ہو

سکتی ہے۔ تاثرات ہوسکتی ہے۔ تخیل اور فکشن ہوسکتی ہے۔''

اس کے دماغ نے تاویل پیش کی، وہ بری طرح الجھ رہی تھی۔ جس موضوع پر وہ لکھ رہی تھی اس سے انصاف کرنا چاہتی تھی۔ مگر یہ انصاف کیسے ہو؟ لکھنے کی صلاحیت اپنی جگہ مگر اس صلاحیت کو نکھارنے کے لیے اس نے بڑے جتن اور بہت محنت کی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کا پہلا ناول بہت پسند کیا گیا تھا، اگرچہ اس نے ادب کی دنیا میں کوئی ایسا دھماکا تو نہیں کیا جو سب کو ہلا کر رکھ دے مگر پھر بھی ایک نئی اور توانا آواز کے طور پر اس نے اپنی پہچان کرا ہی لی تھی۔

اگلے ناول کے لیے اس نے جس موضوع کا انتخاب کیا تھا، وہ فیصلہ شعوری نہیں بلکہ غیر شعوری تھا۔ اس کے پاس جو لائبریری تھی، وہ اور کتاب سے محبت اور مطالعے کا ذوق وشوق نانا سے ورثے میں ملا تھا۔ نانا کے انتقال کے بعد ان کی وسیع وعریض لائبریری جس میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔ شبینہ کے حصے میں آگئی۔ ان کے ادبی ذوق کی وارث بھی شبینہ ہی تھی۔ وقار خلیل ملک کے ادبی حلقوں اور صحافت میں ایک بڑا نام تھے، وہ صحافی بھی تھے اور ادیب بھی۔ دونوں شعبوں میں اپنے فن اور کمال کا جھنڈا گاڑ کر ایک طویل عمر پا کر رخصت ہوئے۔

شبینہ نے جب ہوش سنبھالا تو وہ کافی ضعیف ہو چکے تھے مگر ان کا قلم اور اس قلم کی جولانیاں، تابانی اب بھی جوان اور روشن تھے۔ شبینہ کے اندر چھپے لکھاری کو انہوں نے دریافت کیا، مہمیز کیا اور تربیت کی، اس کے پہلے ناول کی اشاعت کے پندرہ دن بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ شبینہ کے لیے وہ صرف اس کے نانا ہی نہیں بلکہ استاد بھی تھے، اپنے آپ میں وہ ایک انوکھی دنیا تھے۔ ایک حیرت انگیز دنیا۔ جس میں شبینہ نے بہت سی دلچسپ باتیں دیکھیں بھی اور سیکھیں بھی۔

والدین کی شوبز کی مصروفیات اور شبینہ کے بعد دو جڑواں بیٹوں کی پیدائش، شبینہ کی ممی گھن چکر بن گئی تھیں۔ نانا نانی نے شبینہ کو اپنے پاس رکھ لیا۔ ویسے بھی بیٹے بہو کے بیرون ملک آباد ہونے سے دونوں میاں بیوی تنہائی کا شکار تھے۔ اپنی حد تک ایک دوسرے کی تنہائی اور اداسی بانٹنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ شبینہ کی صورت میں ایک جیتا جاگتا کھلونا پا کر اس کی زندگیوں میں بہار آگئی۔ آنگن اور دلوں کا سونا پن ختم ہوگیا۔

شبینہ وہیں پلی بڑھی۔ پہلے نانی اور پھر نانا کی وفات کے بعد وہ واپس ممی، ڈیڈی کے پاس آگئی تھی، دونوں بھائی اپنی تعلیم آسٹریلیا میں مکمل کر رہے تھے۔ والدین کی مصروفیات وہی پہلے والی تھیں، شبینہ کے مزاج میں نرمی اور طبیعت میں ٹھہراؤ تھا۔ کچھ شاید فطری اور کچھ نانا، نانی کی تربیت کا اثر تھا۔ والدین کے پاس آکر وہ یہاں بھی بہت جلد یوں ایڈجسٹ ہوگئی تھی جیسے شروع سے یہیں رہتی چلی آئی ہو۔

اپنے خیالات میں گم وہ کرسی سے اٹھ کر کتابوں کی الماری کے قریب آگئی اور شیلف میں رکھی کتابیں دیکھنے لگی پھر اس نے ایک کتاب نکالی

''خون کی لکیر'' از وقار خلیل۔

کتاب کے سرورق پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ واپس کرسی پر آبیٹھی۔ یہ وہ کتاب تھی، جسے پڑھنے کے دوران اس نے اپنے اگلے ناول کے موضوع کا انتخاب کیا تھا، یہ کتاب دراصل ایک سوانح تھی، وقار خلیل کی سوانح حیات، جس کا آدھا حصہ قیام پاکستان سے پہلے، قیام پاکستان کے دوران اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات و واقعات پر مشتمل تھا۔

اس کتاب کو حالانکہ وہ پہلے بھی پڑھ چکی تھی مگر کچھ عرصہ پہلے اسے دوبارہ پڑھتے ہوئے اس کے

ذہن میں ایک خیال آیا اور جم کے رہ گیا۔ پھر یہ خیال اتنا پختہ ہو گیا کہ اس نے بے اختیار قلم اٹھا لیا اور لکھنا شروع کر دیا اور اس کی ساتھ ساتھ اس نے برصغیر پاک وہند کی تقسیم کے موضوع پر بے شمار کتب، انٹرویوز، مضامین چھوٹی بڑی لا تعداد تحریروں کا مطالعہ کیا۔ اس کے دماغ میں ناول کے حوالے سے جو کہانی تھی، جو کردار تھے، بالکل واضح تھے پھر بھی کوئی الجھن تھی جو اسے الجھا رہی تھی، پریشان کر رہی تھی، کچھ تھا جو اس کی سوچ اور لکھنے کی روانی میں خلل ڈال رہا تھا اور وہ بار بار اٹک رہی تھی۔

کتاب کا سرورق وہ کتنی دیر تک دیکھتی رہی، جو زیادہ گنجلک نہیں تھا۔ آدھے صفحے کے بیچوں بیچ ایک لکیر بنی ہوئی تھی، سرخ رنگ کی۔ نیچے کا حصہ سادہ تھا اور اوپر کے حصے میں ایک لڑکی کا چہرہ تھا۔ ہرنی سی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف تھا۔ اس چہرے سے ذرا پرے ایک اوڑھنی کی تصویر تھی۔ شبینہ کو یہ سرورق کبھی پراسرار لگتا، کبھی دلچسپ، کبھی اس میں دیکھتے دیکھتے اسے کئی ان کہی کہانیوں کی بازگشت سنائی دیتی۔ ان لکھے افسانوں کے حرف گزرتے دکھائی دیتے، پھر یکدم طلسم ٹوٹ جاتا اور وہ واپس اپنی دنیا میں پہنچ جاتی۔ کتاب کے پیچھے وقار خلیل کی تصویر تھی۔ وہ پلٹ کر نانا کی تصویر دیکھنے لگی پھر اس نے کتاب کھول لی۔ وہ بالکل ابتدا سے پڑھ رہی تھی، ایک ایک لفظ، بہت غور بہت احتیاط سے۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، کتاب اپنے اختتام کی طرف گامزن تھی، اچانک ہی دماغ میں ایک شعلہ سا چمکا، ایک خیال جیسے آسمانی بجلی کی طرح چمکا تھا۔ پل بھر کے لیے سارا ماحول روشن ہو گیا۔ شبینہ نے فوراً ہی ابتدائی صفحات نکالے اور وقار خلیل کا لکھا ہوا پیش لفظ ایک بار پھر پڑھنے لگی۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا تھا۔

''یہ کتاب فقط لفظوں کا گورکھ دھندا نہیں، تخیل کی کارفرمائی اور کھوکھلے حرفوں کی شعبدہ گری نہیں بلکہ یہ ایک تجربہ ہے وہ تجربات جو زندگی کے حالات و واقعات نے اپنے دامن میں سمیٹے ہیں۔ وہ سب اس میں پیش کیے گئے ہیں۔''

''تجربہ......'' شبینہ نے اس لفظ کو بار بار دہرایا۔

''میں یہ تجربہ خود حاصل نہیں کر سکتی مگر کوئی ایسا شخص جو ہجرت کے عذاب، خواب، سراب اپنے ہمراہ یہاں لایا ہو۔ وہ اپنے تجربات، اپنی کہانی مجھ سے شیئر کر سکتا ہے اور اس کے جاننے والوں میں ایسی ایک ہی ہستی تھیں جو اس کے نانا کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آئی تھیں اور شبینہ کی خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ ابھی حیات تھیں۔

نانا کی چھوٹی بہن اختر جہاں بس مشکل صرف

اتنی تھی کہ وہ پاکستان میں نہیں بلکہ کینیڈا میں مقیم تھیں۔

☆☆☆

بلو ٹاپ اور وائٹ ٹراؤزر میں ملبوس، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، صوفے پہ براجمان وہ فیشن میگزین کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھیں۔ دوسری بہت سی جدید اور ماڈرن خواتین کی طرح بہت عرصہ ہوا دوپٹہ ان کے لباس سے بھی غائب ہو چکا تھا۔

شبینہ ان کے مقابل صوفے پہ آ کر بیٹھی تو انہوں نے نظر اس کی طرف اٹھائی۔

''ہائے۔'' وہ بیٹی کو دیکھ کر مسکرائیں۔

''ممی! مجھے کینیڈا جانا ہے۔'' شبینہ بغیر کسی تمہید کے ان سے مخاطب ہوئی۔

''کینیڈا؟ خیریت۔'' شاہ نور آصف نے اچنبھے سے بیٹی کو دیکھا اور میگزین، میز پہ رکھ دیا۔

''اپنے ناول کے لیے کچھ مواد چاہیے۔''

''گوگل پہ سرچ کرلو، ویسے اگر دل چاہ رہا ہے تو کرلو ٹریول اور جہاں تک انفارمیشن کا تعلق ہے تو ایک کلک پہ دنیا جہاں کی انفارمیشن مل جائیں گی۔'' ممی نے لگے ہاتھوں مشورہ دے ڈالا۔

''مجھے جو معلومات چاہئیں وہ مشین نہیں، ایک انسان ہی دے سکتا ہے۔''

''کسی سے ملنا ہے؟'' ممی نے اس کا سنجیدہ چہرہ غور سے دیکھا۔

''جی، اختر نانو سے۔''

''اسکائپ پہ بات کرلو۔''

''آپ نہیں چاہتیں کہ میں وہاں جاؤں؟'' شبینہ کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی۔

''شوق سے جاؤ، بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ میں بھی چلتی ہوں، روٹین لائف اور آئے دن کی شوٹنگز سے تھک گئی ہوں، چینج بھی ہو جائے گا اور پھوپھی اماں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' ممی نے تجویز پیش کی۔

''ڈیڈ سے بھی پوچھ لیں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی ہمیں جوائن کرلیں۔''

''پوچھ لیتی ہوں ان سے بھی، ویسے مشکل ہے ان کا جانا، ابھی ایک نیا کانٹریکٹ سائن کیا ہے، اس پر کام کریں گے یا چھٹیاں کر کے تفریح کریں گے۔'' شاہ نور ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ ان کے شوہر کی نئی نویلی ایڈورٹائزنگ کمپنی تھی۔ وہ اپنا سارا وقت اس کو ہی دے رہے تھے۔

***

سفید کڑھائی کی سیاہ قمیض اور سیاہ ٹراؤزر، جس کے پائنچے اور قمیض کی آستینیں اور یب تھیں، نیٹ کے دوپٹے میں اس کا متناسب سراپا اور دراز قد اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ شہیر کے ساتھ مہنگے اور مشہور شاپنگ مال میں گھوم رہی تھی۔ شاپنگ اپنے لیے بھی کرنی تھی اور جہاں جا رہی تھی، ان لوگوں کے لیے بھی تحائف خریدنے تھے۔ شہیر کو اس نے بتایا کہ وہ شاپنگ کرنے جا رہی ہے تو وہ لینے آ گیا۔ شبینہ نے ڈرائیونگ سیکھی ضرور تھی، گاڑی چلاتی بھی تھی مگر اس کی ڈرائیونگ بالکل بھی اچھی نہیں تھی، دو بار گاڑی دوسری گاڑیوں سے ٹکرا چکی تھی، شکر ہے کہ بچت ہو گئی اور اس کا یا گاڑی کا کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ ممی، ڈیڈی کی طرف سے تاکید تھی کہ جہاں بھی جائے ڈرائیور کے ہمراہ جائے، خود سے ڈرائیونگ کی زحمت نہ کرے، اکثر شہیر بھی اس کو پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ذمہ داری سنبھال لیتا تھا۔

اللہ اللہ کر کے اس کی شاپنگ مکمل ہوئی تو وہ دونوں فوڈ کورٹ میں آ بیٹھے، تھوڑی سی پیٹ پوجا کر کے پھر گھر کے لیے نکل لیے۔

ساری شاپنگ اس نے گاڑی کی پچھلی سیٹوں پہ ڈالی اور خود شہیر کے ساتھ آگے بیٹھ گئی۔

''تو تم جا رہی ہو؟'' شہیر نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی، وہ شبینہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''ہاں، مگر میں ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہی، زیادہ سے زیادہ ایک ماہ میں آ جاؤں گی۔'' شبینہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''بائی دا وے تم اتنے چپ چپ کیوں ہو؟''

''تم جو جا رہی ہو، مجھے اکیلا چھوڑ کر، کیا کروں گا میں ایک ماہ تک اکیلے؟'' شہیر نے منہ بسورا۔

''بالکل بچے لگ رہے ہو اس طرح منہ بسورتے ہوئے۔'' شبینہ بے اختیار ہنسی۔

''عادت پڑ گئی ہے تمہاری، دل نہیں لگے گا بالکل بھی۔'' شہیر اب بھی اداس بگلا بنا ہوا تھا۔

''ایسا ہے تو تم بھی ساتھ چلو...... پرانے رشتے داروں سے مل لینا، نئی جگہیں دیکھ لینا۔'' شبینہ نے پیش کش کی۔

''میں ساتھ چلوں؟'' شہیر نے بڑی بے چارگی سے اسے دیکھا۔ ''میرے ابا حضور اتوار کی چھٹی بھی پوری نہیں دیتے۔ آدھے دن کا کہہ کر بلاتے ہیں اور پورا دن نکال دیتے ہیں۔ رات دن بزنس کی پٹیاں پڑھاتے رہتے ہیں۔ بزنس کے منتھڈ گھول گھول کر پلا رہے ہیں جب تک میں ایکسپرٹ نہیں ہو جاتا، میری رہائی ناممکن ہے۔''

''اب اتنے ظالم بھی نہیں ہیں انکل، جتنا تم آنسو بہا رہے ہو، اپنے اصولوں کے معاملے میں سخت ہیں تو اچھی بات ہے، ویسے بھی ان کی سختی تمہارے بھلے کے لیے ہی ہے۔''

''مجھے پتا نہیں تھا کہ ابا جان نے تمہیں اپنا وکیل ہائر کیا ہوا ہے۔''

''اچھا، جلو مت، گاڑی تو اسٹارٹ کرو۔''

''ایک منٹ۔'' شہیر نے ڈیش بورڈ سے کچھ نکالا اور شبینہ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو۔''

''کیا ہے؟'' شبینہ نے سوال کرتے کرتے ایک نظر مخملیں کیس پہ ڈالی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے۔ شہیر نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ شبینہ نے خاموشی سے وہ مخملیں کیس کھولا۔ اس ڈبیہ کی بناوٹ جتنی خوب صورت تھی۔ اس میں رکھی ڈائمنڈ رنگ بھی اتنی ہی خوب صورت اور قیمتی تھی۔

''کیسی ہے؟''

''بہت خوب صورت ہے، مگر......''

''مگر کیا؟''

''میں واپس آ جاتی تو معاملہ سیٹل کر لیتے۔ ابھی ایسی کیا ایمرجنسی ہے؟''

شبینہ کو اعتراض کوئی نہیں تھا کہ یہ بات بن کہے بھی دونوں کے درمیان موجود تھی۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے، سمجھتے تھے، مگر شبینہ بس کچھ الجھ رہی تھی، اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ کیوں؟

''جانے سے پہلے ہی سیٹل کرنا ہے یہ معاملہ، تمہیں اس رنگ میں قید کر کے بھیجوں گا۔'' شہیر کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں۔ وہ خاصا محتاط ڈرائیور تھا۔

''کیوں؟ بھروسا نہیں ہے کیا مجھ پر؟''

''تم پر تو ہے مگر دوسروں پر نہیں ہے۔''

''دوسرے کون؟''

''کوئی بھی ایکس، وائی، زیڈ۔''

''بالکل فضول باتیں کر رہے ہو، اس وقت۔'' شبینہ نے بےزاری سے منہ بنایا۔

''رومانٹک باتیں کروں؟'' شہیر مسکرایا۔

''رہنے دو، اتنے رومینٹک طریقے سے تو رنگ دی ہے۔ رومانس کیا جھاڑو گے؟'' شبینہ نے اسے چھیڑا۔

''آدھی سے زیادہ دنیا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پرپوز کر رہی ہے، میں تمہاری خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تمہیں پرپوز کرنا چاہتا تھا۔'' شہیر سنجیدہ ہو چلا تھا۔

''تم جب سیریس ہوتے ہونا تو بڑے خوف ناک لگنے لگتے ہو۔''

''اچھا، چلو، اپنا ہاتھ اسٹیئرنگ کی طرف لاؤ اور یہ رنگ مجھے دو۔''

شبینہ نے اس کی دونوں ہدایات پہ عمل کیا، وہ مسکرا رہی تھی۔ شہیر نے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی تھی۔

''دنیا میں ایسے کتنے لوگ ہوں گے۔ جنہوں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اپنی فیانسی کو رنگ پہنائی

ہو؟'' شہیر نے سوال کیا۔
''ایک کو تو میں جانتی ہوں۔''
''کون؟'' شہیر چونکا۔
''شہیر حماد۔'' شبینہ کی ہنسی میں اس کی ہنسی بھی شامل ہوگئی۔ بنگلے کے پورچ میں گاڑی رکی تو شبینہ دروازہ کھولنے لگی۔
''ایک منٹ ٹھہرو۔'' شہیر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''اب کیا ہے؟''
''روزانہ بات کرنا مجھ سے۔'' شبینہ کی گھنگھریالی زلفوں کو اس نے چھوا۔
''کوشش کروں گی لیکن اگر کبھی کسی وجہ سے بات نہیں ہو سکے تو رونا مت۔'' شبینہ نے شرارت سے اس کے بال بکھیرے اور ہنستی ہوئی اتر گئی۔

☆☆☆

رات میں ممی کو شاپنگ دکھانے سے پہلے اس نے اپنی انگوٹھی دکھائی ''شہیر نے دی ہے۔''
''نائس چوائس۔'' انہوں نے انگوٹھی کا معائنہ کیا پھر بیٹی کی طرف دیکھا۔
''یہ لڑکا شادی بھی اکیلے ہی کرے گا یا اماں باوا کو بیچ میں ڈالے گا؟'' مصنوعی فکرمندی ان کے چہرے پر تھی۔
''ڈونٹ وری ممی! بڑوں کی مرضی اور خوشی سب شامل ہوگا، یہ تو بس یونہی ......'' شبینہ نے مسکراتے ہوئے اپنی مخروطی انگلی میں سجی انگوٹھی دیکھی۔
''ویسے میرا خیال ہے کہ تم یہ رنگ وہاں پہن کر نہیں جانا، آئی مین کینیڈا۔'' ممی نے کچھ سوچتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔
''کیوں؟'' شبینہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔
''کیونکہ اس رنگ کے بارے میں تم سے سوال ضرور ہوگا۔ جھوٹ تم بولو گی نہیں اور سچ بولنا ٹھیک نہیں، سب آپس میں رشتے دار ہیں، حماد بھائی (شہیر کے والد) کا مزاج تم جانتی ہی ہو، ان تک یہ خبر پہنچی کہ شہیر نے تمہیں رنگ، پہنائی ہے تو جانے کیسے ری ایکٹ کریں۔''
''میں نے تو کہا تھا شہیر سے کہ میرے واپس آنے کے بعد وہ گھر میں بات کرلے تو کوئی فنکشن رکھ لیں گے انگیج منٹ کا۔'' شبینہ نے صفائی پیش کی۔
''آپا سے بات ہوئی تھی میری اس ٹاپک پر۔'' ممی ایک گہری سانس لے کر اسے بتانے لگیں۔
''حماد بھائی کا کہنا ہے کہ جب تک وہ ٹھیک سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا، اس کی منگنی یا شادی کا کوئی نام نہ لے۔ انہیں ابھی تک اپنا بیٹا لاابالی اور غیر ذمے دار لگتا ہے، حالانکہ اب تو کئی ہفتوں سے وہ باقاعدگی سے آفس بھی جا رہا ہے، ویسے آپا کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنے میاں کو منالیں گی شہیر پہ بیوی کی ذمہ داری پڑے گی تو سارا لاابالی پن اور غیر ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔''
''ہوں۔'' شبینہ کچھ سوچتے ہوئے انہیں اپنی شاپنگ دکھانے لگی۔

☆☆☆

ٹورنٹو وہ پہلی بار آئی تھی۔ ایئرپورٹ پر ثمانہ آنٹی انہیں ریسیو کرنے آئی تھیں۔ وہ اختر جہاں نانی کی بہو تھیں۔ شبینہ کی ممانی...... ہنس مکھ اور خوش اخلاق، وہ معذرت کر رہی تھیں کہ جاب پہ ہونے کی وجہ سے ان کے شوہر ایئرپورٹ نہیں آسکے، شبینہ ایئرپورٹ سے ان کے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ تک پورے راستے بچوں کے سے اشتیاق سے گاڑی کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتی رہی۔ برف باری کا سیزن ختم ہو چکا تھا۔ اب ہر طرف برف ہی برف تھی۔ سفید چاندی جیسی برف نے ہر شے کو ڈھانپا ہوا تھا۔ سڑکیں البتہ صاف تھیں۔ بلند و بالا سفید درخت، شبینہ نے لینڈ اسکیپ میں ہی دیکھے تھے۔ آج پہلی بار اصل میں دیکھے تو مبہوت رہ گئی۔ ہر طرف برف کا راج ہونے کے باوجود بھی زندگی رواں دواں تھی۔ راستے سے گزرتے وہ دیکھتی رہی۔ فٹ پاتھ پہ پیدل چلتے لوگ، گاڑیوں میں سوار

لوگ، میدانوں میں باسکٹ بال کھیلتے نوجوان اور بچے، وہ اس نئی کتاب کو پڑھنے میں اتنی محو تھی کہ کار جب رہائشی عمارت کی پارکنگ میں جا رکی تو وہ چونکی۔
''پہنچ گئے؟''
''بالکل پہنچ گئے۔'' ثمانہ آنٹی مسکراتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھیں۔ اپنے ساز و سامان سمیت لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل کے اس اپارٹمنٹ میں پہنچے جہاں اختر جہاں نانی اپنے بیٹے، بہو اور پوتے کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔
اندر داخل ہوئے تو لونگ روم میں ایک شفقت بھرا مسکراتا چہرہ ان کا منتظر تھا۔ باری باری انہوں نے دونوں کو گلے لگایا۔ شاہ نور کو اور شبینہ کو، شبینہ کو ان کے چہرے کے خدوخال اور بدن کی نرمی و گرمی بہت مانوس سی محسوس ہو رہی تھی۔
''آپ کی شکل نانا سے کتنی ملتی ہے۔''
کاؤچ پہ بیٹھتے ہوئے شبینہ نے نانی کو غور سے دیکھا۔ کئی سال پہلے وہ پاکستان آئی تھیں جب شبینہ کافی کم عمر تھی۔ اسے ان کی آمد تھوڑی یاد تھی۔ پھر چند سال پہلے نانا کے انتقال پر وہ خود اپنی بیماری کی وجہ سے نہیں آسکیں۔ ڈاکٹر نے انہیں طویل سفر سے منع کیا ہوا تھا۔
''ہاں، سب دیکھنے والے یہی کہتے ہیں میری اور بھائی صاحب کی شکلوں میں بہت مشابہت ہے۔'' مسکراتے ہوئے تو وہ بالکل ہی نانا لگ رہی تھیں۔
''اور صلاحیتوں میں بھی۔'' شبینہ نے لقمہ دیا۔
''ہوں؟'' چشمے کے پیچھے ان کی آنکھیں کچھ مضطرب نظر آئیں۔
''آپ کے افسانوں کا مجموعہ پڑھا تھا میں نے، خاصا اچھا لکھتی تھیں آپ، پھر لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟'' شبینہ کے انداز اور سوالات میں بڑی بے تکلفی تھی۔
''تم نے میرے افسانے کہاں پڑھ لیے؟''
''نانا جان کی لائبریری مجھے ورثے میں ملی ہے۔'' شبینہ نے بڑے مزے سے بتایا۔
''اوہ!'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔
''بس ایک دور تھا جب لکھنے سے دلچسپی تھی، پھر شادی کے بعد گھر گرہستی میں مصروف ہوگئے، یہاں آگئے تو پرانی دلچسپیاں بالکل ہی ختم ہوگئیں، نئی مصروفیات اور ترجیحات نے دامن پکڑ لیا۔ تم سناؤ، آج کل کیا لکھ رہی ہو، تمہارا پہلا ناول میں نے پڑھا ہے۔ بھائی صاحب بہت خوش تھے۔ انہوں نے ہی فون پر مجھے بتایا تھا۔ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ کتابوں کے ساتھ ساتھ لکھنے کی صلاحیت بھی تمہیں ورثے میں ملی ہے۔''
اختر نانی نے مسکراتے ہوئے گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی۔ شبینہ نے باقی باتیں آئندہ کے لیے اٹھا رکھیں۔ بحیثیت ایک لکھاری، تجسس اس کے اندر فطری تھا۔ انسانوں اور معاملات و واقعات کی کھوج اسے یہاں تک لے آئی تھی۔
لنچ انہوں نے جہاز پر کرلیا تھا۔ ڈنر میں ابھی وقت تھا، ثمانہ بھابھی نے میز پہ لوازمات سجا دیے تھے، کباب، فروٹ کیک، ڈرائی فروٹس، سموسے۔ ہر شے گرم گرم تازہ اور خستہ تھی، بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی شبینہ ٹھیک ٹھاک کھا گئی۔ وہ خوش خوراک تھی اور خوش نصیب بھی کہ ہر طرح کی چیزیں کھانے کے باوجود بھی اس کا وزن نہیں بڑھتا تھا۔ وہ ایسی ہی سلم رہتی تھی۔ شاہ نور البتہ سخت قسم کا پرہیز کرتی تھیں۔ ہر شے سے خوب انصاف کرکے شبینہ کافی پی رہی تھی۔
''اب تم لوگ کچھ دیر آرام کرلو۔'' اختر نانی نے مشورہ دیا۔
''مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔'' شبینہ نے کہا تو وہ ہنس پڑیں۔
''میں حاضر ہوں میرے بچے! اگر آرام بھی ضروری ہے۔'' ان کے لہجے میں بہت شفقت تھی، شبینہ لاؤنج میں بڑی سی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر پردہ سرکانے لگی۔

"نیند نہیں آ رہی نانی جان نہ ہی تھکن محسوس ہو رہی ہے۔"

شبینہ باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ شیشے کی دیوار کے پار برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ درختوں کی شاخوں پہ، پھننگ پہ، جھاڑیوں پہ، زمین کے فرش اور سبزے پہ، سفید روئی کے گالوں کی طرح چمکتی برف نظر آ رہی تھی۔ اندر ہیٹر کی بدولت لونگ روم میں درجہ حرارت نارمل تھا۔ مگر باہر موسم انتہائی سرد اور ہوا انتہائی کٹیلی تھی۔ شاہ نور اندر کمرے میں نانی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد دونوں کی آواز آنا بند ہو گئی۔ شبینہ کمرے میں جانے کے بجائے کچن میں آ گئی جہاں ثمانہ ممانی رات کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

"ممانی! میں آپ کی ہیلپ کروادوں؟"

شبینہ کو شرم آ رہی تھی، وہ بے چاری شاید صبح سے ہی مہمانوں کی خاطر داریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ پھر ایک گھنٹہ ڈرائیو کر کے انہیں لینے ایئرپورٹ بھی آئیں آنے کے بعد کافی کے ساتھ اتنے سارے لوازمات سرو کیے اور اب پھر رات کے کھانے کی تیاریوں میں جت گئی تھیں۔

"آپ تھک گئی ہوں گی۔" شبینہ کی نرم اور حساس طبیعت شرم سار ہو رہی تھی۔

"عادت ہے بیٹا۔" وہ نرمی سے مسکرائیں۔

"جب تک پاکستان میں تھے تو سب کی طرح ہمارے بھی عیش تھے، اوپر کے کاموں کے لیے ماسیاں آتی تھیں، بس کوکنگ کرتی تھی میں۔ یہاں آ کر اچھے اچھے سیدھے ہو جاتے ہیں، ہم بھی ہو گئے، ہر کام خود کرنے کی پہلے مجبوری تھی۔ اب عادت پڑ گئی ہے، ویسے اب اتنا محسوس نہیں ہوتا، مشینوں کی مدد سے بہت سے کام آسان اور جلدی ہو جاتے ہیں پھر یاسر (شوہر) اور اب عباد (بیٹا) خاصی ہیلپ کروا دیتے ہیں۔"

ہلکے پھلکے لہجے میں بتاتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ مشاقی اور پھرتی سے چل رہے تھے۔

"کچھ تو کروا لیں آنٹی، اچھا نہیں لگ رہا، آپ کو اکیلے کام کرتے دیکھ کر۔" شبینہ نے اصرار کیا۔

"کیا بنا لیتی ہو؟"

"بنانا؟" شبینہ نے ایک لمحے کو سوچا۔

"سلاد ہی بنانی آتی ہے۔ دراصل کچن میں نہ خود گئی نہ کوئی لے کر گیا۔ نانا کے گھر بھی کک تھا اور اب ممی کے ہاں بھی ہے، کبھی کبھی شوق ہوتا ہے کچھ بنانے کا، سیکھنے کا مگر میرا زیادہ تر ٹائم لکھنے میں ہی گزرتا ہے۔"

شبینہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی، ثمانہ بھابھی نے اپنی مسکراہٹ ہونٹوں تلے دبائی۔

"چلو، تم سلاد بنا لینا۔"

"ٹھیک ہے۔" شمینہ ایکسائیٹڈ ہو گئی، اچانک اس کی نظر پاستا پر پڑی۔

"مجھے پاستا بنانا بھی آتا ہے بنا لوں؟"

"اگر تمہیں اتنا ہی شوق ہے تو بنا لو۔" انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

باتوں اور کام میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا، وہ چونکی تب جب ایک زوردار "السلام علیکم" اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ بھاری مردانہ آواز اور شائستہ لہجہ۔

"عباد آ گیا۔" ثمانہ کچن سے باہر آئیں، ان کے پیچھے پیچھے شبینہ بھی، عباد کمرے میں شاہ نور سے مل رہا تھا۔ لونگ روم میں آ کر اس نے شبینہ کو ویلکم کیا۔

"کیسی ہو شبینہ؟"

"میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟"

شبینہ نے اس لمبے سے قد کے لڑکے کو سر اٹھا کر دیکھا جو اپنی داڑھی مونچھوں کے ساتھ ذرا بڑا بڑا اور بردبار لگ رہا تھا۔ وگرنہ وہ شبینہ سے تین سال ہی بڑا تھا، شہیر کی طرح۔

شبینہ سے حال چال اور سفر کا احوال پوچھ کر وہ فریش ہونے چلا گیا، اس کے بعد یاسر انکل بھی آ گئے۔ تھکے ہوئے لگ رہے تھے مگر بذلہ سنجی اپنے عروج پر تھی۔

"ارے لڑکی! تم تو اتنی چھوٹی سی لگ رہی ہو۔ اتنی ننھی منی سی عمر میں اتنا بھاری بھرکم ناول کیسے لکھ ڈالا؟"

"اتنی چھوٹی بھی نہیں ہوں، چوبیس سال ہو گئے ہیں دنیا میں آئے ہوئے۔" شبینہ نے جتایا تو وہ کھنکھار کر رہ گئے۔

"یہ عمر تو ہماری بیگم کی بھی ہے پچھلے بیس سال سے۔" ثمانہ، شوہر کے مزاج سے واقف تھیں، فقط ہنس رہی تھیں، یاسر، اب شاہ نور کی طرف متوجہ تھے۔

"واپس جانے سے پہلے وہ نسخہ دے جانا۔"

"کون سا نسخہ؟" شاہ نور چکرا گئیں۔

"ایور گرین رہنے کا۔" ان کا جواب جتنا بے ساختہ تھا، سب کی ہنسی بھی اتنی ہی بے ساختہ اور بھرپور تھی۔

دو چار دن میں ہی اس نے اختر نانی سے پکی والی دوستی گانٹھ لی تھی۔ ویسے شروع سے ہی اس کی فطرت اور طبیعت کچھ اس قسم کی تھی کہ اسے اپنے ہم عمروں کے بجائے بزرگوں، بڑے بوڑھوں کی صحبت زیادہ دلچسپ لگتی تھی، بڑے شوق سے وہ ان لوگوں سے ماضی کی داستانیں سنتی تھی۔ کمبل میں گھسی وہ ڈرائی فروٹس سے بھی شغل کر رہی تھی اور نانی سے باتیں بھی۔

"میں اپنا اگلا ناول لکھ رہی ہوں، قیام پاکستان اور ہجرت کے موضوع پر۔"

"اچھا۔" نانی نے اسے غور سے دیکھا۔

"مگر یہ موضوع تو اب بہت پرانا ہو گیا پھر اس پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے، اب سن دو ہزار اٹھارہ کی دنیا اور پاکستان کے مسائل کچھ اور ہیں، کسی نئے موضوع کا انتخاب کیوں نہیں کیا تم نے؟"

"کیا یہ ٹاپک کبھی پرانا ہو سکتا ہے؟ نہیں کبھی نہیں۔" شبینہ نے نفی میں سر ہلایا، "یہ ٹاپک تو ایک ایسے سمندر کی مانند ہے جس کی ہر لہر میں لاکھوں قطرے اور ہر قطرے میں طوفان ہے، چند قطروں پر لکھ دینے سے سمندر کا سارا احوال سامنے تھوڑی آ جاتا ہے، کون جانے اس کے اندر کیا کیا کچھ چھپا ہے، آگے لکھنے والے اس کے کیا کیا زاویے دریافت کریں گے؟"

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا، گزرا وقت بیت چکا، اب آگے کی، ابھی کی، حال کی بات کرنی چاہیے۔" اختر نانی نے رسان سے بولتے ہوئے اپنے موقف کا اعادہ کیا۔

"ماضی کو بھول کر یا اسے فراموش کر کے انسان یا قوم اپنے حال اور مستقبل سے کیسے جڑ سکتے ہیں؟" شبینہ کی آنکھوں میں حیرانی ہلکورے لینے لگی۔

"ایک قوم نے، ایک پوری نسل نے اپنا سب کچھ لٹا دیا، ایک خواب کی تعبیر کے لیے جو حقیقت بن گیا تھا، ان قربانیوں کو، آگ و خون کے دریا پار کرنے کے سفر کو محض "گزرا وقت" اور "ماضی کی کہانی" کہنا زیادتی نہیں بلکہ سنگ دلی اور بے حسی ہے۔"

"بالکل اپنے نانا پر گئی ہو، فوراً جذباتی ہو کر اگلے کے لتے لینے شروع کر دیتی ہو۔" نانی نے ایک گہری سانس لے کر ڈرائی فروٹس کی پلیٹ اس کے آگے کی۔

"لو کھاؤ۔"

"آپ مجھے اپنی ہجرت کی داستان سنائیے۔" شبینہ نے فرمائش کی۔

"بھائی صاحب نے اپنی کتاب میں پورا واقعہ لکھا تو ہے۔" نانی نے جانے کیوں اس سوال کے جواب سے دامن بچانا چاہا۔

"میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔"

"چاہے میں غلط بیانی کروں، حاشیہ آرائی کروں؟"

"مجھے پکا یقین ہے کہ آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی۔"

"کبھی کبھی تو تم ہو بہو مہر آپا لگتی ہو، شکلاً اور عقلاً دونوں۔" اختر نانی کی نگاہیں شبینہ کو دیکھ رہی

تھیں اور دماغ کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

☆☆☆

سفید فام حاکم کے اقتدار کا سورج مستقل چمکتے چمکتے اب غروب ہونے کی تیاریوں میں تھا۔ محکوم قوم نے آزادی کا پرچم بلند کر دیا تھا۔ برصغیر کی دو بڑی اقوام ہندو اور مسلمان اتحاد کی شاہراہ کو پیچھے چھوڑ کر اپنے الگ الگ راستوں پر گامزن ہو رہے تھے۔

23 مارچ 1940ء کی قرارداد جسے ہندو پریس نے طنزیہ ''قرارداد پاکستان'' کا نام دیا تھا۔ اگلے چھ سالوں میں ایک ایسی مضبوط تحریک اور ایک ایسی اٹل حقیقت بن چکی تھی۔ جسے لاکھ چاہنے اور کوشش کرنے پر بھی نہ انگریز نظر انداز کر سکا۔ نہ ہندو روک سکا، تاریخ لکھنے والے تاریخ لکھ رہے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح تاریخ بنا رہے تھے۔ ایک قوم کی تخلیق کر رہے تھے، ایک ریاست کے حصول کے لیے کوشاں تھے، وہ اپنی قوم کا مقدمہ لڑ رہے تھے اور اس مقدمے میں ان کا مخالف فریق ایک نہیں بلکہ تین تھے، ہندو، جو کسی صورت ہندوستان کو تقسیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے، انگریز جو یہاں سے جاتے جاتے بدامنی، شورش اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے خواہاں تھے اور خود مسلمانوں میں ہی ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے حامی نہیں تھے۔ وہ وقت اور حالات کی نزاکت کو نہیں سمجھے، سب سے بڑھ کر ہندو ذہنیت کو نہیں سمجھے' جواب برصغیر کے اقتدار کے سنگھاسن پہ مسلمانوں اور پھر انگریزوں کی جگہ لینے کے لیے بے تاب تھا۔

3 جون 1947ء تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا، اقتدار کی منتقلی کی تاریخ ایک کے لیے 14 اگست اور دوسری کے لیے پندرہ اگست رکھی گئی۔ ہندوستان کے طول و عرض میں جگہ جگہ فسادات پھوٹ پڑے تھے پھر پاکستان بننے کی قیمت سب نے چکائی، ہر بوڑھے نے ہر جوان نے، مردوں نے عورتوں نے، لڑکوں نے، لڑکیوں نے، بچوں نے، حتیٰ کہ ان بچوں نے بھی جنہیں ابھی اس دنیا میں آنا تھا۔ انہیں ماؤں کی کوکھ میں ہی ختم کر کے ان سے بھی وہ قیمت وصول کی گئی۔

لالٹین جلا کر رکھی ہی تھی کہ اختر جہاں سٹر پٹر کرتی مہر جہاں کے پاس آئی۔

''آپا! ہم کب سے کہہ رہے ہیں ہمیں گلگلے بنا دو، آپ سنتی ہی نہیں۔'' دس سالہ اختر جہاں منہ بسور رہی تھی۔ مہر جہاں کو چھوٹی بہن پہ بے طرح پیار بھی آیا اور ہنسی بھی۔

''گلگلے تو بیاہ پر بنتے ہیں۔ رت جگے میں تب ہی بنانے میں بھی مزہ آتا ہے اور کھانے میں بھی۔''

مہر جہاں پیاز کی چھوٹی چھوٹی گٹھیاں چھیل کر رکھ رہی تھی، دال پکائی تھی مسور کی، ابا اور بھائی کی عادت تھی دال کے ساتھ ثابت پیاز دانتوں سے توڑ کر کھاتے تھے۔ مغرب ہونے والی تھی، مغرب کی نماز پڑھ کر دونوں آتے اور مہر جہاں ان کے آگے کھانا چن دیتی، ماں کو مرے چھ ماہ گزرے تھے، ان کے بعد ایک دم ہی کم سن مہر جہاں کے کاندھوں پہ پورے گھر کی ذمہ داری آ گئی۔

''گلگلے آخر بیاہ پر ہی کیوں بنتے ہیں ویسے کیوں نہیں؟'' اختر جہاں حجت بازی پہ اتر آئی تھی۔

''ارے بھئی بن سکتے ہیں، کوئی قباحت نہیں مگر......'' اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بے صبری اختر نے بہن کی بات کاٹ دی۔

''آپ کا بیاہ کب ہو گا؟ ابا، بھائی جان سے کہہ رہے تھے ایک دو ماہ بعد آپ کو رخصت کریں گے، رت جگے پہ گلگلے بنیں گے نا تو پورا تھال اپنے لیے الگ کر کے رکھ لوں گی۔'' اختر کی پٹر پٹر زبان چل رہی تھی اور مہر جان کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔

''اچھا بس، اب چپ ہو جاؤ، بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

''کیسی باتیں؟ گلگلوں کی؟'' اختر نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''اچھا بابا! میں کل بنا دوں گی تمہیں گلگلے...... جی بھر کے کھا لینا۔''

''تو کیا آپ کا بیاہ پرسوں ہو رہا ہے؟''

''اف، ابھی جو ابا یا بھائی جان آ کر اس بے وقوف کی باتیں سن لیں تو۔'' مہر جہاں نے جز بز ہو کر چھوٹی بہن کو دیکھا۔

''یہ لو۔'' طاق میں رکھی پیالی سے اس نے گڑ کا ٹکڑا نکال کر اسے دیا۔ کسی طرح تو اس کا منہ بند ہو اختر نے گڑ کا وہ ٹکڑا اپنے منہ میں رکھا اور اس کا منہ بند ہو گیا۔

ابا اور بھائی جان حسب معمول مغرب کی نماز پڑھ کر آئے۔ مہر جہاں نے ان کے آگے کھانا رکھا۔ دال، روٹی کی چنگیر، ایک پیالی میں اچار اور پیاز، پانی کے گلاس، وہ اندر کوٹھری میں تھی، صحن سے باپ اور بھائی کی مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔

''ابا! حالات ٹھیک نہیں ہیں، لوگ کہہ رہے ہیں کہ حملہ یہاں بھی ہو سکتا ہے ہمارے علاقے میں۔'' سترہ سالہ وقار کے لہجے میں تشویش تھی۔ خلیل احمد خان ہنس پڑے۔

''اوئے کچھ نہیں ہوتا، یہ لوگ جو ہیں، ایویں رائی کا پہاڑ بنا کر ادھر سے ادھر باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ ہم سالوں سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک، کوئی ہندو، کوئی سکھ، مجھ پر حملہ کیوں کرے گا؟ میں تو کسی کو جان سے مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا پھر ہمیں کوئی کیوں مارے گا اور ہم کون سا پاکستان جا رہے ہیں، جس کو جانا ہے جائے، ہم تو یہیں رہتے ہیں، یہیں رہیں گے، ہمارا وطن یہی ہے۔''

دو ٹوک لہجے میں بات ختم کر کے وہ دوبارہ کھانے میں جت گئے۔ کچھ دیر بعد دوبارہ سر اٹھایا۔

''ایویں فضول لڑکوں کے ساتھ نہ گھوما پھرا کرو۔ اپنی پڑھائی پہ دھیان دو، وزیر صاحب کے بیٹے کو دیکھا۔ وکیل بن گیا پڑھ لکھ کر۔''

''جی ابا۔'' وقار نے سر جھکا لیا۔

وزیر صاحب کے گھر کے باہر بہت بڑا اور گھنا آم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے پکا چبوترہ بنوا لیا تھا انہوں نے، محلے بھر کے مردوں کی محفل وہیں جمتی تھی۔ چبوترہ بھر جاتا تو کرسیاں اور موڑھے آس پاس بچ جاتے اور پھر سیاست، ملکی و غیر ملکی حالات، انگریز، ہندو، مسلمان......

سارے موضوعات زیر بحث آتے، محلے میں زیادہ تعداد مسلمان گھرانوں کی تھی، دو تین گھرانے ہندوؤں کے تھے۔ ایک سکھ اور ایک پارسی بڈھے بڑھیا تھے جن کا اکلوتا بیٹا فلموں میں قسمت آزمائی کے لیے بمبئی (ممبئی) میں جوتیاں چٹخا رہا تھا۔ مختلف علاقوں سے، مقامات سے کشیدگی اور فسادات کی خبریں آ رہی تھیں مگر اس محلے کے لیے ابھی راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

مہر نے نہا دھو کر سبز چھینٹ کا جوڑا پہنا تھا چنری کی اوڑھنی میں سبز، سرخ، سیاہ، زرد کئی رنگ تھے۔ اپنے لمبے سنہری مائل بھورے بالوں میں کنگھا پھیرتے ہوئے وہ بے اختیار چھوٹی بہن کی باتوں کو سوچ رہی تھی اور سوچتے سوچتے خود ہی سمٹ کر کسی چھوئی موئی بن جاتی کبھی شرم سے بیر بہوٹی۔ بال لمبے تو تھے مگر گھنگھریالے تھے۔ خوب تیل لگا لگا کر بال سلجھاتی، تب کہیں جا کر سلجھتے۔ اس وقت بھی وہ اپنے بالوں اور کنگھے کے ساتھ نبرد آزما تھی۔

''ہائے اللہ میاں جی! میری امی کو کیوں اپنے پاس بلا لیا آپ نے۔'' بے اختیار اسے اپنی ماں یاد آ گئی۔ مہر کے بال ہمیشہ وہی سلجھایا کرتی تھیں۔ ساتھ ساتھ بولتی بھی جاتیں۔

''آئے ہائے بال ہیں کہ جنجال۔ موئے سلجھ کر ہی نہیں دیتے۔'' کبھی جھنجلاتیں، کبھی ہنس دیتیں۔

ماں کی یاد آتے ہی مہر کا دل اداس ہو گیا، آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے خاموشی سے آنسو پونچھے اور بال باندھنے لگی۔ پراندے کے آخری بل ڈال کر وہ گرہ لگا رہی تھی کہ دروازے پر کچھ کھٹ

پھٹ ہوئی اور پھر صحن سے ابا جان کی متحیر آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''ارے بھائی غلام حسین! تم یوں اچانک؟ اور یہ حلیہ کیا بنایا ہوا ہے، سب خیریت تو ہے نا؟''

مہر ماموں کا جان کا نام سن کر فوراً کوٹھری سے باہر آئی اور باہر کا منظر دیکھ کر حق دق کھڑی ہوگئی۔ اس کے لمبے چوڑے، آن بان اور شان والے ماموں، کٹے پٹے، اجڑی ہوئی حالت میں سامنے کھڑے تھے۔ زرد چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ آنکھوں میں دیوانگی اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔

''بھائی جان! سب کچھ ختم ہوگیا، میں برباد ہوگیا، لٹ گیا۔'' دونوں ہاتھ سر پر رکھتے وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

''غلام حسین؟ مرد ہو کر رو رہے ہو!'' ابا جان حیران پریشان نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ جو برادر نسبتی بننے سے پہلے ان کا چچا زاد بھائی تھا۔ بالکل دوستوں کی طرح، بھائیوں کی طرح پیار تھا ان کا۔

''مرد نہیں ہوں، مردہ ہوں میں، مر گیا ہوں، پتا نہیں سانس کیوں چل رہی ہے؟''

ابا جان نے دروازے پر بت بنی مہر کو پانی لانے کا اشارہ کیا۔ وہ اسٹیل کے نقشین چمچاتے کٹورے میں پانی لے آئی مگر غلام حسین نے اسے ہاتھ تک نہ لگایا۔

''میرے اندر جو آگ جل رہی ہے۔ وہ اس پانی سے نہیں بجھے گی۔''

''کچھ بتا تو سہی، معاملہ کیا ہے؟''

اور انہوں نے جو دل خراش داستان سنائی، وہ سن کر مہر سے اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں رہا گیا۔ اپنے ڈوبتے دل اور لرزتے وجود کو سہارا دینے کی خاطر اس نے کواڑ مضبوطی سے تھاما...... ابا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو غلام حسین!'' سرسراتی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے وہ اپنا بے یقین دل لیے پلنگ پر ڈھے سے گئے۔

داستان مختصر سی یہ تھی کہ غلام حسین اپنے بھائی سے اپنا قرضہ وصول کرنے مراد آباد گئے ہوئے تھے۔ بیٹے کی شادی کی تیاریاں کرنی تھیں اپنی بیوی کو بہو کا نکاح کا جوڑا سیتے چھوڑ کر گئے تھے۔ واپس آئے تو پورے محلے کا نام ونشان بھی جیسے مٹ گیا تھا۔ جلے ہوئے گھر اور جلی ہوئی۔ لاشیں زبان بے زبانی اپنی کہانی سنا رہی تھیں۔

ان کی زندگی باقی تھی۔ جس دن وہ نکلے ہیں اسی رات حملہ ہوا اور حملہ آوروں نے سب کچھ جلا کر راکھ اور خاک کر دیا۔ انسان بھی، جانور بھی، گھر بھی، گرہستی بھی۔ یہ مختصر داستان طویل ہو کر پوری عمر پر محیط ہوگئی تھی۔

''اب میں کیا کروں، میرے رب کہاں جاؤں؟'' وہ پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچ رہے تھے۔ وقار بھی گھر آگیا تھا۔ دونوں باپ بیٹے نے کس طرح مل کر اس دیوانے کو سنبھالا جو اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ بھرا کنبہ، ایک بیوی اور چھ بچوں پر مشتمل کنبہ کھو کر ایک انسان اپنے ہوش وحواس ہی کھو سکتا تھا۔ کھونے کے لیے کچھ اور بچا کیا تھا؟

مہر کوٹھری میں دوپٹہ منہ میں ٹھونسے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی، ماں ہوتی تو ان کے گلے لگ کر کھل کر رو لیتی۔ اختر جہاں حیران پریشان سب کو روتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیا ہوگیا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟

ابا کوٹھری میں آئے۔ مہر لرزتے قدموں سے کھڑی ہوگئی۔

''اللہ ہی وارث ہے مظلوموں کا، وہی سب کے ساتھ انصاف کرے گا۔'' انہوں نے مہر کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔

''تھوڑا دودھ گرم کر کے لاؤ، دو دن کا بھوکا پیاسا ہے غلام حسین!''

''جی!'' مہر تیزی سے باہر نکل گئی۔

آج رات، صحن میں دو کے بجائے تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ تینوں پر مچھر دانیاں تنی ہوئی تھیں، خلیل خان، وقار خان اور غلام حسین تینوں سونے کے بجائے خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے تھے۔

تعصب کی، نفرت کی یہ کیسی زہریلی ہوا چل پڑی جو، سب کی سانسیں ختم کیے جا رہی ہے اور ان سانسوں کے ساتھ انسانیت بھی دم توڑ رہی تھی۔ خلیل خان آج پہلی بار سوچنے پر مجبور ہوئے تھے ورنہ اس سے پہلے تک تو انہیں ان سب باتوں کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ رات تاریک تھی ستارے بھی جانے کہاں منہ چھپائے ہوئے تھے اور چاند تو ابھی تک بدلیوں میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ نکلا ہی نہیں تھا۔ فضا میں جھینگروں کی آوازیں تھی یا وقفے وقفے سے گیدڑوں کے چلانے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ان ہی آوازوں کے درمیان ایک آواز ابھری، دروازے پر دستک کی آواز۔ خلیل خان، چونک پڑے، ان سے پہلے وقار تیزی سے اٹھا اور دروازے پر پہنچا، پیچھے پیچھے خلیل خان بھی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں بدری ناتھ، جلدی سے دروازہ کھولو۔''

وقار نے زنجیر ہٹا کر کواڑ کھولا، بدری ناتھ تیزی سے اندر آیا اور کواڑ دوبارہ بھیڑ دیا۔

''میاں جی! ایک دو روز میں بلوائیوں کا حملہ ہونے والا ہے یہاں۔ جتنی جلدی ہوسکے، یہاں سے نکل جاؤ۔''

''کیا کہہ رہے ہو بدری ناتھ؟'' خلیل خان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے بچپن کے سنگی، ساتھی اور پڑوسی کو دیکھ رہے تھے۔

''کیوں ہوگا حملہ؟ اور ہم...... کہاں جائیں؟''

وہ اک دم بدحواس سے ہوگئے۔

''بلوائیوں کے آنے سے پہلے نکل جاؤ۔'' بدری ناتھ نے سرگوشی نما آواز میں اپنی بات دوبارہ دہرائی۔

''ارے یہ سب کیا ہو رہا ہے بدری ناتھ؟''

خلیل خان کی آنکھوں میں آگہی کے ساتھ بے بسی اُتر آئی۔

''اپنی جان پر کھیل کر یہاں آیا ہوں، سگا بھتیجا مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ مسلوں کا ہمدرد کہتا ہے مجھے، میں تو دوستی کا دھرم نبھانے آیا ہوں اور بس۔''

بدری ناتھ نے ایک نظر ان دونوں پر ڈالی اور کواڑ کھول کر باہر نکل گیا۔ پیچھے وہ سارے سوال چھوڑ گیا۔ جو خلیل خان کے ذہن میں آرہے تھے۔

''میرے پرکھوں کی ہڈیاں یہاں دفن ہیں۔ میری گھر والی، چار بچوں کی قبریں ہیں یہاں، میرا گھر ہے، کام ہے، میں یہ سب چھوڑ کر کہیں کیوں جاؤں؟ جن کو نئے ملک جانا ہے۔ وہ شوق سے جائیں مجھے کہیں نہیں جانا۔'' خلیل خان کسی ضدی بچے کی طرح بول رہے تھے۔

وقار نے ایک نظر باپ پر ڈالی اور ایک گہری سانس لی۔ وہ کالج میں بارہویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ ذہین تھا۔ سیاسی اور سماجی شعور عمر اور تعلیم سے کہیں آگے بڑھا ہوا تھا۔

''ابا! ماموں جان کا ارادہ بھی یہیں رہنے اور بسنے کا تھا، انہیں پاکستان نہیں جانا تھا مگر ان کے ساتھ کیا ہوا؟ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان بننے کی قیمت ہم سب کو چکانی پڑے گی۔ چاہے ہم وہاں جائیں یا یہیں رہیں، جیسے ماموں نے چکائی ہے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ طوفان آنے سے پہلے ہی اپنا بندوبست کرلیں۔'' وقار نرمی سے انہیں سمجھا رہا تھا۔

''ارے کوئی ان بلوائیوں کو پکڑتا کیوں نہیں، روکتا کیوں نہیں؟'' سفاک حقیقت کا انکشاف ہونے پر خلیل خان کے جسم سے جیسے روح نکل رہی تھی۔

''کیونکہ انہیں پکڑنے اور روکنے والوں نے ہی انہیں چھوٹ دی ہوئی ہے۔''

وقار نے ایک بے بس نظر آسمان پر ڈالی، رات اور زیادہ تاریک اور وحشت ناک لگ رہی تھی۔ غلام حسین جاگ رہے تھے۔ سب کچھ سن رہے تھے۔ مگر

اب انہیں کسی بات سے، کسی معاملے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کوئی واسطہ تعلق نہیں تھا۔

بہادر علی خان کے گھر خفیہ اجلاس ہوا تھا۔ محلے کے سارے مسلمان مردوں کا، بہت سوں کو حملے کی سن گن مل چکی تھی۔ اپنے بل بوتے پر مقابلہ کسی کے بس میں نہ تھا۔ حملہ آور سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ یہاں عورتیں، بچے اور لڑکیاں بھی تھیں جن کی حفاظت کی فکر سب سے زیادہ تھی۔

گھر میں جو باتیں ہو رہی تھیں، مہر اس سے بے خبر نہیں تھی، کچھ عرصے بعد ماموں کے گھر بیاہ کر جانا تھا، ابھی تو سارے خوابوں کے ملیا میٹ ہونے کا ماتم، جانے والوں کا غم بھی ٹھیک سے نہیں منا سکی تھی کہ حملے، بلوائی اور نقل مکانی کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

"ہم، کہاں جائیں گے؟ کیسی ہو گی نئی جگہ، نیا وطن، کیا وہاں یہ چنبیلی ہو گی اور اس کی مہک؟ صحن میں بنی کیاری میں چنبیلی کے جھاڑ کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ چنبیلی کے پھول اور خوشبو بھی اداس لگ رہے تھے۔ اس نے آنگن میں کھڑا آم کا گھنا درخت دیکھا۔ در و دیوار کو ساز و سامان کو، سکھیوں سہیلیوں کو، پڑوسیوں کو، وہ ایک ایک کو چشم تصور سے دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ کیا کیا ساتھ جائے گا۔ کیا کچھ یہیں رہ جائے گا اور ساتھ جانے کے لیے زاد راہ بہت کم تھا اور پیچھے رہ جانے والا، چھوٹ جانے والا بہت کچھ تھا بلکہ سب کچھ تھا۔ مہر کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔

ابا اور وقار تھکے ہارے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ مہر نے جلدی سے دوپٹہ سر پر ٹھیک کیا۔

"اختر کہاں ہے؟"

"وہ رہی۔" مہر نے بڑے سے صحن کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا جہاں اختر جہاں اپنی گڑیا لے کر بیٹھی ہنڈکلیا پکا رہی تھی۔ کپڑے کی یہ گڑیا ممانی نے کچھ مہینے پہلے اس کے لیے بنا کر بھیجی تھی۔

"ادھر آؤ تم دونوں۔" مہر کو ان کا لہجہ عجیب سے لگا۔

"جی۔" اختر کو اپنے ساتھ لے کر وہ ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"یہ...... یہ اپنے پاس رکھو۔" انہوں نے ایک بوتل اور ماچس مہر کی طرف بڑھائی۔ وہ دیکھے بغیر بھی بتا سکتی تھی کہ یہ مٹی کا تیل ہے۔

"اس کا کیا کروں ابا؟" وہ بھونچکی رہ گئی۔

"ہمیں پرسوں نکلنا ہے۔ یہاں سے، لاری آئے گی وہ سب کو لے جائے گی۔ آج کی رات یا کل کی رات خدانخواستہ اگر حملہ ہو گیا تو...... تو یہ خود پر اور اختر پر...... الٹ لینا، زندہ کسی کے ہاتھ نہ آنا۔" ابا کی آواز میں عجیب سی وحشت در آئی تھی۔ اور بولتے ہوئے وہ بار بار اٹک رہے تھے۔

"ابا جان، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وقار تیزی سے ان کے قریب آیا اور تیل کی بوتل اور ماچس مہر کے ہاتھوں سے چھینی۔

"جب تک میں زندہ ہوں، حفاظت کروں گا اپنی بہنوں کی۔" غصے سے یا شاید بے بسی کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"تم دونوں اندر جاؤ۔"

مہر نے ڈری سہمی اختر کا ہاتھ پکڑا اور ڈگمگاتے قدموں سے اندر چلی گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی، آواز باہر نہ جائے۔ اس لیے اس نے دوپٹے کا پلو منہ میں ٹھونس لیا تھا اختر حیران پریشان، سہمی ہوئی نظروں سے مہر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابا کیسی باتیں کر رہے تھے اور کیوں کر رہے تھے؟

خلیل خان دونوں ہاتھوں سے سر تھامے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ غلام حسین چپ چاپ بیٹھے خلا میں جانے کیا گھور رہے تھے۔

دو راتیں محلے کے سارے مردوں، عورتوں نے جاگ کر گزاریں، کسی نے پلک تک نہ جھپکی تھی۔ دو راتوں کے قیامت خیز انتظار کے بعد اگلی رات آ ہی گئی رات کے اندھیرے میں اپنے گھر سے نکلے

تو آنسوؤں کے ہمراہ اور کچھ ساتھ نہ تھا۔ جو کچھ نقد رقم موجود تھی، خلیل خان نے اپنی شلوار کے نیفے میں محفوظ کر لی تھی۔ مہر نے اپنے اور اختر کے ایک دو جوڑوں کی چھوٹی سی گٹھری بنائی، چادر سے خود کو لپیٹا اور بہن کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑی، اختر چلتے سمے اپنی گڑیا بغل میں دابنا نہ بھولی اور ہاں چنوں کی پوٹلی بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

گھر سے نکل کر سب نے حسرت کی ایک نظر اپنے بھرے پرے گھروں پر ڈالی اور بھاری دل اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ لاری کی طرف روانہ ہو گئے۔ مصطفیٰ صاحب نے سارا بندوبست کروایا تھا لاری میں دو سپاہی بھی بندوقوں کے ہمراہ ان کے ساتھ ہونے تھے۔

وقار دونوں بہنوں کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے باپ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اچانک مہر جہاں رک گئی۔

"کیا ہوا؟"

"میری چادر، کانٹوں میں پھنس رہی ہے۔" کیکر کی کانٹوں بھری جھاڑی نے اس کی بڑی سی چادر پر اپنے پنجے پھیلا دیے تھے وہ جتنا چادر کو کانٹوں پر سے گھسیٹ رہی تھی۔ وہ کانٹے اتنا ہی کسی موذی کے پنجوں کی طرح چادر کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔ چادر چھڑانے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں میں خراشیں لگ رہی تھیں۔ وقار کے ہاتھوں میں بھی نوکیلے کانٹے گھس رہے تھے۔

"چھوڑ چادر کو، میرے ساتھ چل، لاری میں سب بیٹھ گئے ہیں۔"

وقار نے ذرا دور کھڑی لاری سے جھانکتے رضا چاچا کو دیکھا جو اشارے سے اسے بلا رہے تھے۔

"بھائی جان!" مہر جہاں نے دہل کر اسے دیکھا۔

"ننگے سر تو کبھی گھر کے آسمان نے بھی مجھے نہیں دیکھا، یہاں سب کے سامنے؟ میں تو مارے شرم کے ہی مر جاؤں گی۔"

"پھر کیا کریں۔ یہ تو کس طرح بھی نہیں نکل رہی کانٹوں سے۔" وقار کے چہرے پر پسینہ ابھر آیا۔

"اختر کے پاس کپڑوں کی گٹھڑی ہے اس میں دوپٹہ ہو گا۔" مہر کو خیال آیا۔

"میں ابھی لاتا ہوں۔" وقار تیر کی سی تیزی سے لاری کی طرف بھاگا۔ وہ کونے میں پڑے سامان کے ڈھیر سے کپڑوں کی گٹھڑی نکال رہا تھا۔ جب اچانک وہ لوگ آن پہنچے۔ سینکڑوں کی تعداد میں کرپانیں، چھرے اور ڈنڈے لہراتے ہوئے، آج تو چاند بھی چودھویں کا تھا اور خوب فیاضی سے اپنی روشنی لٹا رہا تھا۔

ابھی وہ کچھ دور تھے مگر دور سے ہی ان کو لڑکی بھی نظر آ گئی تھی اور لاری بھی۔

"اوئے وہ رہے بھگوڑے۔ بلوائیوں کے بھاگنے اور نعروں میں شدت آ گئی۔

"جو بولے سو نہال، ست سری اکال، ست سری اکال۔" وقار کو گٹھری مل گئی تھی مگر کھولنے کا موقع نہیں ملا تھا، وہ نعروں کی آوازیں سنتے ہی تیزی سے لاری سے اترا تھا۔

"فٹافٹ لے آ بٹیا کو۔" عشرت بوا نے آواز لگائی، خوف سے چہرے سہم گئے تھے سب کے۔ مہر کا چہرہ دہشت کے مارے سفید پڑ گیا تھا۔ بلوائی تیزی سے قریب آ رہے تھے۔ اس نے چادر وہیں چھوڑی اور آگے بھاگی۔

"مہر! تیز بھاگ۔" وقار کی آواز منہ میں ہی رہ گئی۔ وہ راستے میں پڑے ایک بڑے سے پتھر سے بری طرح ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔ اور گرتے گرتے بھی اس کی نگاہیں، بے یقین نگاہیں مہر پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھاگی ضرور مگر تھی لاری کے قریب آنے کے بجائے وہ کیکر کی جھاڑی سے ذرا آگے اس کنویں کے پاس رکی۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں ایک نیک جن رہتا ہے جو ہر چند ماہ بعد اس کنویں کے پانی میں شکر ملاتا ہے تب بھی تو اس کنویں کا پانی اتنا میٹھا ہے۔ مہر جہاں شاید اسی نیک

طنیت جن کو دیکھنے کنویں میں اتر گئی تھی۔
بلوائیوں کے بھاگتے قدموں میں اور تیزی آگئی تھی۔ لڑکی تو گئی ہاتھ سے، اب باقیوں کو تو پاکستان بنانے کا مزا چکھائیں۔
مسعود اور اشرف جھپٹ کر لاری سے اترے اور نیچے گرے۔ وقار کو تقریباً گھسیٹ کر لاری میں اندر لے آئے۔ تب تک وہ اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ جن دو بندوق بردار سپاہیوں کا وعدہ ہوا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ لاری چل پڑی تھی۔ کرپانیں، ڈنڈے لہراتے، نعرے لگاتے بلوائی پیچھے رہ گئے تھے۔ بہن کو دیکھتی منتظر اختر جہاں کی آنکھوں میں وہ منظر نقش ہو گیا تھا اور اسے زندگی کی آخیر سانس تک نقش ہی رہنا تھا۔ خلیل خان کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں کرب اور وحشت سمٹ آئی تھی۔ کئی دن کی صعوبتیں، بلکہ عذاب بھگتنے کے بعد انہیں اس پاک سرزمین کی مٹی پر سجدہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جس کے لیے انہوں نے اور ان جیسے ہزاروں لاکھوں خاندانوں نے قربانیاں دی تھیں۔ بھرے پرے گھر، چھوڑنے کی۔ قیمتی جائیدادیں چھوڑنے کی اور اپنے پیاروں کے کٹنے اور مرنے کی۔
خلیل خان کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگ گئی تھی۔ انہوں نے بیٹے سے فقط ایک ہی وعدہ لیا تھا۔
''اگر میں پاکستان پہنچنے سے پہلے مر جاؤں تو میرا لاشہ وہیں لے جانا وہیں دفن کرنا مجھے۔''
وقار نے وعدہ کر لیا تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ سرزمین پاکستان پہنچنے کے اگلے روز ان کی دھڑکنیں رکی تھیں۔ بلکہ وہ دھڑکنیں، دھیرے دھیرے اسی وقت سے رک رہی تھیں جس وقت مہر جہاں نے ان کی آنکھوں کے سامنے کنویں میں چھلانگ لگائی تھی۔ آہستہ آہستہ، مدھم مدھم ہوتے ہوتے۔ وہ مکمل طور پر رک گئیں جب انہوں نے پاکستان کی خاک پر قدم رکھ لیے اور سجدہ شکر ادا کر لیا۔ ان کے کچھ دن بعد ماموں غلام حسین بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔
وقار خلیل خان نے اپنا غم و غصہ، اپنا کرب اور اپنی محبت و وفاداری اپنے قلم میں سمو کر کاغذوں پر بکھیر دی تھی۔ ان کے صحافتی اور ادبی کارنامے اپنی جگہ مگر آخیر عمر تک معمول رہا کہ جب بھی کوئی پاکستان، تحریک پاکستان اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کے حوالے سے ہرزہ سرائی کرتا، وہ مکمل تاریخی معلومات و مواد اور حوالہ جات اس اس کی وہ خبر لیتے، وہ لتے لیتے کہ اسے گھر تک پہنچا کر آتے۔ مخالفین طنزیہ طور پر انہیں جھکی اور خبطی بڈھا کہتے تھے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔ کیونکہ مخالفین وہ لوگ تھے یا ان لوگوں کی اولادیں تھے جنہوں نے پاکستان بننے کی کوئی قیمت چکائی نہیں کوئی قربانی دی نہیں، بلکہ الٹا قیمت اور قربانیاں پاکستان سے وصول کی تھیں۔
شبینہ کتنی ہی دیر سن بیٹھی رہی۔ اس نے اختر نانی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہ منظر اب بھی جھلملا رہا تھا، آنسوؤں کے ساتھ۔
''نانا نے اتنے بڑے اور اہم واقعے کا ذکر اپنی کتاب میں کیوں نہیں کیا؟'' شبینہ نے سرسراتی آواز میں سوال کیا۔
''میں نے یہ سوال کئی بار کیا تھا ان سے، وہ ہمیشہ ایک جواب دیتے، وہ کہتے تھے کہ میرا قلم اس واقعے کا بلکہ سانحے کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اور کچھ یہ بھی تھا کہ وہ خود کو اس سانحے کا ذمہ سمجھتے تھے۔''
''مگر کیوں؟''
''بس، ان کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی۔''
''اور آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟''
''اس لیے چھوڑ دیا۔ جب میں اپنی مہر آپا کی سچی کہانی دنیا کو نہیں بتلا سکتی تو اور دوسری کہانیاں لکھنے کو دل نہیں مانا۔'' نانی کی بھوری آنکھوں میں ملال کے سائے تھے۔
''میں یہ کہانی اپنے ناول میں شامل کروں گی۔'' شبینہ نے ایک عزم کے ساتھ اعلان کیا۔
☆☆☆
ویک، اینڈ پر ماموں ممانی نے مہمانوں کو خوب گھمایا پھرایا۔ اگلے ہفتے نیاگرا آبشار، دیکھنے کا پروگرام تھا، شبینہ بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ تصویروں میں بہت بار دیکھا تھا۔ اصل میں دیکھا تو مبہوت ہو گئی۔ بلندی سے گرتا ہوا آبشار انتہائی سردی میں پانی سے برف بن چکا تھا۔ جمی ہوئی برف کی اتنی لمبی لمبی قلمیں اوپر سے نیچے تک یہ منظر ایک نیا تجربہ تھا اس کے لیے اس منظر میں خوب صورتی اور حیرت کے ساتھ ساتھ تھوڑی ہیبت بھی تھی۔ ماموں، ممانی اور عباد کے لیے یہ منظر نیا نہیں تھا۔ وہ کئی بار یہاں آ چکے تھے۔ جب یہ آبشار برف بن جاتا ہے تب بھی اور جب پانی بن جاتا ہے تب بھی۔
شاہ نور، شوہر کے ساتھ یہاں پہلے آ چکی تھیں۔ مگر ایسی جمی ہوئی حالت میں وہ بھی پہلی بار دیکھ رہی تھیں اور دیکھ کر بار بار کہہ رہی تھیں۔ ''اوہ مائی گاڈ، او مائی گاڈ!'' یہ ان کا انتہائی حیرت کے اظہار کا انداز تھا۔
''یہ بھی زندگی کی طرح ہے، کبھی گرتا بہتا پانی کبھی ٹھہری ہوئی رکی ہوئی۔ جمی ہوئی برف۔'' شبینہ نے سوچا اور دستانوں والے ہاتھ اپنے لانگ کوٹ کی جیبوں میں گھسیڑ لیے۔ سر پر موٹی، گرم اونی ٹوپی کے بال پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ کئی موٹی موٹی لٹیں چہرے کے گرد ہالہ بنا رہی تھیں۔
شام ہو رہی تھی اجالا سرمئی ہونا شروع ہی ہوا تھا کہ وکٹوریہ پارک میں لگے پرانی وضع کے کھمبوں اور ریسٹورنٹ کی دھیمی دھیمی روشنیاں ہر طرف پھیل گئیں۔
''دیکھنے کا منظر اب آئے گا۔'' شبینہ نے چونک کر دیکھا، عباد اس کے برابر میں کھڑا تھا۔
شبینہ نے اس کی انگلی کے تعاقب میں آبشار کی طرف دیکھا آبشار پر رنگ برنگی روشنیاں ایک کے بعد ایک ڈالی جا رہی تھیں۔ سرخ، نیلی، زرد، سبز اور اور ایک طلسماتی فضا چاروں طرف تھی۔ شبینہ کو اپنے چہرے پر نمی اور ٹھنڈ کا احساس ہوا، اس نے دستانہ پہنی انگلی سے اپنا رخسار چھوا، وہ گیلا ہو گیا۔
''تم رو رہی ہو؟'' حماد کی آواز میں حیرت تھی اور آنکھوں میں حیرت کے ساتھ کچھ اور بھی تھا۔
''نہیں۔'' شبینہ خود حیران تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے اور بہہ گئے۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔
''مجھے نہیں معلوم، میں کیوں روئی۔'' شبینہ اپنی صفائی نہیں پیش کر رہی تھی۔ ہاں بس بڑبڑائی تھی۔
وہ لوگ واپس آئے تو نانی بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ تھکن کے باوجود بھی وہ پورے دن کی روداد سناتی بھی رہی اور موبائل میں قید تصاویر اور موویز کی شکل میں دکھاتی بھی رہی۔
''کاش! اس وقت گرم گرم کافی کا ایک بڑا مگ مل جائے۔'' شبینہ کو اچانک کافی کی طلب ہوئی۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور عباد اندر داخل ہوا، اس کے دونوں ہاتھوں میں دو مگ تھے جن سے کافی کی دل فریب مہک اٹھ رہی تھی۔
''کافی فار ٹو ینگ لیڈیز۔'' اس نے پہلے نانی کو پھر شبینہ کو مگ تھمایا۔
''لو بھئی، تم اس وقت اگر کچھ اور مانگتیں تو اللہ میاں سے وہ بھی مل جاتا۔'' نانی مسکرائیں۔
''میں اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہوں، مانگنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ دل کی خواہش پوری کر دیتے ہیں۔'' شہیر کا خیال آیا تو شبینہ مسکرائی۔ اس کی مسکان بڑی دلفریب تھی۔ کسی کو بھی اپنے حصار میں باندھنے والی، عباد نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ پھر وہ واپس پلٹ گیا۔
نانی اب اپنا موبائل ہاتھ میں لیے اسے لوگوں کی، مقامات کی نئی پرانی ان گنت تصاویر دکھا رہی تھیں۔ ایک بے حد خوبصورت لڑکی پر شبینہ ٹھہر گئی۔
''یہ کون ہے۔ یہ کتنی خوب صورت ہے۔'' شبینہ نے اسے سراہا۔
''عباد کے لیے لڑکی بتائی تھی کسی نے، یہ تصویر سینڈ کی تھی۔ مجھے پسند آ گئی تھی۔''
''پھر؟''
''پھر یہ کہ جب ہم نے اس سے ملاقات کی تو

بڑے مایوس ہوئے۔"

"کیوں؟"

"تین بالشت کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ پیچھے سے بڑا معزز اور عالموں کا گھرانہ ہے۔ میں یہی سوچ کر گئی تھی کہ پوتا اندر سے بہت مولوی ہے۔ ایسا گھرانہ اور لڑکی پسند آجائے گی۔ وہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ لڑکی یہیں پلی بڑھی تھی اور ایسی پلی بڑھی کہ یہیں کے رنگ میں رنگ گئی۔ عباد بھی ساتھ گیا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں اس کی شکل دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اس کی مرضی نہیں ہے۔"

"بے حد حسین ہے۔" شبینہ بغور قدرت کے اس شاہکار کو دیکھ رہی تھی۔

"خالی خولی حسن کا کیا اچار ڈالنا ہے؟ ویسے اب تو گھر میں اچار ڈالنے کی روایت بھی دم توڑتی جارہی ہے۔ بازار میں ہر شے مل جاتی ہے۔" نانی اپنی بات سے خود ہی محظوظ ہو کر ہنسنے لگیں۔ شبینہ مسکراتے ہوئے اگلی تصویریں دیکھنے لگی۔ مگر اس کا دماغ ایک نکتے پر اٹکا ہوا تھا۔

"ایک نسل سے دوسری، تیسری نسل تک آتے آتے کتنا تغیر، کتنی تبدیلی آجاتی ہے۔ ہے نا؟"

"گردش ایام ہے یہ۔ وقت کے ہیر پھیر میں افراد ہی نہیں نسلیں کی نسلیں بدل جاتی ہیں۔" نانی کے مسکراتے چہرے پر سنجیدگی نے جگہ بنالی۔

"پتہ نہیں تبدیلی ہے یا انقلاب، کیا کہیں گے اسے؟"

شبینہ کو بار بار مہر جہاں کا خیال آرہا تھا۔ وہ جو دوپٹہ سر سے اتارنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ جان دینے کو ترجیح دی اور اگلی نسل دوپٹا لینا جہالت اور دقیانوسیت کی علامت سمجھتی ہے۔ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس نے اپنی ممی شاہ نور کے بارے میں سوچا۔ جنہوں نے عرصہ ہوا، دوپٹا اتار پھینکا تھا۔ یہ اب ان کے لباس کا حصہ نہیں رہا تھا۔ ان کے حلقہ احباب میں خواتین کی اکثریت ان ہی کی ہم خیال، ہم ذوق اور ہم شوق تھی۔ ان میں شوبز کے علاوہ، بزنس، سیاست اور اسپورٹس کے نامور گھرانوں کی خواتین بھی شامل تھیں۔ سوچتے سوچتے اسے وکٹورین عہد کی خواتین کا خیال آیا۔ جن کے لباس، لباس ہی ہوتے تھے۔ آج کل کی طرح لباس کے نام پر اس کی پرچھائیں نہیں۔ پہلے جب انسان غاروں میں رہتا تھا غیر متمدن اور وحشی تھا۔ کم لباسی اس کی مجبوری تھی۔ آج ترقی یافتہ جدید دور میں فیشن ہے۔

"کیا سوچنے لگیں؟"

"بس یونہی، لباس، پر غور کررہی تھی، کتنے ادوار، زمانوں اور نسلوں کی چھلنی سے گزر کر، آج کا لباس ہم تک پہنچا ہے۔"

"سوچنا تو اچھی بات ہے۔ سوچو اور خوب سوچو، جتنا زیادہ سوچو گی۔ تحریر میں اتنی پختگی اور شعور جھلکے گا۔" اختر نانی اس کی حوصلہ افزائی کررہی تھیں۔

"آج کافی بہت مزے کی بنائی ہے ممانی نے۔" شبینہ نے آخری گھونٹ پی کر مگ رکھا۔

"عباد نے بنائی ہے۔ یہ ذائقہ تو اس کے ہاتھ میں ہے۔" نانی نے بتایا۔ وہ یہ ذائقہ خوب پہچانتی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے روز پوتے کے ہاتھ کی کافی پیتی تھیں۔

☆☆☆

ایک ماہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ پتا بھی نہیں چلا۔ واپسی کا وقت آگیا۔ مسافر واپس آرہے تھے۔ سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے شبینہ کو اچانک کچھ یاد آیا۔ اس نے ہینڈ بیگ کھولا اور شہیر کی دی ہوئی انگوٹھی نکال کر پہن لی۔

ایئرپورٹ پر وہ جیسے ہی لاؤنج سے باہر آئے۔ ڈیڈ کا فون آگیا۔

"سوری بیٹا! میں بزی ہوں، لینے نہیں آسکا۔ ڈرائیور بھیج دیا ہے۔ ڈنر پر ملاقات ہوتی ہے پھر۔"

"جی ڈیڈ۔"

"تمہاری ممی کا فون آف ہے کیا، موبائل دو انہیں۔"

شبینہ نے موبائل ماں کی طرف بڑھایا "ڈیڈ بات کریں گے آپ سے۔" شاہ نور نے بات کرکے موبائل اسے واپس دیا۔

ڈرائیور کے ہمراہ وہ گھر جارہی تھیں۔ راستے میں شہیر کا فون آگیا۔

"آگئی تمہاری فلائٹ؟"

"گھر جارہے ہیں۔ راستے میں ہیں۔ تم کہاں ہو؟ میں تو سوچ رہی تھی کہ تم ایرپورٹ پر آؤ گے۔"

"اپنے ابا کے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں۔ رہائی ملے گی شام میں، تب آؤں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں انتظار کررہی ہوں۔" شبینہ ہنسی۔ اس کے ابا اتنے بھی ظالم نہیں تھے جتنا وہ خود کو مظلوم ظاہر کرتا تھا۔ بس وہ ذرا سخت مزاج اور اصول پسند تھے۔

واپس آکر معمول کی روٹین شروع ہوگئی۔ شاہ نور کے ڈرامے کی شوٹنگ تھی وہ اس میں مصروف ہوگئیں۔ شبینہ بڑی تن دہی سے ناول کے نوٹس بنانے میں جت گئی۔

ایپلک ورک کی بڑی خوب صورت کرتی ٹراؤزر پر اس نے چنا ہوا میچنگ دوپٹا لیا ہوا تھا۔ اپنی اسٹڈی سے نکل کر وہ سیدھی ڈائننگ روم میں آگئی۔ جہاں کھانے کی میز پر اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو شاہ نور نے اوپر سے نیچے تک اسے بغور دیکھا۔ وہ توجہ دیے بغیر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تمہاری یہ کرتی بغیر دوپٹے کی تھی۔" پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے اس نے ممی کی آواز سنی۔

"جی۔ یہ دوپٹا میں نے الگ سے لیا ہے۔"

"خیریت؟ کیا آج کل دوپٹے فیشن میں آگئے؟ حیرت ہے مجھے نہیں پتا چلا۔" ممی نے بھنویں اچکائیں۔

"دوپٹے فیشن میں ہوں یا نہ ہوں ممی! ہمارے کلچر میں ہیں اور لباس کا حصہ ہیں۔" شبینہ رسان سے بولتے ہوئے سے فرائیڈ رائس کھارہی تھی۔

"آج کل کی دنیا میں کلچر بھی ملٹی نیشنل ہوگیا ہے۔ اب الگ سے اس کی کوئی شناخت ہے بھلا۔" ممی فقط سلاد اور بحث سے شغل فرمارہی تھیں۔ حال ہی میں انہوں نے بالوں کا رنگ اور انداز تبدیل کروایا تھا۔ یہ رنگ اور اسٹائل بھی ان پر بہت سوٹ کررہا تھا۔

"شناخت تو انسان کو خود ہی قائم رکھنی پڑتی ہے۔ ہم اپنے رنگوں کو اپنائے رکھیں گے تو ہماری انفرادیت اور شناخت بھی برقرار رہے گی۔ چھوڑ دیں گے تو دوسرے رنگ ان پر حاوی آجائیں گے۔ جنہیں ہم ملٹی نیشنل یا یونی ورسل کلچر کہہ کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔"

"خیر۔ میں کلچر ولچر کی بحث نہیں کرنا چاہتی مگر یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا فیشن سینس خاصا نامعقول ہوتا جارہا ہے۔" شاہ نور نے کٹے کھیرے کے ٹکڑے کو بغور دیکھا اور منہ میں رکھ لیا۔

"تمہارا ناول کہاں تک پہنچا؟" ڈیڈ نے شبینہ کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو اس کی مدد کے لیے آگے آئے اور موضوع بدل دیا۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ شہیر کو "چھٹی" ملی ہوئی تھی۔ پورے ہفتے وہ اس دن کا انتظار کرتا تھا، لنچ پر جانے کے لیے شبینہ کو معمول کے مطابق ساتھ لیا۔ لیمن اور پنک کلر کے امتزاج کے سوٹ پر ان ہی رنگوں کا بڑا سا دوپٹا بڑے اہتمام سے پھیلا کر اوڑھے ہوئے۔ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ لائٹ میک اپ اور گھنگھریالے بال سمیٹ کر ایک پونی میں قید کیے ہوئے تھے۔

"کہاں چلیں؟" شہیر نے سوال کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"آج گھر لے چلو۔ بہت دن ہوگئے آنٹی سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"بیٹے سے تو کبھی ایسی محبت کا اظہار نہیں کیا۔

وہ بے چارہ خود ہی دوڑا دوڑا چلا آتا ہے۔'' شہیر خفا سے لہجے میں بولا۔

''فضول باتیں مت کرو۔'' شبینہ نے مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

خالہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ وہ ایک گھریلو، خاتون خانہ تھیں سیدھے سادے مزاج کی، اپنی بہن شاہ نور سے بالکل مختلف۔ ان کے گھر کا ماحول بھی شبینہ کے گھر سے ذرا الگ تھا۔ انکل لاؤنج میں بیٹھے اخبار کے مطالعے میں مصروف تھے۔ اس کے سلام کا جواب دے کر رسمی حال احوال پوچھ کر انہوں نے دوبارہ اخبار میں منہ دے لیا۔

''کیا کھاؤ گی؟ میں وہی پکوا لیتی ہوں۔'' خالہ نے بڑی محبت سے پوچھا تھا۔

''میں، اپنی نہیں، آپ کی پسند کا کھانا کھاؤں گی۔''

''پھر تو بیسن کے پراٹھے اور لال مرچ کی چٹنی ہی ملے گی۔'' شہیر نے لقمہ دیا۔

''ناٹ بیڈ، میں نے کھائے ہیں بیسن کے پراٹھے۔ مزے کے ہوتے ہیں۔'' شبینہ نے اس کے اڑائے ہوئے غبارے کو پنکچر کیا۔

''فرائی فش تو کھا لیتی ہو نا شوق سے؟''

''آئی لوسی فوڈ۔'' شبینہ نے بچوں کی طرح آنکھیں میچیں۔

''پلاؤ بنوا لیتی ہوں۔'' خالہ سوچ سوچ کر شبینہ کی پسند یاد کر رہی تھیں۔

''اوہ، آئی لو پلاؤ ود کباب اینڈ رائتہ اینڈ بروسٹ اینڈ......'' شہیر نے شبینہ کی نقل اتاری۔

''شہیر بچے! کبھی زبان کو آرام بھی دے لیا کرو۔'' امی جان نے بڑے شائستہ طریقے سے بیٹے کو ڈانٹا۔

''اب بڑے ہو گئے ہو شہیر! بچوں والی حرکتیں کر کے ڈانٹیں نہ کھایا کرو اماں، ابا سے۔'' شبینہ کا لہجہ شرارتی ہو گیا۔

''یہی تو۔'' شہیر گویا اچھل پڑا۔ ''یہی بات کب سے سمجھا رہا ہوں سب کو کہ میں اب بڑا ہو گیا ہوں سوچیں ذرا مگر کوئی سنتا ہی نہیں۔ سنتا ہے تو سمجھتا نہیں۔'' شہیر نہلے پر دہلا تھا۔

''شہیر!'' لاؤنج سے پاپا کی گرج دار آواز سنائی دی۔

''جی۔!'' وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور کان دبائے سٹک گیا۔

''یہ لڑکا بھی بس......'' امی ہنسنے لگیں۔

''ہاں۔ یہ لڑکا بھی بس۔'' شبینہ نے ہنسی میں خالہ کا ساتھ دیا۔

کھانا بہت عمدہ اور مزے دار تھا۔ میز پر شہیر ذرا سنجیدگی اور۔ ادب کے جامے میں تھا اور اس کی وجہ صرف اور صرف والد ماجد تھے۔

لنچ کے بعد وہ تھوڑی دیر ہی اور رکی تھی۔

''چلو اب مجھے۔'' چھوڑ کر آؤ۔''

''نہ میں آپ کا شوفر ہوں نا شوہر، کوئی بھی عہدہ مجھے عطا فرما دیں۔ بے کار میں ڈیوٹیاں بھگتاتا رہتا ہوں۔''

''بہت بولنے لگے ہو، چلو، اٹھو، ہری اپ۔'' شبینہ کلچ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ ڈوپٹا شانوں پر برابر کیا۔

''کچھ بدلی بدلی سی لگنے لگی ہو۔'' شہیر نے اس کے آنچل کا کونا چھوا۔

''تمہاری نظریں بدل گئی ہیں۔'' شبینہ خالہ اور انکل کو خدا حافظ کہہ کر پورچ میں آگئی۔

''پہلے تو تم اتنے بڑے بڑے دوپٹے نہیں اوڑھتی تھیں۔'' شہیر گاڑی کا دروازہ کھولتا ہوا بولا۔

''جب نہیں اوڑھتی تھی۔ تب تو کبھی نہیں کہا۔ اب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یونہی؟'' شہیر نے کندھے اچکائے اور ڈرائیو کرنے لگا۔

''عون عباسی کا فون آیا تھا میرے پاس۔'' شبینہ کو معاً کچھ یاد آیا وہ بتانے لگی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''میرے ناول پر سیریل، بنانا چاہ رہا ہے۔''

''واؤ، یہ تو زبردست آفر ہے۔ اس وقت سب سے اچھی مارکیٹ جا رہی ہے اس کی۔ اس کے ڈرامے ریٹنگ میں ہمیشہ ٹاپ تھری میں رہتے ہیں۔ آٹھ ڈرامے بنا کر پانچ ایوارڈ جیت چکا ہے۔'' شہیر ایک دم ہی پُرجوش ہو گیا تھا۔

''تم عون عباسی کے پبلسٹی منیجر کب سے بن گئے؟'' شبینہ نے انتہائی بدمزہ ہو کر شہیر کو دیکھا۔

''کیا میں زیادہ ایموشنل ہو گیا تھا۔''

''زیادہ سے بھی بہت زیادہ۔'' شبینہ نے کہا ''میں نے منع کر دیا۔''

''کیوں؟'' شہیر نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ پاگل ہو۔

''اس سے پہلے وہ تین مشہور ناولز پر ڈرامے بنا چکا ہے۔''

''تینوں سپرہٹ گئے۔ دو پر ایوارڈ بھی ملا۔'' شہیر نے لقمہ دیا۔

''بالکل بکواس ڈرامے بنائے تھے۔ ناولز کی کہانی کی، کرداروں کی ایسی کی تیسی کر دی۔ ایک ناول میں انتہائی قدامت پسند جاگیردار فیملی کی کہانی تھی۔ جس میں گھر کی خواتین سر سے دوپٹہ نہیں اتارتی تھیں۔ موصوف نے ڈرامے میں ان کرداروں کو سلیولیس کپڑے پہنا دیے۔ آستینوں کے ساتھ دوپٹے بھی غائب کر دیے۔ ایسا گلیمر ڈالا ڈرامے میں کہ ڈرامہ تو ہٹ ہو گیا مگر میرے جیسے لوگوں کے نزدیک کہانی کی روح اور کردار بے موت مر گئے۔'' شبینہ نے اسے سمجھانے کو تقریر جھاڑ دی۔

''ڈرامہ تو ہٹ ہو گیا نا۔''

''اف، بہت ہی ڈفر ہو تم۔'' شبینہ نے اسے گھورا ''کسی بھی ناول پر ڈرامہ یا فلم بنانا آسان نہیں ہوتا۔ ذرا سی چوک ہو جائے تو کہانی کی اسپرٹ ختم ہو جاتی ہے۔ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔''

''ریٹنگ تو بڑھ جاتی ہے نا۔'' شہیر اب جان بوجھ کے اسے تنگ کر رہا تھا۔

☆☆☆

سرمئی شام اپنے پنکھ پھیلا چکی تھی۔ شبینہ نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھا اور ٹانگیں پھیلا لیں موبائل بجا۔ سامنے اسکرین پر ''ممی کالنگ'' چمک رہا تھا۔ یہ یاددہانی کی کال تھی۔

''اف، شبینہ۔ تیزی سے اٹھی، ممی کی بیسٹ فرینڈ کی بیٹی کی شادی تھی۔ ممی ڈیڈی کے ساتھ اسے بھی جانا تھا۔

''ایک بورنگ شام گزارنی پڑے گی۔'' شبینہ نے کھڑے ہوتے ہوئے خود پر ترس کھایا۔ اپنی اسٹڈی سے نکل کر وہ سیدھی باتھ روم گئی۔ پھر شاور لینے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی، ممی پارلر جا رہی تھیں۔ اپائنٹمنٹ تو انہوں نے شبینہ کے لیے بھی لیا تھا، مگر اس کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ وہ خود بھی بہت اچھا میک اپ کر لیتی تھی۔ سیکنڈ ایئر کی چھٹیوں میں اس نے شوق ہی شوق میں بیوٹیشن کا کورس کیا تھا۔ تیار ہو کر وہ دوبارہ اسٹڈی میں آگئی۔ ممی کے آنے میں ابھی ٹائم تھا، اس نے مختار مسعود کی ''حرف شوق'' نکال لی اور پڑھنے لگی۔

ممی کی گاڑی کا ہارن بجا تو اس نے کتاب واپس رکھ دی اور لاؤنج میں آگئی۔

''یہ کیا حلیہ بنایا ہے تم نے؟'' شاہ نور بیٹی کو دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئیں پھر اپنا سر پکڑ لیا۔

''یہ شامیانہ کیوں اوڑھ رکھا ہے سر پر؟''

''دوپٹہ ہے ممی! شامیانہ کیوں ہوتا؟'' شبینہ نے جان بوجھ کر خفا ہو جانے والا منہ بنایا۔

''تمہیں ہو کیا گیا ہے آج کل؟'' انہوں نے بیٹی کو گھورا۔

''ڈیڈ! آپ ریڈی ہیں تو چلیں۔'' شبینہ نے ممی کی بات کا جواب دینے کے بجائے ڈیڈی کو آواز دی۔

''کمنگ ڈارلنگ۔'' ڈیڈ کا فوراً جواب آ گیا۔

''ممی! آپ بہت خوب صورت لگ رہی

ہیں۔" شبینہ نے ماں کی تعریف کی، جو واقعی بہت خوب صورت اور فریش لگ رہی تھیں۔

"اور تم بالکل جوکر لگ رہی ہو۔" شاہ نور کا موڈ آف ہو رہا تھا۔

"یہ تو زیادتی ہے بھئی، میری بیٹی ہمیشہ کی طرح بہت حسین لگ رہی ہے۔" ڈیڈ آگئے تھے انہوں نے شبینہ کے شانوں کے گرد اپنا بازو دراز کیا۔

"مائی پریٹی گرل!" وہ بالکل فٹ اور ہینڈسم تھے اور خوش مزاج بھی۔

"تم جا کر گاڑی میں بیٹھو۔" انہوں نے شبینہ سے کہا پھر اپنی بیگم سے ذرا سنجیدگی سے مخاطب ہوئے۔

"نور! اسے یوں انڈر اسٹیمیٹ مت کرو، جس عمر میں وہ ہے، اس میں ہر طرح کے فیز آتے ہیں۔ جینز اور اسکرٹ کے بھی اور دوپٹے، چادر کے بھی۔ اسے کچھ وقت دو، خود ہی نارمل ہو جائے گی۔ وہ مطالعے کی عادی ہے، ہوسکتا ہے جو کچھ پڑھا ہے اسے خود پہ اپلائی کر رہی ہو۔ ویسے ٹین ایج میں میں نے بھی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور تبلیغی دورے پر بھی جا چکا ہوں۔"

شوہر صاحب کے انکشاف پر شاہ نور نے گھور کر انہیں دیکھا۔ "اب سمجھ میں آیا کہ بیٹی پر کس کے اثرات ہیں۔"

شوہر موصوف ایک قہقہہ لگا کر کار پورچ کی طرف چل دیے۔

شبینہ ہمیشہ کی طرح پر اعتماد تھی اور خوش اخلاقی سے سب سے مل رہی تھی۔ جاننے والے اسے دیکھ کر کچھ حیران تھے، کچھ متعجب...... سب اپنی کیٹس اور مینرز نبھا رہے تھے۔ شبینہ کے منہ پر کسی نے کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا، سوائے فریال آنٹی کے۔

"ارے تم کینیڈا سے ہو کر آئی ہو یا سعودی عرب سے؟"

"کیا فرق پڑتا ہے آنٹی! کینیڈا ہو یا سعودیہ، ہر جگہ زمین بھی اللہ کی ہے اور بندے بھی۔" شبینہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ کچھ نہ سمجھ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ پیچھے سے شبینہ کو ان کی پشت نظر آ رہی تھی، پیچھے کا گلا آدھی کمر تک کھلا ہوا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ ممی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہاں ایک ہی موضوع ڈسکس ہو رہا تھا، فیشن، فیشن اور فیشن...... کیا اِن ہے کیا آؤٹ۔ فیشن آئیکون سمجھی جانے والی بینش وہاب محفل میں الگ ہی نظر آ رہی تھی۔ میز پر بیٹھی خواتین دل ہی دل میں رشک و حسد میں مبتلا ہو رہی تھیں۔

"اب دیکھنا یہ جو جھبلا یہاں پہن کر آئی ہے، کل فیشن میں آجائے گا۔"

مسز زرینہ بندوق والا نے حسرت سے پہلے اپنے تھلتھلاتے وجود کو دیکھا پھر رشک و حسد کے ملے جلے جذبے سے بینش وہاب کو دیکھا جس کا نازک سراپا نیٹ کی اس چھوٹی سی فراک سے بھرپور انداز میں جھلک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ شاہ نور سمیت ان سب سے ہیلو ہائے کرنے آگئی۔

"ہائے بینو! کتنا خوب صورت کلر پہنا ہے تو نے۔ کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی ہے ایسے یونیک کلر۔" موتا ملک، بینش کی بے تکلف سہیلی تھی، تعریف کرنے میں ذرا کنجوسی نہ دکھائی تھی۔

"کلرز مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ہی مجھ تک آ جاتے ہیں۔" بینش نے ہنس کر کہا۔

"دراصل رنگوں کا انتخاب بھی انسان کی پرسنالٹی بنانے میں، سنوارنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اپنی پرسنالٹی کے حساب سے کلر چوز کریں تو وہ آپ کی پرسنالٹی میں چار چاند لگا دیتے ہیں، پھر ڈریس کی ڈیزائننگ، فیشن اور موسم کے حساب سے۔ شوز، جیولری، بیگ، ایک ایک چیز کا انتخاب۔"

بینش کی تقریر شروع ہو گئی، جس میں دوسروں کے لیے رہنمائی سے زیادہ خود نمائی تھی۔ شبینہ رنگ و بو کی اس حسین اور جدید محفل میں بیٹھے بیٹھے کہیں اور پہنچ گئی۔

"اتنی بڑی کائنات میں یہ دنیا، ہمارا کرہ، یہ زمین...... جیسے کسی عظیم الشان سمندر میں پانی کا ایک قطرہ یا بے تحاشا وسیع و عریض صحرا میں ریت کا ایک ذرہ۔ اس ایک قطرے اور ایک ذرے جیسی دنیا کے ایک چھوٹے سے ملک کے ایک شہر کے ایک مقام پر کچھ لوگ جمع ہو کر کپڑے، جوتے، زیور اور آرائش و زیبائش پر ایسی گفتگو کرتے ہیں جیسے انسان کا سب سے اہم اور سب سے بڑا مسئلہ یہی ہو اور ان لوگوں کی گفتگو اس پر حرف آخر ہو۔ اف یہ انسان، اس کی اوقات کیا ہے اور جرأت کتنی ہے؟"

شاہ نور دولہا دلہن سے ملنے اور مبارک باد دینے اپنے شوہر کے ساتھ اسٹیج پر گئی تھیں۔ شبینہ نہ جانے کہاں تھی، انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر اسے دیکھنے کی کوشش کی کہ فوٹو سیشن میں اسے بھی ساتھ لے لیں۔ فیملی از فیملی، مسز ثمن انصاری ٹکرا گئیں۔ بہت پرانی جان پہچان تھی، جارجٹ کی ڈیزائنر ساڑھی اور سلیو لیس بیک لیس بلاؤز میں ملبوس، بڑی اسمارٹ لگ رہی تھیں۔ بیٹی ہمراہ تھی جس کا ایوننگ گاؤن، شولڈرز کے نیچے سے شروع ہو کر نیچے جاتے جاتے بتدریج خوب پھیل گیا تھا۔ اس خوب گھیر میں داہنی طرف، نیچے سے ایک کٹ تھا جو پنڈلی کے اوپر تک چلا گیا تھا۔ کھڑے ہونے میں وہ کٹ نظر نہیں آتا تھا مگر چلنے میں وہ کٹ اور اس کی دودھیا ٹانگ خوب نمایاں ہو رہی تھی۔

"ہائے نور! ہائے آنٹی!" دونوں ماں بیٹی باری باری بہت تپاک اور خوش اخلاقی سے ملیں۔

"میں نے شبینہ کا ناول پڑھا ہے آنٹی! شی از سچ اے بریلینٹ رائٹر۔" ماہا نے شاہ نور کو مخاطب کیا۔

"یو آر آلسو آ گڈ گرل۔" شاہ نور نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔

"مگر یہ شبینہ کو ہو کیا گیا ہے؟" مسز ثمن نے سوال کیا۔

شاہ نور جز بز ہو کر جواب کے لیے مناسب الفاظ سوچ ہی رہی تھیں کہ ڈیڈ بول پڑے۔

"ہماری بیٹی کی نیچر عام لوگوں سے ذرا ڈفرنٹ ہے۔ میچورڈ اینڈ سیریس، اینڈ یو نو، کریٹیو پیپل۔ ہم اور آپ جیسے لوگوں سے الگ ہی ہوتے ہیں، ان کی دنیا الگ ہی ہوتی ہے۔"

انہیں اپنی بیٹی کا یوں موضوع گفتگو بننا اچھا نہیں لگا، اس لیے اس کا بھرپور دفاع کرنے لگے۔

"تھینک گاڈ۔" شاہ نور نے مورل سپورٹ پر شوہر کو مسکرا کر دیکھا۔

☆☆☆

شہیر کا ری ایکشن بھی اوروں سے مختلف نہیں تھا۔

"کیا ہے یار! کیوں بور کر رہی ہو؟" شہیر اسے زبردستی سی ویو لے کر آیا تھا۔

"صبح سے شام تک اپنی اسٹڈی میں بیٹھے بیٹھے اور لکھتے لکھتے مصر کی ممی بن جاؤ گی ایک دن۔" شہیر نے اس کے سر پر کھڑے ہو کر اتنا شور مچایا کہ اسے اٹھنا ہی پڑا۔

"اب کیا ہے؟" ریت پر ٹہلتے ہوئے شبینہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ کیا ملانی آپا بن کر دوپٹہ باندھا ہوا ہے سر پر۔" وہ جھنجلا رہا تھا۔

"میرے دوپٹے سے تمہیں کیا پرابلم ہے؟" شبینہ نے تحمل سے اسے دیکھا۔

"بال سارے چھپ گئے ہیں، ہوا سے اڑ اڑ کر میرے چہرے سے ٹکراتے کتنا رومانٹک لگتا۔"

"لہروں سے ٹکراتی ہوئی نمکین، ٹھنڈی ہوا ہم دونوں کو چھوتی ہوئی گزر رہی ہے۔ قدموں تلے ریت سرک رہی ہے، یہ کیا کم رومانٹک ہے؟ اس ہوا نے صدیوں سے کتنے چہروں کو چھوا ہوگا؟ ان گنت قدموں نے اپنے نقوش اس ریت پر پل بھر کے لیے ڈالے پھر غائب ہو گئے۔ انسان اور وقت دونوں کتنے عجیب اور کتنے پر اسرار ہیں۔"

شبینہ سوچ رہی تھی۔

”ہیلو۔“ شہیر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ ”کہاں ہو؟“

”یہیں ہوں، کہو؟“

”یہ بتاؤ، تم نے کوئی مذہبی تنظیم تو جوائن نہیں کرلی؟“ شہیر کی نظریں اور انداز مشکوک سے تھے۔

”مذہبی تنظیم تو کوئی جوائن نہیں کی، فقط اپنے مذہب کو جوائن کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔“ شبینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”مذہب کیا سر پر دوپٹہ لپیٹنے تک محدود ہے؟“ شہیر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو، ہمارا مذہب صرف سر پر دوپٹہ لپیٹنے تک محدود نہیں ہے۔ نماز، حلال روزی، سچائی اور بہت کچھ ہے اس میں۔ جاننے کی، سمجھنے کی اور عمل کی کوشش کررہی ہوں۔“

”یہ تم کن چکروں میں پڑگئی ہو؟ مجھے میری پہلے والی شبینہ چاہیے۔ اسمارٹ، فیشن ایبل اینڈ ایکٹو۔“

شبینہ نے ایک نظر شہیر کے خفا خفا چہرے پر ڈالی اور ایک نظر سامنے بپھرتے سمندر اور اڈلتی لہروں پر، پھر وہ دھیرے سے مسکرادی۔

”شہیر! میں اب بھی وہی ہوں، جو پہلے تھی۔ ڈیڑھ دو گز کا یہ ٹکڑا جو میرے سر پر ہے، اسے خود پر حاوی مت کرو۔ اپنے سر پر سوار مت کرو، نارمل رہو پلیز۔“

”نارمل رہنے کی ضرورت مجھے نہیں، تمہیں ہے۔“ شہیر کا موڈ آف ہوگیا۔

”تم مجھے لنچ کے لیے یہاں لائے تھے یا جھگڑنے کے لیے؟“

شہیر خاموشی سے کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

”چلو، لنچ کرنے چلتے ہیں۔“

☆☆☆

سورج نکلا تو اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنوں کے ساتھ تھا پھر وہ بتدریج اونچا ہوتا رہا اور کرنیں گرم ہوتی رہیں پھر دھوپ بن کر ہر طرف پھیل گئیں۔

شبینہ نے اب اپنی روٹین تبدیل کرلی تھی، اب وہ رات میں جلدی سو جاتی۔ صبح فجر کی نماز پڑھ کر کچھ دیر واک کرکے پھر اپنی اسٹڈی میں آجاتی اور لکھنا شروع کردیتی۔ اس کی اسٹڈی کی ایک کھڑکی باہر لان میں نکلتی تھی، پردہ سمیٹ دیتی۔ دھوپ کی کرنیں جب لان میں پھیل جاتیں، کھڑکی کے ذریعے گھس کر اس کی میز تک آجاتیں، پھر وہ ناشتے کے لیے اٹھ جاتی۔ آج وہ ناشتے کی میز پر اکیلی نہیں تھی، شاہ نور کو شوٹنگ پر جانا تھا، لہٰذا وہ جلدی اٹھ گئی تھیں۔

شبینہ نے تازہ اورنج جوس جگ سے گلاس میں انڈیلا اور ان کے آگے رکھا۔

”تھینک یو بیٹا!“ شاہ نور نے گلاس اٹھالیا۔

شبینہ نے آج پنیر آملیٹ بنوایا تھا، وہ بڑے شوق سے اپنا پسندیدہ ناشتہ کھانے میں مگن ہوگئی۔

”اسکن تو بہت گلو کررہی ہے تمہاری، کون سی کریم لگارہی ہو؟“ ممی نے بیٹی کو بغور دیکھا۔

”ممی! پانچ وقت وضو سے اسکن جو گلو کرتی ہے، وہ مہنگی سے مہنگی برانڈڈ کریم بھی نہیں کرسکتی۔“ شبینہ پنیر آملیٹ انجوائے کرتے ہوئے مسکرارہی تھی۔

”تمہاری تو آج کل باتیں ہی الگ ہیں۔“ ممی نے جوس کا گھونٹ بھرا، اچانک انہیں کچھ یاد آیا۔

”نیکسٹ منتھ ہماری ویڈنگ اینورسری ہے سلور جوبلی۔“

”مجھے یاد ہے۔“ شبینہ نے سر ہلایا۔

”میں نے اور کاشان نے مل کر بہت بڑی پارٹی پلان کی ہے۔“

”ویری گڈ۔“

”اب آپ سے ریکویسٹ ہے کہ ذرا اس پارٹی کو ڈھنگ کے حلیے میں جوائن کیجیے گا۔“ شاہ نور نے طنزیہ لہجہ اپناتے ہوئے بیٹی کو مخاطب کیا۔ شبینہ کی وجہ سے انہیں اپنے سرکل میں اکثر ہی کچھ نہ کچھ سننے کو مل جاتا، وہ جھنجلا گئی تھیں۔

”ایک دوپٹا ہی تو ہے ممی! کیا فرق پڑتا ہے؟“

”میں بھی تو یہی کہتی ہوں، کیا فرق پڑتا ہے۔ پہنو نہ پہنو۔“ شاہ نور نے جلدی سے بیٹی کو لاجواب کرنے کی کوشش کی۔

”نہ پہننے سے بہت فرق پڑتا ہے، بلکہ پڑگیا ہے۔“ شبینہ سنجیدہ ہوگئی۔

”کیا مطلب؟“

”دوپٹہ ہمارے لباس اور مشرقی تہذیب کا حصہ ہے۔ میں مذہب اسلام کو بیچ میں لائے بغیر بات کررہی ہوں کہ مشرق میں یہ مسلم قوم کے علاوہ ہندو اور دوسری اقوام کے لباس میں بھی شامل ہے۔ جب یہ اوڑھنی سر سے اتر کر شانوں پر اور پھر وہاں سے بھی بالکل ہی غائب ہوجاتی ہے تو لباس کے دوسرے حصے بھی آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتے ہیں۔ کبھی آستینیں نکل جاتی ہیں، کبھی شولڈرز پر سے، ٹانگوں پر سے، پیٹ پر سے، کمر پر سے، کم یا زیادہ کپڑا غائب ہونے لگ جاتا ہے اور اسے ہم فیشن کا نام دے دیتے ہیں۔“ شبینہ نے آج پہلی بار اتنی تفصیل سے بات کی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ سب سو سال پیچھے لوٹ جائیں، برقعے پہن لیں، گھروں میں قید ہوجائیں؟“ شاہ نور جوس پیتے پیتے بحث پر اتر آئیں۔

”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔“ شبینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”بھئی دنیا ہر معاملے میں ترقی کررہی ہے، ہر شعبے میں آگے جارہی ہے۔ فیشن میں بھی اسی طرح تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔“ ممی نے دلیل دی۔

”فیشن اپنانے میں، اس کے تبدیل ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ مسئلہ تب ہوتا ہے جب فیشن کے ساتھ ساتھ روایتیں اور قدریں بھی تبدیل ہونے لگتی ہیں۔“

”وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔“ شاہ نور نے لاپروائی سے کہا۔

”جو لوگ اپنی روایتوں اور قدروں کو محفوظ رکھنا اہم سمجھتے ہیں، وہ انہیں محفوظ رکھتے ہیں۔ ملکہ برطانیہ کی نئی نویلی پوت بہو پر شاہی خاندان کے رسم و رواج کی پابندیاں لاگو کی گئی ہیں۔ ان کے لیے باہر نکلتے وقت سر پر ہیٹ کا استعمال لازم ہے۔“ شبینہ نے خطہ مغرب کی ایک مثال دی۔

”ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے، ایک ہم ہیں جو اپنے چہروں کے ساتھ ساتھ اپنی نسلوں کو بھی بگاڑ رہے ہیں۔“

رائٹر بیٹی کے پاس دلائل اور لفظوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ انہیں تسلیم کرنا پڑا مگر پھر بھی ہار تو تسلیم نہیں کرسکتی تھیں۔

”مائی ڈیئر! ہم دنیا سے الگ تھلگ تو لائف نہیں گزار سکتے نا۔ دنیا کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔“ شاہ نور ذرا میٹھے لہجے میں بولیں۔

”کبھی کبھی ہم دنیا کے ساتھ ساتھ چلنے کے چکر میں، اللہ سے دور ہوجاتے ہیں۔“ شبینہ آہستہ سے بولی۔

”او کے، تم سے بحث کرنا فضول ہے۔ تم بے شک ٹوپی والا برقعہ پہن کر ہماری سلور جوبلی میں شریک ہوجانا۔“ شاہ نور لاجواب ہوگئیں تو جھلا کر بولیں۔

☆☆☆

شبینہ اپنی الماری ٹھیک کررہی تھی، جب شہیر کی کال آئی۔

”جو کچھ بھی کررہی ہو سب چھوڑ دو، میں ابھی لینے آرہا ہوں تمہیں۔“

”خیریت؟“ وہ ایک ایک کرکے کپڑوں کے ہینگر راڈ میں لگارہی تھی۔

”آکر بتاتا ہوں۔“

جب تک وہ آیا شبینہ اپنا کام تقریباً ختم کرچکی تھی۔ لاؤنج میں آگئی۔

”یہ لو۔“ شہیر نے اس کے آتے ہی ایک شاپر

میز پر رکھ دیا۔

"کیا ہے؟" شبینہ نے شاپر اٹھایا اور کھول کر دیکھنے لگی۔ جدید وضع کی بلو جینز اور اس کے ساتھ عنابی رنگ کا بے حد خوب صورت ٹاپ۔

"فٹافٹ تیار ہو جاؤ، میوزک کنسرٹ کے دو ٹکٹ لایا ہوں۔"

"ٹکٹ کی خیر ہے، مگر یہ کیوں لائے ہو؟" شبینہ اس کا لایا ہوا ڈریس دیکھ رہی تھی۔

"اپنے لیے شاپنگ کرنے گیا تھا۔ یہ تمہارے لیے اچھا لگا، لے لیا۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" شہیر نے جلدی جلدی کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔

"آرام سے بیٹھو، آ رہی ہوں میں۔" شبینہ نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ نک سک سے تیار، جینز اور شرٹ میں ملبوس، گھنے براؤن بال ماتھے پر بکھرے ہوئے، فرنچ کٹ داڑھی میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" موبائل میں مگن ہوتے ہوئے بھی وہ شبینہ کی جائزہ لیتی نگاہوں کا جائزہ لے چکا تھا۔

"دیکھ رہی ہوں، خاصے ہینڈسم لگ رہے ہو۔"

"تم نے تو میرا دل توڑ دیا۔"

"کیوں؟ تعریف تو کی ہے تمہاری۔"

"لگ رہے ہو کا کیا مطلب، میں ہینڈسم ہوں، ڈارلنگ!" شہیر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی، مسٹر ہینڈسم! کچھ لوگے۔ چائے، کافی، جوس، کولڈ ڈرنک، ایکسٹرا، ایکسٹرا......" شبینہ نے آداب میزبانی نبھائے۔

"صرف اور صرف تمہیں لوں گا۔ جو کھانا پینا ہے، ہم باہر جا کر کھائیں گے۔"

"اوکے۔" شبینہ شاپر لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تیار ہونے میں اس نے زیادہ وقت نہیں لگایا تھا۔

"چلیں؟" لاؤنج میں آ کر اس نے شہیر کو مخاطب کیا جو اپنے موبائل میں مصروف تھا۔

"چلو۔" شہیر نے موبائل آف کر کے سر اٹھایا، اسے دیکھا اور ٹھٹک گیا۔

"یہ کیا ہے؟ تم نے میرا لایا ہوا ڈریس نہیں پہنا؟" شہیر کے لہجے میں دبا دبا غصہ جھلک رہا تھا۔

"جینز پہن لی ہے، ٹاپ ٹھیک نہیں لگا مجھے۔ اس لیے یہ پہن لی۔" شبینہ نے اس کی لائی ہوئی جینز کے ساتھ بڑی خوب صورت اور اسٹائلش میچنگ کرتی پہن رکھی تھی اور ساتھ میں میچنگ اسکارف۔

"ٹاپ میں کیا خرابی ہو گئی؟" شہیر نے اسے گھورا۔

"بہت چھوٹی تھی شہیر! اور آستینیں برائے نام۔"

"پہلے تو پہنتی تھیں تم ایسے ہی کپڑے؟"

"اب نہیں پہنتی۔" شبینہ نے رسان سے جواب دیا، پھر بولی۔ "چلیں؟"

"جو ڈریس میں لایا ہوں، پہلے وہی پہن کر آؤ اور میری پسند کا ہیئر اسٹائل بنا کر آؤ۔" شہیر ضدی انداز میں مخاطب تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کس طرح بات کر رہے ہو؟" شبینہ اس کے لہجے اور انداز پر ہکا بکا رہ گئی۔

"بحث مت کرو، جو کہہ رہا ہوں، بس وہ کرو۔"

"شہیر! ہوش میں تو ہو تم؟" شبینہ کو غصہ آ گیا۔ "مجھے کیا پہننا ہے کیا نہیں، یہ میں ڈیسائیڈ کروں گی، تم نہیں۔"

"کیوں؟ میں کچھ نہیں لگتا تمہارا؟ پہلے بھی تو میری پسند کے ڈریسز پہنتی تھیں، اب کیا ہو گیا؟" شہیر تند لہجے میں بولتا ہوا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا تھا۔

"پہلے کی بات اور تھی۔" شبینہ دھیمی پڑ گئی۔

"ہاں، پہلے کی بات اور تھی۔ پہلے تم محبت کرتی تھیں مجھ سے، پروا کرتی تھیں میری۔ اب تو میں یہ دیکھ رہا ہوں، تم جب سے کینیڈا سے آئی ہو، بدل گئی ہو۔ تم وہ نہیں رہیں، جو یہاں سے گئی تھیں، کچھ اور ہی ہو گئی ہو۔" سدا کا جذباتی شہیر پھٹ پڑا تھا۔

"ہاں، میں بدل گئی ہوں مگر اس کی وجہ......" شبینہ تحمل سے آگے کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر شہیر نے بے صبرے پن اور غصے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھ سکتا ہوں میں ساری وجوہات، یقیناً کوئی ہائی فائی اور تمہارے مینٹل لیول کی وجہ ہو گی۔ بتا دیتیں مجھے، میں ہٹ جاتا راستے سے۔"

"اسٹاپ اٹ شہیر! جو منہ میں آ رہا ہے بول رہے ہو، بغیر سوچے سمجھے۔" شبینہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ وہ اتنی جلدی غصے میں نہیں آتی تھی مگر شہیر کی باتیں، غصے سے زیادہ اس کا دل دکھا رہی تھیں۔

"جاؤ یہاں سے، جب تمہارا دماغ ٹھکانے پر ہو، تب بات کرنا مجھ سے۔" شبینہ کو لگا، وہ کچھ دیر اور سامنے کھڑا اناپ شناپ بولتا رہا تو وہ رو دے گی۔

"بھگا رہی ہو مجھے؟" شہیر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔" شبینہ کی آواز بھیگ گئی اور آنکھیں بھی مگر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ ہی کب رہا تھا۔ شدید غصے نے اس کی آنکھوں پر جیسے پٹی باندھ دی تھی۔

"جا رہا ہوں، تمہارے گھر سے بھی اور زندگی سے بھی۔ تمہارے دل سے تو پہلے ہی نکل چکا ہوں۔" غم و غصے کی زیادتی سے اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ فوراً ہی نکل گیا تھا۔ شبینہ اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر بیٹھی تو اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

"محبت تھی یا پانی کا بلبلہ؟ لمحے نہیں لگے ختم ہونے میں۔" شبینہ کو شہیر کے رویے اور الفاظ کا بڑا رنج تھا۔ کچھ دیر تک اس کی آنکھیں روتی رہیں اور شہیر کی باتوں کو دل دہراتا رہا۔

رات خلاف معمول وہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔ اسے پوری امید تھی کہ شہیر فون بھی کرے گا اور سوری بھی۔ اس سے پہلے بھی وہ لڑ جھگڑ کے سوری کرتا رہتا تھا مگر رات گئے تک بھی اس کی امید بر نہیں آئی۔ مایوسی کے عالم میں اس نے سونے کے لیے آنکھیں موند لیں، مگر نیند بھی روٹھی ہوئی تھی شہیر کی طرح۔ پتا نہیں کتنی دیر میں آئی۔

☆☆☆

اگلا دن ہمیشہ کی طرح طلوع ہوا تھا۔ علی الصبح لان میں کھڑے گھنے سرسبز درختوں پر روز کی طرح پرندے چہچہا رہے تھے۔ اسٹڈی کی کھڑکی سے پرندوں کی سریلی آوازیں ہی نہیں۔ گلاب، چنبیلی، موتیا، سمیت بے شمار پھولوں کی خوشبوئیں بھی آتی ہیں۔ شبینہ کو ہر روز یہ سب کچھ اچھا لگتا تھا۔ مگر آج اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لکھنے میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا، جو کچھ وہ لکھ رہی تھی۔ خیالات، ایک نکتے پر مرکوز ہونے کے بجائے بھٹک بھٹک کر شہیر کی طرف جا رہے تھے۔ تنگ آ کر وہ باہر لان میں نکل آئی۔ ہر پھول بوٹا، پتا اسے اداس لگ رہا تھا حالانکہ اداس وہ نہیں اس کا دل تھا۔ صبح کی ٹھنڈی دل فریب ہوا بھی آج اسے سکون بخشنے کے بجائے بے سکون کر رہی تھی۔ ٹہل ٹہل کر اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں، وہ لان میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ایسے کب تک چلے گا۔ شہیر کا بچپنا ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ کسی بھی بات پر غصہ آ جائے تو بغیر سوچے سمجھے بک بک کرنے لگتا ہے۔ زندگی کیسے گزرے گی اس طرح اور اس بار تو حد ہی کر دی۔ پتا نہیں دماغ میں ایسی ایسی باتیں کہاں سے آتی ہیں۔"

شبینہ کو شہیر کے الفاظ، اس کا رویہ پھر یاد آئے تو اس کا رنج اور سوا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر اندر جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ باہر سے واچ مین کی آواز آئی۔ وہ کسی سے کچھ کہہ رہا تھا، شبینہ کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ اٹھ کر گیٹ کی طرف بڑھی، سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے اس نے

چوکیدار کو پکارا۔

''کیا بات ہے دلاور خان؟'' وہ پوچھ رہی تھی کہ اتنے میں دلاور نے گیٹ کھول دیا۔

''آپ کا مہمان آیا ہے بی بی صیب۔'' شبینہ نے گیٹ سے اندر آتے مہمان کی شکل دیکھی تو دنگ رہ گئی۔

''آپ؟'' اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

''السلام علیکم!'' صبح کی ٹھنڈی اور تازہ ہوا کی طرح اس کی مسکان بھی بہت اجلی تھی۔

''وعلیکم السلام۔'' شبینہ حیران ہوتے ہوئے بے ساختہ مسکرائی۔

''بہت خراب ہیں نانی، پرسوں ہی بات ہوئی تھی میری ان سے۔ بالکل بھی ذکر نہیں کیا کہ آپ آرہے ہیں۔'' شبینہ کے لہجے میں بچوں کی سی معصومیت اور شکوے کے ساتھ خوشی گھلی ملی تھی۔

''میں نے منع کیا تھا۔''

''کیوں؟''

''دیکھنا چاہتا تھا آپ حیران زیادہ ہوتی ہیں یا خوش؟'' بولنے والے کا لہجہ سادہ تھا مگر بات شاید اتنی سادہ نہیں تھی۔ شبینہ چند لمحوں کے لیے چپ ہوگئی۔

''اگر اجازت ہو تو مہمان بیٹھ سکتے ہیں؟'' دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں دیے شبینہ کے سامنے کھڑا اپنی دراز قامتی کے ساتھ بہت اسٹائلش لگ رہا تھا۔

''اوہ، آیئے۔'' شبینہ خجل ہوگئی۔

پاؤں آگے کی طرف پھیلائے وہ بہت آرام اور فرصت سے شبینہ کے سامنے والی لان چیئر پر بیٹھا تھا۔

''جی، اب سنایئے داستان۔'' شبینہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''داستان......؟ دل کی یا زندگی کی؟'' شبینہ کو اندازہ نہیں تھا کہ عباد اتنا حاضر جواب بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن وہ بھی کوئی گونگی تو نہیں تھی، فوراً بولی۔

''نہ دل کی، نہ زندگی کی۔ فقط اپنے سفر کی۔''

''مختصر سی داستان ہے، ٹکٹ کٹایا، جہاز میں بیٹھے اور کراچی آگئے۔ وہاں سے رات رمادہ (ایرپورٹ ہوٹل) میں ٹھہرے۔ صبح یہاں ہیں، آپ کے سامنے۔''

''ایرپورٹ سے سیدھا یہاں گھر کیوں نہیں آئے؟'' شبینہ نے اپنائیت سے گلہ کیا۔ کینیڈا میں اتنی اچھی مہمان داری ہوئی تھی ان کی اس لیے یہ شکوہ بجا تھا۔

''رات کافی ہوگئی تھی، اچھا نہیں لگا ڈسٹرب کرنا۔ صبح بھی بس میں یوں ہی نکل پڑا، کراچی کی صبح دیکھنے۔ دیکھتے دیکھتے رکا تو آپ کے گیٹ پر کھڑا تھا۔''

''گریٹ، اب آیا ہے داستان میں ٹوئسٹ۔'' شبینہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ کچھ دیر پہلے کی اپنی اداسی اور رنج وغم کی کیفیت وہ فراموش کرچکی تھی۔

''ناشتہ کتنے بجے کرتے ہیں آپ؟''

''جب میزبان کی مرضی ہو۔'' عباد نے کچھ سوچتے ہوئے بالوں میں ہاتھ چلایا۔

''میں، ممی اور ڈیڈ کو انفارم کردیتی ہوں۔'' شبینہ کھڑی ہوئی۔

''نہیں پلیز، میری وجہ سے کسی کو ڈسٹرب نہ کریں۔ مجھے پہلے ہی شرمندگی ہورہی ہے، بغیر کسی اطلاع کے، بے وقت میں یہاں پہنچ گیا۔''

''اتنا فارمل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آیئے، اندر آجایئے۔''

''یہیں اچھا لگ رہا ہے۔ درختوں، پھولوں اور پرندوں کی سنگت۔ درودیوار اور فرنیچر کی صحبت سے بہتر ہے۔'' عباد وہیں بیٹھا رہا۔ شبینہ، ممی اور ڈیڈ کو اٹھانے اندر چلی آئی۔

ناشتے کی میز لوازمات سے بھری ہوئی تھی اگر ہر شے تھوڑی تھوڑی بھی چکھی جاتی تو لنچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی، تم کراچی آئے اور ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ شام سے پہلے چیک آؤٹ کرکے یہاں آجانا۔'' شاہ نور بڑی اپنائیت اور محبت سے اسے ڈانٹ رہی تھیں۔ جسے کھاتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا۔

پھر ڈیڈ سے، پاکستان اور کینیڈا کے کاروبار و سیاسی معاملات کے بارے میں ذرا سنجیدہ گفتگو ہونے لگی۔

''مجھے ماہ نور آنٹی سے ملنے جانا ہے۔'' ناشتے کی میز پر عباد نے اعلان کیا۔

''آج تو شبینہ تمہیں کمپنی دے گی، میں شوٹنگ سے واپس آؤں گی شام تک۔ کاشان کو بھی کبھی شام کبھی رات ہوجاتی ہے واپسی میں۔'' شاہ نور نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''ڈونٹ وری آنٹی! آپ لوگ پلیز میری وجہ سے ڈسٹرب نہ ہوں، ویسے تو شاید مجھے یاد ہے ان کا گھر لیکن اگر شبینہ کچھ وقت نکال لیں تو مہربانی۔''

''میں لے چلوں گی۔'' شبینہ نے آہستہ سے کہا۔ کچھ خیال آتے ہی وہ سنجیدہ اور رنجیدہ ہوگئی تھی۔ ناشتے کے بعد عباد لاؤنج میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ شبینہ اپنے کمرے میں آگئی، موبائل اٹھا کر اس نے چیک کیا، نہ کوئی میسج، نہ مس کال۔ اس نے شہیر کا نمبر ملایا، موبائل بند جارہا تھا، وہ لاؤنج میں آگئی۔

''ماہ نور آنٹی کے ہاں شام تک چلیں گے۔ شہیر اور انکل بھی آفس سے آجائیں گے، ان سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔'' شبینہ کی تجویز پر عباد نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور کندھے اچکائے۔

''ٹھیک ہے۔''

''اب آپ ہوٹل چلیں اور اپنا سامان لے آئیں۔''

''پھر تم مجھے کراچی گھماؤ گی۔'' عباد نے جوابی شرط عائد کی۔

''ٹھیک ہے۔'' شبینہ نے مسکرا کر ہامی بھرلی۔

☆☆☆

کپڑے تبدیل کرنے کے لیے وہ الماری کھول کر سوٹ نکال رہی تھی، جب اس کا موبائل بجا، اسکرین پر شہیر کا نمبر چمک رہا تھا۔

''ہیلو۔'' شبینہ نے موبائل کان سے لگایا۔

''تم نے فون کیا تھا۔'' شہیر کی سنجیدہ آواز آئی۔

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''عباد آیا ہے کینیڈا سے، شام میں ہم لوگ تمہارے گھر آئیں گے۔''

''اچھا۔''

''عباد کو کراچی دکھانا ہے، کل تو تمہاری چھٹی ہوگی تو تم ساتھ چلو گے؟''

''ایک شرط پر۔''

''کہو۔''

''میری مرضی کی ڈریسنگ اور ہیئر اسٹائل۔''

''بچوں جیسی باتیں مت کرو شہیر!'' شبینہ نے بامشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔

''کیوں؟ کیا میں نے تمہاری مرضی اور خوشی کے لیے خود کو تبدیل نہیں کیا؟ تمہاری پسند کی ڈریسنگ کرتا ہوں۔ تمہیں میرے لمبے بال پسند نہیں تھے، میں نے کٹوالیے۔ تمہیں ماتھے پر بکھرے بال اچھے لگتے تھے، میں نے جیل لگانا چھوڑ دیا، ہیئر اسٹائل بنانا چھوڑ دیا۔ گلے میں چین پہننی چھوڑ دی، تم نے کہا پاپا کے ساتھ آفس جایا کرو۔ میں نے ان کے ساتھ آفس جانا شروع کردیا حالانکہ میرے سارے دوست ابھی تک ہر ذمہ داری اور کاموں سے فارغ، عیش کررہے ہیں۔ میں نے کیا نہیں کیا تمہاری خوشی کے لیے۔'' شہیر پھٹ پڑا۔

''میں نے تمہیں اپنی مرضی اور خوشی بتائی تھی، تمہیں پریشرائز نہیں کیا تھا۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''مگر میں کررہا ہوں، تم میری مرضی پر چلوگی یا نہیں؟''

”نہیں۔“ شبینہ نے دوٹوک جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ جو رنگ میں نے پہنائی تھی اسے ڈسٹ بن میں پھینک دینا۔“

”ڈسٹ بن میں کیوں پھینکوں؟ تمہیں واپس کردیتی ہوں۔ کسی اور کے کام آجائے گی۔“

شبینہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ شہیر نے بغیر کچھ کہے لائن کاٹ دی۔ شبینہ نے موبائل بیڈ پر پھینکا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ بڑی مشکل سے خود کو کمپوز کرکے وہ تیار ہوکر باہر آئی۔ عباد اسی کا ہی انتظار کررہا تھا، اخبار رکھ کر کھڑا ہوگیا۔

”آر یو آل رائٹ؟“ عباد نے اس کا چہرہ دیکھا تو ٹھٹک گیا۔

”ہاں، مجھے کیا ہونا ہے؟“ شبینہ زبردستی مسکرائی۔

”یہ وہ چہرہ نہیں ہے جسے لے کر تم اندر گئی تھیں۔“ عباد نے نفی میں سر ہلایا۔

”چہرہ تو وہی ہے، آپ کی شاید آنکھیں بدل گئی ہیں۔“ شبینہ نے مذاق میں بات کو اڑادیا۔

دن بھر کراچی کے مختلف مقامات دیکھ کر اور بے شمار سڑکیں ناپ کر انہوں نے شام میں خالہ کے گھر کا رخ کیا۔

”بہت سال پہلے میں کراچی آیا تھا، یہ شہر کافی بدل گیا ہے پہلے کے مقابلے میں۔“ عباد نے تبصرہ کیا۔

”ہاں بدل تو بہت گیا ہے۔“ شبینہ نے ایک گہری سانس لی۔ مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے وہ دیکھتے جارہے تھے، پل، فلائی اوورز، رہائشی عمارتیں، فلیٹوں کا جنگل اور کچرے کے ڈھیر۔ خالہ کے ہاں پہنچے تو انہوں نے پرتپاک استقبال کیا۔

”اتنے بڑے ہوگئے ہو ماشاءاللہ، پہلے جب آئے تھے کتنے چھوٹے سے تھے۔“ خالہ کے بے ساختہ انداز پر عباد ہنس پڑا۔

”وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔“

”بہت کچھ نہیں، سب کچھ۔“ شہیر نے لقمہ دیا۔ لہجہ عجیب تھا۔ الفاظ اس سے بھی عجیب...... خالہ اور عباد کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں شہیر کو دیکھنے لگے اور شبینہ سب کچھ سمجھ کر تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

شہیر گو، شبینہ سے بالکل لاتعلقی برت رہا تھا مگر ایک اچھے میزبان کی طرح وہ عباد کو کمپنی دے رہا تھا۔ ڈنر بہت پرتکلف اور شان دار تھا۔

”کب تک ہو یہاں؟“ شہیر نے سوال کیا۔

”ڈیپنڈ کرتا ہے، ایک خاص کام سے آیا ہوں۔ جیسے ہی کام ہوگیا، واپس چلا جاؤں گا۔“

”کیا خاص کام ہے؟“ خالہ بے ساختہ سوال کر بیٹھیں۔

”پہلے سے نہیں بتاسکتا، کام ہوجائے گا تو ضرور اناؤنس کروں گا۔“

”ایسا کیا سیکریٹ ہے؟“ شہیر کی نظریں عباد پر جم گئیں۔ شبینہ کچھ بے چین نظر آرہی تھی۔

اگلے روز امی، شہیر سے بات کررہی تھیں۔

”تمہاری پھر لڑائی ہوگئی شبینہ سے؟“ انہوں نے سب نوٹ کیا تھا کہ شہیر نے شبینہ سے بات بھی نہیں کی۔ جس طرح وہ کیا کرتا تھا بلکہ اسے یوں نظر انداز کردیا جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں، اسی لیے بیٹے سے پوچھ رہی تھیں۔

”میں کیا ہر وقت لڑائیاں کرتا رہتا ہوں؟“ شہیر جانے پہلے سے ہی بھرا بیٹھا تھا یا اس جواب طلبی سے چڑ گیا تھا۔

”ہر وقت تو نہیں مگر اکثر تمہاری ناراضی چلتی ہی رہتی ہے کسی نہ کسی بات پر۔ ہر دوسرے دن فون نہ کرے تو تم روٹھ جاتے ہو، ہر تیسرے روز ملاقات نہ ہو تو تمہیں غصہ آنے لگتا ہے۔ تمہیں سمجھانے کی کوئی بات کرے تو ناراض ہونے لگتے ہو۔ آخر کب بڑے ہوگے تم؟“

”بالکل اسی کی زبان بول رہی ہیں آپ اس وقت۔“ شہیر نے ناراضی سے ماں کو دیکھا۔

”زبان اس کی ہو یا میری، تمہارے لیے جو بات کہتے ہیں، تمہاری بھلائی کی لیے ہوتی ہے۔“

”معاف کردیں مجھے، نہیں چاہیے مجھے اپنی بھلائی۔“ شہیر کا لہجہ اور تلخ ہوگیا تھا۔

”شبینہ کی ہمت ہے جو تمہارے جیسے بگڑے نواب کو جھیل لیتی ہے۔“ امی کو اس کے لہجے اور رویے پر اب جلال آنے لگا تھا۔

”آپ اس کی ماں ہیں یا میری؟“

”دونوں کی ہوں۔ مجھے تو وہ بھی اتنی ہی پیاری ہے جتنے کہ تم ہو۔“ امی نے ترنت جواب دے کر اس کی شکل دیکھی پھر بولیں۔

”تمہارے پاپا کا خیال ہے کہ تمہاری اور شبینہ کی باقاعدہ رسم کردینی چاہیے اب۔ اگلے سال شادی۔ خدا جانے انہیں کیسے محسوس ہوا کہ تم اب ذمہ دار ہوگئے ہو۔“ امی نے اچانک ہی بم پھوڑا تھا۔ شہیر نے ہکا بکا ہوکر ماں کی شکل دیکھی۔

”پاپا کو یہ اچانک کیا سوجھی؟“

”اچانک؟“ امی نے بیٹے کو گھورا۔ ”سالوں سے تم میرے پیچھے پڑے ہو کہ پاپا کو راضی کرکے باقاعدہ انگوٹھی پہنادیں اسے۔ اسی چکر میں تم نے ان کے کہنے سے قبل آفس بھی باقاعدگی سے جانا شروع کردیا۔ اب یہ کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔“

”ابھی رہنے دیں منگنی اور شادی کی باتوں کو، بعد میں دیکھیں گے۔“ شہیر نے جانے کس دل سے کہا تھا۔ شاید اسی دل سے جس میں بیک وقت شبینہ کے لیے بے پناہ محبت بھی تھی اور بے تحاشا غم و غصہ بھی۔

”بعد میں کب؟“ امی نے تحمل سے اپنے عجیب و غریب بیٹے کو دیکھا۔

”ٹھیک سے سیٹل تو ہوجاؤں۔“ شہیر نے ماں سے نظریں چرائیں۔

”ہو تو گئے سیٹل، اب کیا اپنی الگ فیکٹری لگانی ہے۔ ہمارا جو کچھ ہے، سب تمہارا ہی تو ہے۔“

”جو کچھ بھی ہے۔ ابھی میں ذہنی طور پر ایسی کسی بات کے لیے تیار نہیں ہوا۔ فی الحال تو خاموشی اختیار کریں۔“ شہیر کا دل منتیں کررہا تھا۔ امی کی بات ماننے پر مگر انا نے دل کو پچھاڑ کر اس پر قبضہ کیا ہوا تھا۔

”تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے، وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتاؤ گے۔ اس وقت میرے پاس مدد کے لیے آئے تو ٹانگیں توڑدوں گی تمہاری۔“

انتہائی غصے کی حالت میں دی گئی ماں کی یہ دھمکی وہ بچپن سے سن رہا تھا۔ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

ناشتا معمول کے مطابق جلدی کرکے شبینہ نے سوالیہ نگاہوں سے عباد کو دیکھا۔

”آج کہاں چلیں؟“

”کہیں نہیں، آج گھر پر ہی رہنے کا موڈ ہے۔ تمہاری اسٹڈی اور کلیکشن دیکھیں گے۔“

”کیوں، الیکشن کی ریلیاں اور جلسے جلوس، جھیل جھیل کر پریشان ہوگئے جو آج کلیکشن کا خیال آگیا۔“ شبینہ مسکرائی۔ پچھلے تین چار روز سے روزانہ کہیں نہ کہیں یا تو کسی انتخابی ریلی سے ان کا واسطہ پڑجاتا یا پھر جلسے اور جلوس سے۔

”نہیں، پریشانی کی کیا بات ہے، میں تو اس قسم کے ایونٹ انجوائے کرتا ہوں۔“ عباد نے نفی میں سر ہلایا۔

”چلیے، آج گھر سے باہر کے بجائے گھر کے اندر کی سیر کریں۔“ شبینہ اسے اپنی اسٹڈی میں لے آئی۔

عباد شیلفوں میں سجی کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا، اچانک اسے کچھ یاد آیا۔

”آنٹی شاہ نور بتارہی تھیں کہ تم ماڈلنگ وغیرہ بھی کرتی ہو۔“ وہ سرسری لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”ایک ایڈ کیا تھا، آفر آئی، شوق میں کرلیا۔“ شبینہ بولنے کے ساتھ ساتھ اپنی میز پر موجود کاغذات اور اشیا ترتیب سے رکھ رہی تھی۔

"دوبارہ بھی تو آفر آئی تھی؟" عباد خاصا باخبر لگ رہا تھا۔

"ہاں، مگر مجھے انٹرسٹ نہیں ہے۔" شبینہ نے بے کار اور فالتو کاغذات ڈسٹ بن میں ڈالے۔

"آنٹی تو اسی فیلڈ میں ہیں، حیرت ہے تمہیں انٹرسٹ نہیں ہے اس فیلڈ سے۔"

"میرے شوق اور دلچسپیاں ممی سے ذرا الگ ہیں۔"

"کس پر چلی گئی ہو تم؟" عباد مسکرایا۔

"شاید......" شبینہ کچھ بولتے بولتے ٹھہر گئی۔ نگاہوں کے سامنے کوئی سایہ سا لہرایا۔ اجنبی بھی مانوس بھی۔

"شاید کسی اور پر چلی گئی ہیں۔ ممی سے پہلے والی جنریشن میں سے کسی پر۔" شبینہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تب ہی کچھ اولڈ فیشنڈ ہو گئی ہو۔" عباد کی نظریں اس کے سر پر موجود دوپٹے پر تھیں۔

"ہر نیا فیشن کچھ عرصے بعد اولڈ ہو جاتا ہے۔ اللہ کے قوانین ہی ہیں جو نہ پرانے ہوتے ہیں نہ متروک۔ جو قوانین چودہ سو سال پہلے تھے وہی آج بھی ہیں اور قیامت تک وہی رہیں گے۔"

"مگر لوگوں کا تو خیال ہے کہ دنیا نے بہت ترقی کر لی ہے، بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اب مذہب کا عمل دخل زندگی میں کچھ زیادہ ضروری نہیں سمجھا جا رہا۔" عباد نے شیلف سے ایک کتاب نکالی، ورق گردانی کرتا جا رہا تھا۔

"کچھ زیادہ بدلاؤ تو نہیں آیا دنیا میں۔" شبینہ اس کی بات پر غور کر کے جواب دینے لگی۔

"اللہ بھی وہی ہے، شیطان بھی وہی۔ انسان اور فطرت انسان بھی وہی، خیر و شر کا معرکہ ہر دور میں رہا ہے۔ رہی بات ترقی کی تو شاید آج کی دنیا بہت سے معاملات میں پہلے کی دنیا سے بہت بہتر ہے اور کچھ معاملات میں، بدتر بھی۔ مشینوں کی حکمرانی اسی طرح بڑھتی چلی گئی تو آنے والے دور میں انسان کم ہوں گے اور مشینیں زیادہ۔" شبینہ کا بحث کا ارادہ نہیں تھا پھر بھی وہ بولتی چلی گئی۔

عباد نے کتاب واپس شیلف میں رکھ دی اور شبینہ کی طرف مڑا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ میں یہاں ایک خاص مقصد کے تحت آیا ہوں۔"

"خاص مقصد؟ کسی سیکریٹ مشن پر آئے ہیں کیا؟" شبینہ نے مسکراتے ہوئے عباد کو دیکھا۔

"میں یہاں تمہارے لیے آیا ہوں۔" عباد سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرے لیے؟" شبینہ کی حیران اور بے یقین آنکھیں عباد پر جمی تھیں۔

"ہاں، تمہارے لیے۔ تمہاری وجہ سے میں یہاں آیا ہوں، دادی کو بلکہ امی، پاپا کو بھی تم بہت اچھی لگیں اور میں......" بولتے بولتے ایک لمحے کو رکا، ایک گہری سانس لی پھر کہنے لگا۔

"میں نے کبھی کسی لڑکی کے لیے ایسے فیل نہیں کیا جیسے تمہارے لیے کیا ہے۔ تمہارا آنا، تمہارا ساتھ مجھے کتنا اچھا لگا۔ میں شاید ٹھیک سے بیان نہ کر سکوں۔ پھر تمہاری واپسی کے بعد مسلسل تمہیں مس کر رہا تھا، دادی کا خیال تھا کہ مجھے یہاں آ کر تم سے اپنی فیلنگز شیئر کرنی چاہئیں اور خود میری بھی یہی خواہش تھی۔"

شبینہ یک ٹک اسے بولتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"نیاگرا فال دیکھ کر تمہارے آنسو نکل پڑے تھے۔ تم اللہ کی عظیم الشان قدرت دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھیں اور اس وقت تم نے مجھے جیسے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ شاید اسی لمحے نے مجھے تمہارا اسیر کر دیا اور اس وقت جس طرح تم مجھے حیران ہو کر دیکھ رہی ہو۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ حیران اور جادوگر آنکھیں مجھے اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیں گی۔"

عباد دھیرے سے مسکرایا تھا اور شبینہ یکا یک ہی ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی تھی۔

ان سے پوچھ سکتی ہیں......

"عباد! آپ......"

مگر عباد نے دایاں ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

"ایک منٹ ٹھہرو، ابھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، تم اچھی طرح سوچ لو پھر جواب دے دینا۔"

شبینہ نے ایک نظر اس شخص پر ڈالی جو اس سے محبت کا دعوے دار تھا۔ جس کی چمکتی آنکھیں، پرکشش اور متوازن شخصیت، سلجھا ہوا لب و لہجہ، کسی کو بھی اپنی طرف باآسانی مائل کر سکتے تھے۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں آپ کو ابھی بتا دیتی ہوں۔" شبینہ نے خود کو کہتے سنا۔

☆☆☆

کمرے سے باہر رات تھی اور اندر خاموشی۔

"اب کیا ہو گیا صاحب زادے کو۔ کہاں تو فرہاد مجنوں بنے ہوئے۔ اب یکا یک دوسرا کوئی جن سوار ہو گیا۔"

والد صاحب خاموشی ختم کر کے شروع ہو گئے۔ ان کا لہجہ اور باتیں طنز سے خالی نہیں تھے۔ بیوی بے بسی سے میاں کو دیکھ کر رہ گئیں، جتنا غصہ بیٹے کو آتا تھا۔ اس سے دو گنا باپ غصہ ور تھے۔ اب بیٹے کی وکالت کریں یا شوہر کی حمایت...... وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔ شوہر ان کے جواب کے انتظار میں تھے۔

"لڑائی ہو گئی ہے، ذرا غصے میں ہے اسی لیے ابھی انکار کر رہا ہے۔"

وہ بیگم سے لاڈلے بیٹے کی ماں بن گئیں۔ بڑے سبھاؤ سے بات بنانے کی کوشش کی، مگر ان کی وضاحت یا صفائی سن کر شوہر صاحب کا موڈ مزید آف ہو گیا۔

"یہ ذرا غصہ ہے؟ شدید ہوتا تو کیا غضب ڈھاتے محترم!" والد ماجد نے اپنی بیگم صاحبہ کو گھور کر دیکھا۔

"غصہ اتر جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

"خاک ٹھیک ہو جائے گا، ساری عمر یوں ہی رہے گا یہ نالائق، گدھا، الو کا پٹھا۔" والد صاحب کا جلال شروع ہو گیا اور بیگم صاحبہ مزید دبک گئیں۔ وہ سوچ رہی تھیں، بیٹا من و عن اپنے باپ پر ہی گیا ہے۔

☆☆☆

بالوں میں برش پھیر کر اس نے کیچر لگایا اور دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر باہر لان میں آ گئی۔ عباد کو خالہ نے ایک دو دن کے لیے اپنے گھر بلا لیا تھا۔ شبینہ نے اگرچہ پرسوں ہی اسے اس کی بات کا جواب دے دیا تھا اور وہ اپنے جواب پر مطمئن بھی تھی۔

زندگی میں امکانات اور ناممکنات ہمیشہ رہتے ہیں جو ہمیں ناممکن لگتا ہے۔ اچانک ہی اس کے ممکن ہونے کا کہیں نہ کہیں سے امکان پیدا ہو جاتا ہے اور جس کام کے امکانات سامنے ہی نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ وہ پتا نہیں کیسے ناممکن نظر آنے لگتا ہے، کیا اسی کو قسمت کہتے ہیں؟

وہ زندگی میں تقدیر کے فلسفے پر غور کر رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کے خیالات کی رو شہیر اور عباد کی طرف مڑ گئی۔ شہیر کو وہ بچپن سے جانتی تھی اور عباد کو اب جاننا شروع کیا تھا۔ وہ دونوں ہی بہترین انسان تھے بلکہ کچھ معاملات میں غیر جانب داری سے دیکھا جائے تو عباد کا پلہ بھاری تھا۔ شبینہ نے زیادہ نہیں سوچا اور ایک فیصلہ سنا دیا۔

بہت زیادہ سوچنے سے بھی الجھنیں بڑھتی ہیں۔ اس نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ اب جلد از جلد اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا تاکہ کوئی الجھن باقی نہ رہے، نہ ابھی کے لیے نہ آگے کے لیے۔

☆☆☆

امی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بیٹے کو یہ خبر سنانے پر اس کا کیا ردعمل ہو گا اور یہی ہوا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" حیرت کی زیادتی سے شہیر کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ایک ثانیے کو اسے یوں لگا جیسے دل کی دھڑکن رک سی گئی ہو۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وہ کرسی پر گرسا گیا۔

''کیوں...... کیوں نہیں ہوسکتا دنیا ہے...... دنیا میں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ وہ بھی جو بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ تمہیں کتنا سمجھایا تھا مگر تم تو یوں اکڑے ہوئے تھے جیسے اب کبھی سیدھے ہی نہیں ہوگے۔ دیکھ لو، نتیجہ اپنی ضد اور اکڑ کا اور بڑوں کی بات نہ ماننے کا۔'' امی کا لہجہ تیز تھا۔

''امی......!'' شہیر کی تو بولتی بند ہوگئی تھی، ماں کو مدد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''میں اب کچھ نہیں کرسکتی۔ تمہیں خود کچھ کرنا پڑے گا۔'' امی نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

''کیا کروں؟ شبینہ کے آگے ہاتھ جوڑوں یا کینیڈا سے آئے، اس ولن کو یہاں سے ڈی پورٹ کروادوں؟'' شہیر کے انداز میں بے بسی کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ بھی نمایاں تھی۔

''جو مناسب سمجھو، وہ کرو۔'' امی نے گیند اسی کے کورٹ میں واپس ڈال دی۔ اب اسے خود ہی کھیلنا تھا اور جھیلنا تھا۔

زندگی میں کبھی اتنی ریش ڈرائیونگ اس نے نہیں کی تھی، شبینہ کے گھر پہنچا تو محترمہ سورہی تھیں۔

''اف یہ ناقدری میری محبت کی؟ میرے جذبات کی کوئی وقعت ہی نہیں۔''

جب تک شبینہ ڈرائنگ روم میں آئی وہ غصے اور رنج کی کیفیت میں ٹہلتا رہا۔ جیسے ہی وہ اندر آئی، شہیر کا سارا غصہ بھاپ بن کر اڑ گیا اور رنج اور سوا ہوگیا۔ چند لمحے خاموش کھڑا وہ اس دشمنِ جاں کو دیکھے گیا۔

''کیسے ہو؟'' شبینہ نے ہی حال پوچھنے میں پہل کی، منہ دھونے کے باوجود بھی سوئی سوئی آنکھوں میں نیند کا خمار باقی تھا۔ لان کے بے حد خوب صورت کڑھائی والے سوٹ پر دوپٹہ سر پر اوڑھے سادہ سے چہرے کے ساتھ وہ اتنی پیاری اور دل کش لگ رہی تھی۔

''تم کیا کررہی ہو کل؟'' شہیر اضطراب کے عالم میں ایک قدم آگے بڑھا۔

''مگر تم کیسے کرسکتی ہو یہ؟'' وہ بس جیسے رو دینے کو تھا۔

''کیوں نہیں کرسکتی؟ نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اس نے مجھے پروپوز کیا تھا۔'' شبینہ نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اتنا ٹوٹا اور بکھرا ہوا آج سے پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔

''اس سے پہلے میں نے تمہیں پروپوز کیا تھا، تمہیں رنگ پہنائی تھی؟'' شہیر نے احتجاج کیا۔

''وہی رنگ؟ جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ اتار کر ڈسٹ بن میں پھینک دوں۔'' شبینہ نے اسے یاد دلایا۔

''میں نے غصے میں کہا تھا۔''

''غصہ صرف تمہیں ہی آتا ہے، تمہارے خیال میں مجھے غصہ نہیں آسکتا کبھی؟ میں نے تمہیں کتنی بار فون کیا۔ کتنی بار تم سے بات کرنے کی کوشش کی، تم نے ہر بار مجھے اگنور کیا۔ یہ تھی تمہاری محبت؟'' شبینہ اسے آئینہ دکھارہی تھی۔

''میں شرمندہ ہوں اپنے غصے پر۔'' شہیر کے چہرے پر اس کی آنکھوں میں ندامت تھی۔

''تم غصہ کرتے رہو اور اس پر شرمندہ ہوتے رہو، مگر ان سب کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' شبینہ ازحد سنجیدہ تھی۔

''مجھے معاف کردو پلیز، مت کرو یہ منگنی۔'' شہیر سچ مچ اس کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

''شہیر! تم نے میرا بہت دل دکھایا ہے، اپنے اور میرے تعلق کو کھیل تماشا بنادیا۔ تم نے میرے لباس پر، میرے دوپٹے پر اتنی تنقید کی، اتنا غصہ کیا جیسے میں کوئی غلط کام کررہی ہوں۔ کیا تمہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ میں آدھا ادھورا لباس پہن کر اپنی نمائش کروں سب کی سامنے۔''

رنجیدگی سے بولتے بولتے شبینہ کی آواز بھرا گئی، آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ شہیر کے دل کو یک دم ہی کچھ ہوا۔ وہ گھٹنوں کے بل اس کے آگے بیٹھ گیا۔

''میں سچ کہتا ہوں شبینہ! میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ بہت بہت زیادہ...... بچپن، لڑکپن، جوانی...... عمر کے ہر دور میں تمہیں ہی اپنے ساتھ دیکھا ہے اور سوچا ہے اپنی ساری جوانی اور بڑھاپا میں تمہارے ساتھ ہی گزارنا چاہتا ہوں۔ اسے میری خود غرضی ہی سمجھ لو، میری بے توفیوں اور نالائقیوں کو تم ہی برداشت کرسکتی ہو اور اپنا سکتی ہو۔ رہی بات لباس اور دوپٹے کی تو یقین کرو، تم اس میں پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت لگتی ہو۔ مجھے اس دن پتا نہیں کیوں اتنا غصہ آگیا اور بعد میں بھی میری ضد، بلاوجہ کی ضد تھی۔ میں جانتا ہوں اور تم...... تم اگر ٹوپی والا برقعہ پہن کر بھی میرے ساتھ چلوگی نا تو میں خوشی خوشی تمہارا ہم قدم، ہم سفر رہوں گا۔ خدا کے واسطے، میری بے وقوفی کی مجھے اتنی بڑی سزا مت دو۔'' شہیر سراپا التجا بنا ہوا تھا۔

''واپس چلے جاؤ شہیر! جو ہونا ہے وہ تو ہوگا کل۔'' شبینہ نے دھیرے سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''شبینہ...... میری بات سنو۔'' شہیر اس کے پیچھے لپکا مگر وہ تیزی سے نکل گئی۔

☆☆☆

لٹا پٹا، ہارا ہوا وہ گھر واپس آیا۔ گھر پر امی تھیں نہ پاپا، دونوں شاپنگ پر گئے ہوئے تھے۔ ملازم نے بتایا، اس نے شاہ نور آنٹی کا نمبر ملایا، بزی جارہا تھا۔ اپنی امی کا ملایا وہ بھی بزی۔ دل چاہا کہ فون کو اٹھا کر دیوار سے دے مارے۔ ٹہل ٹہل کر اس کی ٹانگیں شل ہوگئیں۔ فون ملا ملا کر تھک گیا، سوچ سوچ کر پاگل ہوگیا، دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔'' بے زاری سے بولا۔ اس کا خیال تھا کہ ملازم ہے، مگر وہ عباد تھا۔

''ہیلو۔'' وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اندر آیا، شہیر کا شدت سے دل چاہا کہ ایک زوردار مکہ مار کر اس کے سارے دانت مستقل باہر کردے۔

''ہیلو۔'' شہیر نے بے حد رکھائی سے جواب دیا۔

''صبح جلدی اٹھ جاؤ گے؟''

''کیوں؟''

''مجھے سی آف کرنے ایئرپورٹ چلوگے۔ میری فلائٹ ہے؟''

شہیر کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا، اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

''تمہاری صبح فلائٹ ہے تو شام میں شبینہ کی انگیج منٹ کس سے ہے؟''

''اسی سے...... جس نے اسے رنگ پہنائی تھی۔'' عباد کو وہ لمحہ اچھی طرح یاد تھا، جب شبینہ نے سوچنے کے لیے وقت لینے کے بجائے اپنا فیصلہ فوراً ہی سنادیا تھا۔ اس نے عباد کو رنگ دکھائی تھی۔

''یہ مجھے شہیر نے دی ہے۔ میری مرضی اور خوشی اسی سے وابستہ ہے۔''

عباد نے ایک اچھے انسان کی طرح اس کا

فیصلہ قبول کرلیا مگر اسے اپنے جذبوں کی پذیرائی نہ ہونے کا دکھ تھا۔

شہیر بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''شبینہ کی انگیج منٹ تم سے نہیں ہو رہی؟''

''نہیں، لکی بوائے! اسی لیے تو جا رہا ہوں، واپس۔'' عباد کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ تھی۔

امی اور پاپا اسی وقت مارکیٹ سے واپس آئے تھے۔ شہیر کا ہونق چہرہ دیکھ کر امی بے ساختہ ہنس پڑیں۔

''سب آپ کا پلان ہے۔ مجھے بے وقوف بنا رہے تھے سب مل کر۔'' ناراض ناراض لہجے میں وہ ماں سے مخاطب تھا۔

''بے وقوف نہیں بنا رہے تھے، سبق سکھا رہے تھے۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں اتنی ضد، اکڑ اور غصہ نہیں ہوتا ورنہ محبت روٹھ جاتی ہے۔''

امی نے پیار سے سمجھایا اور شہیر کی سمجھ میں تو پہلے ہی آ گیا تھا۔ آج تو اس کی جان ہی نکل گئی تھی، اسے اب پتا چلا کہ کتنی شدت سے وہ شبینہ کو چاہتا ہے۔ اس کا سارا غصہ، انا، ضد ایک طرف دھری کی دھری رہ گئی جب اسے پتا چلا کہ شبینہ کسی اور کی ہونے جا رہی ہے۔ وہ خوش نصیب تھا کہ اس کی محبت اس سے روٹھتے روٹھتے رہ گئی تھی۔

''میرے باپ کی توبہ جو میں نے آئندہ کبھی ایسا برا غصہ اور ضد دکھائی۔'' شہیر سچ مچ ماں کے سامنے کان پکڑے کھڑا تھا۔

''شریر! اب بھی خود توبہ کرنے کے بجائے باپ کی کروا رہا ہے۔'' امی نے اس کے کان کھینچے۔

''ویسے آپ کی بھانجی بہت بڑی ایکٹریس ہے، میں تو سچ میں دہل کر رہ گیا تھا۔''

''میں نے کہا تھا کہ ذرا ٹھیک سے تمہارا دماغ درست کرے۔ وہ بے چاری تو سیدھے سیدھے تمہیں فون کر رہی تھی سب کچھ بتانے کے لیے۔'' امی نے بھانڈا پھوڑتے ہوئے کہا پھر ایک بڑا سا ڈبہ کھولتے ہوئے انہوں نے سوٹ نکالا۔

''اسے ٹرائی کرو، ویسے ٹھیک ہی ہوگا۔ شبینہ کی پسند کا ہے، ابھی ہم سب نے مل کر خریدا ہے۔ جب تم یہاں دیوداس بنے بیٹھے تھے۔'' امی مزے سے بتا رہی تھیں۔

''اور ''اس'' کا جوڑا؟'' شہیر نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا۔

''میں نے اپنی پسند سے لیا ہے۔''

''گھونگھٹ والا ہے نا۔'' شہیر کے دل و دماغ سے سارا بوجھ اتر گیا تھا وہ واپس اپنی جون میں آ گیا۔

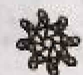
''بالکل گھونگھٹ والا ہے۔'' امی کا جواب سنتے ہوئے وہ اپنا سوٹ ٹرائی کر رہا تھا اور آنے والی کل کے خواب بن رہا تھا۔

☆☆☆

کوئی صدیاں تو نہیں گزریں، فقط ستر برس ہی تو گزرے ہیں۔ وہ نوزائیدہ مملکت جس نے انتہائی کسمپرسی اور بے سروسامانی کے عالم میں اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اپنی گولڈن جوبلی کے اگلے سال دنیا کی ساتویں اور عالم اسلام کی پہلی ایٹمی مملکت بن گئی۔ جس کے پاس دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام ہے، چاروں موسم ہیں، خوب صورت مقامات، محنتی اور جفاکش عوام ہیں۔ وہ ملک جو اندرونی اور بیرونی مسائل اور مشکلات میں گھرے ہونے کے باوجود بھی جینے کا ہنر جانتا ہے، آگے بڑھنے کی ہمت رکھتا ہے۔

شبینہ کا قلم تیزی سے، کتاب کے اس باب کو رقم کر رہا تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے اسٹڈی کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔

آج سورج کی کرنیں معمول سے زیادہ روشن اور خوش گوار تھیں اور خوش و خرم بھی۔ کیوں نہ ہوتیں، یہ سن دو ہزار اٹھارہ کے چودہ اگست کا سورج تھا۔ ویسی ہی شان اور آب و تاب سے طلوع ہوا تھا جیسے آج مملکت خداداد کے باشندے اپنا یوم آزادی منا رہے تھے۔



وہ میرا منگیتر تھا سرخ و سفید رنگت اور لمبے قد سمیت دیگر خوب صورتی کے معیار پر پورا اترتا تھا مگر میرے لیے وہ بس منگیتر ہی تھا کیونکہ امی ابو ایسا کہتے تھے اور میں سنتی تھی بس میں نے اسے کبھی منگیتر والا پروٹوکول نہیں دیا۔ شرمانا لجانا چھپ چھپ کے دیکھنا یہ صرف دوسری لڑکیاں کر سکتی تھیں شاید میں نہیں۔

ایک آدھ مرتبہ سہیلیوں کے کہنے پر میں نے اسے چائے دی تھی اور اس نے بھی چائے کو چائے سمجھ کر ہی پی لیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر نہ میرا دل دھڑکا نہ گال شرم سے لال ہوئے بلکہ سپاٹ سیدھے چہرے کے ساتھ گئی تھی اور ویسے ہی واپسی ہوئی تھی۔

وہ کبھی کبھار لاہور سے سرگودھا آیا کرتا تھا۔ امی ابو کے پاس بیٹھتا تھا ڈھیروں باتیں کرتا تھا۔ اپنے مستقبل کے حوالے سے بہت پریشان رہتا تھا۔ اسے کسی اچھی جاب کی سخت ضرورت تھی۔ ماموں کا کاروبار چھوٹا سا تھا اور کپڑے کی دکان ہی حصے میں آ سکتی تھی۔ وہ کچھ اور کرنا چاہتا تھا نام بنانا چاہتا تھا۔ میں اس کی باتیں ویسے ہی سنتی تھی جیسے دوسرے۔ درمیان میں اٹھ کر چائے پانی ہو یا شربت معمول کی طرح پیش کرتی اور پھر ریموٹ پکڑ لیتی۔ ابو خبریں سنتے اور حسیب کے ساتھ تبصرے ہوتے درمیان میں بحث چلتی اور پھر سب سو جاتے۔ اس کا آنا جانا یہیں تک تھا۔

بچپن کی منگنی تھی جو محبت میں نہیں بدلی تھی۔ یہ کوئی فلمی کہانی نہیں تھی کہ جس میں بچپن کی محبت کے رومانوی گیت گائے جاتے اور میں کھیتوں میں اچھل کود کرتی پھرتی عام سے دن تھے جو روٹین کی طرح گزرتے جا رہے تھے۔ ماموں جان حسیب کی نوکری کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسے اسی کاروبار کو سنبھالنا چاہیے تھا جو آگے چل کر اسے بہت کچھ دے سکتا تھا مگر حسیب نہیں مانتا تھا۔ وہ مسلسل دوڑ دھوپ میں لگا ہوا تھا۔

بڑے حبیب بھائی ماموں کے ساتھ ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کے دست راست تھے اور حسیب اپنے کام کی تلاش میں۔ اسے شایان شان ملازمت ملنی چاہیے تھی۔ آخر کو اس نے ایم بی اے کیا تھا۔ وہ بہترین طریقے سے بزنس سنبھال سکتا تھا مگر بڑے کاروبار کی خواہش تھی۔

میں نے بی اے کر لیا تھا اور گھر پر ہی تھی ابو شادی کے لیے زور دینے لگے تھے اور ادھر ماموں کے دلاسے اور مجبوریاں روز فون ہوتے مگر کچھ ہاتھ نہیں آتا بس امید دلائی جاتی اور صبر کی تلقین۔ ماموں خود بھی شادی کر دینا چاہتے تھے۔

ایک خرچے میں دو بہوویں آ جاتیں۔ مگر دھماکا تب ہوا جب حسیب نے شادی سے انکار کر دیا

شازیہ الطاف ہاشمی

کوئی بتلاؤ کہ ہم



ماموں سمجھانے میں لگے ہوئے تھے اسے مگر اڑتی اڑتی خبر ہمارے گھر تک بھی پہنچ گئی تھی میرا کہیں رشتہ کرنے کی کوشش تو کیا سوچا بھی نہیں گیا تھا امی ابو کو حبیب کی صورت اپنا داماد ملا ہوا تھا مگر وہ انکار کر رہا تھا۔

سارے خاندان کو رشتے کا پتا تھا اب ٹوٹنے کی وجہ کیا بتاتے سارے محلے اور خاص کر قریبی رشتے داروں نے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی ابو کا پریشانی سے برا حال تھا۔ امی بھائی، بھاوج کے دیے صدمے کو دل سے لگائے بیٹھی تھیں۔ کہاں غلطی کہاں کی تھی میں خوب صورت تھی۔ اس کے جوڑ کی تھی پڑھی لکھی تھی مگر اب انکار کی وجہ پہلے کیوں نہیں کہا۔ پہلے ختم کر دیتا تو اور بات تھی مگر اب شادی سے انکار کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ سب کے لیے اور بات تھی مگر میرے لیے وہ بھی نہیں تھی۔

میں شام کو روز کیاریوں میں پانی ڈالتی، گوڈی کرتی اور صبح صبح گلاب کے پھولوں کی خوشبو بھی ضرور اپنے اندر انڈیلتی۔ فجر کی نماز کے بعد تازہ ہوا کے ساتھ گلاب کی خوشبو کا تڑکا مجھے اب بھی روز کی طرح مسحور کرتا۔ امی تسبیح گھماتی جاتیں اور مجھے بھی دیکھتی جاتیں صبح کی یہ ـــ چہل قدمی مجھے تازہ دم کر دیتی تھی۔ پھر مزے دار خوشبو اڑاتے ہری مرچوں والے انڈے کے ساتھ پراٹھا اور چائے کا مگ دل کو گرمانے میں سورج کی آب و تاب کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا۔

ابو اخبار پڑھتے اور میں کالم' وہ مقامی خبریں اور میں بقیہ' روز مقابلہ چلتا۔ اب بھی چل رہا تھا دن کتابوں میں کھوئی رہتی اور رات کو سکندر اعظم کی فتوحات میں۔

امی ابو کے کان فون کی گھنٹی میں الجھ گئے تھے۔ وہ انتظار کرتے تھے اور انتظار مایوسی میں بدل جاتا ابو اب عینک ہٹا کر باقاعدہ آنسو صاف کرنے لگے تھے۔ میری عمر اتنی ہاتھ سے کبھی نہیں نکلی تھی۔ جتنی اب آگے بھاگ رہی تھی۔ مایوسی اب دیواروں پر بال کھول کے سونے ہی والی تھی کہ خاموش طبع حبیب بھائی نے مجھ سے شادی کا پیغام بھجوا دیا۔ گو کہ وہ عمر میں مجھ سے پندرہ بیس برس بڑے تھے مگر ان کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے بغیر انتظار کروائے مجھ سے شادی کر لی تھی اور ثابت کیا تھا کہ وہ دوسروں کا خیال رکھنے والے ـــ بھلے مانس آدمی تھے۔

حبیب بھی شادی میں بغیر نظر چرائے شریک ہوا تھا کیونکہ ہم دونوں میں نظر چرانے والا تعلق کبھی بنا ہی نہیں تھا۔ اب میں اس کی بڑی بھابھی تھی اور وہ میرا چھوٹا دیور۔

میرے دل میں اس کے لیے فیلنگز ہوتیں تو دل شکوہ بھی کرتا تھا۔ نہ احساس تھا اور نہ شکوہ، آگے کی راہ صاف تھی اور میں حبیب کا ساتھ پا کر خوش تھی۔ حبیب اب گھر دیر سے آتا تھا۔ پتا نہیں کہاں کہاں نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا۔ میں دل سے دعا کرتی تھی کہ اللہ اسے اس کی منشاء کے مطابق دے دے۔

میں اب اسی گھر کی بہو تھی اور اللہ نے عزت برقرار رکھی تھی مجھے کسی سے کوئی شکوہ گلہ نہیں تھا۔ اللہ حبیب کی جھولی بھی بھر دیتے تو کتنا اچھا تھا ناں؟

اور میری دعائیں قبول ہو گئی تھیں یا شاید بہت پہلے سے قبولیت کا شرف پا چکی تھیں۔ حبیب آئینہ سے شادی کرنا چاہتا تھا جو اسے ایک بڑا بزنس جما جمایا حوالے کر رہی تھی اس کی نیا پار لگی تھی تو اس نے شادی سے انکار کیا تھا۔

امی ابو، ماموں ممانی نے جا کر باقاعدہ رشتہ مانگا تھا وہ لوگ بہت مغرور، منہ چڑھے اور بدلحاظ تھے ماموں کو اعتراض تھا حبیب کو نہیں۔ زندگی اس نے گزارنی تھی ماموں نے نہیں۔ حبیب کی آنکھوں میں چھپے خواب حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔

☆☆☆

آئینہ نے گھر میں داخل ہوتے ہی پورے گھر میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور حبیب کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ اس کی قیمت بزنس کی صورت ادا ہو چکی تھی وہ گھر میں اپنی مرضی چلاتی تھی۔ فیشن کے نام پر مختصر کپڑے پہنتی تھی کسی کی مجال نہیں تھی کہ کچھ کہہ سکتا کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی اس کے میکے والے واہیات قسم کے لباس پہنتے تمام دن اس کے کمرے میں گزارتے بہت کم عرصے میں آئینہ یہ جان چکی تھی کہ میں حبیب کی سابقہ منگیتر ہوں۔ جس بات کو گھر میں غیر اہم جان کر بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ اب ایک دم دھماکے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ میں لاکھ قسمیں کھاتی کچھ بھی کر لیتی اسے یقین نہیں آتا تھا۔

وہ حبیب کو لے کر یہاں سے جانا چاہتی تھی مگر کبھی کسی معاملے میں دخل اندازی نہ کرنے والے ماموں نے اس بات سے روک دیا۔

پھر وہ امید سے ہوئی اور اس کے ہاں بیٹا ہوا تھا اور وہ بچہ پورے گھر کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ وہ مجھے بھی پیارا لگتا تھا گو حبیب اور میں اس کے کپڑے جوتے بھی لائے تھے مگر آئینہ اب بھی بدگمان تھی کیونکہ اس کی سوچ غلط تھی۔ وہ الزام لگاتی تھی اور حبیب بھیگی بلی بنا رہتا خیر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ میرا شوہر اور ساس سسر مجھ سے مطمئن تھے تو کیا غم۔

گئے دنوں کی بات تھی جس میں کوئی حقیقت نہیں تھی نہ سچ حبیب سے کبھی محبت نہیں کر سکی تھی۔ کیونکہ اللہ نے حبیب سے محبت کروائی تھی۔

''شہزاد'' پہلے کاٹ میں پڑا رہتا تھا مگر اب تھوڑا تھوڑا چلنے لگا تھا۔ آئینہ پہلے سے زیادہ بدتمیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں شہزاد کو نقصان پہنچاؤں گی کیونکہ اس کے باپ نے مجھے چھوڑ کر اس کی ماں سے شادی کر لی تھی اور دوسرے ان کا کاروبار بھی تیزی سے نیچے کی طرف آرہا تھا جبکہ حبیب اور ماموں کے کاروبار میں دن رات ترقی ہو رہی تھی۔

میں نے شہزاد کی طرف دیکھنا تک چھوڑ دیا تھا کیونکہ میں خود امید سے تھی۔ اللہ نے میری گود میں بھی نشانی اتار دینی تھی اور یوں بھی شہزاد تو بچہ تھا مگر اس کی ماں بچی نہیں تھی۔

میں کچن میں چائے بنا رہی تھی کہ شہزاد ہاتھ میں فیڈر لیے اندر چلا آیا۔ وہ بار بار دودھ کو دیکھ کر غوں غاں کر رہا تھا۔ اسے یقیناً دودھ چاہیے تھا میں ابھی فیڈر میں نیم گرم دودھ ڈالنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ آئینہ نے ایک دم کچن میں آئی اور چیخنے لگی کہ میں اس کے بیٹے کو دودھ میں زہر دے رہی ہوں حالانکہ فیڈر خالی تھا مگر وہ جذباتی انداز میں چیخ رہی تھی سب جمع ہو گئے تھے۔

سب جانتے تھے کہ وہ جھوٹی ہے مگر چپ تھے کیونکہ ماموں دونوں بیٹوں میں سے کسی کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

وہ بکتی جھکتی بیٹے کو لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

''میں جا رہا ہوں تم شہزاد کا اسپیشلی خیال رکھنا اور اسے بھابھی سے دور رکھنا۔''

''اوکے'' حبیب نے ان کے کمرے کے آگے سے گزرتے سن لیا تھا تو یہ حبیب بھائی تھے جو بیوی کو خوش رکھنے کے چکر میں اس کی بات مان چکے تھے۔ میں ان سے کہنا چاہتی تھی کہ تم کسی کی محبت کے لائق ہی نہیں تھے جب ہی تو میں نے تمہیں چاہا ہی نہیں تم تو پیسے کے عوض خریدے جانے والے شوہر ہو اور مجھے بکاؤ مال نہیں چاہیے شوکیس میں سجے کھلونوں جیسے جو کوئی بھی راہ چلتا چند روپوں کے عوض خرید سکتا ہے۔ تم بیوپاری کے مال کا ڈھیر ہو جسے کوئی بھی لے سکتا ہے۔

حبیب کی اس سوچ نے اسے اور گھٹیا ثابت کیا تھا جبکہ اس کے سامنے صاف ستھرے راستے اور اچھی سوچ کے زینے تھے کیونکہ اچھی سوچ ہمیشہ جیت جاتی ہے اور گھٹیا سوچ منہ کے بل گرتی ہے۔ اللہ نے درست فیصلہ کیا تھا جس کے نتیجے میں، میں حبیب کے ساتھ تھی اور آئینہ اپنے جیسے آئینے کے ساتھ تھی۔

☆

منشا محسن علی

رب کی بستی

زندگی کے پھاٹک پر آزمائشیں ہارن بجا رہی ہیں اور یہ پھاٹک تو کھلا رہتا ہے۔ ساری زندگی...... ہر شام۔

پچھلے ایک گھنٹے اور دس منٹ سے میں لان کی کھردری اور بے رنگ گھاس پر اکڑوں بیٹھی ہوں۔ زندگی کا پھاٹک کھل چکا ہے اور اندر داخل ہونے والی چیزوں میں بدکرداری، نافرمانی، بے اعتباری اور جانے کیا کچھ شامل ہے۔ لفظ آک کی ڈوڈیاں تھے۔ سماعتوں میں جلن پیدا کرنے والے اور وہ سرمئی شام

ناولٹ

نائک کی پیداوار......

"بیٹیاں ایسی ہوتی ہیں۔ کتنا روکتا تھا تمہیں اپنی زندگی گزارو...... دوسروں کی زندگیاں گزارنے کی ضرورت نہیں تمہیں...... تم تو مدر ٹریسا بننے چلی تھیں۔ مدر ٹریسا کا زمانہ گزر چکا۔ آج کی بھلائی چابک کی طرح پھر اپنے ہی چہرے پر لگتی ہے۔ آج چار دن اور پانچویں دن کی شام کو تم اس حال میں گھر واپس آئی ہو۔ سو انگلیاں اٹھی ہیں میری طرف تمہاری جاہل اور ان پڑھ ماں کو بھی یونہی دوسروں کی مصیبتیں سر لینے کا شوق تھا۔"

میری آنکھ کے ہر قطرے کو زمین چوستی رہی۔

مولسری کے پودے کی مہک لوبان سلگنے کی سی تھی...... کبھی کبھی ہوتے ہیں ناں ایسے لمحے کہ اپنا گھر بھی اپنا نہیں رہتا۔ میری زندگی میں آنے والا وہ ایک ایسا ہی لمحہ تھا۔ آندھی رک چکی تھی مگر درختوں کی جڑیں باہر آ چکی تھیں۔ شیاما چڑیوں کے گھونسلے تنکوں کی صورت اڑ گئے تھے۔

میں نے ڈبڈبائی آنکھیں اٹھائی تھیں۔ پورچ کے سرخ اینٹوں والے فرش پر وہ ہاتھ باندھے کھڑی تھیں...... ان کے الفاظ بھی آک کی ڈوڈیاں ہوتے تھے، سچ سچ۔ چلتی وہ قریب آئی تھیں اور میرے پاس اکڑوں بیٹھ گئی تھیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو قدم قدم پر آپ کو حیران کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں لگائے گئے آپ کے سارے اندازے غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ پریسہ جہان......



میری دوسری ماں......!!!

''کتنا ہانٹ کرتا ہے ناں اس عمر میں اپنے قد سے بڑی جنگ لڑنا...... تبدیلی کی خواہش کرنا...... انقلاب کے نعرے بلند کرنا......اور پھر ہار جانا۔''

''میں ہاری نہیں ہوں پریسہ!'' میں انکار میں سر ہلاتے ہوئے رو پڑی تھی۔

مگر میں تو ہار گئی تھی امید۔'' جانے کتنے کانچ ٹوٹے تھے شور نے پردے پھاڑ دیے۔

''فرق پتا ہے کیا تھا میں صرف اپنے لیے کھیل رہی تھی اور تم۔'' بات ادھوری رہ گئی تھی۔ میں نے انہیں کبھی روتے نہیں دیکھا تھا وہ تو چٹانوں کا سا وجود رکھتی تھیں۔ ''اپنے لیے نہیں کھیلتی ہو امید، تم دوسروں کے لیے کھیلتی ہو میں نے تمہارے بارے کبھی اچھا نہیں سوچا مگر آج میں تمہارے بارے میں برا بھی نہیں سوچ رہی۔'' وہ ہولے سے اٹھی تھیں۔ لباس شکن آلود تھا۔

''تمہارا باپ کہتا ہے کہ میں تم سے پوچھوں کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے اور شکر ہے مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔'' آسمان چار ٹکڑے ہو کر میرے چاروں طرف گر چکا تھا۔ میری سانسیں کروشیا کے گھروں کی مانند الجھ گئیں۔

''کیا مطلب......؟'' میری آواز پر وہ مڑی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے میری آواز پر مڑتی آ رہی ہیں اور ہر واپسی پر ان کے پاس میرے لیے آک کی ڈوڈیاں ہی ہوتی ہیں...... مگر آج زمین میں کیل ہو گئی تھیں۔ دھات کی مانند ٹھنڈی اور سخت......!!!

''میں تو یہ سوچ کر ہنستی آئی تھی کہ تمہارے چہرے پر عزت چلے جانے کے غرور کو ٹوٹتا دیکھوں گی۔ مگر یہاں تو باپ کے اعتماد کو بے اعتباری میں بدلتا دیکھ رہی ہوں۔ اور پتا ہے کیا دیکھا میں نے؟'' پریسہ نے آنسو انگلی کی پور سے صاف کیا تھا...... وہ شام ناٹک تھی اور میں نوٹنکی...... پہیلیاں تھیں اور سلجھنے سے محروم۔ ''میں نے اپنا آپ دیکھا...... پریسہ جہان کو، میں تو تین دن گھر سے باہر تھی امید...... ہم لڑکیوں کو چھوٹی غلطیاں بڑی سزا دیتی ہیں...... میں بھی ایسے ہی رو رہی تھی اور میری ماں میرے باپ کا سوال لے کر آئی تھی تب عزت کا غرور نہیں ٹوٹا تھا...... اعتبار کا مان ٹوٹا تھا اور ساری زندگی سنبھل کر فیصلے کرتی میری ماں دھوکا کھا گئی......

وہ عزت کی موت کا جواب لے گئی...... وہ میری ماں کی غلطی تھی اور آج میں اسی جگہ ہوں سوتیلی ہی سہی مگر ہوں تو ماں ناں...... ماؤں کو بیٹیوں کے ہر آنسو کی کتھا معلوم ہونی چاہیے ورنہ غلط جواب لے کر جانے والیاں ہر شام چیختی رہتی ہیں...... کونج ڈاریں اس بار رستے نہیں بھولی تھیں...... منزلوں کے رقعے ان کی چونچوں کی گرفت میں تھے۔

وہ گلابی ہاتھوں والی، موٹی آنکھوں اور گھنگھریالے بالوں والی ماہ نور جہاں تھی جو میرے کپڑوں سے گرد کو جھاڑ رہی تھی۔

''آپو...... آپ کہاں چلی گئی تھیں......؟''

''دور...... بہت دور......''

''میں نے آپ کو بہت مس کیا۔'' وہ میرا چہرہ، ہاتھ چوم رہی تھی۔

''مما نے کہا تھا آپ چاند کی بڑھیا کے پاس گئی ہیں بے چاری بڑھیا کے سوت کا چرخہ ٹوٹ گیا تھا۔

کیا آپ نے بے چاری بڑھیا کی مدد کی تھی آپو......؟'' مانو کا ہر سوال ادھورا رہ جاتا تھا کیوں کہ وقت کو اسی وقت پورا ہونا ہوتا تھا۔

عجب بیر تھا مانو اور وقت کا اک دوجے سے...... گل خان گیٹ کھول رہا تھا اور میں نے میڈیا کے ہجوم کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ سب کے سب میرے ساتھی تھے میں نے ان کے ساتھ وقت گزارا تھا آج وہ میرے سامنے تھے۔ جانے کیسے ہمیں خبر ہو جاتی ہے کہ ہم میں سے کس کس کو حوصلے اور تسلی کی ضرورت ہے؟ کس کو ایک تھپکی اور کسی کو ٹشو کا ڈبا تھمانا ہوگا؟ آج شاید وہ جان سکیں کہ مجھے کس شے کی ضرورت ہے۔

لان کے اندھیرے میں، میں ان کے چمکتے

چہروں، فلیش لائٹس کو دیکھ رہی تھی اور تب ہی میں نے مہک نواب کو مائیک پر بولتے سنا تھا۔

''جی ناظرین بہت افسوس کے ساتھ ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ اب ہم آپ کی ملاقات اپنی کولیگ امید جہاں سے کروانے جا رہے ہیں جو آج ساڑھے چار روز کے اغوا کے بعد واپس آئی ہیں۔ حبس بے جا میں رکھنے کے علاوہ سنا ہے ان کے ساتھ......'' زمین شق ہو گئی۔ وہ صرف اور صرف ''خبر'' لینے آئے تھے۔ ناٹک نے میری روح کھینچ لی تھی۔ پریسہ جہاں میری ماں تھیں اور مہک نواب میری بہترین ساتھی...... پریسہ جہاں ابا کے لیے جواب لے گئی تھیں اور مہک نواب ''زمانے'' کے لیے آئی تھی۔

☆☆☆

''دی جسٹس'' کے آفس میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ صدف گروسری سے لدی پھندی آئی تھی اور گاجر، شلجم، کھیرے، سلاد سامنے گلاس ٹیبل پر ڈھیر کر دیے تھے۔ وہ کوکنگ پروگرام کرتی تھی جو سوا دو گھنٹوں کا ہوتا تھا۔ سارا نے ناک سکوڑا تھا۔

''یہ دی جسٹس کا آفس ہے یا سبزی منڈی؟'' وہ بہت نفاست پسند اور دل کی اچھی لڑکی تھی۔ رافع کا چین رکا تھا۔

''جب جواب کا پہلے سے پتا ہو وہاں سوال کرنے کا فائدہ؟''

''ایک تو صدف تم پچھلے دو ہفتوں سے سبزیاں کھلا رہی ہو ہمیں۔ تمہارے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے پتھر'' صدف بہت خوبصورت ہنستی تھی۔

''میری غلطی نہیں، واسطی صاحب کا کہنا ہے کہ چینل کرائسز میں جا رہا ہے تو بجٹ کا خیال رکھا جائے۔'' مہک فائنل پچ کے بعد ریڈی ہو چکی تھی رسٹ واچ دیکھتی، لیپ ٹاپ اٹھاتی وہ جانے لگی۔

''ہم تو بھئی جب سے آئے ہیں یہ چینل کرائسز کا ہی شکار ہے۔'' میں نے اسائنمنٹ سے سر اٹھایا تھا۔

''سبزیوں کی ریسپیز سکھا کر جیسے بجٹ کا بحران ختم ہو جائے گا۔'' دھاڑ سے واسطی صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور غصے سے تن فن کرتا جندب باہر آیا تھا۔ میں نے چوری سے نظر اٹھائی تھی۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس، بال جیل سے سیٹ کیے، بھوری آنکھوں میں بے تحاشا غصہ تھا۔ وہ دھم سے آ کر میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ''کوئی مجھے ایک کاغذ اور پنسل لا دو۔'' انداز میں بے تحاشا سنجیدگی تھی۔ صوفوں کے نیچے پھسل جانے والا شلجم ڈھونڈتی صدف ہی پوچھ سکی تھی۔

''خیریت تو ہے؟''

''میں ابھی اور اسی وقت استعفیٰ لکھتا ہوں اور یہ چینل چھوڑ کر جا رہا ہوں۔'' رپورٹ سٹیپل کرتے رافع کے ہاتھ ایک بار پھر رکے تھے وہ ہر واقعے کو پوری طرح انجوائے کرتا تھا۔ لڑائی جھگڑوں، غنڈہ گردیوں، بھتہ خوروں سے متعلق ہر رپورٹ رافع کے ذمہ ہوتی تھی...... وہ انگلیوں کی پوروں پر گنتی کر رہا تھا۔

''یہ شاید کوئی تیرھویں دفعہ ہے جب تم نے کاغذ پنسل منگوا کر استعفیٰ لکھنے اور یہ چینل چھوڑنے کی دھمکی دی ہے۔'' جندب گڑبڑایا تھا۔

''میں اس بار سچ کہہ رہا ہوں۔'' رافع نے ہونٹوں سے پھسلتی ہنسی روکی تھی۔

''پچھلے بار بھی تمہارے سچ ہی تھے جو سیاستدانوں کے وعدوں کی طرح پورے نہ ہوئے...... آدھ گھنٹے بعد بلیک کافی پی کر سب نارمل ہو چکے تھے۔ مہک نیوز روم سے ابھی آئی تھی اور وہ کافی کے ساتھ ساتھ اسنیکس بھی کھا رہی تھی اسے بھوک بہت لگتی تھی...... اس کا بیگ، ''کھانا گھر'' تھا جس سے کھانے کو کچھ نہ کچھ برآمد ہوتا ہی رہتا تھا۔ اور آفس کا ہر شخص فیض یاب ہوتا تھا......

میں اپنا آئیڈیا مکمل کر چکی تھی اور سب کو سنا رہی تھی۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے میں حتیٰ الامکان ان کے چہرے دیکھنے سے گریز کر رہی تھی

کیونکہ وہ عجیب وغریب شکلیں میرے حوصلوں کو ریت کا ڈھیر بنا سکتی تھیں۔ تالیاں بجنی ختم ہوئیں اور میں سوالیہ نظریں اٹھاتے ہوئے ان سب کو دیکھا تھا......

''آئیڈیا بُرا نہیں مگر......؟'' کھیرے کے سلائس کاٹتی صدف نے میرا سانس روک دیا تھا۔

''مگر......'' واسطی صاحب نہیں مانیں گے۔''

میرا منہ لٹک گیا تھا۔ مہک میری مدد کو آئی تھی۔

''اپ سیٹ کیوں ہوتی ہو امید...... اس خر دماغ آدمی کو کچھ بھی، کبھی بھی پسند آسکتا ہے۔'' پورے آفس میں مہک واحد ہستی تھی جو انہیں قائل کرلیتی تھی۔ وہ لندن سے پڑھ کر آئی تھی اور ایسی باتیں واسطی صاحب کو بڑا امپریس کرتی تھیں...... میں نے جنیدب کو دیکھا تھا ان آنکھوں میں میرے لیے ستائش تھی۔ میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

☆☆☆

''آپ امید جہاں ہیں نور جہاں نہیں ہیں کہ سارے لوگ آپ کو اشتیاق سے دیکھیں گے اور سنیں گے۔ آپ کا کمزور سا آئیڈیا تو یقیناً ریٹنگ کے پیمانے توڑ کر رکھ دے گا۔'' واسطی صاحب کرسی سے گرتے گرتے بچے تھے۔ تھری پیس سوٹ میں ان کی توند خطرناک حد تک نمایاں ہو رہی تھی۔ سامنے رکھا ایش ٹرے سگریٹ کی راکھ سے بھر چکا تھا۔ اس چار کھڑکیوں والے کمرے میں جانے کیوں مجھے گھٹن سی ہوتی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھی مہک میری مدد کو آئی۔

''سر...... یقیناً یہ ایک یونیک آئیڈیا ہے...... اگر یہ چل گیا تو ریٹنگ ساون کی بارش کی طرح برسے گی۔'' واسطی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔

''ساون کی بارش کی طرح...... دی جسٹس تو پھر ڈوب جائے گا امید جہاں۔'' میرا دل چاہ رہا تھا پیپر ویٹ اٹھا کر ان کے سر میں دے ماروں......

''سر...... سمجھنے کی کوشش کریں...... یہ دوسرے چینلز سے ہٹ کر ہے اور آج کل تو ہر نئی چیز بہت تیزی سے قبول کی جارہی ہے۔'' میں نے شیشے کے دروازے کے پار سے سب کی نظروں کو خود پر جما ہوا محسوس کیا تھا۔ انہیں سنائی تو کچھ نہیں دے رہا تھا مگر دکھائی سب رہا تھا۔

''میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔'' ان کا پُرسوچ انداز ہمیں پرجوش سا کر گیا تھا' ہماری خوشی سوئی میں دھاگا ڈالنے جیسے ہی تھی۔

''وہ کیا سر جی؟'' مہک نے ہاتھ آپس میں رگڑے تھے۔

''یہی کہ مینٹل ہاسپٹل کال کروں کہ سارے پاگل دی جسٹس میں جمع ہوگئے ہیں براہ مہربانی انہیں ساتھ لے جائیں۔'' ہائے حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے۔

''سر...... آپ ہماری توہین کر رہے ہیں۔''

''توہین کے معنی سے میں اچھی طرح واقف ہوں لیڈیز...... اصل بات یہ ہے کہ ساری دنیا کے لطیفے اس ادارے میں وجود پا رہے ہیں اور افسوس ہے کہ ان لطیفوں پر رونے کے علاوہ کوئی ری ایکشن نہیں دیا جاسکتا۔'' دھاڑ سے دروازہ بند کرتے ہم باہر آگئے تھے۔

''قاتلوں کی فہرست میں واسطی صاحب کا نام بھی ڈال لو۔'' مہک صوفے میں دھنس گئی اور میں ناخن چباتی رہ گئی۔

''ارے کیوں؟''

''یہ شخص ہمیں قتل کر کے رہے گا۔ دنیا بھر کا موٹا انسان۔'' مہک کے تیکھے نقوش غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔ واسطی صاحب تین سالوں سے ہمارے سروں پر مسلط تھے ایسی ڈھیٹ ہڈی تھے جو نگلی جاسکتی تھی اور نہ ہی اگلی جاسکتی تھی۔ صدف نے ادھر اُدھر دیکھا اور فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی...... بہت کم موقعوں پر اس کے اندر ہٹلر کی روح نمودار ہوتی تھی اور شاید آج وہی وقت تھا۔

''میں جا رہی ہوں ——————

—— آفس چھوڑ کر......؟'' صدف اور رافع میں

شروع دن سے ٹھنی رہتی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے آفس چھوڑ جانے کے منتظر رہتے تھے مگر یہ انتظار لاحاصل ہی تھا...... کہیں آج......؟

''تمہارے منہ میں گوبر...... واسطی صاحب کے پاس۔'' اور اگلے پانچ منٹ میں وہ واسطی صاحب کے سامنے دھواں دار تقریر شروع کر چکی تھی۔ کسی زمانے میں وہ سارے مقابلے ہاری ہوئی مقررہ رہی تھی اور آج وہ سارا لاوا باہر آنے کو تھا۔ جس میں واسطی صاحب جل کر راکھ ہونے والے تھے۔

''ریٹنگ...... ریٹنگ...... کیا بلا ہے یہ......؟ سامنے لائیں میرے مکھی بنا کر دیوار پر نہ چپکا دوں تو صدف نام نہیں میرا...... آپ امید جہاں کے آئیڈیے پر نظر ثانی کریں۔'' سگریٹ کے مرغولوں کے پار صدف کو دھوئیں میں ان کا چہرہ مشکل سے ہی دکھائی دیا تھا۔

''وجہ......؟''

''وجہ یہ ہے سر! کہ آج کل ہر چینل سیاست، کرپشن کے پیچھے پڑا ہے۔ میڈیا صرف اور صرف سیاست کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اور پاکستان کے سارے عوام سیاسی نہیں ہیں۔ عوام اکتا چکے ہیں۔ انہیں کچھ نیا چاہیے...... آپ انہیں کچھ نیا دیں آپ کو ریٹنگ ملے گی۔'' وہ دلائل کی پٹاری سے ایک ایک کر کے دلیلیں باہر کر رہی تھی' واسطی صاحب نے نشست کا انداز بدلتے ہوئے آنکھیں چندھی کر کے اسے دیکھا تھا۔

''مس صدف سرفراز...... رب کی بستی، سب کی بستی، امید کا آئیڈیا ہے...... وہ نائیوں، درزیوں، ڈاکٹروں، موچیوں، ادیبوں کے انٹرویوز کرنا چاہتی ہے۔ آج کل عوام سیاست چاہتے ہیں بس۔ صرف اور صرف سیاست...... نائی، موچی، درزی، لوہار یہ عام لوگ ہیں۔ اور عام لوگوں کے آئیڈیل عام لوگ کبھی بھی نہیں ہوتے۔ میں یہ رسک کیسے لے لوں؟'' وہ سخت متامل تھے۔

''سر ایک ہفتے کا ٹرائل ہے بس اگر ریٹنگ آجائے تو ٹھیک ورنہ اس شو کو مکمل سیاسی شو میں بدل دیجیے گا۔''

واسطی صاحب کمرے میں ہاتھ باندھے ٹہلنے لگے تھے۔ صدف جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگی تھی آخر عزت کا مسئلہ تھا۔ چلتی ہوئی ٹرین صدف کے پاس آرکی تھی۔ ''تم کھانے انتہائی بدذائقہ اور فوڈ پوائزن کی وجہ بن جانے والے بناتی ہو مگر باتیں کبھی کبھی کام کی کر جاتی ہو۔''

کھل جا سم سم کے منتر کی طرح دروازہ کھلا اور صدف ہنستی مسکراتی میرے گلے آنے لگی تھی۔

''مبارک ہو۔ تمہارا آئیڈیا اپروو ہوگیا...... میرے سامنے مجال تھی واسطی صاحب کی کہ انکار کرتے۔

رافع صدمے سے مرتے مرتے بچا تھا......

''آہ......!!!''

''بل بتوڑی کہیں کی۔'' وہ بڑبڑایا۔ صدف نے اسے گھورا تھا۔

''تم نے کچھ کہا......؟''

''ناں...... نہیں...... تو۔''

''شاید تم اپنی دانتوں کی گنتی کم کرانا چاہتے ہو۔''

وہ غصے سے غرائی تھی۔ وہ میری زندگی میں آنے والے دنوں میں سب سے یادگار دن تھا......

☆☆☆

میں اپنے والدین کی زندگی میں آنے والی ایک ان چاہی اولاد تھی۔ میری ماں کا مسئلہ ایک وارث تھا اور میرے باپ کا مسئلہ ایک پڑھی لکھی بیوی کا ساتھ، جو ان جیسے بزنس ٹائیکون کے شانہ بشانہ چل سکے۔ دونوں کی یہ خواہشیں پوری نہ ہوئی تھیں۔ زندگی کبھی بھی میرے لیے تو کم از کم آسان نہیں رہی۔ میرا مسئلہ میری زندگی ہی رہی۔ بے سکونی، احساس کمتری، اور ان چاہا احساس...... ان تینوں چیزوں کی مثلث نے میرے وجود کے سینکڑوں حصے کردیے تھے۔ ابا اور میری ماں کی لڑائی میں ہمیشہ سے سنتی آرہی تھی۔

"اگر امی جان جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی نہ دیتیں تو میں کبھی بھی تم جیسی جاہل، گنوار سے شادی نہ کرتا۔"

"میں تو جیسے تم سے شادی کرنے کو مری جا رہی تھی ناں"

"تہمینہ بیگم! ابھی تم مجھے جانتی ہی کہاں ہو۔"

"میں تو جیسے واقف ہی نہیں ملک جہان...... دولت کی ہوس لے ڈوبے گی تمہیں، تم جیسوں کے لیے قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہوتا۔"

اور موت کے سمندر میں تو میری ماں چپ چاپ ڈوب گئی تھیں۔ انہیں بریسٹ کینسر تشخیص ہوا تھا۔ اس وقت میں دس سال کی تھی۔ وہ دس سال کی عمر میں نے کیسی گزاری تھی یہ بات صرف اور صرف میں جانتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا میرے ماں باپ دونوں کو مجھ سے محبت نہیں تھی ان دونوں کی "انا" میرے وجود کی محبت کو کھا گئی تھی...... ابا ایک مشین تھے جو دن رات تھکن سے بے پروا ہو کر صرف اور صرف کام کرنا جانتی ہے اور کچھ نہیں......!!!

میٹرک ــ میں آکر بھی میں دوست بنانے میں ناکام ہوئی تھی شاید دوست بنانے کا آرٹ مجھے کبھی بھی نہیں آسکتا تھا۔ کتابیں ہی میری گوڑی سہیلیاں تھیں...... اشفاق احمد، بانو قدسیہ، شیکسپیئر، مایا انجلو، انطونی چیخوف کو میں دسویں جماعت میں ہی پڑھ چکی تھی۔ میرے مصروف ابا کو بھی کبھار ہی مجھے وقت دینا نصیب ہوتا تھا۔

"امید تمہاری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟"

"اچھی جا رہی ہے۔"

"تم آگے آرٹس ہی لو گی ناں......؟" سوپ کے پیالے سے سر اٹھا کر میں نے انہیں دیکھا۔

"میں نے تمہیں اکثر ادبی کتابیں ناول، سفرنامے پڑھتے دیکھا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اپنے انٹرسٹ کو ہی فالو کرنا چاہیے۔" جانے انہیں یہ جج کرنے کا وقت کیسے مل گیا تھا۔ کم از کم مجھے تو بے تحاشا حیرت ہوئی تھی۔ انٹر میں، میں نے آرٹس ہی لیا تھا اور میں نے ٹاپ کیا تھا۔ ابا حیران رہ گئے تھے۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی ذہین رہی ہو گی۔ پہلے پتا ہوتا تو تمہیں بزنس فیلڈ میں لے آتا۔" کبھی کبھی انسان کتنا خود غرض ہو جاتا ہے ناں...... وہ صرف اور صرف اپنا ہی سوچتا ہے۔ شاید ابا بھی ایسوں میں ہی شامل تھے مگر میں......؟ میں دوسروں کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ زندگی کے کسی بھی لمحے میں میں نے اپنے بارے میں سوچا ہو میں تو ایک "کٹھ پتلی" کے سوا کچھ نہیں تھی۔

زندگی یوں ہی گزر رہی تھی، جب ایک دن میں نے ٹی وی چینلز بدلتے ایک چینل پر وہ چہرہ دیکھا تھا۔ وہ راحیلہ زمان تھی۔ ایک مشہور اینکر، جو عام آدمی کے مسائل اور ان کے حل پر بات کرتی تھی۔ اس کا ایک ہی موٹو تھا۔ "زندگی پر سب کا حق ہے۔" کچھ لوگ کہتے ہیں ناں آئیڈیل تو وجود ہی نہیں رکھتے۔ حقیقت نہیں ہوتے۔ مگر اس دن سے راحیل زمان میری آئیڈیل بن گئی تھی۔ وہ تو وجود رکھتی تھی میں نے اس کے بارے میں ایک ایک بات کی خبر رکھنی شروع کر دی تھی۔ وہ کیسے ہنستی تھی؟ کون کون سے رنگ اس کے پسندیدہ تھے؟ وہ کیا کھاتی تھی؟ کیسے بولتی تھی؟ میں نے فالو کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کے پروگرام میں مستقل کالر کی حیثیت بھی حاصل کر لی تھی۔

"میں آپ جیسی بننا چاہتی ہوں۔" اور وہ جواب میں کیسی کھنکتی ہنسی، ہنسی تھی۔

"آپ امید ہیں...... امید ہی بنیں...... آپ کی زندگی کی یہی خوب صورتی ہے۔" وہ بات پیاز کی طرح مجھ پر آشکار ہوئی تھی۔ پرت کے بعد پرت کھلتی چلی گئی۔ ہر کسی کو اپنی ذات میں مکمل ہونا ہوتا ہے اور ذات کا عرفان کوئی کوئی ہی حاصل کرتا ہے۔

بی، اے کے پراسپکٹس کو ابا نے تعجب سے دیکھا تھا۔ "جرنلزم......؟"

"جی ابا......"

"کیا سوچ کر یہ سبجیکٹ لیا ہے تم نے......؟"

"میرا انٹرسٹ ہے اس میں" وہ طنز سے ہنسے تھے۔ "تمہیں لکھنا آتا ہے اچھا بولنا آتا ہے؟" میں کچھ نہ بولی تھی۔ آنکھ سے گرم آنسو ٹوٹ کر ہاتھ کی پشت پر گرا تھا۔

☆☆☆

وہ میرا بی اے کا آخری سال تھا اور ہمارے پیپرز ہو رہے تھے۔ میں لان میں پیپر کی تیاری کر رہی تھی جب ابا ایک لڑکی کے ساتھ میرے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔

"یہ پریسہ ہیں۔ تمہاری نئی امی۔" میں نے حیرت سے اس سجی سنوری لڑکی کو دیکھا تھا جو مجھ سے چند سال ہی بڑی ہو گی۔ دراز پلکیں، صبیح چہرہ اور جاذب نظر نقوش وہ ایک متاثر کن شخصیت کی مالک تھی مگر ان کالی آنکھوں میں عجیب سی تپش تھی۔ وہ دونوں واپس پلٹ گئے تھے۔ آنے والے دنوں میں جہاں میں پیپرز کی تیاری میں مگن تھی پریسہ جہان کی گھر میں موجودگی مجھے وقتاً فوقتاً محسوس ہوتی رہی تھی۔ مگر زندگی میں آنے والے لوگوں میں وہ تیسری شخصیت تھی اور اس کے لیے بھی میرے دل میں خالی پن کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے انہیں کئی بار کھڑکی میں کھڑے دیکھا تھا۔ پودوں کے چوڑے پتوں پر ہاتھ پھیرتی وہ سوچوں میں گم نظر آتی تھیں۔ کبھی کبھار وہ ننگے پاؤں سارے گھر میں ٹہلتی پھرتیں۔ ہم دونوں میں کبھی بھی بات نہ ہوئی شاید ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک بار میں نے انہیں فون پر باتیں کرتے سنا تھا۔

"خوب صورت ہونا میرا قصور نہیں تھا۔ آپ کی بیٹی ہونا میرا قصور تھا۔" دوسری طرف جانے کیا کہا تھا کہ ان کی ہنسی ہزار ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔

"عمر رسیدہ شوہر، گھر، گاڑی اور ایک پلی پلائی بیٹی اور کیا چاہیے زندگی میں...... محبت تو ایک اضافی اور فضول چیز ہوتی ہے ناں......" ریسیور کریڈل پر پٹخ کر وہ مڑی تھیں۔ میں کافی کا کپ تھامے کھڑی تھی۔

"تم چوری چوری میری باتیں سن رہی تھیں ناں؟" پریسہ کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

"نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"اچھا ہاں میں جلد غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔" دوپٹا کندھے پر جھول رہا تھا۔ وہ کرسٹل کے گلدان کے پھول بدل رہی تھیں۔ بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ میں نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔

"یہ میڈلز تم نے جیتے ہیں؟" وہ کارنس پر رکھے میڈلز غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے۔" میرا لہجہ برف سا ٹھنڈا تھا۔

"یہی کہ تم نے جیتے ہوں گے اور بھلا کون ہو سکتا ہے؟"

"تو پھر سوال پوچھنے کا مقصد۔" جانے میں چاہ کر بھی ان سے نرمی سے بات نہیں کر پاتی تھی ورنہ میں ایسی کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ شاید میں بھی روایتی ہو کر سوچ رہی تھی کہ اس نے میری ماں کی جگہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

"تم خوش قسمت ہو امید۔" کافی کی بھاپ کے پار بیٹھی وہ مجھے چونکا گئی تھیں۔

"اس لیے کہ میں نے میڈلز جیتے ہیں......"

پریسہ جہان کے وجود کی عمارت میں زلزلہ برپا ہوتا تھا۔ "ہاں...... کیوں کہ تم نے صرف میڈلز جیتے ہیں۔ میں نے جس دن میڈل جیتا اسی دن محبت ہاری...... ملک جہان گیسٹ تھے میڈل دیتے ہوئے میری محبت بھی لے لی۔ عاشق ہو گئے مجھ پر، پیسے کے زور پر حاصل کر لیا۔ عورت پراپرٹی تو نہیں ہوتی۔ مگر میں تھی کیونکہ غریب تھی۔ اللہ کرے ملک جہان کی بیٹی کی بھی بولی لگے۔ نیلامی ہو آک کی ڈوڈیوں نے میرا وجود نیلا کر دیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میری ماں کہتی ہے کالی زبان ہے میری۔ جو

کہتی ہوں وہ پورا ہو جاتا ہے۔"

"پہلی بار مجھے ان سے خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ ابا سے اونچی آواز میں بات کرتی تھیں۔" بت لے کر آئے ہو تم...... روح وہیں ہے میری۔" اک گونج دار تھپڑ کی آواز کے بعد ابا کی آواز آئی تھی۔

"جس کے لیے گھر چھوڑا تھا وہ بھی تو تمہیں اکیلا دارالامان میں روتا چھوڑ گیا تھا۔ محبت...... محبت...... آئندہ میں یہ لفظ نہ سنوں تمہارے منہ سے۔"

محبت تو کیا اس کے بعد میں نے انہیں ایک سال دو ماہ تک کچھ بھی بولتے نہ سنا تھا...... وہ چپ رہتی تھیں مگر چیزیں ادھر ادھر پٹختے ہوئے شور ضرور پیدا کرتی تھیں۔ وہ ایسی عجیب و غریب تھیں۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا تھا کہ انہیں مصر کے عجائب گھر میں رکھوا دیا جائے۔ بارشوں کے بعد چڑیوں کے ٹوٹے گھونسلے جوڑتی نظر آتیں...... کبھی بلیوں کی مرہم پٹی کرتی بھی نظر آجاتی تھیں۔ ایک بار میں نے انہیں ایزل، کینوس کے ساتھ رنگوں سے کھیلتے دیکھا تھا۔ وہ تصویر دیکھ کر میں دنگ رہ گئی تھی۔ مجھے آرٹ سے بے تحاشا لگاؤ تھا۔ رنگوں نے ایک تڑپتی ہوئی چڑیا کو گھونسلے سمیت پنجرے میں مرتا دکھایا تھا اور چڑیا کی آنکھوں کے آنسو گھونسلے کے تنکوں کو رنگین کر گئے تھے۔ وہ کمال تصور تھی۔ پکا سو یا صادقین کی نہیں وہ پریسہ جہان کی بنائی گئی پینٹنگ تھی۔ صدیوں چپ رہنے والی نے جیسے پہلی بار چپ توڑی تھی۔

"یہ پنجرہ ملک جہان کا گھر ہے اور دم توڑتی چڑیا میں خود ہوں۔ پریسہ جہاں...... سوچ رہی ہوں کہ اس کا کیپشن کیا رکھوں......؟" برش کان کے پیچھے اڑس رکھا تھا اور زندگی میں پہلی بار مجھے ان پر بے تحاشا ترس اور تھوڑا پیار آیا تھا......!

☆☆☆

جس دن میں جرنلزم کا آخری پیپر دے کر گھر لوٹی تھی، اسی دن میں نے پریسہ جہاں کو وہ گلابی گڑیا تھامے صوفے پر بیٹھا دیکھا تھا، میرا دل عجب انداز میں دھڑکا تھا۔ میں انہیں نظر انداز کرتی کچن میں آ گئی تھی اور بے خیالی میں چار گلاس پانی پی گئی۔ میرا دل بار بار باہر جانے اور اس گلابی گڑیا کو دیکھنے پر مجھے اکسانے لگا تھا۔ مگر ایک انا نے مجھے روک رکھا تھا...... تین دن کی مسلسل جنگ کے بعد وہ چوتھی رات تھی۔ جب ابا بیرون ملک دورے پر تھے اور میں کمرے کی کھڑکی میں کھڑی چاند دیکھ رہی تھی۔ رات کے بارہ بجے تھے موسم میں خنکی اور ہواؤں میں پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں دروازے میں کھڑی تھیں اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"امید!" میں پلٹی تھی۔

"جی۔"

"وہ مانو کی طبیعت خراب ہو رہی ہے سانس بھی رک رک کر آ رہا ہے۔ ہاسپٹل جانا ہوگا ڈرائیور بھی نہیں ہے۔ اگر تم......؟"

"کون مانو......؟" بے ساختہ میرے منہ سے پھسلا تھا اور میں نے پریسہ جہان کو ننگے الٹے پیر واپس پلٹتے دیکھا تھا۔ حال ہی میں، میں نے ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ گاڑی کی چابی اٹھاتی میں باہر آ گئی تھی۔ اسپتال سے واپسی پر میرا کمبل میں لپٹی وہ گلابی پری دیکھنے کو دل چاہا تھا مگر میں نے تب بھی دل پر جبر کر لیا تھا۔ وہ ساری رات میں نے ٹیرس کے اوپر ٹہلتے گزاری تھی۔ وہ فجر کی اذانوں کا وقت تھا جب میں نے وہ ننھی سی چیختی چلاتی آواز سنی تھی۔ میں بے اختیاری میں کمرے میں داخل ہوئی تھی پریسہ کمرے میں نہیں تھیں۔ میں دوڑ کر کاٹ کی طرف آئی تھی۔ وہ گلابی گڑیا مجھے ہی آنکھیں کھولتی، جھپکتی دیکھ رہی تھی۔ موٹی آنکھوں میں عجب شرارت تھی۔ پھولے پھولے گال۔ فرشتے کے پروں کا سا وجود...... میں نے ہولے سے انگلی اس کے رخسار پر پھیری تھی۔ وہ دنیا کا سب سے خوب صورت احساس تھا۔ یکبارگی میں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا اور چٹاچٹ چوم ڈالا۔ میرے دل میں ابال سا اٹھا تھا یوں لگا تھا جیسے میری ساری روح تک سیراب ہو گئی ہو۔ میں نے اپنی آنکھوں کو برستے پایا تھا۔ پھر میں دروازے بند کرتی ہولے سے باہر آ گئی تھی۔

اس دن کے بعد میں نے پھر اس وقت کی تلاش شروع کر دی جب وہ ننھی پری اکیلی ہو اور میں چپکے سے اسے اٹھا لوں۔ وہ مجھے پہچان لیتی تھی اب تو ہنسنے بھی لگی تھی۔ وہ میرا اور اس کا راز تھا۔ جہاں کہیں وہ میری موجودگی محسوس کر لیتی تھی تو پریسہ کی گود سے سر ادھر ادھر کر کے مجھے ڈھونڈتی تھی۔ اک دن میں نے پریسہ کو سارا دن اکیلے دیکھا۔ جانے وہ ننھی پری کہاں تھی۔ میں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا تھا۔ مگر وہ کہیں تھی ہی نہیں۔ میں اضطرابی کیفیت میں انگلیاں چٹخاتی پریسہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"مانو کہاں ہے؟"

پریسہ نے سر اٹھا کر اک نظر مجھے دیکھا تھا۔

"کون مانو......؟" یہ جملہ مجھے شرمندہ کر گیا تھا۔

"آئی ایم سوری......"

"نانو کی طرف گئی ہے حفاظتی ویکسین لگوانی تھی شام تک آ جائے گی۔"

شام کو میں جھولے پر آنکھیں موندے بیٹھی تھی کہ وہ ماہ نور کو میری گود میں ڈال گئیں۔

"تمہیں صحیح سے نہ تو محبت کرنی آتی ہے اور نہ ہی نفرت...... ایک رستہ چن لو امید...... محبت یا نفرت...... چوری چھپے کی محبت بھی تکلیف دیتی ہے اور چوری چھپے کی نفرت بھی......"

☆☆☆

جرنلزم میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد ہمارا سارا گروپ یونیورسٹی کے آخری دن کینٹین میں بیٹھا تھا۔ صدف برگر کھاتے ہوئے مستقل بول رہی تھی۔

"بھئی میں کیمرے کا سامنے کرنے کے لیے ہی جرنلزم میں آئی ہوں تو میرا ارادہ کوئی کوکنگ شو کرنے کا ہی ہے۔ کون اب بورنگ سیاستدانوں کی نفرت بھری تقریریں برداشت کرے۔" سارا کیمرے کی سیٹنگ میں مصروف تھی۔ مہک اور جندب اپنی کسی بحث میں الجھے بیٹھے تھے۔ رافع اور صدف کی آپس میں ٹھنی ہوئی تھی۔

"جو انسان سوچتا ہے وہی ہوتا ہے۔ تم مستقبل کی زبیدہ آپا ہی بنو گی۔ دیسی ٹوٹکوں اور کھانے پکانے کے علاوہ تمہیں آتا ہی کیا ہے آخر۔" میں نے نظروں کو بار بار جندب کی طرف اٹھتا پایا تھا۔ دل کے سنگھاسن پر براجمان وہ شخص کتنا بے نیاز اور انجان تھا۔ وہ شروع دن سے ہی ہمارے گروپ میں شامل تھا اور اسے دیکھ کر پہلی بار ہی میرے دل میں گھنٹیاں بج اٹھی تھیں...... سارا نے جندب کو مخاطب کیا تھا۔

"نیوز پیپر کے لیے جو تم نے کارٹون بنایا تھا وہ تو سوشل میڈیا پر خوب وائرل ہوا ہے۔" وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

"ارے وہ تو میں نے ایسے ہی بیٹھے بیٹھے شرارت میں بنا دیا ہے۔" صدف نے برگر کھانا روک کر رشک سے اسے دیکھا تھا۔

"تم واقعی اک اچھے کارٹونسٹ ہو۔" صدف نے کہا۔

"اور تم بھی ایک اچھی کارٹون ہو۔" کوک پیتے رافع کی زبان پھسلی تھی۔

"میں تمہاری جان لے لوں گی موٹے گینڈے۔" موٹا گینڈا بھاگ گیا تھا۔

"امید آج کل آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ آپ نے تو چونکا کر رکھ دیا ہے۔" جندب مجھ سے مخاطب تھا اور ہر بار کی طرح میرا دل بے ایمان ہونے لگا تھا۔ میں آج کل جنگ میں کالم نگاری کر رہی تھی حالانکہ میں قلمی نام سے لکھتی تھی مگر اسے یہ سب کیسے پتا چلا تھا۔

"مگر آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"جو اپنے ہوتے ہیں ان کے بارے میں ہر خبر رکھی جاتی ہے۔" میں نروس ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ سارا دن میں نے جیسے بادلوں پر چلتے ہوئے گزارا تھا۔

رات کو کھانے کی میز پر ابا مجھ سے مخاطب

تھے۔

"لڑکیوں کے لیے چینل پر کام کرنا بہت مسائل کھڑے کرسکتا ہے۔تم کوئی اور جاب کرلو۔"

"میں اس کے علاوہ اور کوئی جاب نہیں کرسکتی۔" پلیٹ میں کباب رکھتے ہوئے میرا لہجہ قطعی تھا۔

"تم ایسا نہیں کروگی۔"

"یہ میرا خواب ہے۔"

"مگر......؟"

"میں چھوٹی بچی نہیں رہی اب۔" میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پیچھے سے میں نے پریسہ کی آواز سنی تھی۔

"زبردستی کروگے اس پر۔ کر دیکھو...... ہر لڑکی پریسہ فاروق کی طرح بزدل اور ہار ماننے والی نہیں ہوتی ہونہہ......"

☆☆☆

"میں جانتی ہوں کہ تم مجھے برا سمجھتی ہو خیر اچھا تو میں بھی تمہیں نہیں سمجھتی۔" لان میں چہل قدمی کے دوران وہ کب میرے ساتھ شامل ہوگئی تھیں مجھے خبر نہیں ہوسکی تھی۔

"کیا مطلب......؟" میں رک گئی۔

"تمہارا باپ کہتا ہے کہ میں تمہیں تمہارے اس فیصلے سے باز رکھوں۔" میں چیخی تھی۔

"کیا کرلیں گے وہ، میری زندگی ہے، میں اپنی مرضی سے گزاروں گی۔" پریسہ کی آنکھوں میں ماضی کی چبھن تھی۔

"ہاں کیا کرلیں گے ملک جہان...... کرتے تو غریب باپ ہیں انہیں عزت اور روٹی کے لالے پڑے ہوتے ہیں، چوٹی سے پکڑ کر بیٹی کے دو بول پڑھا دیتے ہیں اور سوچتے ہیں وہ مٹی کی مورت خوش رہے گی۔" وہ گرل سے ٹیک لگائے ہار سنگھار کے پیڑوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"تم خوش نہیں ہو پریسہ......؟" میں نے سوال کیا تھا۔ ٹھنڈی آہ فضا میں بکھر گئی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" سوال واپس پلٹ آیا تھا۔ آج جانے کتنے سالوں کے بعد آمنے سامنے آئی تھیں۔ میں نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔ وقت نے انہیں کتنا بدل دیا تھا۔

"تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ اتنا بڑا گھر ہے، گاڑی، نوکر چاکر، شوہر اور بیٹی بھی ہے۔ کون سی آسائش نہیں ہے؟" میں انہیں آئینہ دکھانا چاہتی تھی۔ ہلکی ہوا چلی تھی موتیا کی خوشبو کھلی۔

"تم نے کبھی محبت کی ہے امید......؟" میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ یہ سوال کریں گی...... میرے تصور کی چوکھٹ پر جندب کی شبیہہ ابھری تھی۔

"محبت آسائش نہیں ہوتی امید! مگر یہ ہر آسائش سے بڑھ کر ضرور ہوتی ہے۔ وہ بہت محبت کرتا تھا مجھ سے ہم کورٹ میرج کرنے والے تھے مگر زندگی اس کے لیے چھوٹی پڑ گئی...... وہ چلتی گاڑی کا نشانہ بن گیا مجھے بھی چوٹیں آئیں۔ میری جگہ دارالامان ٹھہری...... پلٹ جاتی گر ابا کا پتا نہ ہوتا۔ میری غلطی چھوٹی نہیں تھی امید! مگر میری سزا بہت بڑی رکھ دی گئی۔ وہ نہیں رہا مگر میرے خواب تو میرے پاس تھے۔ جنہیں مجھے ہی تو پورا کرنا تھا۔ ہم لڑکیوں کی زندگی میں یا محبت ہوتی ہے یا خواب۔ ایک مرجائے تو دوسری ضرورت باقی رہتی ہے۔ محبت نہیں رہی مگر مجھے میرے خواب جینے کا تو حق تھا ناں...... ہر مسئلے کا حل شادی تو نہیں ہوتا...... میڈم زبیری کہتی تھیں، پریسہ کی بنائی گئی تصویریں بولتی ہیں...... کاش میں زمانے کے سامنے اپنی بولتی تصویریں پیش کرکے۔ فخر سے گردن اور اونچی کرسکتی۔ مگر میرا تو سارا غرور مٹی میں مل گیا۔ اپنے خوابوں کی جنگ کبھی نہ ہارنا...... یہ تو ذات کا غرور ہے۔ ورنہ پریسہ جہان کی طرح زندگی گزاروگی۔" آخر میں پریسہ کی آواز نمی میں ڈھلتی چلی گئی۔

"یہ گھر ایک پنجرہ اور میں ایک پرندہ، تڑپتا ہوا...... مرتا ہوا......"

میں نے اس چڑیا کو لڑکھڑاتی چال کے ساتھ

جاتے دیکھا تھا...... جانے کیا بات تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے "محبت" نہیں کرتی تھیں مگر "نفرت" بھی نہیں کرسکی تھیں۔ زندگی نے ہمارے سامنے سکے کا وہ رخ رکھا تھا جو اصل میں تھا ہی نہیں......!!

★★★

مزدوروں کے حقوق کے سلسلے میں نکالی گئی ایک ریلی میں ہمارے گروپ نے بھی شرکت کی تھی۔ سارے روڈ بلاک کردیے گئے تھے اور ٹریفک کی آمدورفت رک گئی تھی۔ ہم بینرز تھامے احتجاجی نعرے لگا رہے تھے۔ جب پولیس کی بھاری نفری وہاں آ پہنچی تھی شیلنگ اور آنسو گیس نے ہجوم کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ میں نے ایک قریبی دیوار سے جندب کو سر پکڑ کر ٹیک لگاتے دیکھا تھا۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس آئی تھی۔

"آر یو اوکے......؟"

"میں ٹھیک ہوں امید......! جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ...... معاملہ بگڑ سکتا ہے۔" وہ کراہ رہا تھا اور مجھے وہاں سے جانے کا بھی کہہ رہا تھا۔

"میں ایسے کیسے چلی جاؤں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر......" محبوب تکلیف میں ہو تو جان انگاروں پر آجاتی ہے میرا بھی وہی حال تھا۔

"جیسے باقی سب چلے گئے ہیں۔" مجھے اس کے لہجے میں کچھ محسوس ہوا تھا۔

"میں نہیں جاسکتی جندب!" آنسو گیس کے دھوئیں میں مجھے وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تم کیوں نہیں جارہیں امید......؟" اس کی آواز اتنی ہلکی تھی کہ مجھے بمشکل سنائی دی تھی۔

"میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر جا ہی نہیں سکتی جندب۔ وضاحت مت مانگنا۔" میں دیوار سے ہی ٹیک لگائے بیٹھ گئی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں" وہ کیسی تھکی تھکی سی آواز تھی۔

"کیا جانتے ہو......؟" میں نے آنکھیں جھپکتے اسے دیکھا تھا۔

"میں بچہ نہیں ہوں امید!" وہ چپ ہوگیا تھا۔ میری محبت بھی مشک کی طرح پھیل گئی تھی۔ پیشانی پر بکھرے بال، جلتی سرخ آنکھیں، وہ ایسا تھا کہ اس سے محبت کی جاتی۔ اسی وقت کیمرے کی لائٹس چمکی تھیں۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر ابا نے اخبار میرے سامنے پھینکا تھا۔ میری اور جندب کی تصویر فرنٹ پیج پر لگی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے امید......؟" میں نے کانٹے سے آملیٹ توڑتے ہوئے اخبار پر نظر ڈالی تھی۔

"اسٹرائیک فوٹو ہے۔"

"اور یہ لڑکا......؟" اب کی بار مجھے سر اٹھانا پڑا۔

"کلاس فیلو ہے میرا۔" "پہلے بھی کئی بار تمہارے ساتھ نظر آیا چھوٹے گھر کا ہے۔ کوئی اسٹیٹس، کلاس نہیں ہے اس کی۔ محتاط رہنا۔" میں جانتی تھی کہ وہ پس پردہ مجھے کیا جتانا چاہتے تھے۔

"جب آپ اسٹیٹس، کلاس نظر انداز کرکے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرسکتے ہیں تو میں بھی کرسکتی ہوں۔" میں نے پریسہ اور ملک جہان کے چہرے کا رنگ ایک ساتھ اڑتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

کافی کی ساری تلخی میرے وجود میں سمٹ آئی تھی میں نے آنکھوں کی برسات کے پار اس شخص کو بھیگتے دیکھا تھا۔

"امید! تمہارے جذبے کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو۔ تمہیں ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ تمہاری اور ہماری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میری زندگی سہل نہیں ہے۔ میرے رشتوں کو میری ضرورت ہے امید...... میری پانچ جوان بہنیں گھر بیٹھی ہیں ابو معذور ہیں اور امی نے پیٹ کاٹ کر ہمیں پڑھایا ہے۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔"

کیا وہ امید جہاں سے ذرا بھی واقف نہیں تھا؟

''اسٹیٹس، کلاس کیا یہ چیزیں محبت جیسے جذبے سے بڑھ کر ہوتی ہیں؟'' میرا سوال ادھورا چھوڑ کر وہ اٹھ گیا تھا......

اس دن میں صدف کی بات پر چونکی تھی۔

''امید......؟'' میں نیوز پیپر پڑھ رہی تھی۔

''جی؟''

''تم نے ایک بات نوٹ کی ہے؟'' صدف کے انداز میں کچھ تو غیر معمولی تھا۔

''کون سی بات صدف......؟''

''مجھے لگتا ہے مہک اور جندب ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہیں؟'' میرے دل کو جیسے کسی نے تیز آری سے چیر ڈالا تھا۔

''نہیں صدف...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔ آفس میں ہونے والی ون ڈش پارٹی میں، میں فروٹ ٹرائفل اور ڈیزرٹ لے گئی تھی۔ صدف چائنیز کھانے لے کر آئی تھی۔ رافع فرائیڈ رائس لایا تھا۔ مجھے ٹیبل پر چاٹ اور دہی بھلے کی موجودگی حیران کر گئی۔ چاٹ اور دہی بھلے میرے فیورٹ تھے۔ میں پلیٹ میں دہی بھلے نکال کر کھانے لگی تھی۔

''ارے واؤ، یہ کون لایا ہے۔ اتنے مزے کے ہیں، ایسے ٹیسٹی دہی بھلے میں نے کبھی نہیں کھائے۔ سارا تم لائی ہو؟'' میرے استفسار کرنے پر سارا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

مہک خوشبو بکھیرتی اندر آئی تھی۔

''اف یہ دہی بھلے ــ اور چاٹ۔ مڈل کلاس لوگوں کا کھانا ہے۔'' کب سے خاموش بیٹھے جندب کی سرد آواز آئی تھی۔

''میں لایا تھا۔ میری بہنوں نے بنا کر بھیجے تھے۔'' پلیٹ میرے ہاتھوں میں کانپ گئی تھی اسی وقت میری نظر مہک نواب پر پڑی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور وہ خود کو کمپوز کر چکی تھی۔

''میں ضرور ٹیسٹ کرنا چاہوں گی۔'' وہ پلیٹ اور چمچ اٹھانے کو جیسے ہی آگے تھی جندب کرسی پرے دھکیلتا باہر نکل گیا تھا مہک بھی اس کے پیچھے گئی تھی۔ تو کیا ــ صدف کی کہی گئی بات ٹھیک تھی......؟ آہ زندگی کبھی بھی تو میرے لیے خوشیوں کی سیج نہیں رہی تھی۔ رافع گنگنانے لگا تھا۔ صدف کافی کے گھونٹ لے رہی تھی......!!!

☆☆☆

ریٹنگ کے پیمانے ٹوٹے تو نہیں تھے مگر ہل کر ضرور رہ گئے تھے۔ واسطی صاحب تو اب جیسے خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ وہ میرے شو کا پہلا دن تھا۔

''رب کی بستی'' کے سیٹ پر میں پورے جوش کے ساتھ موجود تھی۔ اور میری پوری ٹیم الرٹ تھی۔ ہم لائیو جا رہے تھے۔ وہ میری زندگی کا پہلا شو اور پہلی بار میرا کیمرے کا سامنا تھا۔

''آئیڈیل ایسی چیز نہیں ہوتی جو کہ وجود رکھتی ہو۔ نظر آتی ہو۔ یوں سمجھیں آئیڈیلزم ایک پرفیکشن ہے جو کبھی بھی کسی کو بھی، کسی شعبے میں حاصل نہیں ہوتی۔ آج کل کا میڈیا زیادہ تر سیاستدان اور فنکار ہی دکھا رہا ہے مگر ہمارے چینل نے آپ سب کے لیے کچھ نیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم آپ کے لیے لائے ہیں آپ میں سے ہی وہ لوگ جو آپ کے اردگرد رہتے ہیں جن سے آپ کا واسطہ روزانہ کی بنیاد پر پڑتا ہے۔ آج ہم آپ کو ملواتے ہیں سبزی فروش چاچا شبن سے......'' میرے شو کے پہلے مہمان چاچا شبن ہی تھے جو کاٹن کے کڑکڑاتے کرتے، آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر سرمہ پہنے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے پر براجمان تھے۔

''چاچا آپ لوگوں پر الزام ہے کہ آپ سبزی انتہائی مہنگی دیتے ہیں اور جس میں سے کچھ خراب بھی ہوتی ہے۔ عائشہ منزل کی خواتین کو آپ سے یہی شکایت ہے۔'' میں نے مسکرا ان سے منتظر نظروں سے جواب مانگا تھا وہ تو مرغ بسمل کی طرح پھڑک اٹھے تھے۔

''پتری...... آج میں سچ سامنے لا کر رہوں گا۔ آخر ہم سبزی فروشوں کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ یہ عورتوں کا ٹولہ تو ہمارا دماغ تک چاٹ جاتا ہے۔ آدھے ادھورے پیسے دیتی ہیں، ناک بھوں چڑھاتی ہیں اور جاتے جاتے ان کے بچے شیطان کے چیلے بطور بونس ہری مرچیں اور پودینے کی گٹھی تک اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اب بھی ہم ہی برے ہیں کیا......؟؟ چاچا شبن کا منہ غصے سے ٹماٹر کی طرح لال ہو گیا تھا۔ اور جواباً مجھے بریک لینا پڑا تھا۔

ہمارے دوسرے مہمان نائی ذاکر تھے جو محلے بھر کی دیگیں پکاتے تھے اور انہیں ظالم زمانہ عزت و تکریم سے نہیں نواز رہا تھا انہوں نے اپنے دکھڑے پورے میڈیا کے سامنے روئے تھے۔

''ارے بیٹا...... ہم معصوم، فرشتہ صفت لوگ تو گھر کی مرغی دال برابر ہیں...... کوئی بھی ویلیو نہیں دیتا۔ ہر شادی، خوشی میں، غم میں، ہم ہی تو کام آتے ہیں۔ مگر یہاں تو ایسے ناموں سے پکارا جائے گا کہ دانتوں پسینہ آ جائے گا۔ غیر ملکی ہمیں ''شیف'' کا درجہ دیتے ہیں اور یہاں ہم دیگیں کھڑکاتے (کھڑکاتے) ''نائی'' ہیں۔ اگر ایک دن کے لیے ہمیں غائب کر دیا جائے تو کیا حال ہوگا دنیا کا...... شادی بیاہ میں مہمان ہی دیگوں میں چمچ ہلاتے اور پیاز، دھنیا کاٹتے ہوئے پائے جائیں گے۔ ارے تب قدر ہوگی ہماری اس ظالم دنیا کو......'' ذاکر کے دھواں دار تقریری انداز نے واسطی صاحب کو خوب مزا دیا تھا...... بہت منتوں اور ترلوں کے بعد ذکیہ درزن نے ہمارے آفس میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ آتے ساتھ ہی چائے کے چار کپ اور دو سو پر بسکٹ کھا چکی تھیں۔

''آپ کو میڈم معاشرے سے کیا شکایات ہیں؟'' چکن کے پیازی رنگ کے سوٹ میں ملبوس ذکیہ نے کافی پر سوچ انداز اپنایا۔

''بھئی ہمیں تو صاف صاف کہوں گی جتنے ضروری ہم ہیں ایسا کوئی اور نہ ہوگا...... لباس پہلی اور بنیادی ضرورت ہے۔ سلائی کڑھائی آسان تھوڑی ہوتی ہے۔ نہ تو اچھی اجرت ہاتھ آتی ہے اور نہ ہی عزت کا بھورا ملتا ہے۔ ہم چاہے کتنی ہی خوب صورت سلائی کڑھائی کر لیں، رہیں گے۔ وہی ''درزی'' بڑے شہروں اور دوسرے ملکوں میں چاہے الم غلم سلائی بھی کی جائے گی تاں کہلائیں گے پھر بھی ''فیشن ڈیزائنر'' یہ کوئی انصاف ہے بھلا......؟ اور یہ جو آپ کی ٹی وی والی درزنیں ہوتی ہیں نا بڑی خرانٹ ہوتی ہیں۔ اداکاروں کا سٹوم (کاسٹیوم) سلائی ہم سے کروالے جاتی ہیں ہماری ہتھیلی پر بس سو کا نوٹ رکھ کر خود ہزاروں کماتی ہیں۔ ایسا سلوک آخر کب تک، ہاں کب تک؟'' ذکیہ کا سوال اسٹوڈیو میں گونجتا ہی رہ گیا تھا......

رب کی بستی کے اس دن کے شو نے ریٹنگ کے پیمانے ہلا دیئے تھے۔ واسطی صاحب سارے آفس کو دو بار فروٹ کیک اور چار بار کافی پلا چکے تھے اور صدف کو حیرت تھی کہ اتنا کھلانے پلانے کے باوجود بھی وہ زندہ تھے۔

''یا حیرت......!''

انٹرویوز کے حوالے سے مختلف شعبوں کے لوگ مجھ سے بار بار رابطے کر رہے تھے اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ طالب علموں نے میرے شو پر سے کہا تھا۔

''ہمیں تعلیم کا نہیں بستوں کا بوجھ ادھ موا کر رہا ہے۔ تھکا رہا ہے۔'' حوا کی بیٹیوں کی بات نے مجھے سوچ میں ڈال دیا تھا۔

''تعلیم تو ہمیں بہت فخر کے ساتھ دی جا رہی ہے مگر ہم پر اعتبار نہیں کیا جا رہا ہے۔'' ایک مشہور اداکارہ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں لاوارثوں کی طرح ایک خیراتی اسپتال میں داخل تھیں۔ ہماری پوری ٹیم ان کے انٹرویو کو پہنچی تو۔ بستر مرگ پر نیم دراز ان کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہتے جا رہے تھے۔

''ہم فنکاروں کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہم جوانی تک ہی بس جوان رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری زندگی کا چارم اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ تب

ہماری فیلڈ کے لوگ، ہمارے فینز پلٹ کر خبر تک نہیں لیتے۔ ہم اتنے کرداروں کی زندگیاں جی لیتے ہیں کہ پھر ہمیں یاد ہی نہیں رہتا ہے کہ ہماری بھی کوئی زندگی ہے اور جب احساس ہوتا ہے تب موت سرہانے آکر اپنا کردار ادا کرنے چلی آتی ہے۔"

میری اپنی آنکھیں برسنے لگی تھیں کتنا غلط سوچتے ہیں کہ زندگی نے صرف ہمارے حصے میں ہی پہاڑ جیسے دکھ درد رکھے ہیں حالانکہ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔ سروائیو کر رہا ہوتا ہے۔

☆☆☆

واسطی صاحب کے آفس میں، میں بیٹھی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"آپ، رب کی بستی کو سیاسی شو کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ ریٹنگ کا تو بالکل بھی مسئلہ نہیں ہے۔" واسطی صاحب کے چہرے کا اطمینان مجھے حواس باختہ کر گیا تھا۔

"امید جہان...... یہ سیاسی سیزن ہے۔ نوٹ کمانے کا وقت ہے اور اس سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی ہی ہوگی...... ایک ماہ کی بات ہے آپ اگلے ہفتے سے سیاسی شخصیات کے انٹرویوز لینا شروع کریں۔ ایک ماہ بعد الیکشن سیزن ختم ہوگا تو پروگرام کا فارمیٹ پھر سے بدل دیا جائے گا۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ واسطی صاحب نے میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ جندب نے پانی کا گلاس میرے سامنے کیا تھا۔

"امید! سیاسی شخصیات کے انٹرویوز کا سلسلہ آپ کی ذاتی زندگی کو مسائل سے دوچار کر سکتا ہے۔" میرا دل جلا ہوا تھا گلاس پرے کر دیا۔

"آپ کو میری اتنی فکر کیوں ہے جندب صاحب...... جائیں مہک نواب کو اپنے مشوروں سے نوازیں۔" میں جانتی تھی کہ میرا لہجہ ضرورت سے زیادہ تلخ تھا۔ بھوری آنکھوں میں جانے کیا تھا۔

"آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔"

"وضاحتیں پیش مت کیجیے آپ۔"

"میں بات کو پردوں میں چھپا کر رکھنے کا قائل نہیں ہوں امید۔"

"آپ کو مجھے ریجیکٹ کرنا تھا کر دیتے کہ امید! مجھے آپ سے محبت نہیں ہے...... آپ نے اسٹیٹس اور کلاس کا سہارا لیا۔ حالانکہ یہی چیز مہک کے ساتھ بھی ہے۔"

میری آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔ وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

"تالی دو ہاتھوں سے ہی بجتی ہے۔ مہک میرے بارے میں جو کہے یا سوچے مگر میں اس کے لیے کوئی فیلنگز نہیں رکھتا۔ فی الحال میری زندگی میں محبت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

اتنے دنوں بعد جیسے دل کی زمین پر پھوار پڑی تھی۔

"آپ کسی اور سے محبت کرتے ہیں؟" میرا سوال خالی کمرے میں گونج بن کر پلٹا تھا۔

"آپ نہیں سمجھیں گی۔" دروازہ بند کرتا وہ باہر نکل گیا تھا اور میں اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔ جانے محبتوں کی زنجیروں کے تالوں کی چابیاں کون سے سمندر میں اچھالی جاتی ہوں گی؟

☆☆☆

اسفند یار میرے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ کھدر کے سوٹ میں ملبوس، ڈھیروں ڈھیر پرفیوم انڈیلے وہ مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی تپش تھی جو وجود میں جھرجھری سی پیدا کر دیتی تھی۔ میں نے واسطی صاحب کی بات مان لی تھی۔ مجھے اپنے آئیڈیے کے عروج کا وقت دیکھنا منظور تھا۔ ابا کو پتا چلا تھا تو انہوں نے خصوصاً مجھے متنبہ کیا تھا۔

"امید پہلے جو بھی تھا ٹھیک تھا مگر اب سیاسی لوگوں سے ٹکر لینا مناسب نہیں۔ تم یہ جاب چھوڑ دو۔" ساری زندگی میری پروا نہ کرنے والوں کو اب بھی میرے فیصلے میں انٹرفیئر کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کاش میں ایک بار سوچ لیتی۔ اولاد سو بار غلط ہو سکتی ہے مگر والدین نہیں اور اس بار میں ہی غلط تھی۔

اسفند کے حوالے سے میری معلومات مکمل تھیں۔ واسطی صاحب کا سارا غصہ میں نے اسفند یار پر نکالا تھا اور میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں نے اپنے ہر سوال کے جواب میں واسطی صاحب اور اسفند یار کا رنگ ایک ساتھ اڑتے پایا تھا۔

"آپ کے بارے میں ایک خبر گردش کر رہی ہے کہ آپ نے اپنے ایک کمزور و بے بس مزارعے کی بیٹی کے ساتھ زیادتی کے بعد اسے موت کے منہ میں پھینک دیا......؟"

"اسفند صاحب...... آپ نے علاقے کے غریب غربا کی زمینوں پر کس حق کے ساتھ قبضہ کیا ہے؟"

"سننے میں آیا ہے کہ آپ نے ایک طوائف سے نکاح کر رکھا ہے اور آپ میڈیا سے یہ بات چھپا رہے ہیں؟"

وہ شام آگ کی ٹوڈیوں سے بھی زہریلی اور بھیانک تھی۔ غصیلے آسمان کی ساری بجلیاں امید جہاں کے سر پر ٹوٹی تھیں۔"

☆☆☆

میں نے سر گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔ مہک کی مائیک پر بولتی آواز کو ایک تھپڑ نے خاموش کرایا تھا۔ وہ تیز آواز میں بول رہا تھا۔

"مہک تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔ امید جہان ہے وہ۔ ہمارے آفس کا فرد اور اسے تم ریٹنگ کے لیے استعمال کر رہی ہو؟ ہا...... تم ایسے کیسے کر سکتی ہو۔" وہ مہک کو گم صم کھڑا چھوڑتا باقی لوگوں کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"بند کرو یہ کیمرے اور جاؤ یہاں سے۔" کھلے پھاٹک سے وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی جانے لگے۔ مہک نواب اس قافلے کا آخری فرد تھی وہ میری طرف آئی تھی۔

"آئی ایم سوری امید! وہ مجھے واسطی صاحب۔" جندب کو میں نے پہلی غصے میں دیکھا اور وہ میری ذات کے لیے لڑ رہا تھا۔

مہک نے جندب کی غراہٹ سنی تھی۔ "گو ٹو ہیل ود واسطی! گیٹ لاسٹ۔" پورچ کی سیڑھیوں پر ابھرنے والی واپسی کی چاپ دور چلی گئی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ پورچ کی سیڑھیوں پر میں نے ابا اور پریسہ کو کھڑے دیکھا تھا۔ ملک جہان دو اور دو چار کرنے والے آج ایسے کیوں کھڑے تھے؟ اچانک بڑھاپے نے انہیں کیوں آلیا تھا؟ ایسی حالت پچھتانے والے کسی شخص یا تھکنے والے کی ہوتی ہے۔ تو کیا وہ بھی......؟

فاصلے ختم کرتے وہ میری طرف آئے تھے۔ پہلی بار مجھے لگا دنیا میرے لیے محفوظ ہے۔ کوئی ہے جو اب مجھے رونے نہیں دے گا...... جندب ابا تک آیا تھا۔

"امید جہان اگر میرے لیے دھویں اور شیلنگ کے وقت میں، جب سب میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے ساتھ دے سکتی ہیں تو میں بھی ان کے کردار اور عزت کی حفاظت خود پر فرض سمجھتا ہوں۔"

کیا ہم کو اندھیروں کے حوالے
نہیں اچھے لگے اب کے اجالے
جو خود الفاظ کے پتھر اچھالے
لگا تا ہے مرے ہونٹوں پر تالے
ہوا نے آندھیوں کا روپ دھارا
کوئی کیسے یہاں آنچل سنبھالے
وہ دن ان کے لیے مخدوش نکلا
کہ جب چڑیوں نے بال و پر نکالے
کتابوں میں پڑھا ہے ذکر جن کا
کہاں اب محبت کرنے والے
بظاہر جبر سے جاں بچ گئی ہے
کہیں یہ چپ نہ تجھ کو مار ڈالے
میں ہوں قندیل اتنا جانتی ہوں
دیے جائیں گے کل میرے حوالے

☆☆☆

زندگی پر کبھی کتنی ہنسی آتی ہے اور کبھی کبھی تو قہقہہ لگانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ امید جہان سے امید جندب ہونے تک کا سفر میں نے کر لیا ہے۔ وہ

اسٹیٹس اور کلاس کے تال میل میں الجھا ہوا شخص کیسے مان گیا......؟ اس کا جواب آپ کو بتائے دیتی ہوں۔"

"تم نے سچ کہا تھا امید! سب سے بڑی آسائش تو محبت ہوتی ہے اور میں تمہاری محبت کی آسائش کو کیسے اپنے زندگی سے جانے دیتا۔ اپنی آنکھوں کے آنسو تکلیف نہیں دیتے محبت کی آنکھ کا قطرہ بھی فرات لگتا ہے۔"

چیزوں، لوگوں، رویوں، رشتوں کو دیکھنے کا میرا زاویہ نظر اب بدل چکا ہے۔ پریسہ جہان امی کی جگہ کیسے لے سکتی تھی جن کی جگہ کبھی تھی ہی نہیں۔ پریسہ جہان میرے سوالوں پر مسکرا کر مجھے دیکھتی ہیں۔

"میں اب خوش ہوں امید! تم میرے بارے میں پریشان مت ہوا کرو۔ اولاد کی آسائش محبت کی آسائش پر بھاری ہوتی ہے۔"

سچے موتیوں سی لڑکی کی باتیں ہیروں جڑی بیش قیمت ہیں۔

"امید تم جندب کے گھر میں خوش تو ہو ناں......؟" کچھ سوالوں کے جواب تو کبھی بھی نہیں سوچنے پڑتے...... چار کمروں اور چھوٹے سے سرخ اینٹوں والے فرش، طویل برآمدے، آلوچے، چیکو، انار والا میرا گھر ہے۔ عشق پیچاں کی بیلوں نے اور ہار سنگھار کے درختوں نے میرے گھر کو جنت کر دیا ہے اور وہ سانولی سلونی پانچ لڑکیاں...... جو کسی ساز کے تار پر پڑنے والی چوٹ کی طرح ہنستی ہیں۔ کوئلوں کو آنے کی ضرورت کہاں پڑتی ہے......؟ چھوٹے گھروں میں بڑی خوشیاں بند ہوتی ہیں جیسے لکڑی کے پرانے آبنوسی صندوق میں جگر جگر کرتا کوئی ہیرا......

پانچ بیریوں پر پتھر پڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ وہ روہانسی ہو کر میرے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔

"بھابھی! ہمیں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔"

"لاڈلیوں...... جیسے کنول تالاب میں کھلتا ہے ناں عورت پھول بھی شوہر کے گھر ہی کھلتا ہے۔"

"آپ پھر ہم سے روز ملنے آئیں گی ناں......؟" وہ یقین دہانی چاہتی ہیں۔

"بشرطیکہ تمہاری ساسیں خرانٹ اور بدمزاج نہ ہوئیں تو......"

ساون کی بارش شروع ہو چکی ہے اور وہ پانچوں کچن میں اکٹھی ہو کر پکوان کم پکا رہی ہیں اور شور زیادہ کر رہی ہیں۔ کوئلیں تب ہی تو بھول کر بھی یہاں نہیں آتیں، جل جل جاتی ہوں گی ناں......

موتیے کے گجرے میرے ہاتھوں میں پہناتا، بالوں میں گلاب اڑستا وہ پاس آن کھڑا ہوا ہے......

"امید تم خوش تو ہو ناں......؟" بادلوں سے گھرے آسمان کو دیکھ کر میں اس کی طرف مڑتی ہوں۔

"میں بہت خوش ہوں جندب! آپ نے، اس گھر کے لوگوں نے میری زندگی کی ساری محرومیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔ اب مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہیں۔"

"صدف اور مہک نے بھی۔" دی جسٹس، چھوڑ دیا ہے۔ جہاں عزت نہیں ملتی وہاں کیا کام کرنا۔"

ٹھنڈی ہوائیں جسم میں جھرجھری بھر دیتی ہیں۔

ٹھیک کیا دونوں نے جو ادارہ آپ کی عزت وقار کا خیال نہ رکھے وہاں آپ کی وفاداری کام نہیں آتی۔"

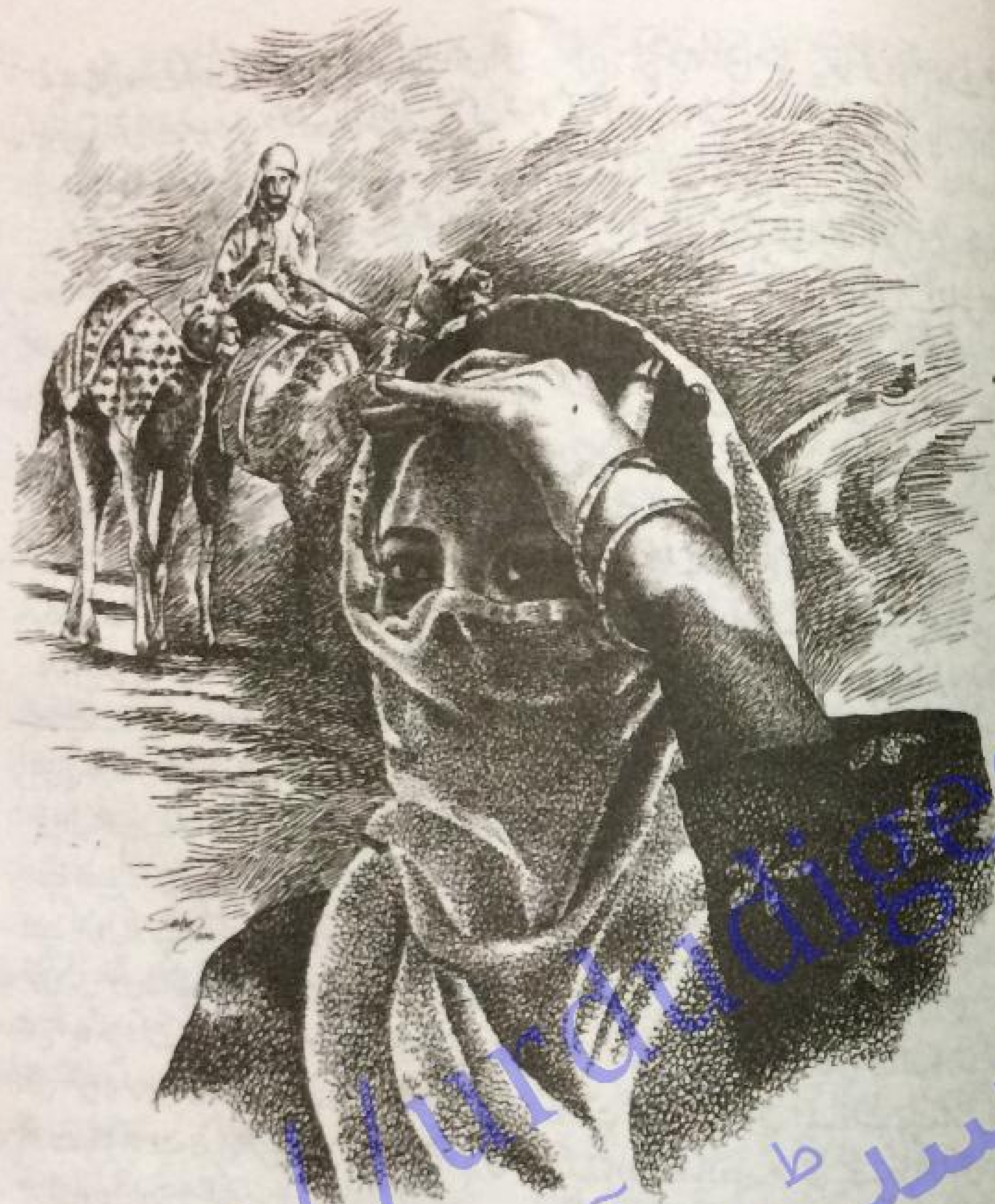
"تمہیں پتا چلا رافع نے صدف کو پرپوز کیا ہے؟"

"اوہ سچ میں...... یقین نہیں آ رہا۔ وہ دونوں تو کتنا لڑتے تھے۔ ایک دوسرے کئی بار قتل کرنے کی دھمکیاں تک بھی دے چکے تھے۔"

"جندب نے ہنستے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"محبت بہت چوری، چپکے سے وجود میں داخل ہوتی ہے تب انسان کو ذرا بھر پتا نہیں لگنے دیتی اور پھر اچانک سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔"

"رب کی بستی میں، بسنے والے سارے باسی محبت، امن، احترام اور شناخت چاہتے ہیں۔ اور یہ سارے جذبے کبھی بھی ایک ساتھ نہیں ملتے...... یہ تب ہی زندگی میں آتے ہیں جب ان کا وقت آتا ہے۔



شبینہ گل



آج مجھے آسمان ہر روز سے زیادہ روشن اور چمک دار لگ رہا ہے۔ بہار کی خوشگوار شام میں آسمان پر تیرتے بادل مجھے کسی شرارتی بچے کی طرح جھومتے اٹکھیلیاں کرتے محسوس ہو رہے ہیں۔ آج تو سڑک پر بے صبروں کی طرح ہارن بجاتے گاڑیوں والے بھی برے نہیں لگ رہے اور ان کا سیاہ دھواں بھی بادِ صبا کے جھونکوں جیسا لگ رہا ہے۔ صبح سے شام ہو چلی ہے، خلاف معمول آج میری سبزیاں بھی خوب بکیں اور اب

ٹھیلا خالی ہونے کو ہے جبکہ روز ایسا نہیں ہوتا۔ میں اسی جوش و خروش سے سبزیوں پر تازہ پانی چھڑک چھڑک کر زیرِ لب گنگنا رہا ہوں۔ میری اس سرمستی کو کئی گاہکوں نے محسوس کیا اور مستقل گاہکوں نے تو سوال بھی کر ڈالا۔

"جانی استاد آج کیا بات ہے؟ بڑا خوش لگ رہا ہے۔"

ہاں میں آج بہت خوش ہوں اسی لیے تو سب کچھ اچھا لگ رہا ہے، لیکن ہر خوشی ہر کسی سے کہنے والی تو نہیں ہوتی نا۔ میرے دائیں طرف میرا لنگوٹیا یار، میرا بیلی جمیل اپنے نئے نکور ٹھیلے پر قرینے سے موسمی پھل سجائے گاہکوں کے ساتھ مصروف ہے۔ اس کے چہرے پر بھی طمانیت اور تازگی ہے اور مجھے اس کے چہرے کا سکون بہت بھلا لگ رہا ہے۔ آج اس کا اس کاروبار میں پہلا دن تھا اور اس نے پھلوں کو اس قدر خوبصورتی اور سلیقے سے سجایا کہ سب لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔ اس پر مستزاد اس کا اخلاق، اس کا پھل بھی خوب فروخت ہوا۔ میرا دل سکون سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ ہم دونوں نے مل کر اپنے اپنے ٹھیلوں کا سامان سمیٹا اور اکٹھے ہی ٹھیلے دھکیلتے اپنے گھروں کو چلے۔ جمیل بے حد خوش ہے اور میں اس کی خوشی میں خوش۔ اب میں اپنے خستہ حال گھر کے کچے صحن میں ٹھیلا کھڑا کر کے کھانا کھا رہا ہوں جو میری بیوی نے ابھی ابھی لا کر میرے آگے رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں بانو نے پکایا کیا ہے، میری نظر پلیٹ پر ہے ہی نہیں، میری نظر میں تو کوئی اور ہی منظر گھوم رہا ہے۔

جمیل اور میں بچپن سے ایک ہی محلے میں پلے بڑھے، ساتھ ہی کھیلے اور ساتھ ہی دکھ سکھ جھیلے۔ ہمارے جیسے محلوں میں بچے سمجھدار ہوتے ہی اسکول کے بجائے کسی نہ کسی نوکری کی تلاش کو نکلتے ہیں۔ پہلے پہل کسی ورکشاپ یا ہوٹل کا چھوٹا، پھر عام ملازم، پھر تجربہ کار ملازم اور ترقی کرتے کرتے اگر کوئی بہت محنتی اور لگن والا نکلا تو چار پیسے جوڑ کر اپنا کاروبار شروع کر لیتا ہے، جیسے کہ کوئی ٹھیلا یا کھوکھا۔ میں نے بھی بہت کم عمری سے ہی ہوٹلوں میں چھوٹے اور پھر بیرے کی نوکری کر کر کے پائی پائی جوڑی اور اپنا ذاتی ٹھیلا خرید لیا۔ جمیل کو اینٹ گارے سے لگاؤ تھا سو وہ اینٹ اٹھانے والے "چھوٹے" سے ترقی کر کے مزدور بن گیا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ کم وقت میں بہت سا پیسہ کمانا چاہتا تھا، کیونکہ اس کے سر پر چار بہنوں کا بوجھ تھا اور وہ ابا کا تنہا کماؤ پوت۔

اس کی اپنی شادی بہت کم عمری میں ہی اس کی ماں نے اپنی یتیم بھتیجی سے کر دی تھی جس کے پاس جہیز کے نام پر بس اپنی ماں کے دو جھمکے اور ایک انگوٹھی تھی۔ اس کا میکہ سسرال سب اس کی پھوپھی یعنی جمیل کی ماں ہی تھی کیونکہ وہ بہت بچپن میں ہی اپنے ماں باپ کھو چکی تھی اور اسے جمیل کی ماں نے ہی پالا تھا۔ بالغ ہوئی تو جمیل سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ اب ان کا ایک بچہ بھی تھا اور بہنوں کے اخراجات بھی منہ پھاڑے کھڑے رہتے۔ کسی نے اسے باہر جانے کا خواب دکھایا تو وہ باپ کی آخری پونجی اور ماں کی آخری بالی بیچ کر لیبر ویزے پر سعودیہ چل دیا۔ دیارِ غیر جا کر کمانا آسان نہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ وہاں جاتے ہی گھر میں ہن برسنے لگے گا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہی ہوتی ہے۔ جمیل تو پھر عام سا مزدور تھا جسے تنخواہ بھی بمشکل رو پیٹ کر کافی دن گزار کر ملا کرتی جس میں سے وہ اپنے پاس محض چند ریال رکھ کر باقی سب باپ کو بھجوا دیتا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اچھی خوراک کا رسیا جمیل وہاں دو وقت فاقہ کر کے صرف ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتا تاکہ زیادہ سے زیادہ پیسہ گھر بھیج سکے۔ پہلی تنخواہ ہی اسے دو ماہ بعد ملی۔ اس وقت تک نجانے اس نے کیسے گزارہ کیا، مجھے اس نے کبھی اپنا حال نہیں بتایا۔ اس کے گھر والوں سے یہی سننے کو ملتا کہ وہ وہاں بہت خوشحال ہے۔

اسے سعودیہ گئے کوئی تین ماہ گزرے تھے جب میری اماں نے میری شادی کی تاریخ رکھ دی۔ بانو میری بچپن کی منگ تھی۔ محلے میں تاریخ کی مٹھائی بانٹی تو سب سے پہلے میرے یار جمیل کی ماں مبارک دینے آئی۔ اس نے جا کر جمیل کو فون پر بتایا تو اس نے نجانے کتنا اوور ٹائم لگا کر پیسے اکٹھے کیے اور مجھے مبارکباد کا فون کیا۔ میں نے ازراہِ مذاق پوچھا۔

"یار جمیلے، میری شادی پر کیا تحفہ دے گا۔"

وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا، پھر چند لمحے سوچ کر بولا۔

"او میرا ویر! تو فکر ہی نہ کر، دس دن بعد میرے گھر جا کر ماں سے اپنی شادی کا تحفہ لے لینا۔"

میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ سعودیہ کی کوئی سوغات بھجوا دے گا، کوئی پرفیوم یا شیونگ سیٹ وغیرہ۔ دس دن بعد میں یہ بات ہی بھول گیا۔ جمیل کی ماں نے محلے کے بچے کے ہاتھ پیغام بھیج کر بلوایا تو مجھے اس کی بات یاد آئی۔ میں خوشی خوشی چل دیا۔ اس کی اماں نے ٹھنڈے شربت سے تواضع کی، پھر ایک لفافہ لا کر پکڑایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر شفقت سے بولیں۔

"پتر یہ تیرے ویر کی طرف سے تیرے ویاہ کا تحفہ۔"

میں شرما گیا۔ لفافے میں یقیناً رقم تھی جس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ بہر حال گھر آ کر جب میں نے لفافہ کھولا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اس میں بیس ہزار روپے رکھے تھے۔ ہم جیسوں کے لیے تو بیس ہزار گویا بیس لاکھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے جمیل کی قسمت پر رشک آیا جو سعودیہ میں اس قدر پیسہ کما رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب اس نے مجھے محض شادی کے تحفے کے نام پر بیس ہزار دے دیے تو اپنے گھر تو وہ پچاس ساٹھ ہزار بھیجتا ہوگا۔ جو بھی تھا، پر دوستی میں کون اتنا کرتا ہے، میں اس کا احسان مند ہو گیا۔ میری شادی ہو گئی اور زندگی اگلے دور میں داخل ہو گئی۔ کئی ماہ گزرے، پھر ایک روز سنا جمیل واپس آ رہا ہے۔ اسے فون کیا تو بہت پریشان لگا۔ پھر سنا کہ وہاں اس پر نجانے کس کوتاہی کی وجہ سے مقدمہ ہوا اور جیل ہو گئی۔ جیل کاٹ کر اسے ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔ مجھے شدید دکھ ہوا اور یہ احساس دل میں پنجے گاڑنے لگا کہ اسے کہیں میری ہی نظر نہ لگ گئی ہو۔

ایک روز میری ملاقات اس کے چچا زاد بھائی افضل سے ہوئی۔ اس کا جمیل کے گھرانے سے بہت قریبی تعلق تھا۔ اس نے مجھے اصل حقیقت سے آگاہ کیا کہ جمیل وہاں کتنی کٹھن زندگی گزار رہا تھا اور یہ کہ وہ وہاں اتنی کمائی نہیں کر سکا جتنا پیسہ اسے مقدمے کی مد میں خرچ کرنا پڑ گیا۔ اب وہ واپس آئے گا تو اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کام ہی شروع کر سکے۔ شدید الجھن میں گھرے میں نے اس سے وہ سوال کر لیا جو یہ ساری داستان سنتے ہوئے اتنی دیر سے میرے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔

"بھائی افضل! اگر اس کے حالات پہلے دن سے اتنے برے تھے تو اس نے میرے ویاہ پر مجھے بیس ہزار روپے کیسے بھیجے تھے؟"

افضل مسکرایا تو اس کی مسکراہٹ میں دکھ گھلا ہوا تھا۔

"تو نہیں جانتا وہ تجھے کیا سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے جانی میرا ویر ہے، رب نے اگر مجھے سگا ویر بھی دیا ہوتا تو شاید وہ بھی مجھے جانی سے زیادہ پیارا نہ ہوتا۔ تیرے ویاہ کے لیے وہ بڑا پریشان تھا، اس نے مجھے فون کر کے کہا کہ اگر میں جانی کے ویاہ پر کچھ نہ دے سکا تو خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ پھر اس کی بیوی رانی نے اپنی انگوٹھی بیچ کر اس کی مشکل آسان کر دی تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔"

میں دنگ رہ گیا، جمیل نے تو جیسے مجھے حیران کر دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ حیرت کے ساتھ اب شرمندگی میرے دل کو چیرنے لگی۔ مجھے اس لمحے پر افسوس ہوا جب میں نے مذاق مذاق میں اس سے شادی کے تحفے کی فرمائش کی تھی۔ افضل تو یہ سب کہہ کر چل دیا مگر میرے دل پر انجانا بوجھ دھر گیا۔ کئی روز میں اس بوجھ تلے دبا کراہتا رہا اور جب برداشت سے باہر ہو گیا تو بانو سے کہہ ڈالا۔ وہ سمجھدار عورت تھی، اس نے مجھے وہ مشورہ دیا جو بہترین تھا اور پھر فیصلہ ہو گیا۔ میں ٹھیلا ختم کر کے سبزی کی دکان کرنے کا سوچ رہا تھا اور اسی سلسلے میں میری اور بانو کی کمیٹی اور جمع پونجی ملا کر بیس تو نہیں مگر اٹھارہ ہزار ہو گئی تھی۔ جمیل کے وطن واپس آتے ہی میں نے ایک پھل کی ریڑھی مال سمیت خرید کر اس کے حوالے کر دی۔ روزگار کا ذریعہ سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھر آنے والے پانی سے میری سبزی کی دکان والی پیاس بجھ کر مجھے یوں سیراب کر گئی کہ کوئی تشنگی باقی نہ رہی۔



سحر ملک

مٹی میں جگنو

"مالا چلی گئی لاہور......" وہ ناشتے کے لیے بیٹھا ہی تھا جب تائی نجمہ نے اسے اطلاع دی۔

"جی پتا ہے مجھے۔" رات کے واقعہ کا اس نے جان بوجھ کر ذکر نہیں کیا تھا، کیا بتاتا کہ رات کس طرح اسے کھری کھری سنا کر گئی ہے۔

"پتا نہیں اس لڑکی کے ہاتھوں کتنی ذلت لکھی ہے ہمارے مقدر میں۔ آج تو ادھر ہمارے سینے پر مونگ دل رہی ہے، کل کو شادی ہو گی — لوگ تھوتھو کریں گے میرے منہ پر۔ مجھے تو سوچ کر ہی ہول اٹھتے ہیں، کیا کہیں گے لوگ کہ دیور کی ایک بچی نہیں سنبھالی گئی۔ اب کیا بتاؤں کہ چھٹانک بھر کی چھوکری نے نچا کر رکھ دیا ہے۔" چائے کا کپ تقریباً پٹختے ہوئے اس کے سامنے رکھا۔

"نہ پڑھا نہ لکھا، نہ کوئی ہنر ہاتھ میں...... چلو یہ سب بھی جانے دو اس کی تو تربیت میں ہی کھوٹ نکلے گا۔ ساری لعن طعن میرے حصے میں آئے گی۔ اب ماہ رخ کو دیکھ لو، اس سے بس سال ہی بڑی ہو گی ماشاء اللہ ہر فن مولا ہے میری بچی!"

حسب معمول تائی نجمہ کا لیکچر طویل ہو رہا تھا اور اس کا فشار خون بلند، ان کے اس اکتا دینے والے لیکچر سے وہاب لفظ بہ لفظ متفق تھا۔

مالا چھوٹے چاچو کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ایک

مکمل ناول



حادثے میں چاچو کی وفات ہوگئی تو چاچی منزہ عدت کے لیے ایسی گھر گئیں کہ واپس ہی نہ آئیں۔ ان کے گھر والوں نے باہمی رضامندی سے ان کی دوسری شادی کردی۔۔ البتہ مالا کو واپس بھیج دیا گیا تھا۔ مالا اس وقت پانچویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ واپس آنے کے بعد لاکھ کوششوں کے باوجود وہ تعاون پر تیار نہیں تھی۔ اس کا ننھا وجود ہر تلخ حقیقت کا انکاری تھا۔ برتن اٹھا اٹھا کر دیواروں پر مارتی، بس ایک ہی رٹ "ماما چاہیے، پاپا لا کردو۔" شروع میں تو برداشت کرتے رہے پھر تائی نجمہ جانیں یا مالا کہ انہوں نے اسے کس طرح قابو کیا۔ اب وہ اتنا چیخ تو نہیں کرتی تھی لیکن ضدی بہت ہوگئی تھی۔

اسی ضد میں اس نے پڑھائی چھوڑی تھی، اس کی ضد کا ہی نتیجہ تھا کہ اکیس سال کی عمر میں نہ صرف تعلیمی لحاظ سے بلکہ ہر معاملے میں کوری تھی اور یہ اس کی بدتمیزیاں ہی تھیں جن کی وجہ سے اب اس سے پیار تو درکنار کوئی اس پر ترس بھی نہیں کھاتا تھا۔ اس نے خود کمرے تک محدود کرلیا تھا، نہ کسی سے دوستی نہ دشمنی بلکہ دشمنی تو تھی اس کی ماہ رخ سے...... خاموش دشمنی۔

تائی نجمہ نے اپنا سارا اکھڑاپا پوری طرح ماہ رخ میں منتقل کردیا تھا۔ نرم طبع ماہ رخ ہر طرح سے مالا کی ضد تھی۔ باتمیز، بااخلاق، اصول پرست اور سب کا خیال رکھنے والی، ہر کام میں طاق...... کھانا بنانا، سینا پرونا، ہر کام میں ماہر۔ پورا گھر جیسے اس نے سنبھال رکھا تھا۔ خود تائی نجمہ کہتی تھیں کہ اب مجھ سے کچھ نہیں کیا جاتا، ماہ رخ کی ہمت ہے جو ہر کام اپنے ذمہ لے لیا۔

"اچھا دفع کرو مالا کو، آج ذرا جلدی آجانا آفس سے۔" تائی نجمہ کی آواز سن کر وہ خیالوں سے باہر نکل آیا۔ ویسے اسے حیرت بھی تھی کہ ایسا کون سا ضروری کام تھا جس کے لیے تائی نجمہ نے "مالا نامہ" لپیٹ کر سائیڈ پر رکھ دیا۔

"جی اچھا، آجاؤں گا۔"

"جیتے رہو، شام کو ذرا کسی اچھے ہوٹل سے کھانا بھی لے آنا۔ میرا بھانجا آرہا ہے کراچی سے، ماہ رخ کے تو پیپرز ہیں۔ بچی اپنی پڑھائی پر پہلے ہی سارا سال توجہ نہیں کرپائی اور پیپروں میں مالا کو بھی ماں یاد آجاتی ہے۔ کام چور، نمی۔"

"جی ٹھیک ہے، بتادیں کیا کیا لانا ہے، میں لیتا آؤں گا۔"

"شاباش میرا بچہ۔" تائی نے اسے مینو بتادیا تو وہ بھی آفس کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

★★★

"وہاب......"

اس نے مڑ کر دیکھا، کمرے کے دروازے میں ماہ رخ کھڑی تھی۔

"ہاں آجاؤ۔" کف کے بٹن لگاتے ہوئے اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"نہیں، میں نیچے جارہی ہوں امی کھانے پر بلارہی ہیں۔"

"بس نیچے ہی آرہا ہوں۔" ماہ رخ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا کر نیچے چلی گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی اتر آیا۔

شائق تقریباً اسی کی عمر کا ہنس مکھ اور خوش اخلاق لڑکا تھا۔ وہاب کو شائق اچھا لگا تھا۔ بڑے خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے دوران بھی شائق باتیں کرتا رہا۔ اس نے وہاب کے بزنس کے متعلق بھی پوچھا اور خود اپنی جاب کے حوالے سے بھی بتایا، کھانے کے بعد تائی نجمہ چائے لے آئیں۔

"اوہو امی! میں ـــ بنا لیتی چائے، آپ کیوں بنالائیں۔" ماہ رخ نے شرمندگی سے کہا۔

"لو، میں نے بنالی تو کیا ہوگیا، پہلے بھی تم ہی بناتی ہو، بعد میں بھی تم نے ہی بنانی ہے، بس پہلے پیپر دے لو۔" تائی نجمہ نے محبت سے کہا تو اس نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پتا ہے شائق! امی پیپرز میں مجھے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔"

"کس کلاس کے پیپرز ہیں تمہارے؟" شائق نے دلچسپی سے پوچھا۔

"بی اے کے پیپرز ہیں۔" اس نے فخر سے جواب دیا۔

"تیاری کیسی ہے؟"

"تیاری...... بس سو سو ہے، مجھ سے اتنی مغز ماری نہیں ہوتی۔ یہ تو امی کا شوق ہے ورنہ میٹرک کے بعد ہی پڑھائی کو خیرباد کہہ دیتی۔" اس نے ہنس کر جواب دیا تو شائق بھی ہنس پڑا۔ وہاب البتہ ٹی وی پر خبرنامہ دیکھنے میں مصروف تھا۔

"ہاں اسے کاموں کا شوق ہے۔ گھر کے کام کروالو، کھانا بنوالو، چاہے پاکستانی ہوں یا چائنیز، اٹالین، تھائی...... ہر طرح کی کوکنگ کرلیتی ہے۔"

وہاب کی بات پر شائق نے حیرانی سے سامنے بیٹھی سانولی سلونی سی ماہ رخ کو دیکھا۔

"کیا واقعی؟"

"ہاں ناں۔" سرسری سا جواب دے کر وہ بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

شائق آیا تو آفس کے کام سے دو دن کے لیے تھا لیکن آتے ہی اسے بخار نے گھیر لیا جس کی وجہ اس کا قیام ایک ہفتے پر پھیل گیا تھا۔ ایک تو طبیعت خراب دوسرا گھر سے دور، وہ جی بھر کر بدمزہ ہورہا تھا۔ ماہ رخ کے پیپرز تھے سو وہ شاذ و نادر ہی چہرہ دکھاتی۔ وہاب کا اپنا بزنس تھا اور وہ فل ٹائم بزنس مین تھا، اس کے علاوہ گھر میں تھا ہی کون جس سے وہ رفاقت کی امید کرتا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کمپنی نے نئے آفس کے لیے اسے بھیجا تو وہ کم از کم یہاں نہیں رہے گا، ان ہی سوچوں میں گم وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ ماہ رخ سے سامنا ہوگیا۔

"ارے...... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں، کہاں جارہے ہیں آپ؟ کوئی کام تھا تو مجھے بلالیا ہوتا۔"

نظر اٹھا کر اس نے ٹپ ٹاپ سی کھڑی اس لڑکی کو دیکھا۔

"محترمہ! مانا کہ بیمار ہوں بلکہ تھا...... اب تو ٹھیک ہوں، اس کے ساتھ ساتھ زندہ انسان بھی ہوں۔ آپ لوگ تو مجھے "رکھ" کر بھول ہی گئے ہیں۔" اس نے مسکرا کر شکوہ کیا۔

"ارے نہیں، بس ذرا مصروف ہوں، سارا سال گھر کے کام مصروف رکھتے ہیں تو بس پڑھائی کے یہی دن ہوتے ہیں۔" اس نے سر جھٹک کر شرمندگی اور مسکراہٹ سے وضاحت کی تو وہ باقاعدہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"مجھے کیا پتا۔"

"جب اگلی بار آئیں گے تو آپ کے سارے گلے شکوے دور ہوجائیں گے۔"

"یہ بات ہے تو بس پھر تیار رہنا، میں ادھر

ٹ ہونے والا ہوں۔" وہ بھی ہنس پڑی۔
"ضرور...... پہلے یہ بتائیں آپ جا کہاں
ہے تھے؟"
"کہیں بھی نہیں بس ذرا اکتا گیا تو باہر نکل
یا۔"
"چلیں پھر لان میں چلتے ہیں، میں چائے اور
ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے لاتی ہوں۔" اثبات
میں سر ہلا کر وہ لان میں آ گیا۔
لان عدم توجہی کا شکار لگ رہا تھا۔ گھاس بڑھی ہوئی تھی اور پودوں کو بھی کانٹ چھانٹ کی ضرورت تھی، خودرو پودوں نے لان کا حسن ماند کر دیا تھا، کچھ ہی دیر میں ماہ رخ چلی آئی۔
"یہ لیں جناب میرے ہاتھ کے بنے کباب اور چائے۔" ٹرے اس نے میز پر رکھ دی اور کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔
"اتنی جلدی کباب بنا لیے؟" کباب منہ میں رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔
"اصل میں پیپر شروع ہونے سے پہلے بنا کر فریز کر دیے تھے کیونکہ مجھے پتا ہے کھائے بنا میرا گزارہ نہیں اور بنائے مجھ سے جائیں گے نہیں۔"
اس نے مزے سے جواب دیا۔
"ہاں...... ویسے کباب تو بہت اچھے بنے ہیں۔"
"میں سب کچھ اچھا ہی بناتی ہوں بلکہ بہت اچھا بناتی ہوں۔" اس نے مصنوعی کالر اکڑائے۔
"غلط بات...... چائے بالکل بھی اچھی نہیں بنی۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہی اس نے کپ واپس رکھ دیا، وہ منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
"پی کر دیکھو، مذاق نہیں کر رہا، میں تو بس کباب ہی کھاؤں گا۔" اپنی دھن میں کہتے اس نے ایک نظر ماہ رخ کے چہرے پر ڈالی جس کا رنگ دھواں ہو رہا تھا۔ اسے اپنی بات پر دکھ ہوا لیکن وقت گزر گیا تھا۔ بطور خاص بنی چائے کی وہ بے عزتی کر چکا تھا۔
"چپ کیوں ہو گئی ہو، کھاؤ یہ کباب بہت مزے کے ہیں۔" اپنی پہلی بات کا تاثر زائل کرنے کے لیے اس نے کہا، ماہ رخ کا چہرہ پھر بھی نہیں کھلا۔
"ہاں...... تم کھاؤ میں ذرا امی کو دیکھ آؤں۔"
اس کا جواب سنے بغیر وہ تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر چلی گئی۔
کندھے اچکا کر وہ کباب کھانے میں مشغول ہو گیا۔

☆......❁......☆

آنے والے دن شائق کے لیے بے پناہ مصروفیت لیے ہوئے تھے، کمپنی نے اس کی مرضی سے نئے آفس کی پوری ذمہ داری اس پر ڈال دی تھی، کام اتنا زیادہ تھا کہ وہ دن اور رات کا فرق بھلائے کام نمٹانے میں لگا ہوا تھا۔ پاپا چاہتے تھے فائق کی طرح شائق بھی ان کا کاروبار سنبھالے لیکن شائق کی اپنی طبیعت تھی، اپنا مزاج تھا۔
اس کے مطابق جاب کا مطلب صرف ڈیوٹی آورز کی ذمہ داری اور بزنس کا مطلب فل ٹائم ٹینشن، فی الحال اس کا ٹینشن وہ بھی فل ٹائم، کا موڈ نہیں بن رہا تھا سو جاب کر رہا تھا۔
آج کافی دن بعد وہ ناشتے کے لیے گھر پر موجود تھا۔ ماہ رخ کے بھی کل پیپر ختم ہو گئے تھے سو وہ اور وہاب بھی کچن میں میز کے گرد کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ تائی نجمہ پراٹھے بنا رہی تھیں، وہ تینوں ماہ رخ کے کالج میں پیش آنے والے کسی واقعے پر ہنس رہے تھے جب تینوں نے اندر آنے والی شخصیت کو بیک وقت دیکھا۔
"ابو آپ......" وہاب مؤدب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔
وہ شاندار تھری پیس میں ملبوس تھے، ان کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آ رہے تھے۔
"کیوں، تم نے سوچ لیا کہ میں مر گیا ہوں؟"
ان کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔
"کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی صاحب!"
بُت بنی تائی نجمہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

"بس......" ہاتھ اٹھا کر انہوں نے تائی نجمہ کو کچھ بھی کہنے سے روکا۔
"تم سے مجھے یہی امید تھی، تم ذمہ داری نبھا ہی نہیں سکتے۔" وہ وہاب کی طرف بنا پلکیں جھپکائے دیکھ رہے تھے۔
ماہ رخ تو کاٹو بدن میں لہو نہیں کی زندہ مثال بنی کھڑی تھی۔
"ہوا کیا ہے ابو!" چھ فٹ لمبے وہاب کی آواز دبی دبی سی نکلی۔
"اگر تمہیں یہاں رہ کر پتا نہیں چل سکا تو میرے بتانے سے کیا خاک پتا چلے گا، ابھی بھی وقت ہے اپنی آنکھوں سے غفلت کی پٹی اتار دو پھر سب کچھ خود نظر آئے گا، کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں ہی غیر ذمہ دار نکلا جو بابا کی ذمہ داری تمہارے جیسے...... تمہارے جیسے...... کو سونپ گیا۔"
آخر میں ان کا لہجہ شکستہ ہوا تھا۔
"ابو! بابا کا خیال پوری طرح رکھنے کی کوشش کی ہے ہم نے، اگر کوئی کمی رہ گئی تو میں معافی......"
"اوہ بس کرو، کیا خیال رکھا؟ کتنی بار ان کے پاس گئے تھے؟" انہوں نے بات کاٹی۔
"ابو! ماہ رخ کھانا بنا کر دوائیں دے کر آتی رہی ہے۔ میں روز پوچھتا رہا ہوں، آفس سے بھی فون کر کے پوچھتا رہا ہوں۔"
"تم میں اور مجھ میں یہیں سے پہلا فرق نکل آیا، تم پوچھتے ہو اور میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ بابا کی بیشتر دوائیاں ختم ہو چکی ہیں اور جو ہیں وہ کم و بیش ایک ماہ سے نہیں کھائیں۔ اب ماہ رخ سے پوچھ لینا یہ کون سی دوائیں دے کر آتی رہی ہے۔"
زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے ایک نظر بے چینی سے پہلو بدلتی ماہ رخ پر ڈالی اور باہر نکل گئے۔
ان کا رخ پورچ کی جانب تھا۔ یقیناً وہ دوائیں لینے جا رہے تھے۔ وہاب کو سنبھلنے میں چند لمحے ضرور لگے تھے۔
"ماہ رخ! تم نے جھوٹ بولا مجھ سے؟"

"اب تم نہ شروع ہو جانا پلیز، ان کی مجھ سے چڑ کون نہیں جانتا؟ ایک تو میرے پیپرز اوپر سے میں منتیں ترلے کر کے اگلے بندے کو اسی کے بھلے کے لیے دوائیں اور کھانا کھلاتی پھروں، اتنا وقت نہیں ہوتا میرے پاس پیپرز میں۔ اوپر سے تمہیں بھی ان کے علاوہ کچھ بجھائی نہیں دیتا، خود تم ہفتہ ہفتہ ان کی شکل نہیں دیکھتے اور میں دن کے اٹھارہ گھنٹے ان پر ضائع کروں، امپاسبل۔"
اس کے سامنے کھٹ کھٹ کرتی وہ بھی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ ماہ رخ کی بدتمیزی اور کٹھور لہجے پر وہ حد درجہ حیران تھا۔ ماہ رخ کب سے ایسی ہو گئی۔ تائی نجمہ بھی دل ہی دل میں ماہ رخ پر کھول رہی تھیں اور شائق...... وہ اپنی جگہ حیران تھا کہ کم و بیش ایک ماہ ہونے کو تھا اسے ادھر اور اسے علم ہی نہیں کہ اس گھر میں بابا نامی کوئی ذی روح بھی موجود ہے حالانکہ اس نے بابا کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن یہ نہیں پتا تھا کہ وہ بھی اسی گھر میں رہتے ہیں۔ وہ حیران تھا، یہ جانے بغیر کہ آنے والی صبح اس کے لیے حیرانیوں کے مزید سامان لیے کھڑی ہے۔

☆......❁......☆

نماز ادا کر کے تلاوت کے بعد وہ جاگنگ کے لیے نکلنے ہی والا تھا جب اسے نیچے اترتے ہوئے کچن کی طرف سے مدھم مدھم آنے والی آواز نے روک لیا۔
"ڈونوٹ ٹرائے ٹو ریڈیوس ہی پلیز...... اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا، راحتیں اور بھی ہیں......" وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرائی۔
وہ کسی کی ذاتیات میں دخل اندازی کا قائل نہیں تھا لیکن آواز تھی کہ زنجیر، وہ کھنچتا چلا گیا۔ یہ تو اسے یقین تھا کہ آواز ماہ رخ کی نہیں، اگر ماہ رخ کی تو نہیں تو کس کی آواز تھی؟ فطری سا تجسس تھا۔
"جی نہیں، آپ میرے حال پر رحم فرمائیں، میرے کرنے کے اور بہت سے کام ہیں۔" وہ شاید فون پر بات کر رہی تھی۔

''اوہ یار! جانے دو۔ کبھی موقع ملا تو کروں گی ڑائی آپ کی محبت وجت۔''

''اچھا اب ناشتا بن گیا' ذرا ٹرے ریڈی کرلوں۔'' اس کا لہجہ الوداعی ہوا تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ جتنی تیزی سے وہ کمرے کی طرف گیا تھا اس سے دگنا تیزی سے وہ واپس آیا تھا۔

اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ سستی سی کاٹن کی پیازی چیک والی قمیص اور سادہ شلوار پر دوپٹا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شہد رنگ بال اس نے موڑ کے کیچر میں جکڑ رکھے تھے اس لیے ان کی لمبائی کے بارے میں وہ کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

جب وہ پلٹی تو وہ اس کے ہاتھ میں دھلے ہوئے چائے کے دو مگ تھے، شائق پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ پھرتی سے مگ ٹرے میں رکھ کر چائے انڈیلنے لگی۔

''کچھ چاہیے؟'' اس نے بغیر دیکھے شائق کو مخاطب کیا۔

''ایک کپ چائے ملے گی؟'' بلا ارادہ اس کے منہ سے نکلا۔

''ہم......ضرور۔'' ٹوسٹر سے توس نکال کر اس نے چینی کی پلیٹ میں رکھے اور پلیٹ ٹرے میں رکھ دی پھر ایک اور کپ نکال کر اس میں چائے ڈال کر پرچ میں رکھ کر اس کی طرف بڑھادی۔ اس سارے عرصے میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی شائق کی طرف نہیں دیکھا اور اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سے نظر نہیں ہٹائی۔

بلا کے تیکھے نقوش تھے اور حد درجہ سادگی بھی۔

چائے لے کر وہ کمرے میں چلا گیا۔ چائے کا ذائقہ کمال کا تھا۔ ہلکی سی اٹھتی الائچی کی مہک بھلی لگ رہی تھی۔ اس کی طبیعت فریش ہوگئی تھی۔

کپڑے اگرچہ سستے تھے لیکن پھر بھی وہ کسی طور کام والی نہیں لگ رہی تھی۔ اسی کو سوچتے ہوئے وہ تیار ہو کر آفس کے لیے نکل گیا، دن بھر وہ کام میں اتنا مصروف رہا کہ اس کے ذہن سے سب کچھ نکل گیا لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی ایک بار پھر اسے وہ لڑکی یاد آ گئی۔ فریش ہو کر لاؤنج میں آیا تو خالہ اور ماہ رخ وہیں پر بیٹھے تھے۔

''السلام علیکم!'' کہہ کر وہ خالہ نجمہ کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا، ٹی وی پر کوئی انڈین سوپ چل رہا تھا۔

''میں نے اٹالین پاستا بنایا ہے، کھاؤ گے؟''

''ہاں لے آؤ، اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔'' اس سے پہلے نجمہ بیگم نے جواب دے دیا۔ ماہ رخ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

تب ہی اس نے صبح والی لڑکی کو دیکھا، اسی حلیے میں بغیر دوپٹے کے وہ کچن سے نکل رہی تھی۔ ویسے تو دوپٹا ماہ رخ بھی نہیں لیتی تھی لیکن کم از کم اس کے کندھے پر دوپٹا موجود ہوتا تھا۔

''مالا! سلام تو لے لو۔'' اسے خاموشی سے جاتا دیکھ کر نجمہ بیگم نے آواز دی۔

''السلام علیکم!'' کہہ کر وہ اسی بے نیازی سے لاؤنج عبور کر گئی۔

''یہ میرے مرحوم دیور کی بیٹی ہے، باپ کے گزر جانے کے بعد ماں نے دوسری شادی رچالی اور اسے یہاں بھیج دیا۔ میں نے تو بہت چاہا کہ ماہ رخ کی طرح پڑھے لکھے' گھرداری سیکھے لیکن اللہ جانے مجھ سے کہاں کوتاہی ہوگئی۔ بالکل کوری رہ گئی' اوپر سے بددماغ اتنی ہے کہ خدا کی پناہ، مجھے بھی نہیں بخشتی۔ اس کی بدتمیزیوں سے تو شیطان بھی پناہ مانگے۔'' نجمہ بیگم اس کی عدم توجہی سے بے نیاز اپنی کہے جارہی تھیں، اس کی نگاہیں ابھی بھی اسی طرف تھیں جہاں پر وہ غائب ہوئی تھی۔

''اوہو چھوڑیں بھی، کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں آپ۔'' پاستا اس کے سامنے میز پر رکھ کر وہ اس کے عین سامنے بیٹھ گئی۔

''اگر وہ بدتہذیب یا جاہل ہے تو کیا ضروری ہے ہم بھی اس سے ویسے ہی بن کر ٹریٹ کریں' ٹھیک

کہا نا شائق؟'' نرم لہجے میں کہتے اس نے شائق سے تائید چاہی، اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''پاستا تو بہت اچھا بنایا ہے۔'' واقعی اتنے مزے کا پاستا تھا کہ وہ تعریف کیے بنا نہیں رہ سکا۔

''تھینک یو۔'' اس کے تعریف کرنے پر وہ کھل اٹھی۔ ''ایک فرینڈ سے لی تھی ریسپی۔''

''وہاب نے ٹھیک کہا تھا' واقعی تمہارے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔'' اس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

''اب تو روز کچھ نہ کچھ اسپیشل بنا کر کھلایا کروں گی، پیپرز ختم اور میں آزاد۔'' اس کے ساتھ وہ بھی ہنس پڑا۔

''شائق بیٹا! اگر برا نہ مانو تو بیٹا' وہاب کے ساتھ کمرہ شیئر کرلو۔ کنسٹرکشن کا کچھ کام ہے اور بھائی صاحب کسی بھی غیر ملکی دورے پر جانے سے پہلے اپنی نگرانی میں کام کروانا چاہ رہے ہیں۔''

''جی خالہ ضرور کرلوں گا اور ماہ رخ......'' اس نے ماہ رخ کی طرف دیکھا۔ ''پاستا سچ میں بہت مزے کا ہے۔'' ماہ رخ کے ساتھ نجمہ بیگم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆......❁......☆

رات تک خالہ بیگم نے اس کا سامان اٹھوا کر وہاب کے کمرے میں رکھوا دیا تھا، وہاب یوں بھی بہت مصروف رہتا تھا۔ کم کم ہی گھر پر نظر آتا تھا سو اسے یا وہاب کو کمرہ شیئر کرنے سے کوئی مسئلہ نہیں ہوسکتا تھا۔

وہاب کے کمرے کی ایک کھڑکی گھر کے پچھلے حصے کی طرف کھلتی تھی، رات سونے کے لیے لیٹنے سے پہلے اس نے وہ کھڑکی کھولی تو مالا کو ادھر سے گزرتے دیکھا۔ کھڑکی کھلی چھوڑ کر وہ وہاب کے پاس آ بیٹھا۔ وہاب لیپ ٹاپ کھولے کسی کام میں مصروف تھا۔

''وہاب بھائی! یہ جو لڑکی ہے مالا......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہاب چونک کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''کیا ہوا؟ تم سے بھی کوئی بدتمیزی کی ہے اس نے؟''

''اوہ نہیں۔'' وہ شرمندہ ہوگیا۔ ''میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا، کتنی عجیب سی ہے، اس کا رویہ ابنارمل سا لگتا ہے مجھے' شاید میرا وہم ہو۔''

''عجیب تو خیر واقعی ہے، بچپن میں میری اچھی خاصی دوستی تھی اس سے پھر جب اس کے فادر کی ڈیتھ کے بعد اس کی مدر کی سیکنڈ میرج ہوگئی اور یہ یہاں آ گئی تب اس کا رویہ اتنا برا تھا کہ ڈھونڈنے سے بھی مجھے پہلے والی مالا نہیں ملی۔''

''ہوں......'' اس سے مزید کچھ کہا ہی نہیں گیا، جانے کیوں اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔

اسے پتا تھا کہ خالہ نجمہ کے ساتھ ان کے شوہر کی بھتیجی بھی رہ رہی ہے اور شاید سالوں پہلے ملاقات بھی ہوئی ہو لیکن یہاں آنے تک ذہن سے سب محو ہوگیا تھا اور اب اسے مالا نامی مقناطیس اپنی سمت کھینچتا چلا جارہا تھا اور وہ بے بس تھا۔

☆......❁......☆

اگلی صبح وہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے کچن میں آیا تھا، حسب توقع وہ کچن میں ہی تھی۔ اسی طرح سادہ سے لباس میں بغیر دوپٹے کے تیزی سے کام نمٹاتی ہوئی۔

''چائے چاہیے؟'' آج اس کا سوال مختلف تھا۔ زیر لب مسکرا کر اس نے ''ہاں'' میں جواب دیا اور دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔

''سو......تم روز یہی ناشتا کرتی ہو؟'' اس کا اشارہ سامنے شیلف پر دھری ٹرے کی طرف تھا جس میں گزشتہ روز کی طرح سنکے ہوئے براؤن توس، ابلے ہوئے دو انڈے اور چائے کے دو خالی مگ پڑے تھے۔

ایک لمحے کے لیے حیران ہو کر اس نے شائق کی طرف دیکھا، اسے یقیناً اس بے تکلفی کی امید نہیں تھی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں حیرت بہت بھلی لگی تھی شائق کو۔

''نہیں، بابا کے لیے بناتی ہوں کبھی کبھار۔''

اسے ایک بار پھر بابا یاد آ گئے۔ اس دن وہاب کے ابو کے منہ سے اس نے بابا کا ذکر سنا تھا اور آج اس کے منہ سے۔

"بابا ہوتے کدھر ہیں؟ مجھے تو مہینے سے اوپر ہو گیا یہاں رہتے ہوئے، میں نے تو کبھی نہیں دیکھا انہیں۔" وہ اس سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

"وہ چل پھر نہیں سکتے، پچھلی طرف اپنے کمرے میں ہی ہوتے ہیں۔" اب کی بار اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سرد مہری تھی۔ اسے یقیناً اس کا بے تکلف ہونا پسند نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اور کوئی سوال کرتا" وہ اس کا کپ شیلف پر چھوڑ کر اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل گئی۔ دوسرے لفظوں میں یہ واضح اشارہ تھا کہ وہ اس سے زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرے۔

زیرِ لب گنگناتے ہوئے جینز کی جیب میں ہاتھ پھنسا کر وہ اس کے پیچھے کچن سے نکل آیا۔ پہیلیوں کا اسے بچپن سے ہی بہت شوق تھا اور اب وہ مالا نامی پہیلی کو بوجھنا چاہتا تھا۔ مالا کے لیے اس کے ذہن میں "سمپلی امیزنگ" کے علاوہ کوئی لفظ نہیں آتا تھا۔

☆......❁......☆

سورج کی ابتدائی کرنیں نرم سی تمازت لیے اتر رہی تھیں۔ اسے لگا شاید اس نے پہلی بار اتنی خوب صورت صبح دیکھی ہے۔ گھر کا پچھلا حصہ ایک مکمل الگ گھر تھا۔ شاید کسی دور میں اس کی اپنی بھی کوئی شناخت ہو۔

پکی روش مرکزی عمارت کی طرف رہنمائی کر رہی تھی جب کہ باقی ساری زمین پر مخملی سبز گھاس کا فرش بچھا ہوا تھا۔ ملکی غیر ملکی نایاب پودوں پر لگے خوش رنگ پھول جہاں آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے وہیں مکین خانہ کے اعلیٰ ذوق کا بھی پتا دے رہے تھے۔ ایک چھوٹے سے قطعے پر مصنوعی چھوٹی سی آبشار پتھروں پر سے چھلکتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ انگور کی بیل سلیقے سے پوری دیوار ڈھانپ کر کھڑی تھی تو ایک طرف ——— سے مصنوعی چھت تخلیق کی گئی تھی جس کے نیچے دو کرسیاں اور میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ پودوں کی تراش خراش اس کمال کی تھی کہ وہ داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ بڑا فرحت بخش اور جاں فزا احساس تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

جائزہ لیتے اور پکی روش پر چلتے ہوئے وہ چوبی دروازے کے عین سامنے کھڑا ہوا، دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے اندر کا منظر بڑا واضح نظر آ رہا تھا۔ مرکزی دروازے کے سامنے کمرے کا دروازہ بھی کھلا تھا جہاں وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا وجود اگرچہ بہت بوڑھا تھا پھر بھی اس چہرے پر عجیب سی معصومیت اور کشش تھی۔ وہ اندر چلا آیا۔ مالا کی پشت دروازے کی طرف تھی اس لیے وہ اسے دیکھ نہیں سکی، وہ کمرے کے باہر رک گیا۔ اسی لمحے بابا کی نظر اس پر پڑی، انہوں نے اشارے سے اسے اندر بلایا۔ وہ تو پہلے ہی اندر جانا چاہ رہا تھا بس تذبذب کے عالم میں کھڑا دیکھ رہا تھا، انہوں نے اشارے سے پوچھا۔

"کون ہو؟"

"میں......" اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا مالا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اس کی نظر میں خنجر سی کاٹ تھی۔

"کیا مسئلہ ہے...... اب کیا چاہیے؟"

"چاہیے تو کچھ نہیں بس ذرا بابا کو دیکھنے آ گیا تھا۔" اس نے قدرے اطمینان سے جواب دیا، یہ اور بات کہ اس بات سے کسی اور کا اطمینان غارت ہو گیا البتہ بابا کے چہرے پر ہلکی سی غیر واضح مسکراہٹ اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"بابا کو دیکھنے کے لیے میں کافی ہوں، اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں، سمجھے؟" اس کے لہجے کی نوکیلی چبھن اس نے چٹکیوں میں اڑائی تھی۔

"جی سمجھا، اب تم بھی یہ سمجھ لو کہ بابا پر تمہاری اجارہ داری نہیں ہے اور نہ ہی بابا تمہارے قیدی ہیں۔ اس لیے کوئی بھی، کسی بھی وقت ان سے ملنے آ سکتا ہے، کیوں بابا؟" بات ختم کر کے اس نے بابا کی طرف دیکھا جو پہلے ہی ہنسی روکنے کے چکر میں بے حال ہو رہے تھے۔

"ہاں ہاں، بالکل ٹھیک۔" بمشکل بول کر وہ پھر اپنی ہنسی کنٹرول کرنے لگے۔

"میں دیکھ لوں گی تمہیں۔" اس کی آواز غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی، پیر پٹختی وہ ساتھ والے کمرے میں چلی گئی اور زور کے دھماکے سے دروازہ بند ہو گیا، اگلے ہی لمحے بابا کے قہقہے ابل پڑے۔

"کمال کے ہو تم۔" زیادہ ہنسنے کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

"وہ تو میں ہوں، آپ بھی کچھ کم نہیں، آپ بھی بہت کمال کی ہیں۔" وہ ایسے بے تکلفی سے بات کر رہا تھا جیسے کوئی ہم عمر بچپن کا دوست ہو۔

"ایکسکیوزمی...... تم میری جینڈر چینج کرو، مجھے یہ پسند نہیں۔" انہوں نے قدرے برا مان کر کہا۔

"اوہ سوری، اصل میں آپ اس قدر پردہ نشین واقع ہوئے ہیں کہ مجھے لگا آپ بابا نہیں بی بی ہیں۔" اس نے مصنوعی شرمندگی سے وضاحت کی۔

بابا پھر ہنس پڑے۔ "بتاؤں گا کبھی یہ بھی، ابھی تم یہ بتاؤ تمہیں ڈر نہیں لگا اس سے؟" ان کا شارہ مالا کی طرف تھا۔

"اوہ...... وہ مجھے کھا سکتی تھی؟ میں ڈر گیا۔ پہلے بتاتے تو پہلے ڈر جاتا۔" اس نے ڈرنے کی اداکاری کی تو بابا پھر ہنس پڑے۔

"اچھا بتاؤ کیا واقعی مجھ سے ملنے آئے ہو؟" انہوں نے راز داری سے اس کی طرف جھکتے ہوئے شرارتی لہجے میں پوچھا۔

"آپ سے ملنے بھی اور اس کے پیچھے بھی۔"

"اوہ گریٹ۔" وہ بے ساختہ پرجوش ہوئے۔ "سچ بھی بولتے ہو؟"

"ہم...... کوشش کرتا ہوں۔" گھڑی دیکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا لگا تم سے مل کر۔" ان کے لہجے میں ایک آس کی خوشبو بسی تھی۔

"اب یہ اچھا لگتا رہے گا ان شاء اللہ۔" اس نے مسکرا کر بابا کے شفیق چہرے پر دمکتی خوشی کا عکس دیکھا۔

"ضرور، میں انتظار کروں گا۔"

وہ کچن کی طرف جا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہی سہی پر وہ اس کے ہاتھ کی بنی چائے مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد وہ کمرے سے نکل آئی۔

"اتنے سڑے منہ کے ساتھ ناشتا کرواؤ گی تو مجھے نہیں کرنا۔" ناشتے کے لیے میز پر برتن لگاتے دیکھ کر انہوں نے آواز لگائی۔

"یہ تو آپ کو خود سوچنا چاہیے تھا، وہ بھی پہلے۔" برتن تقریباً پٹخ پٹخ کر وہ میز پر رکھ رہی تھی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" انہوں نے حیرت سے کہا تو اس نے مڑ کر ناراض سی نظر ان پر ڈالی جیسے کہہ رہی ہو "آپ کو نہیں پتا؟"

"آپ کو پتا ہے وہ تائی نجمہ کا بھائی تھا۔" لاہور جانے سے پہلے اسے تائی نجمہ کی زبانی ہی پتا چلا تھا۔

"تو......؟"

"ابھی بھی پوچھ رہے ہیں؟" اپنے مخصوص انداز میں اس نے ابرو اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون ہے۔"

"مجھے پڑتا ہے۔" وہ بات کاٹ کر بولی۔

"آزر کا بیٹا ابراہیم ہو سکتا ہے ناں؟" انہوں نے پینترا بدلا۔

"آزر کا بیٹا ابراہیم ہے۔" "ہے" پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔ "اور یہ تائی نجمہ کا بھانجا ہے، دونوں بہنیں ہیں ایک ماں باپ سے تربیت پائی ہے اور اب یہی سب اپنی اولاد میں بھی منتقل کریں گی، ماہ رخ کو نہیں جانتے آپ؟"

"موسیٰ نے فرعون کے محل میں پرورش نہیں پائی تھی؟"

"بابا......" وہ احتجاجاً اونچی آواز میں بولی تھی۔

"تم خوف زدہ کس چیز سے ہو؟" انہوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ پہلو بدل گئی۔

"نہیں ہوں میں خوف زدہ۔"

دونوں خاموشی سے ناشتا کرنے لگے یہ اور بات کہ اس نے اندر کہیں مان لیا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے۔ اس کی بڑھتی ہوئی بے تکلفی نے اسے ازحد خوف زدہ کردیا تھا۔

☆......❁......☆

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھل سکی، جلدی سے تیار ہو کر وہ سیڑھیاں اتر آیا۔ بابا سے ملے بغیر جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے کھڑے ظہور صاحب پر اس کی نظر پڑی، ان کے ساتھ کوئی آدمی بھی تھا۔ دونوں ہاتھ میں شاید نقشہ لیے کھڑے کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ سلام کرتے ہوئے وہ ان کے پاس سے گزر جانا چاہتا تھا لیکن ظہور صاحب کی بات سن کر ان کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

"ایکسکیوزمی انکل! یہ نقشہ دیجیے گا۔" سلام کے بعد اس نے سیدھا ان سے نقشہ مانگ لیا، یہ دیکھے بغیر کہ اس کی بات پر ظہور صاحب کی آنکھوں میں ناگواری کی تیز لہر ابھر کر معدوم ہوئی تھی، اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ہم...... نقشہ یقیناً کسی قابل انجینئر نے بنایا ہے لیکن......" لیکن اس نے کھینچ کر کافی لمبا کر لیا تھا۔

"انکل ایک منٹ ذرا ادھر آئیں گے؟" جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ایک طرف چلا گیا تو ناچار وہ بھی اس کے پیچھے چلے گئے۔

"نقشہ بلاشبہ اچھا بنا ہے لیکن اس گھر کے لحاظ سے مناسب نہیں، اب یہ دیکھیں۔" اس نے کاغذ پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ "اگر آپ یہاں کوریڈور بناتے ہیں تو یہ کمرہ......" اس نے سامنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ کو اسے ختم کرنا ہوگا بلکہ یہ سارا حصہ مکمل طور پر ڈس ٹرکٹ ہوگا تو اس نقشے کے مطابق کام ہو سکے گا اور اگر آپ اس حصے کو مکمل ڈس ٹرکٹ کرواتے ہیں تو مطلب آپ کی ماں جی سے جڑی یادیں یقیناً اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گی۔"

نجمہ بیگم کی زبانی اسے ان کی ماں جی سے دلی وابستگی کا علم ہوا تھا اور اس گھر کے محل وقوع کے بارے میں بھی اکثر وہ بات کرتی تھیں کہ کس طرح تینوں بھائیوں نے اس گھر کو بنایا تھا۔

ظہور صاحب پوری توجہ اور دلچسپی سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"کنسٹرکشن کے لیے ڈسٹرکشن تو ضروری ہوتی ہے۔"

"کس نے کہہ دیا آپ سے؟" وہ حیران ہوا۔

"بنانا مشکل نہیں بنے ہوئے کو قائم رکھنا مشکل ہے۔ خیر...... اگر آپ چاہیں تو ڈسٹرکشن کے بغیر کنسٹرکشن کروالیں۔ آپ اس حصے کو ماڈرن لک دے دیں، بہت چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ آپ کا وقت اور پیسہ دونوں بچ جائیں گے۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر وہ انہیں مختلف امکانات بتاتا رہا، تفصیلی گفتگو کے بعد جب وہ چلا گیا تو ایک خوش گوار حیرت نے ظہور صاحب کو اپنے حصار میں لے لیا۔

بنیادی طور پر یہ دو بنگلے تھے جو ایک ایک کر کے خریدے گئے تھے پھر درمیانی دیوار گرا کر اسے ایک گھر کی شکل دے دی گئی تھی۔ اب ان کا ارادہ تھا کہ جو حصہ اظہار صاحب کے استعمال میں تھا وہ مستقل طور پر ان کے لیے مختص کر دیا جائے اور جو حصہ ان کے استعمال میں تھا اسے اپنے لیے ری سیٹ کروالیں۔ پچھلے حصے کے لیے انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ اس کا دروازہ پچھلی سڑک کی طرف کھول کر اسے الگ گھر کی حیثیت دے دی جائے تاکہ آنے والے وقت میں ان کے بچوں کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ شائق کی باتوں کے ردعمل میں نقشہ پھاڑ کر انہوں نے باہر پھینک دیا، دل ہی دل میں وہ اس کی ذہانت کے معترف ہوئے تھے۔

☆......❁......☆

"کبھی ایم ایم زی کو پڑھا ہے؟" وہ بابا کے پاس بیٹھا باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اخبار دیکھ رہا تھا، جب انہوں نے پوچھا۔

"ہاں پڑھا ہے، اچھا لکھتا ہے لیکن سچ کہوں، بندہ بڑا اسٹرِیل ہے۔" اخبار لپیٹ کر اس نے ایک طرف ڈال دیا۔

مالا ساتھ والے کمرے میں تھی اور دونوں کمروں میں مشترک دروازہ کھلا ہوا تھا جس کا مطلب ان کی آوازیں آسانی سے دوسرے کمرے میں سنی جا سکتی تھیں۔

"کیوں؟" بابا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"جب میں نے شروع شروع میں اسے پڑھنا شروع کیا تو اس کا ایک کالم میری نظر سے گزرا تھا، اس کالم میں حکومت اور اس سے پہلے برسراقتدار جماعتوں کا تقابلی جائزہ لیا تھا۔ اکنامیکل اعداد و شمار اور بہت سی معلومات لیے وہ کالم مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے تعریفی میل بھیجی، جس کا مجھے جواب موصول نہیں ہوا۔ میں نے پھر میل کی، میں اس بندے سے بات کرنا چاہ رہا تھا اور جب دو چار میلز میں بھیج چکا تو اس نے پتا ہے کیسے جواب دیا؟" اس نے سسپنس پھیلایا۔

"کیسے؟" بابا نے بے تابی سے پوچھا۔

"جیسا جواب آپ کی مالا صاحبہ مجھے دیتی ہیں، سڑا ہوا۔" اس کے ساتھ بابا بھی ہنس پڑے۔ ان کے قہقہے پورے پورشن میں گونج رہے تھے، تو یہ ناممکن سی بات تھی کہ ساتھ والے کمرے میں آواز نہیں گئی ہوگی۔

"بہت شیطان ہو...... سوری شرارتی۔" بابا ابھی بھی ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔

"بندے کو کم از کم کسی کے بارے میں بات کرتے ہوئے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔" دروازے سے چاند کی طرح طلوع ہو کر، سورج کی طرح قہر برساتے لہجے میں کہہ کر اس نے زور سے دروازہ بند کیا تو ایک بار پھر ان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"تمہارا تو کچھ نہیں ہو سکتا شائق!"

"آپ چیلنج کر رہے ہیں؟"

"ہم...... نہیں لیکن تم سمجھ لو۔" وہ شرارتی ہوئے۔

"آپ نہ بھی چیلنج کریں مگر یہ جو مجھے چیلنج کرتی ہے ناں، خود ہار کر اسے جتوا دوں گا۔ ایسے گھماؤں گا کہ اسے خود نہیں پتا چلے گا جیتی ہے کہ ہاری ہے۔" مسکرا کر آنکھ دباتے ہوئے وہ آفس کے لیے نکل گیا۔

☆......❁......☆

"اوہ واہ...... آج تو بڑی ضیافت کا انتظام کیا ہوا ہے؟" میز پر سجے لوازمات دیکھ کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ وہ سب رات کے کھانے کے لیے بیٹھے تھے، آج پہلی بار اظہار صاحب اور وہاب کے ساتھ ظہور صاحب کی بیٹی سحاب بھی مع فیملی موجود تھی۔

"بس سحاب کے لیے محبت سے کھانا بنایا ہے، اتنے عرصے بعد تو آئی ہے۔" نجمہ بیگم نے محبت سے سحاب کی طرف دیکھا۔

"بس سحاب کے لیے؟" شائق نے خفگی دکھائی۔

"ارے نہیں بچے، میرا وہاب بیٹا بھی تو ہے اور تم بھی تو ہو۔ تم نے تو ابھی تک ماہ رخ کے ہاتھ کا کھانا کھایا ہی نہیں، آج بتانا کیسا کھانا بنا ہے۔"

"شاہی قورمہ، شاہی بریانی اور میٹھے میں شاہی ٹکڑے...... دو تین طرح کے رائتے اور سلاد بھی موجود تھے۔ کھانا ایسا شان دار تھا کہ سب ہی تعریف کر رہے تھے، خود وہ بھی تعریف کر رہا تھا۔ اس نے ٹرے میں کھانا لے کر مالا کو باہر نکلتے دیکھا۔

"آؤ مالا! تم بھی ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔" ماہ رخ نے دیکھتے ہی اسے آواز دی، وہ سنی ان سنی کر کے چلی گئی۔ ماہ رخ نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

"تمہیں خود کو کوڈی گریڈ کروانے کا بڑا شوق

ہے، نہ منہ لگایا کرو۔ دیکھا کیسے اگنور کر کے چلتی بنی۔'' سحاب نے ماہ رخ سے کہا۔

''وہ اپنی عادت سے مجبور اور میں اپنی عادت سے، جانے دو تم کھانا کھاؤ۔ فیروز بھائی قورمہ تو آپ نے چکھا بھی نہیں۔ سحاب قورمہ ڈال کر دو فیروز بھائی کو۔'' ماہ رخ نے بڑی خوب صورتی سے بات بدلی تھی پھر بھی وہاب کو اس کے رویے پر غصہ آ رہا تھا، شائق البتہ نارمل انداز سے کھانا کھا رہا تھا۔

☆......❁......☆

باغ میں پڑی تین کرسیوں میں سے ایک پر ظہور صاحب جب کہ دوسری پر مالا بیٹھی تھی، بابا حسب معمول وہیل چیئر پر تھے، تیسری کرسی خالی تھی۔ دوپہر ڈھل چکی تھی، دھوپ کی شدت دم توڑ چکی تھی۔ وہ تینوں ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے جب وہ آ کر سلام دعا کے بعد تیسری کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔'' ظہور صاحب نے مسکرا کر کہا تو جواباً وہ بھی مسکرا دیا۔

''مجھے بھی آپ سے یہی امید تھی۔''

''حاضر جواب بھی ہو۔''

''اور بھی بہت کچھ ہوں' آپ پر کھل جاؤں گا، اگر تھوڑا وقت دیں گے۔'' اس نے اس قدر معصومیت سے کہا کہ بابا اور ظہور صاحب دونوں مسکرا دیے جب کہ وہ تو حیرتوں میں گم تھی۔ ظہور صاحب کے چہرے پر وہ نرم تاثر تھا جو صرف اس کے لیے مخصوص تھا، وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''بس یار! آج کل وقت کی ہی تو کمی ہے، وہی تو دے نہیں سکتا۔'' ان کے بے تکلف انداز پر بابا بھی خوش اور کسی حد تک حیران تھے۔ بڑے عرصے بعد انہوں نے ظہور کو اس طرح کسی تیسرے شخص کے ساتھ عام انداز میں بات کرتے دیکھا تھا، اسی لیے ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

''ہو سکتا ہے کسی کو صرف آپ کا وقت چاہیے ہو، ایسے میں آپ اسے دنیا کی ہر چیز دے کر بھی اپنی کمی پوری نہیں کر سکیں گے' ہے ناں؟''

شائق کی بات پر انہوں نے غیر شعوری طور پر بابا کی طرف دیکھا، وہ شائق کی طرف توصیفی نظروں سے تک رہے تھے' جیسے کہہ رہے ہوں ''شاباش میرے دل کی بات کر دی۔''

''اتنا کما کر کیا کرنا ہے؟ بچے آپ کے ماشاء اللہ اپنی اپنی جگہ خوش و آباد ہیں، کما رہے ہیں' تو آپ کس کے لیے اپنا خون جلا رہے ہیں؟ آپ کیوں کسی کے حصے کی محنت کریں؟ آپ اپنی زندگی جئیں۔ بچوں کو ان کی زندگی جینے دیں، بہت سی آسانیاں ملیں گی۔''

بڑے سادہ لفظوں میں اس نے انہیں زندگی کا سبق پڑھایا تھا۔ بہت عرصے سے کندھوں پر پڑا نادیدہ بوجھ ان چند لفظوں نے پرے دھکیل کر ان کے شانے بوجھ سے آزاد کر دیے تھے۔

''کوشش نہیں کروں گا۔'' اٹھتے ہوئے اتنا کہہ کر انہوں نے دونوں کا چہرہ باری باری دیکھا، دونوں طرف ایک سی تاریکی تھی۔

''یقیناً ایسا ہی کروں گا، بس ایک بار سب منی مائز کر لوں' وائنڈ اپ اس لیے نہیں کر رہا کہ چلتے رہنے کا نام زندگی ہے۔'' ان کی وضاحت پر دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

کیسا جادو تھا اس کے الفاظ میں، کیسا اثر تھا ان سادہ سے پرخلوص جملوں میں۔ ایک عرصے سے وہ خود ساختہ پریشانیوں سے الجھ رہے تھے، بے نام بوجھ ڈھو رہے تھے۔

پانچ سال سے شہاب انگلینڈ میں جاب کر رہا تھا۔ شریک حیات گزر جانے کے بعد سحاب بھی انہوں نے اپنے گھر کی کر دی تھی۔ اب تو شہاب نے بھی وہیں شادی کر لی تھی، رہ گیا وہاب تو وہ اب سیٹل تھا۔ اگر وہ چاہتے تو آج اس کی شادی کر سکتے تھے۔ اب ان کو اپنے باپ کو وقت دینا چاہیے تھا جس نے ان کے لیے دن رات یقیناً ان ہی کی طرح محنت کی ہوگی۔ ہر انسان سوچتا ہے صرف وہی اتنے سخت حالات سے نبرد آزما ہے' یہ جانے بغیر کہ اس سے پہلے بھی کئی آئے اور گئے۔ بابا نے ان کو سب دیا اور بدلے میں انہوں نے اخیر عمر میں تنہائی پائی۔

''زندگی یوں ہی گزر جاتی اگر شائق نام کا اسپیڈ بریکر نہ آ جاتا، کاش شائق یا شائق جیسا میرا کوئی بیٹا ہوتا، ان کے دل میں خواہش ابھری۔

وہ بڑی محبت سے کھڑے شائق کا چہرہ دیکھ رہے تھے، اس بات سے بے خبر کہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے اچانک نظر پڑ جانے پر پتھر ہو جانے والے وہاب کی نظروں میں کیسی پیاس کروٹیں لے رہی تھی۔

☆......❁......☆

جانے کیا بات تھی کہ اچھا خاصا آفس سیٹ کرتے کرتے شائق نے جاب چھوڑ کر پاپا کا بزنس جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چند دن یہیں گزار کر وہ کراچی چلا جاتا تھا سو آج کل وہ بالکل فارغ تھا اور گھر میں ہی رہ رہا تھا۔ ظہور صاحب کو اس کے ہونے سے بہت سکون ملا تھا، ان کی اپنی اولاد سے خواہش تو تشنہ رہ گئی تھیں البتہ شائق ان کا دست راست بنا ہوا تھا۔ کنسٹرکشن کا کام وہ اپنی نگرانی میں کروانا چاہتے تھے' اس لیے انہوں نے بزنس کے کافی معاملات پرے رکھ دیے تھے' اب چونکہ بیٹا کہ شائق نے کنسٹرکشن کی ذمہ داری بخوشی اپنے کندھوں پر لے لی تھی تو وہ پورے سکون سے بزنس سمیٹنے میں لگ گئے تھے۔

شائق حسب معمول کام کروا رہا تھا، جب چائے کے لیے آیا تو سامنے سے ماہ رخ آتی دکھائی دی۔

''کزن! تھک گیا ہوں۔ اچھی سی چائے تو پلاؤ اور اگر ہو سکے تو اپنے مشہور زمانہ کباب بھی لیتی آنا، میں نے ناشتا بھی نہیں کیا ہوا۔''

''شیور...... لان میں بیٹھو گے یا لاؤنج میں لے آؤں؟'' اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

''باہر ہی ٹھیک ہے۔'' کہہ کر وہ لان میں رکھی کرسیوں کی طرف چلا گیا تو وہ بھی جلدی سے کچن کی طرف بھاگی۔

تھوڑی ہی دیر میں چائے کے ساتھ کبابوں کے علاوہ مزید لوازمات سجائے وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

''یہ بات، شکر ہے اللہ کا' کچھ تو کھانے کو ملا۔'' اس نے بے صبری سے کباب منہ میں ڈالا اور چائے کا گھونٹ بھرا۔ ''ویسے برا مت ماننا' چائے تمہارے بس کی بات نہیں۔'' آج پھر وہ کہے بنا رہ نہیں سکا۔ بات سمجھ کر ماہ رخ ہنس پڑی' وہ خود بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''یاد رہے' اس دن منہ بنا لیا تھا لیکن واقعی تم چائے بہت بری بناتی ہو۔'' غصہ کرنے کے بجائے وہ پھر مسکرا دی، سامنے سے آتے وہاب نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا اور اپنی جگہ ساکن ہو گیا۔ اتنے فاصلے سے بھی اسے چائے نظر آ گئی تھی، چائے......

رات سے ہی اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا، پھر بھی وہ آفس چلا گیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں درد شدت اختیار کر گیا تو وہ فیملی ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ چیک اپ کے بعد دوائی دے کر ڈاکٹر نے اسے سختی سے آرام کا کہا تھا تو شاید سالوں بعد ایسا ہوا تھا کہ وہ ورکنگ ڈے میں اس طرح جلدی گھر آ گیا تھا، ماہ رخ تیار ہو کر کمرے سے نکل رہی تھی اس نے ماہ رخ سے چائے کا کہہ دیا۔

''وہاب وہ...... میں...... اصل میں مارکیٹ جا رہی ہوں، امی سے کہہ دیتا وہ بنا دیں گی۔'' اس کی بات پر بے نیازی سے بے تاثر لہجے میں کہتی وہ اس کے سامنے سے گزر گئی۔ اس نے بھی ماہ رخ کے رویے پر دھیان نہیں دیا اور اب جب دوائی کھا کر طبیعت سنبھلی تو وہ تائی نجمہ سے چائے کا کہنے آیا تھا۔

زیادہ سے زیادہ بیس پچیس منٹ پہلے کی بات ہوگی اور اب...... بات یہ نہیں تھی کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے ماہ رخ کا بدلتا رویہ نہ چاہتے ہوئے بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آگے پیچھے پھرنے والی، بھاگ

بھاگ کر اس کے کام کرنے والی، ہمہ وقت اس کی فکر کرنے والی ماہ رخ تو کہیں کھو گئی تھی۔ ایک کزن ہونے کے ناتے جتنا اسے دکھ ہو رہا تھا' ہونا چاہیے تھا لیکن اشاروں کنایوں میں تائی نجمہ نے بہت بار ماہ رخ اور اس کا نام جوڑا تھا۔ خود ماہ رخ کے انداز اس کے خاص جذبات کے ترجمان تھے' گوکہ اس نے بھی اس طرح سوچا نہیں تھا اور نہ ہی چاہا تھا پھر بھی شائق کی موجودگی میں اپنی ذات کا پس منظر میں چلے جانا اس کے لیے تکلیف دہ ہو رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر ماہ رخ اس کے لیے اس رخ سے سوچتی تھی تو اب اس کے التفات کا محور بدل کیسے گیا؟ اور اگر کبھی وہ ماہ رخ کے لیے خاص نہیں تھا، وہ تبھی اس طرح، تو وہ سب کیا تھا؟

یا وہ غلط تھا یا یہ غلط......

چند سال پہلے ماں کی وفات کے بعد اور خاص طور سے سحاب' شہاب کی شادیوں کے بعد وہ بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔ شروع کے چند سالوں کے علاوہ ظہور صاحب اس سے ہمیشہ خائف ہی رہے، ایسے میں تائی نجمہ اپنی چند ایک ناپسندیدہ عادتوں کے باوجود اس کے لیے جذباتی سہارا ثابت ہوئیں۔ ماہ رخ کی پروا نے اسے ہمیشہ بہت خاص ہونے کا احساس بخشا تھا اور آج......

جانے کیسے لوگ بدل جاتے ہیں؟ ابو اس کے بہت اچھے دوست تھے پھر جانے کیوں وہ دور ہو گئے تھے' پھر ماں...... اور اب یہ سب...... اسے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ ہر انسان کی طرح اس نے احتساب کے کٹہرے میں دوسروں کو ہی کھڑا کیا تھا۔

شائق کے بارے میں اپنے احساسات کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ جس شخص نے آپ سے آپ کا سب کچھ چھین لیا ہو' آپ اسے کیا نام دیں گے۔ شائق کی طرف اٹھی پیار بھری ظہور صاحب کی نظر اسے پھر یاد آ گئی تھی۔ بوجھل دل کے ساتھ وہ اپنے کمرے کی طرف پلٹ گیا۔

☆......❁......☆

''شائق سنو۔'' وہ سونے کے لیے جا رہا تھا، جب ماہ رخ نے آواز دے کر روک لیا۔

''ہاں بولو۔''

''ایک منٹ کمرے میں آ جاؤ پلیز۔'' کمرے کا دروازہ پوری طرح کھول کر وہ اندر چلی گئی تو ناچار اسے بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔

''اتنی جان کیوں کھپا رہے ہو اپنی؟ ظہور چاچو خود کروا لیں گے کام اور جاب کیوں چھوڑ دی؟'' اس کے اندر آتے ہی اس نے ایک سانس میں تینوں سوال کر ڈالے۔

''پہلے لائٹ آن کر دو' مجھے الجھن ہو رہی ہے۔''

کمرے میں سرخ سبز اور نیلے رنگ کے دھبے دائرے کی صورت گردش کر رہے تھے۔ ٹی وی پر کسی انڈین ڈرامے کا سستا اور بے ہودہ رومینس چل رہا تھا، اس نے منہ پھیر لیا۔ ماہ رخ نے بتی جلائی۔ تو شوخ رنگوں سے سجے در و دیوار چمک اٹھے۔

''کھڑے کیوں ہو' بیٹھو۔ اب بتاؤ۔'' بے حد چست گہرے گلے والی بغیر بازوؤں کے جامنی رنگ کی قمیص میں وہ اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی تو نظر چرا کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''بلاوجہ تو کچھ نہیں کر رہا۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ بہت خطرناک ارادے ہیں، تم سو جاؤ۔'' بات ٹال کر اس نے اٹھنا چاہا۔

ماہ رخ نے اس کا ارادہ بھانپ لیا تھا تب ہی اسی لمحے ہاتھ کھینچ کر اسے دوبارہ بٹھا دیا۔ اسے ماہ رخ کا بے باک انداز بے حد برا لگا تھا۔ وہ یقیناً آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی سو نرمی سے ہاتھ چھڑا کر وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔

''ظہور انکل اپنا، اظہار انکل کا اور مالا کا حصہ الگ الگ کر رہے ہیں، میں مالا سے گھر خرید کر اپنی ہونے والی بیوی کو تحفہ دینا چاہتا ہوں اسی لیے اپنی مرضی سے کام کروا رہا ہوں۔'' اس نے مختصراً بتایا۔ ماہ رخ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کون ہے وہ؟''

''ہے کوئی...... اب جب کراچی جاؤں گا تو گھر میں بات کروں گا ان شاء اللہ اور مجھے یقین ہے کسی کو اعتراض نہیں ہوگا اسی لیے تو جاب چھوڑ کر بزنس جوائن کرنے کا ارادہ کیا ہے۔'' کچھ دیر پہلے والی بے زاری، کوفت، ناپسندیدگی سب تحلیل ہو گیا۔ باقی رہا تو مالا کا عکس اور آنکھوں میں سنہرے مستقبل کے خوابوں کی چمک اور اسی چمک نے ماہ رخ کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔

''جانتے ہو' میں نے کیا بات کرنے کے لیے بلایا تھا؟'' ماہ رخ آہستہ سے بولی۔

''ہوں......'' اس نے بے دھیانی میں جواب دیا۔

''میں اعتراف کرنا چاہتی ہوں' میں ایک عام سی لڑکی ہوں، شکل و صورت سے لے کر زندگی کے ہر معاملے میں پھر چاہے وہ تعلیم ہو یا کوکنگ اور گھر سنبھالنا وغیرہ۔ میں ہر طرح سے عام لڑکی ہوں، ہاں میری صرف ایک خوبی یا خاصیت کہہ لو کہ میں صاف دل کی ہوں۔ بے لوث، بے غرض محبت کرنے والی، بس امی کو میں مالا کے آگے کوئی آسمانی چیز نظر آتی ہوں اور ہر وقت وہ اپنی رائے کا اظہار کرتی بھی رہتی ہیں شاید اس لیے کہ ماں ہونے کے ناتے انہیں میری چھوٹی سی چھوٹی بات، عادت ہر چیز غیر معمولی طور پر اچھی اور بہترین نظر آتی ہے۔ یہ سراسر ان کی اپنی ذاتی رائے ہے' اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں۔'' سر جھکا کر نرمی سے اس نے مدعا بیان کیا۔ شائق سنی ان سنی کیے اپنے ہی خیالوں میں مگن تھا، اس کے خاموش ہونے پر ایک دم چونک گیا۔

''تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟ ہر ماں کو اپنی اولاد اسی طرح پیاری ہوتی ہے اور جہاں تک کوکنگ یا گھر سنبھالنا اور تعلیم کا تعلق ہے تو اس کا تعلق کہیں بھی اچھی زندگی کی گارنٹی کے ساتھ نہیں جڑا۔ جن لوگوں کی تعلیم کچھ نہیں ہوتی یا جنہیں کوئی ہنر نہیں آتا' تمہیں کیا لگتا ہے ان کی اچھی زندگی کے چانسز ختم ہو جاتے ہیں۔ عام ہونا بہت مشکل ہے اور اگر تم عام ہو تو پھر سب سے خاص ہو، اب سکون سے سو جاؤ۔'' بات ختم کر کے گھڑی دیکھتے ہوئے وہ اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ دروازے پر ہی نجمہ بیگم سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے اتنی گہری نظر سے اسے دیکھا کہ وہ بلاوجہ ہی شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ دل میں چور نہ ہوتے ہوئے بھی وہ چور بن گیا۔

''شب بخیر۔'' کہتے ہوئے وہ جلدی سے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اسے بے حد شرمندگی ہو رہی تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ نجمہ بیگم نے اس وقت اس کی موجودگی سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہوگا، وہ سوچ کر ہی رہ گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے ہاتھ میں پکڑی چابیاں یاد آ گئیں جو وہ یقیناً ماہ رخ کے کمرے میں بھول آیا تھا۔ ابھی تو نجمہ بیگم وہیں تھیں سو وہ ان ہی قدموں واپس آ گیا۔

''امی بس کر دیں، مجھے خوب صورت خواب دکھا دکھا کر میری زندگی برباد نہ کریں' آپ تو جیسے وہاب یا ظہور چاچو کو جانتی ہی نہیں ناں۔ شائق کو بات کرنے کے لیے میں نے ہی بلایا تھا، اسے کوئی اعتراض نہیں اگر مجھے کچھ نہیں آتا۔ اب آپ نے کوئی کھیل شروع نہیں کرنا بڑی مہربانی ہوگی، میں شائق کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔'' ماہ رخ کی آواز نے اسے پتھر کر دیا تھا۔

''اس کی ماں میری بہن ہے' میں اچھی طرح جانتی ہوں اس کا مزاج بھی، دور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں' پاس آنے پر کان پھٹتے ہیں۔ شائق مجھے بھی پسند ہے لیکن میں جانتی ہوں تیرا گزارہ نہیں ہو سکتا اس کے ساتھ۔''

نجمہ بیگم کی بات سن کر وہ چپ چاپ کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا جو کھچڑی پک رہی تھی۔ اب اس کا کراچی جانا ضروری ہو گیا تھا سو اس نے رات ہی ساری تیاری کر لی تھی۔

صبح جانے سے پہلے وہ بابا کے پاس چلا گیا، وہ ان سے بات کر کے جانا چاہتا تھا۔ بابا اس وقت اکیلے ہی بیٹھے تھے۔ مالا اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی اور اسے یقین تھا جب تک وہ وہاں بیٹھا ہے تب تک وہ ادھر آئے گی بھی نہیں، سو وہ اطمینان سے بات کرسکتا تھا۔

''کراچی جارہا ہوں آج۔''

''اچھا، کب تک آؤ گے؟''

''آپ کو پوچھنا چاہیے تھا' کیوں جارہا ہوں؟'' اس نے قدرے برامان کر کہا۔

''اچھا بتاؤ کب تک آؤ گے اور یہ بھی بتادو کیوں جارہے ہو؟'' بابا کا لہجہ شرارتی ہوا۔

''اپنی والدہ محترمہ کو لینے جارہا ہوں، میں نے سوچا ماں ہونے کے ناتے ان کا حق ہے کہ وہ اپنی ہونے والی بہو کو رسمی طور پر دیکھ لیں۔'' چڑ کر ہی سہی پر اس نے جانے کا مقصد بتایا۔

بابا ایک صدمے کی کیفیت میں تھے' وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شائق' ماہ رخ کو پسند کرسکتا ہے۔ ماہ رخ اور نجمہ بیگم کتنی ہی چالاک سہی پر انہیں شائق سمجھ دار لگا تھا۔ دل میں ابھرنے والی ننھی سی خواہش کو انہوں نے دل کے مقبرے میں ہی دفن کر دیا تھا۔

''فیصلہ تو میں کر ہی چکا ہوں، بس ماما کو بلالوں تاکہ وہ آپ سے بات کرلیں۔'' ان کی حالت سے بے خبر وہ بول رہا تھا۔

''ماہ رخ کی ماں حیات ہے' بھلا وہ کیوں مجھے اپنی بیٹی کی قسمت کا اختیار سونپنے لگی؟'' انہوں نے الجھن بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی الجھ گیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم ماہ رخ کے رشتے......''

''اوہ بابا! کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ میں مالا کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے بے چینی سے بات کاٹی۔

''مالا اور تم؟'' وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

''کیوں...... کیا میں مالا کے لائق نہیں؟'' اس کے لہجے میں در آنے والا اضطراب بابا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا۔

''میرا مطلب...... میں...... یعنی......'' وہ بات سمجھانے کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگے۔

''بابا......'' وہ اٹھ کر ان کے پاس زمین پر آبیٹھا اور ان کے جھریوں زدہ بوڑھے ہاتھ کو تھام لیا۔

''میں لمبے چوڑے دعوے اور وعدے نہیں کروں گا' صرف اتنا کہوں گا کہ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں، میں اسے خوشیاں دینا چاہتا ہوں۔ آپ کو پتا ہے اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟ میں اسے ہنستا مسکراتا، کبھی کبھی روتا بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ روتا اس لیے کہ یہ نارمل ہونے کی نشانی ہے اور مجھے مالا نارمل نہیں لگتی۔

میرے دل میں یہ خواہش جڑ پکڑ چکی ہے کہ میں اس کا اوپری خول توڑ کر اس کو باہر نکالوں۔ اسے ہنستا دیکھوں ایک عام لڑکی کی طرح۔'' وہ بڑی جذب کی کیفیت میں بول رہا تھا اور بابا حیرت سے گنگ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ یہ تو ان کی خواہش سے بھی بہت زیادہ تھا، خوشیوں کے جگنو ان کے طرفین میں رقص کناں تھے۔

مالا ناشتا بنانے کے لیے باہر نکلی تھی کہ بابا کے چہرے کی چمک نے اسے ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کردیا۔ جانے وہ کون سا اسم اعظم تھا جس سے اس لڑکے نے سب کو اپنا اسیر کرلیا تھا۔ پہلے بابا اور پھر ظہور صاحب، یہ دونوں ہی دسروں کو ناقابل تسخیر لگتے تھے لیکن یہ کتنی آسانی سے نہ صرف ان کی زندگیوں میں شامل ہوا تھا بلکہ ان کو خوشیوں کی وجہ بھی دے رہا تھا، سر جھٹک کر نظر انداز کرتی وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

''میں کہہ رہا تھا تم دونوں میں اتنا فرق......''

''کوئی فرق نہیں۔'' اس نے بات کاٹی۔

''کہاں لکھا ہے ایک پڑھی لکھی سگھڑ لڑکی گھر کو خوشیوں سے بھر سکتی ہے؟ وہ جو ہے جیسی ہے' مجھے قبول ہے۔ میں اپنے دل اور دماغ کی پوری آمادگی کے ساتھ اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔'' ایک بھرپور مسکراہٹ بابا کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''وہ تو تمہیں دیکھتی بھی نہیں تو تمہاری زندگی خوشیوں سے کیسے بھرے گی؟'' متبسم لہجے میں بابا نے پوچھا تو اس کا دل بھی ہلکا پھلکا ہوگیا۔

''میں ہوں ناں اسے خوشیاں دینے کے لیے' وہ مجھے کچھ نہ کچھ واپس ضرور کرے گی اور ایسے ہی ہم خوش رہیں گے۔'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔

''تم اتنے پر یقین کیسے ہو کہ تم اسے خوشیاں دے سکتے ہو؟''

''ویری سمپل، قرآن سے دلیل پیش خدمت ہے' کیا انسان کے لیے وہی کچھ نہیں جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔''

''ہاں ہے تو؟'' بابا مسلسل مسکرا رہے تھے۔

''تو بس پھر میں پوری زندگی اسے خوش رکھنے کی کوشش کروں گا تو کیا وہ خوش نہیں رہے گی؟''

جواباً بابا کا قہقہہ بلند ہوا، وہ بھی ان کے ساتھ ہنسی میں شریک ہوگیا۔

☆......❁......☆

شائق' ماما کے ساتھ ہی کراچی واپس چلا گیا تھا، بابا شائق کی ماں سے مل کر مطمئن ہوگئے تھے۔ نہ تو ان کے انداز میں سرد مہری کی تھی نہ ہی کوئی جلن بلکہ ان کے رویے میں خوشی کی ہلکی سی آنچ تھی ورنہ بابا تو ڈر رہے تھے کہ جانے نجمہ بیگم کی بہن کس طبیعت کی مالک ہو یا شاید ان کے دل میں خود بہو ڈھونڈنے کا ارمان ہو لیکن ان کے رویے نے انہیں مطمئن کیا تھا۔ نجمہ بیگم نسبت ٹھنڈے مزاج اور سلجھی طبیعت کی مالک وہ عورت انہیں مالا کے لیے ساس کے طور پر بے حد پسند آئی تھی۔ وہ باضابطہ طور پر شائق کا رشتہ ڈال گئی تھیں اور بابا نے رسمی طور پر سوچنے کا وقت لیا تھا۔ شائق جانتا تھا کہ رسمی طور پر ہی سہی لیکن بابا وقت لیں گے ضرور، سو اس نے ماما سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جب تک باقاعدہ رسم نہیں ہوجاتی وہ اس رشتے کا ذکر کسی سے نہ کریں چاہے وہ ان کی سگی بہن ہی کیوں نہ ہو۔ اصل میں اسے ایک انجانا سا ڈر جکڑے ہوئے تھا کہ کہیں ضد میں ماہ رخ کی وجہ سے رشتہ خراب نہ ہو۔ دوسری طرف ماہ رخ کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے ماما کی زبانی ہی اس نے نجمہ بیگم تک یہ بات پہنچادی تھی کہ وہ شائق کے لیے نہ صرف رشتہ دیکھ چکی ہیں بلکہ بات بھی چلا چکی ہیں اور اب مثبت جواب کے لیے پرامید ہیں۔ بابا نے ظہور صاحب سے بات کی تو وہ بھی دلی طور پر خوش ہوئے تھے۔

''میری بہت خواہش تھی کہ میری بیٹی میرے ہی گھر رہے لیکن میرا اپنا خون، میرا بیٹا ہی مٹی ہے جو اس ہیرے کے قابل نہیں۔ آپ بھابی سے بات کر کے مثبت جواب دے دیں، اللہ مقدر اچھے کرے۔'' ان کا لہجہ جذبات سے بوجھل تھا' خوشی بھی تھی اور دکھ بھی۔ خوشی بہرحال دکھ سے بڑی تھی۔

بابا نے ابھی مالا سے اس رشتے کے بارے میں بات نہیں کی تھی، وہ جذباتی تھی، کم عمر تھی۔ یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اس رشتے میں اس کی کیا بہتری پوشیدہ ہے۔ اس سے بات کرنے کے لیے وہ مناسب وقت کے انتظار میں تھے اور یہ وقت انہیں ٹھیک دو دن بعد میسر آگیا تھا۔ دوپہر کے بعد مالا الماری میں کپڑے رکھ رہی تھی، وہ خود لیپ ٹاپ گود میں لیے جانے کیا کچھ کھول کر بیٹھے تھے، ایک دو کیز دبانے کے بعد اب وہ منتظر نظروں سے اسکرین کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''مالا......'' خوشی سے ان کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''جی بابا۔'' اس کے تیزی سے حرکت کرتے ہاتھ رک گئے۔

''میں...... میں پاس ہوگیا فرسٹ ڈویژن۔'' وہ خاصے پرجوش ہو رہے تھے۔ مالا کے چہرے پر ایک دم تاریکی پھیل گئی، انہوں نے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ وہ اپنی خوشی کا مزہ خراب نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

''آپ فیل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔'' اس نے پھر الماری کی طرف رخ موڑ لیا، اس کی آواز جیسے کسی گہری کھائی سے آرہی تھی۔

"میری کامیابی پر تم خوش نہیں؟"

"یہ کیسا سوال ہے بابا؟ خوش تو ہوں بلکہ بہت خوش ہوں۔" اس کے الفاظ رو رہے تھے۔

"آج جو مانگوں وہ دو گی؟"

"آپ کر لیں دی نیوز کی آفر ایکسیپٹ۔"

"میں تمہارا رشتہ طے کرنا چاہتا ہوں۔" وہ حیران رہ گئی۔ اسے تو لگا تھا وہ بابا کو حیران کر دے گی۔

"میں نے ظہور سے بات کی ہے، اسے کوئی اعتراض نہیں اور منزہ سے بھی میری بات ہو چکی ہے، اب صرف تم رہ گئی ہو...... تم بتاؤ اب۔"

"میں کیا بتاؤں؟" ہاتھ روکے وہ ان کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے اختیار ہے کہ نہیں؟"

"بابا! سب اختیار آپ ہی کے تو ہیں۔" پرنم آواز میں کہہ کر وہ پھر کپڑے رکھنے لگی۔

"گڈ، تو پھر میں فون کر کے شائق کے والدین کو ہاں کر دیتا ہوں۔" اسے لگا اس کے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ بھلا اس کے رشتے سے شائق اور اس کے والدین کا کیا تعلق؟ لیکن اس کا دماغ کہہ رہا تھا' جو سنا ہے وہ سچ ہے۔ دل اس بات سے مسلسل انکار کر رہا تھا۔

"آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں بابا؟ جس عورت نے میری آدھی زندگی جہنم بنا دی' آپ چاہتے ہیں اس کی بہن اور بھائی میری باقی کی زندگی بھی جہنم بنا دیں۔" بے اختیار وہ ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ وہ انتہائی صدمے کی کیفیت میں تھی۔ بابا اور ظہور صاحب اسے پسند کرتے ہیں' وہ جانتی تھی لیکن اتنا نہیں؟ وہ مر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

"اپنے جملے سے صرف "جہنم" نکال دو' تو میں بھی چاہتا ہوں۔"

"آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا جب کہ آپ جانتے ہیں......"

بابا نے بات کاٹی۔ "میں نے صرف چاہا تھا، سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ دعائیں مانگے بغیر بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ شائق نے خود بات کی تھی مجھ سے، اپنی ماں کو بلانے سے بھی پہلے۔"

"اوہ...... تو آپ نے سب بتا دیا اسے؟" وہ ایک دم خوف زدہ ہوئی۔

"مالا! اعتبار کرنا کب سیکھو گی؟ کچھ نہیں بتایا میں نے۔" بابا ناراض ہوئے اور وہ وہیں حیران حیران سی بیٹھی رہی۔

"تو پھر...... میرا مطلب اس نے کیوں کیا ایسا؟ کیوں بات کی آپ سے؟"

"یہ بات تم خود اپنے آپ سے یا اس سے پوچھو، میرے الفاظ تمہیں مطمئن نہیں کر سکیں گے۔" شل ہوتے وجود کے ساتھ وہ باہر چل دی۔

"سوچنا چاہو تو وقت لے لو۔" انہوں نے پشت سے آواز دی۔

"جب سب کچھ آپ لوگ طے کر چکے ہیں تو پھر میں سوچ کر کیا کروں گی؟" ٹوٹے لہجے میں کہہ کر وہ اُدھر رکی نہیں۔

بابا نے اطمینان کا سانس لیا، بڑوں کے فیصلے اکثر چھوٹوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں کیونکہ بڑوں کے پاس تجربے کی جو عینک ہوتی ہے' چھوٹے اس سے محروم ہوتے ہیں۔ مالا بھی ان کے فیصلے کو سمجھ نہیں رہی تھی اسی لیے دکھی تھی جب کہ وہ نہ صرف پرسکون تھے بلکہ بے حد خوش بھی تھے۔

☆......❁......☆

"مالا! سارہ کی کال آئی ہے۔"

رات وہ فون بابا کے پاس ہی بھول گئی تھی، جلدی سے جائے نماز تہ کر کے وہ بابا کے پاس فون لینے آ گئی۔ وہ جانتی تھی موضوع گفتگو وہی ہو گا پھر بھی فون پکڑ لیا۔

"ہائے مالا! یہ میں کیا سن رہی ہوں، تم نے ہاں کر دی؟ مطلب رشتہ پکا۔ اب تو جلد ہی میری مالا کی سہرے کے پھول کھلیں گے۔" ہمیشہ کی طرح شوخ اور باتونی سارہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی، وہ باہر نکل آئی۔

"پھول کھلنا اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا اہم دل۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی زبان سے پھسل گیا، سارہ پہلے تو حیران ہوئی پھر فوراً ہی پریشان ہو گئی۔

"مالا! کیا ہوا ہے؟ بابا تو کہہ رہے تھے تم نے اپنی مرضی سے ہاں کی ہے؟"

بے بسی کے احساس سے مغلوب ہو کر اس نے دیوار سے سر ٹکا کر چہرہ اوپر کیا۔ جب سے وہ باہر نکلی تھی وہاب کھڑکی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے گرد آسمانی رنگ کا دوپٹا تھا۔ اسے لگا جیسے نیلے آسمان سے چاند نکل آیا ہو۔ ایک عجیب سی دلکشی اور حزن نظر آ رہا تھا۔ چہرہ اس کا ہمیشہ سے یہی تھا پھر خاص کیا تھا؟ وہ دوپٹا جو اس کے چہرے کے اطراف لپٹا ہوا تھا۔ وہ بے خودی میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

ایک لمحے میں مالا کا لہجہ بدلا تھا۔

"ایک منٹ سارہ!" جانے وہ کیا بول رہی تھی، اندر جا کر اس نے دوپٹا اتارا اور روزمرہ کے حلیے میں باہر نکل آئی۔ اب کی بار اس نے خود نظر اٹھائی۔ وہاب ابھی بھی پتھر کے مجسمے میں ڈھلا وہیں کھڑا تھا۔ بغیر دوپٹے کے وہ اسے روز جیسی لگی، بدتمیز' اکھڑ اور بددماغ...... جانے کیوں وہاب کو تذلیل سی محسوس ہوئی۔ یہ پہلی بار نہیں تھا' جب بھی اس کے دل میں مالا کے لیے کوئی اچھا جذبہ سر اٹھاتا' وہ بڑی بے رحمی سے اس کونپل کا سر کچل دیتی۔ شدید نفرت سے اس نے لعنت بھیجتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔ آواز اتنی زوردار تھی کہ نیچے کھڑی مالا نے بھی سن لی۔

اس کے اندر سکون سا اتر آیا، جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کرتی تھی وہ ایسے، ہاتھ میں پکڑے فون کی طرف متوجہ ہو کر وہ ناشتا بنانے کچن میں چلی گئی۔ اپنی بالکنی میں کھڑی نجمہ بیگم نے انتہائی غور سے وہاب کے تاثرات دیکھے تھے۔ اس کے چہرے پر بے خودی کی ایک نئی کہانی تھی۔ شائق ان کی ترجیح کبھی بھی نہیں تھا لیکن ماہ رخ کی وجہ سے خاموش تھیں اور اب جب شائق کا رشتہ طے ہونے جا رہا تھا تو ماہ رخ کے پاس وہاب کے لیے نہ کرنے کا جواز نہیں رہ گیا تھا۔

اسی صبح ناشتے پر انہوں نے اظہار صاحب سے بات کر لی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ تاخیر کے سبب وہ وہاب جیسے ہونہار لڑکے سے ہاتھ دھو لیں۔ اظہار صاحب جانتے تھے کہ یہ بات نجمہ بیگم کے ارادے کا اعلان ہے سو وہ "نہ" کر کے اپنی شامت نہیں بلانا چاہتے تھے اسی لیے ظہور صاحب، وہاب اور بابا کو شام کی چائے کی دعوت دے ڈالی۔

چائے کے ساتھ لوازمات سے میز بھر گئی تھی لیکن نجمہ بیگم کا اہتمام ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

مقررہ وقت پر تینوں حضرات آ چکے تھے' ماہ رخ کو چائے کا کہہ کر وہ بھی ان سب کے پاس آ بیٹھیں۔ ایک خاموشی سی تھی جسے نجمہ بیگم کی آواز نے توڑا۔

"بھائی صاحب! وہاب اب ماشاء اللہ کاروبار سیٹ کر چکا ہے اور ماہ رخ بھی مزید پڑھنا نہیں چاہتی۔ میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آپ کب تک وہاب کی شادی کرنا چاہیں گے؟" انہوں نے بڑی خوب صورتی سے اپنا موقف سامنے رکھا تھا۔

"وہاب ماشاء اللہ سمجھ دار ہے، باشعور ہے۔ جب چاہے گا اس کی شادی کر دیں گے۔" ان کے بے تاثر لہجے میں اجنبیت اور بے گانگی کی کاٹ تھی۔

"پھر بھی آپ کی اپنی رائے' آپ کی خواہش کیا ہے؟"

"وہاب سے پوچھ لیں' جو کہتا ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" کہہ کر وہ ان کے درمیان سے اٹھ کر چلے گئے۔ وہاب بے یقینی سے انہیں جاتا دیکھ رہا تھا۔ اسے پتا تھا' ظہور صاحب کو ماہ رخ کبھی پسند نہیں رہی پھر بھی انہوں نے ایک بار بھی اس سے رشتے پر نہ اعتراض کیا نہ اپنی مرضی ظاہر کی بلکہ وہ تو ایسے اٹھ کر گئے تھے جیسے بزنس میٹنگ میں اختتامی طور پر چند رکی جملے بول کر ذمہ داری ختم کر کے جان چھڑا کر چلے جاتے ہیں۔

ماہ رخ کب چائے لے کر آئی، کون کتنی دیر بیٹھا، کیا کیا بات ہوئی اسے کچھ خبر نہیں۔ نجمہ بیگم نے

کندھے پر ہاتھ رکھ کر مبارک باد دی تو خالی ذہن لیے وہ ان کے پاس سے اٹھ گیا۔ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو بار بار ذہن کے پردے پر وہی منظر ابھرنے لگا۔

پاپا کی نظر میں اس کی اتنی بھی اہمیت نہیں تھی کہ شادی جیسا اہم معاملہ بھی انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ یہ بات اسے ساری رات جگانے کے لیے کافی تھی، ابھی کچھ سال پہلے تک سب کچھ ٹھیک تھا۔ پاپا نے اپنی جوانی کے قیمتی سال کاروبار کو دے دیے تھے۔ پہلے کاروبار پھیلانے اور پھر سنبھالنے کے چکر میں انہوں نے بہت سا وقت اپنی فیملی سے دور گزارا تھا۔

غیر ملکی دوروں کے باوجود وہ اپنے بچوں سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ اپنے تینوں بچے خصوصاً وہاب شروع سے ان کا بہت لاڈلا تھا، وہ اس کے ہر معاملے میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کی تعلیم مضامین، اس کے گریڈ، ہر معاملہ میں انہوں نے ذمہ داری کے ساتھ محبت بھی دکھائی تھی پھر جب شریک سفر کی بیماری کا پتا چلا تو انہوں نے گھر اور فیملی کو وقت دینا شروع کر دیا، ان ہی دنوں شہاب اولیول کے بعد انگلینڈ چلا گیا۔ جانا تو وہاب بھی چاہتا تھا لیکن ان کی خواہش تھی کہ وہاب پاکستان میں رہ کر تعلیم حاصل کرے اور ان کا کاروبار سنبھالے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

جن دنوں وہاب ایم بی کر رہا تھا' ان ہی دنوں وہ اس سے کھنچے کھنچے رہنے لگے پھر زبیدہ بیگم کی وفات ہو گئی اور اس کے بعد انہوں نے خود کو پھر سے کاروبار میں الجھا لیا۔ وہاب ان کے اور اپنے درمیان ان دیکھی دیوار بنتے دیکھ رہا تھا لیکن دل میں کڑھنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکا تھا۔ سحاب کی شادی ہو گئی تو وہ بالکل اکیلا ہو گیا۔ اس نے اپنا بزنس شروع کر لیا تھا، پاپا کی تقلید میں وہ بھی دن رات کا فرق بھلائے بزنس کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ اپنی محنت، اپنی قابلیت ان پر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کسی دن پاپا' پہلے کی طرح اسے گلے لگائیں، اسے سراہیں لیکن اس ساری جان کھپائی سے وہ اچھا بزنس مین تو بن گیا مگر اچھا بیٹا نہ بن سکا۔ اسی بات نے اس کا سکون چھین لیا تھا۔ وہ اگر ایک بار کہہ دیتے تو وہاب اس رشتے سے انکار کر دیتا لیکن انہوں نے تو کوئی ردعمل ہی نہیں ظاہر کیا۔

شہاب نے انگلینڈ میں شادی کی تو واپسی پر انہوں نے علی الاعلان کہا تھا کہ شہاب کی شادی پر ان کے ارمان پورے نہیں ہوئے، رسم و رواج کے بغیر پھیکی شادی نے انہیں از حد مایوس کیا ہے سو وہاب کی شادی پر دہرا اہتمام ہوگا اور اب یہ لاتعلقی وہاب کو اندر سے کاٹ رہی تھی۔

ساری رات اور آنے والی کئی راتیں اس نے کانٹوں پر گزاری تھیں۔

''تعمیر کا کتنا کام باقی رہ گیا؟'' وہ ناشتے کے لیے میز پر بیٹھا تو نجمہ بیگم نے ناشتا میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں، میری بات نہیں ہوئی پاپا سے، مجھے نہیں پتا وہ کیا کروانا چاہتے ہیں۔''

''اچھا، میں سوچ رہی تھی یہ کام ختم ہو تو شادی کی تاریخ رکھ لیں۔ میں چاہتی ہوں جلد از جلد تم دونوں کو ہنستا بستا دیکھوں۔ اللہ بخشے تمہاری ماں ہوتی تو تمہاری تنہائی کی فکر کرتی لیکن بھائی صاحب کو تو کام' کاروبار کے آگے کچھ دکھائی ہی نہیں پڑتا۔ انہیں تو جیسے تمہاری فکر ہی نہیں' اس دن بھی بے گانوں کی طرح اٹھ کر چلے گئے۔ انہوں نے تو یہ بھی خیال نہیں کیا کہ میں لڑکی کی ماں ہو کر بات کر رہی ہوں اور کیوں نہ کرتی بھئی' مجھے تمہاری بھی فکر ہے پھر ماہ رخ کو کب تک بٹھا کر رکھتی۔ لوگ باتیں بناتے ہیں ویسے بھی اب بھی بات نہ کرتی تو جانے کتنے سال اور گزر جاتے۔'' حسب عادت اس کے ناشتا کر چکنے تک وہ دل کھول کر بول چکی تھیں، وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ اسے کسی ایک بات سے بھی اختلاف نہیں تھا' صبح صبح اس کا دل مزید بوجھل ہوا تھا۔

☆.........❁.........☆

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بیٹھے بٹھائے بھائی صاحب کو کیا ہو گیا ہے، اپنا پورشن انہوں نے سیٹ کروا لیا پھر پچھلا پورشن بھی چھیڑ لیا۔ کل کو مالا شادی ہو کر چلی جائے گی تو یہ حصہ بیچنا ہی ہے پھر اس پر اتنا پیسہ لگانے کا مقصد؟ چلو اس بات کو بھی جانے دیا لیکن پچھلا گیٹ کھلوانے کا مقصد، درمیانی دروازہ رکھا بھی تو اپنے پورشن میں سے یعنی ہمیں ہی کاٹا ہے اس حصے سے۔ ساری زندگی گالی دی اس لڑکی کے لیے اور آج سب کیے پر پانی پھیر دیا۔ لڑکی تو یوں بھی ہاتھ میں نہیں اوپر سے بالکل الگ پورشن۔

میں کہتی ہوں کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی؟ لڑکی ذات ہے' کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو دنیا کو منہ دکھانے لائق نہیں رہیں گے۔'' نجمہ بیگم سے بالا والے پورشن کی الگ حیثیت برداشت نہیں ہو رہی تھی سو آدھی رات کو اظہار صاحب کی شامت آئی تھی۔

''بابا بھی ادھر ہوتے ہیں، کچھ نہیں ہوگا اور رہی بات دروازے کی تو جلد یا بدیر اسے کھلوانا ہی پڑتا۔''

''یہ بھی خوب کہی، بھلا مردوں کو عورتوں کے مکر کی کیا خبر؟ اور بابا کی بوڑھی ہڈیوں میں چل سکنے کا دم خم تو ہے نہیں' پوتی کی پہرے داری کریں گے؟ اور مجھے بتائیں ناں ذرا کیوں ضرورت پڑی تھی دروازہ کھلوانے کی؟ آخر ان کے پاس آنا ہی کسے ہے۔ جو آتے ہیں وہ ادھر سے بھی آ سکتے تھے۔ مجھ سے لکھوا لیں' کوئی نہ کوئی بات ہو کر رہے گی۔'' نجمہ بیگم کا پارہ فل ہائی تھا۔

پچھلا پورشن تو تقریباً سارا ہی دوبارہ تعمیر ہوا تھا، جدید طرز پر تعمیر شدہ چھوٹا سا گھر۔ نجمہ بیگم کے اندر آگ ہی تو لگا گیا تھا، انہوں نے توجہ ہی نہیں دی تھی کہ کیا کام ہو رہا ہے اور کہاں تک ہو چکا ہے۔ وہ تو ایک دن یوں ہی ادھر جھانک لیا اور پھر باقاعدہ جا کر دیکھ آئیں، ان کے سینے پر تو سانپ لوٹنے لگے تھے۔ باقی کسر نئے لگنے والے مین گیٹ نے پوری کر دی تھی اور تو اور ان کے پورشن کا رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا تھا۔

''اگر کل کو مالا گھر بیچ دیتی ہے تو خریدنے والے ہمارے گھر سے تو گزریں گے نہیں' یوں بھی ظہور نے اپنا اور ہمارا گیٹ بھی تو الگ کروا لیا ہے۔ اب یہ ایک نہیں تین گھر ہیں تو دروازے بھی تین ہی ہوں گے ناں۔'' انہوں نے رسان سے سمجھایا لیکن چکنے گھڑے پر پانی کی طرح ان کی باتیں نجمہ بیگم کے ذہن پر دستک دیے بنا پھسل گئیں۔ انہیں ظہور صاحب پر تو غصہ تھا ہی' اظہار صاحب پر بھی تپ چڑھی تھی۔ ظہور صاحب کے آگے بول نہیں سکتی تھیں سو اظہار صاحب کی شامت آئی تھی۔

''ہاں زمانے بھر کے عقل مند تو آپ ہیں، بھائی جو کہہ دے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتا ہے۔ ساری زندگی گزر گئی لیکن اپنی عقل استعمال کرنی نہ آئی، مشترکہ کاروبار کا مطلب یہ نہیں کہ میری بچی کا حق بھی یتیم بھتیجی پر رحم کھاتے ہوئے ضائع کر دیا جائے۔ اپنے گھر کو چھوڑ کر سخاوت نہیں ہوتی سمجھے آپ؟ اللہ کے گھر اس کا بھی حساب ہوگا، سن رہے ہیں آپ؟''

خراٹوں کی ہلکی ہلکی گونج سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اظہار صاحب انہیں بولتا چھوڑ کر سو چکے ہیں۔ خاموشی نے تصدیق کی تو جلتے کڑھتے وہ بھی سونے لیٹ گئیں۔ انہیں جو فکریں لاحق تھیں اظہار صاحب سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور خود وہ بھی کسی سے بات نہیں کر سکتی تھیں۔ اندر کی کھولن بڑھتی جا رہی تھی۔ درپیش حالات کو مدنظر رکھ کر وہ مستقبل کا اندازہ کر سکتی تھیں۔ حالات قابو کرنے کے لیے وہاب کو قابو کرنا ضروری تھا' ساتھ ہی ساتھ ماہ رخ کو بھی راہ پر لانا تھا۔

وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں کہ کب تعمیر کا کام ختم ہو اور وہ وہاب اور ماہ رخ کی شادی طے کریں۔

☆.........❁.........☆

تعمیر کا کام ختم ہونے تک کا وقت نجمہ بیگم نے بہت بے قراری سے کاٹا تھا، وہاب اور ماہ رخ کی شادی کی خوشی میں انہیں مالا اور اس کے گھر کا دکھ بھی بھول گیا تھا۔ ان کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی سو وہ اپنے

سارے ارمان پورے کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہاب کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے جہیز کے لیے مہنگی سے مہنگی اور اچھی سے اچھی چیزیں خریدی تھیں۔ کپڑے، زیور، جوتے ہر چیز میں ماہ رخ کی خواہش مقدم رکھی گئی تھی۔

ماہ رخ بھی ہوا کی رتھ پر سوار تھی۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتی پھر رہی تھی، یہ اس خواب کی تعبیر تھی جو کچی عمر میں ہی ماں نے اس کی آنکھوں میں سجادیا تھا۔ کیا جہیز کیا بری، وہ جس چیز کو نظر بھر کر دیکھتی، وہ ہی چیز مقدر بن کر اس کے گھر چلی آئی۔ قسمت مہرباں ہو تو کسی جادو کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس وقت قسمت کی دیوی دونوں ہاتھوں سے اس پر خوشیاں برسا رہی تھی۔ یہ خوشیوں کا ہی عکس تھا جو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، اس کی سانولی رنگت بھی کھل رہی تھی۔ شادی پر وہ خوب صورت سے بھی خوب صورت نظر آنا چاہتی تھی سو مہنگے پارلر سے ٹریٹمنٹ کروا رہی تھی۔

نجمہ بیگم شادی ہال کے بجائے ہر فنکشن گھر میں کرنا چاہتی تھیں اور کسی کی روک ٹوک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا سو پورا گھر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

آج ماہ رخ کی مایوں اور نکاح تھا۔ اماوس کی کالی رات میں بھی پورا گھر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ہر کونا جگر جگر کر رہا تھا۔ ماہ رخ مایوں کے پیلے جوڑے میں سنوری اسٹیج پر بیٹھی تھی۔ سحاب وقفے وقفے سے اس کے کانوں میں وہاب کے نام کا شہد انڈیل رہی تھی، دور پار کے سب رشتے دار تقریب میں شامل ہونے کے لیے آچکے تھے۔ نجمہ بیگم خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں رکھ پا رہی تھیں۔

''وقار کی بیٹی نظر نہیں آرہی۔'' کسی رشتے دار خاتون نے مالا کی غیر حاضری کا نوٹس لیا تو انہیں بھی خیال آگیا۔ سحاب کو بلانے بھیجا تو پتا چلا بابا اور مالا دونوں ہی گھر میں نہیں ہیں۔

''جل گئے میری بیٹی کے نصیب سے۔'' انہوں نے تنفر سے سوچا اور سر جھٹک کر مہمانوں میں مصروف ہوگئیں۔ پہلی بار انہیں بیٹے کی کمی کا احساس ہوا تھا جو شائق کی آمد سے دور ہوگیا۔ شائق نے از خود بہت سے انتظامات اپنے سر لے لیے تھے۔ وہ تو حیران تھا اور خوش بھی، دو مہینے میں حالات نے کیسا پلٹا کھایا تھا کہ ماہ رخ از خود اپنی خواہش سے احسن طریقے سے دستبردار ہوگئی تھی۔

اس کی متلاشی نظریں ہر طرف مالا کو ڈھونڈ رہی تھیں اور تو اور بابا بھی غائب تھے۔ آخر اور کچھ نہ سوجھا تو وہ کاموں سے جان چھڑا کر ظہور صاحب کے پاس چلا آیا۔

''انکل! بابا نظر نہیں آرہے؟'' اس نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

''اوہ یار! میں تو بھول ہی گیا تھا۔'' کہہ کر وہ تیزی سے اندر کی طرف لپکے تو وہ بھی ان کے پیچھے چلا آیا۔

''کیا ہوا انکل! خیریت؟''

''ہاں، آج فیصل وڑائچ کا لائیو انٹرویو آنا ہے۔'' گھڑی دیکھتے ہوئے انہوں نے ٹی وی آن کیا۔

شائق کو عجیب سا لگا، آج ان کے بیٹے کا نکاح ہے اور انہیں ایک سیاسی لیڈر کے انٹرویو کی فکر پڑی ہے، انہوں نے شاید اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔

''ایم ایم زی کو پڑھا ہے کبھی؟''

''جی، کبھی نہیں اکثر پڑھا ہے۔''

''تو آج اس کا پہلا لائیو شو ہے' وہ بھی اتنے بڑے سیاسی لیڈر کا انٹرویو۔'' انہوں نے بہت جوش سے کہا۔ شائق کو ان کے تاثرات ناقابل فہم لگ رہے تھے تب ہی کوئی ظہور صاحب کو بلانے آگیا۔

''تم ادھر بیٹھو' میں ابھی آتا ہوں۔'' ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر وہ باہر نکل گئے تو کچھ دیر وہیں کھڑے رہنے کے بعد وہ بھی وہاں سے باہر نکل آیا۔

لان میں نکاح کی سنت ادا کی جارہی تھی۔

شائق! میں چھوہارے اندر بھول آئی ہوں' ذرا جلدی سے لے آؤ۔'' نجمہ بیگم نے اس کے کان کے پاس آکر آہستگی سے کہا تو وہ اندر آگیا۔ چھوہارے لے کر وہ باہر نکلا تو ٹی وی پر شو کا باقاعدہ آغاز ہوچکا تھا اس نے سرسری سی نظر ڈال کر آگے بڑھ جانا چاہا لیکن نظر آنے والے منظر نے اس کو جامد کردیا۔ ایم ایم زی کے نام سے کالم نگار ایک لڑکی تھی اور وہ لڑکی اس وقت مردانہ سفید شرٹ کے ساتھ بلیک پینٹ میں کھلے بالوں میں ٹی وی اسکرین پر دکھائی دے رہی تھی۔

''ملیحہ مبشر زیدی'' کہہ کر خوشی سے تالی بجا کر ظہور صاحب اس کے قریب سے گزر کر صوفے پر جا بیٹھے ''میری مالا'' کے الفاظ نے رہا سہا شک بھی دور کردیا۔

وہ مالا تھی...... ان پڑھ' جاہل مالا...... ملیحہ مبشر زیدی کی شکل میں ایک خواب کی طرح اس کے سامنے تھی۔ وہ ساکت وصامت کھڑا تھا۔ وہی نہیں' اس پاس سے گزرنے والا ہر وہ شخص جس کی نظر اسکرین کی طرف اٹھی' اسی کی طرح جم کر رہ گیا۔ کسی نے باآواز بلند اعلان کیا۔

''مالا ٹی وی پر آرہی ہے۔'' دیکھتے ہی دیکھتے لان سے دولہا سمیت سب مہمان لاؤنج میں چلے آئے۔ گھر کے سب کونوں سے عزیز رشتے دار مالا کو دیکھنے کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ سب حیرت زدہ تھے، اسے اسٹوڈیو میں دیکھ کر فیصل وڑائچ نے کہا تھا۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ اتنی کم عمر ہیں' یہ میرے جیسے سینئر بندے کے ساتھ زیادتی ہے۔'' وہ سوچ رہا تھا اس لڑکی کو ''ان'' کرنے کے لیے چینل والوں نے اس کا سہارا لیا ہے۔ اگلے چند منٹوں میں اس کی غلط فہمی رفع ہوگئی تھی۔ پہلے وقفے سے پہلے ہی وہ گھبرا گیا تھا۔

اس لڑکی کے لہجے میں کاٹ تھی۔ اس کے تیکھے سوال اور سرد رویہ...... اس کے دانتوں تلے پسینہ آگیا تھا۔ پہلے ہی وقفے میں اس نے منرل واٹر منگوا کر پیا۔ اظہار دوستی کے لیے اس نے انداز کی تعریف بھی کی اور مستقبل روشن ہونے کی پیشن گوئی بھی لیکن یہ لڑکی اس کے لیے عجیب تھی۔ اس نے وقفے کے دوران اس کی طرف دیکھا تک نہیں' اس کی کسی بات کا جواب تو کیا خاک دینا تھا ورنہ اب سے پہلے تو اینکر شو میں کچھ بھی کہتے' آف دی کیمرہ ساتھ تصویریں بنواتے اور گپ شپ کرتے، ہاتھ ملاتے اور شو شروع ہوتے ہی اپنی پروفیشنل طرز پر بودے حملے کرتے۔

دوسرے وقفے میں اتنی سردی میں بھی اس کے ماتھے پر ٹھنڈی بوندیں بہنے لگیں۔ آف دی کیمرہ اس نے اسے سیاست میں آنے کا مشورہ دیا بلکہ اپنی پارٹی سے ٹکٹ دلوانے کا وعدہ بھی کیا لیکن جواب ندارد۔

جو لڑکی اتنی سی عمر میں سیاق وسباق کے حوالے سے پوری سیاست گھول کر پیے بیٹھی ہو، ان کے بودے الفاظ منہ پر دے مارنے کی صلاحیت رکھتی ہو' وہ یقیناً اپوزیشن کو چاروں شانے چت کردینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہوگی اور پھر ایک دنیا نے فیصل وڑائچ کو حواس باختہ ہو کر شو چھوڑ کر جاتے دیکھا۔

ملیحہ مبشر زیدی کی زندگی کا پہلا لائیو شو ادھورا رہ گیا لیکن یہ اس کی ناکامی نہیں بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس ایک شو نے بتادیا تھا کہ وہ کیا ہے، یہ شو اس کی صلاحیت کی ایک جھلک اور کامیابی کی پہلی سیڑھی تھا۔

فیصل وڑائچ آف دی کیمرہ گالیاں بکتا گیا تھا، ٹیم ممبرز نے کیمرہ آف ہوتے ہی باقاعدہ تالیاں بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ ثابت ہوگیا تھا کہ چینل نے اس کم عمر لڑکی کو موقع دے کر غلطی نہیں کی۔

بابا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے، انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

اس رات وہ گھر پہنچی تو وقار زیدی کی یتیم بیٹی نہیں بلکہ ملیحہ مبشر زیدی تھی، جس کی قابلیت کا نظارہ ہر شخص نے کھلی آنکھوں سے کیا تھا۔

جس خاموشی سے وہ گئے تھے، اسی خاموشی سے وہ آ بھی گئے تھے۔ ظہور صاحب ان کے انتظار میں ہی بیٹھے تھے۔

"میری بچی...... مجھے فخر ہے، میں نے اپنی بھائی کی روح کو یقیناً سکھ دیا ہوگا۔ وقار آج بہت خوش ہوگا۔" مالا کو گلے لگا کر انہوں نے ماتھا چوما تو اس کی نظر پیچھے کھڑے شائق پر پڑ گئی، اس نے فوراً نگاہیں چرالیں۔

شائق خوش تھا۔ مالا جو نظر آتی ہے وہ ہے وہ نہیں، اس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

"شائق تم نے دیکھا ایم ایم زی کو؟" بابا نے مالا کے جانے کے بعد پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

"جی دیکھا صرف اسی کو تو دیکھا ہے۔"

"میری مالا نے میرا نام اپنے نام کے ساتھ جوڑ رکھا ہے، شائق میں مبشر وہ ملیحہ مبشر زیدی...... تم بھی یہ اعزاز نہیں چھین سکتے۔" انہوں نے فخر سے سینہ پھلایا۔

"مجھے کچھ نہیں چھیننا آپ سے۔" اس نے نرمی سے بابا کے ہاتھ دبائے اور اندر لے آیا، مالا یقیناً اپنے کمرے میں تھی۔

مالا کی آنکھیں خالی تھیں، سونی گلیوں اور کورے کاغذ کی طرح وہ سوچ رہا تھا ان آنکھوں میں دھنک رنگ کیسے سجیں گے۔

بابا بہت خوش تھے، وہ اسٹوڈیو کی باتیں بتا رہے تھے، ایک ہی بات بار بار دہراتے ہوئے خوش، بے حد خوش ہو رہے تھے۔ دوسری طرف یہی خوشی کسی کے لیے آزمائش بنی ہوئی تھی۔ ایک ہی چھت تلے، ایک ہی گھر کے مکینوں کے لیے وہ کتنی مختلف تھی۔ وہاب کمرے کی کھڑکی میں کھڑا دیکھ رہا تھا، ابھی کچھ دیر پہلے اس نے یہیں سے مالا اور بابا کو گاڑی سے اتر کر اندر جاتے دیکھا۔ ظہور صاحب کی محبت اور شائق کا والہانہ پن......

آج سے پہلے اسے اپنا آپ کبھی اتنا خالی نہیں لگا تھا۔ مالا...... جسے اس نے کبھی کسی گنتی میں رکھا ہی نہیں تھا' ملیحہ مبشر زیدی بنتے ہی اسے خود سے بہت اوپر' بہت دور نظر آرہی تھی۔ ستاروں کی طرح روشن اور درخشاں۔

وہ مالا سے ملیحہ مبشر زیدی کب بنی' چند لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ بھی لاعلم تھا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ اتنی دور تھے' یہ اسے آج پتا چلا تھا۔ ایک شدید دکھ کی لہر دل کو ڈبوتی جارہی تھی۔ دل میں رہنے والی تکلیفوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا تھا یہ بھی کانٹوں پر گزرنے والی راتوں میں سے ایک رات تھی۔

☆......❀......☆

وہاب کی بارات سے دو دن پہلے بابا کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوگیا، مالا کا رو رو کر برا حال ہوگیا تھا۔ وہ ہر آتے جاتے ڈاکٹر کے پاس جا کر بابا کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ظہور صاحب اسے سینے سے لگائے کوریڈور میں کھڑے اس کی سسکیوں سے کانپتے وجود کو تھپک رہے تھے۔ نجمہ بیگم اور اظہار صاحب کے ساتھ وہاب بھی ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ماہ رخ کو نجمہ بیگم نے خود ہی ساتھ لانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ابٹن لگنے کے بعد ماہ رخ گھر سے نکلے۔

شائق نے ایک نظر روتی ہوئی مالا پر ڈالی، بالکل عام لڑکیوں کی طرح روتی ہوئی مالا اسے بری طرح اداس کر گئی تھی۔ اس کے رونے سے وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ بابا اس کے لیے کیا اہمیت رکھتے ہیں، خود وہ بھی تو بابا سے اتنا پیار کرتا تھا۔ افسردگی سے وہ کوریڈور سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نے کہا تھا اس عمر میں اٹیک زیادہ شدید نہیں ہوتا پھر بھی ان کی عمر اور جسمانی حالت کے پیش نظر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ شائق نے دل سے بابا کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کی تھی۔ وہ کیا وہاں کھڑے تمام نفوس ان کی خیریت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ یہاں تک کہ نجمہ بیگم بھی۔ اگرچہ انہیں بابا سے دلچسپی تھی نہ ان کی زندگی سے، بس وہ اپنی بیٹی کی خوشیاں خراب نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں۔

ماہ رخ کے اکیلے پن کے خیال سے اور نجمہ بیگم کی صحت کے خیال سے ظہور صاحب نے انہیں گھر

بھیج دیا تھا۔ بھیج تو وہ مالا کو بھی رہے تھے لیکن وہ ضد کی ایسی پکی تھی کہ ان کے اتنے اصرار پر بھی وہ ادھر سے ہلی تک نہیں۔ اگر وہ بابا سے اتنی محبت کرتی تھی تو بابا بھی اس سے بے حد پیار کرتے تھے۔

اگلے دن دوپہر کے بعد انہیں ہوش آیا تو مالا واش روم گئی ہوئی تھی۔ وہ جب ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو بابا کی آخری شدید ترین خواہش ظاہر کی کہ وہ مالا کو اپنی زندگی میں اپنے گھر کا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ حیرت اور بے یقینی سے گنگ رہ گئی تھی۔

بستر مرگ پر پڑے وجود کو خود سے زیادہ اس کی فکر پڑی تھی، وہ انسان جو اپنی زندگی کے بارے میں پریقین نہیں تھا کیسے اس کی خوشیوں کا سوچ رہا تھا۔ وہ کیسے اس کا برا چاہ سکتا تھا۔ ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر اس نے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

شائق کے والد کراچی جاچکے تھے۔ پہلی میسر فلائٹ سے وہ بھی واپس آگئے تھے۔ اس کی والدہ گھر ہی میں موجود تھیں سو باہمی مشاورت سے اگلے چند گھنٹوں میں چار گواہوں کی موجودگی میں اس کے جملہ حقوق شائق کے نام محفوظ کر دیے گئے۔ نجمہ بیگم کو پتا چلا تو ان کو تو جیسے پتنگے ہی لگ گئے۔ غم و غصے کے مارے ان کا برا حال تھا۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی اور مالا ان کا لائق فائق بھانجا لے اڑی۔

ابھی تو انہیں مالا کا ٹی وی شو ہی ہضم نہیں ہوا تھا، ماہ رخ کی کیفیت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اس کا تو پہلے ہی موڈ آف تھا۔ بابا کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے پہلے ہی اس کی رخصتی والا معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آرہا تھا۔

مالا کے نکاح کے بعد بابا کی طبیعت میں ڈرامائی تبدیلی آئی تھی۔ اس کے باوجود انہیں اسپتال سے ڈسچارج نہیں کیا گیا تھا۔ اظہار صاحب فنکشن کینسل کرنا چاہتے تھے لیکن بابا نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے پھر چند گھنٹوں کی ہی تو بات ہے' نتیجتاً مالا کے علاوہ سب ہی گھر چلے گئے تھے۔ ظہور صاحب نے اس پر خود بھی زور نہیں دیا تھا کیونکہ کوئی کچھ جانتا تھا یا نہیں' وہ بن دیکھے بن سنے بھی سب جانتے تھے۔

رخصتی کے بعد وہاب دلہن بنی ماہ رخ کو اس کی مرضی کے خلاف گھر لے جانے کے بجائے اسپتال لایا تھا۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے اسے دعاؤں کی اشد ضرورت تھی سو وہ دعائیں لینے آیا تھا۔ دلہن بنی بجی سنوری ماہ رخ کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوا تو مالا فوراً ہی باہر نکل گئی، اس نے رسماً بھی ان دونوں کو شادی کی مبارک باد دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ یہی اگر کچھ دن پہلے مالا کے ٹی وی پر آنے سے پہلے ہوا ہوتا تو وہ اسے مالا کا حسد یا بدتمیزی سمجھتا لیکن اب وہ جانتا تھا کہ وہ اتنی بے نیاز تھی ان سے کہ اسے ان کی کسی بات سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔ اسے مالا اتنی اونچائی پر لگ رہی تھی جہاں سے اس کی نظر وہاب جیسے بونے کو دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

بابا بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ ان سے یوں ملے تھے جیسے ان سے کبھی کوئی رنجش تھی ہی نہیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ دل سے خوش ہوتا لیکن جانے آج کیا بات تھی کہ وہ بالکل بھی خوش نہیں ہو پا رہا تھا سب کچھ بے مصرف و بے وجہ' رائیگاں لگ رہا تھا۔ جانے کیوں؟ وہ اس پر ایک نظر ہی ڈال دیتی تو شاید وہ اتنا بے کل نہ ہوتا۔ اس کا دل ہر چیز سے بری طرح اچاٹ ہوا تھا۔ غائب دماغی سے کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد وہ وہاں سے گھر کے لیے نکل پڑے۔ اپنی بے زار حالت کے باعث وہ ماہ رخ کا پھولا منہ بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔

☆......❀......☆

بابا ڈسچارج ہو کر گھر تو آگئے تھے لیکن ان کی صحت پہلے سے بہت گر چکی تھی۔ مالا جی جان سے ان کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ بابا کے علاوہ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ اپنا آپ بھلائے وہ بابا کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی۔ ایسے میں کہاں کا ٹی وی، کہاں کا پروگرام، البتہ چینل سے بار بار فون آرہے تھے۔ وہ اسے ایک مستقل پروگرام دینا چاہ رہے

تھے۔

اس کی قابلیت کے بعد یہ ظہور صاحب تھے جن کی وجہ سے وہ لوگ اسے اتنی اہمیت دے رہے تھے ورنہ وہ جانتی تھی اس سے بھی کہیں زیادہ لائق اور قابل موقع کی تلاش میں سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ وہ بابا کو اس حال میں چھوڑ کر اپنی زندگی بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

پھر ایک دن بابا نے خود ہی پوچھ لیا۔

''مالا میری محنت پر پانی پھیر دیا کیا؟''

''نہیں بابا! بالکل بھی نہیں۔'' اس نے محبت سے بابا کا ہاتھ چوم کر جواب دیا۔

''تو پھر مجھے دوبارہ ٹی وی پر نظر کیوں نہیں آئیں؟'' انہوں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ ابھی آپ کو میری ضرورت ہے۔''

''وہ تو ہمیشہ رہے گی۔''

''تو میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔''

''جھوٹ، تم شادی ہو کر چلی جاؤ گی۔''

''بالکل بھی نہیں، یہیں آپ کے پاس رہوں گی ہمیشہ اسی گھر میں۔''

''مکھن لگا کر بات پلٹ رہی ہو؟''

وہ ہنسی۔ ''نہیں تو...... بس آپ ٹھیک ہو جائیں پھر تب تک میں بھی سوچ لوں کہ مجھے کرنا کیا ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے، شائق سے بھی مشورہ کر لینا، اب وہ تمہارا شوہر ہے اس کا حق ہے کہ تم اسے اپنے ذاتی معاملات میں انوالو کرو۔'' بابا کی خالص زنانہ انداز میں کی گئی نصیحت پر وہ کھل کر ہنس پڑی۔

''ویسے آپ کی اور دادو کی محبت بہت مثالی ہے، آج بھی آپ کے انداز، آپ کی بات میں دادو بولتی ہیں۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

بابا نے سر ہلا کر بھرپور تائید کی اور پھر اس کی شرارت سمجھ کر مصنوعی خفگی سے گھورا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ شائق کے نام پر اس نے بات بدل دی ہے ــــ انہوں نے بات دہرائی نہیں۔

☆......❁......☆

بابا کی علالت نے مالا کو بااعتماد اور اپنے طور پر فیصلہ کرنا سکھا دیا تھا۔ شائق سے مشورہ کرنے کا اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا۔ یوں بھی نکاح کو دو ماہ ہونے کو تھے اور وہ ماہ رخ کا ولیمہ بھگتا کر ایسا کراچی گیا کہ لوٹا ہی نہیں۔ بابا سے اس وقت مشورہ مانگنا فضول تھا کیونکہ اسے انگلی پکڑ کر راہ پر چلانے والے نے واضح انداز میں ہاتھ کھڑے کر دیے تھے کہ اب ان کی ذمہ داری ختم ہوئی اب وہ جانے اور اس کا شوہر۔

ظہور صاحب سے بات کرنے سے پہلے ہی وہ جانتی تھی کہ وہ بھی بابا کے ہم خیال، ہم زباں ہوں گے سو اس نے اپنے طور پر لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔ عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا کہ ایک بار ظہور صاحب اور بابا سے کھل کر بات ہو جائے۔ اس نے آج تک بابا اور ظہور صاحب کے فیصلوں پر خاموشی سے سر جھکایا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک دم سے ان کے سامنے اپنا فیصلہ رکھے اور وہ یہ سوچنے لگیں کہ ان کے ہاتھوں میں پلی لڑکی نے انہیں اپنے معاملات میں سے مکھن میں بال کی طرح نکال پھینکا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ خود بات کریں اور وہ طریقے سے بات کرے یوں نہ لگے کہ سب کچھ اس نے پہلے سے طے کر رکھا ہے۔

اس شام وہ اور بابا ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ کوئی ٹاک شو تھا۔ وقفے کے دوران آواز بند کر کے وہ دونوں زور و شور سے تبصروں میں مصروف تھے جب ظہور صاحب آ گئے۔ بابا کی بیماری کے بعد سے وہ زیادہ سے زیادہ وقت بابا کے ساتھ گزارنے لگ گئے تھے۔

سلام دعا کے بعد وہ بھی کاؤچ پر بیٹھ کر گفتگو میں شریک ہو گئے۔

''مالا خالی خولی تبصروں پر ٹرخانا ہے یا اب کچھ کرنا بھی ہے؟'' انہوں نے اچانک اسے مخاطب کیا، وہ ذہنی طور پر اس اچانک سوال کے لیے پوری طرح

تیار تھی۔

''کرنا کیوں نہیں بس بابا کی طبیعت......''

''اب بس بھی کرو مالا!'' بابا نے منہ بنا کر بات کاٹی۔ ''اپنی ساری کام چوری میری بیماری کے پلے باندھ دو۔ پہلے بھی کہا تھا میں ٹھیک ہوں تم جاؤ، جو شو آفر کر رہے ہیں اسے شروع کرو۔''

''کون سا؟'' ظہور صاحب نے استفسار کیا۔

''تایا ابو وہ مستقل شو ہے ایک۔'' وہ تفصیل بتانے لگی۔

''ہاں تو بسم اللہ کرو دیر کس بات کی؟'' انہوں نے خوشی سے کہا۔ بہت پہلے دیکھا ہوا ایک خواب اب شرمندہ تعبیر ہونے کو تھا۔

☆☆☆

''میں اپنے حصے کا دیا جلانا چاہتی ہوں، میرے پاس بہت سے آئیڈیاز ہیں جن پر کام کرنے کے لیے سیاست سے بہتر پلیٹ فارم مجھے نہیں لگتا کوئی اور ہوگا۔''

''آپ ناراض تو نہیں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ناراض تو نہیں، ہاں دکھ ضرور ہوا تھا کہ صحافت کے میدان میں آگے جانے کی صلاحیت ہونے کے باوجود تم راہ بدل رہی ہو۔'' انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

''لیکن تمہاری بات سننے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، دنیا کو دیکھنے والی میری عینک پرانی ہو گئی ہے۔ اس میں جدید تقاضوں کو دیکھنے کی اہلیت نہیں رہی اور مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی اتنی باشعور ہے کہ اب اپنی نظر سے مجھے دنیا دکھانے لگی ہے۔'' شگفتہ لہجے میں کہتے ہوئے ظہور صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو خوشی سے اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں، بابا نے وکٹری کا نشان دکھایا تو نم آنکھوں سے وہ مسکرانے لگی۔

☆......❁......☆

وقت ضائع کیے بغیر مالا نے اپوزیشن کی مضبوط ترین پارٹی جوائن کر لی تھی، فرصت تو پہلے بھی کوئی خاص نہیں ملتی تھی اور اب تو اس کا وقت مصروف ترین گزرتا تھا۔

محض چند ماہ میں اس کی مقبولیت کا گراف آسمان کو چھونے لگا تھا۔

سیاسی حلقوں میں وہ اتنی مقبول نہ بھی ہوتی تو الیکشن میں کامیابی کی ضمانت انہیں عام لوگوں میں تھی۔

دن میں کام رات میں کام...... اس نے خود کو بری طرح مصروف کیا ہوا تھا۔ وہ رات گئے جب باہر سے لوٹتی تو نجمہ بیگم کسی نہ کسی کھڑکی سے اس کی آمد کا دھیان ضرور رکھتی تھیں، وقتاً فوقتاً اپنے دل کی بھڑاس وہ وہاب کے سامنے نکالتی بھی رہتی تھیں۔

آج بھی وہ رات کا کھانا کھانے نجمہ بیگم کے پاس آئے ہوئے تھے جب وہ بولنا شروع ہو گئیں، ہمیشہ کی طرح وہاب چپ کر کے سنتا رہا۔

ماہ رخ کا آخری ماہ چل رہا تھا سو نجمہ بیگم اسے اپنے پاس لے آئی تھیں، وہ بھی آفس سے ادھر ہی آ جاتا تھا۔ گھر میں تھا کون جس کے پاس وہ جاتا۔ ظہور صاحب نہ گھر میں کھانا کھاتے نہ رہتے تھے۔ اگر وہ آفس میں نہ ہوتے تو مالا کے گھر میں ہوتے تھے۔ وہاب کو کئی کئی دن گزر جاتے تھے انہیں دیکھتے ہوئے ورنہ ان سے بات کیے تو اسے لگتا تھا صدیاں ہی گزر گئی ہیں۔

خبریں دیکھنے کے لیے اس نے ٹی وی لگایا ہوا تھا جہاں کوئی ٹاک شوز چل رہا تھا۔

سفید دوپٹے کے ہالے میں وہ بہت پاکیزہ لگ رہی تھی۔ کتنا بدل گئی تھی وہ، پتا نہیں کب اس نے سوٹ پر دوپٹہ پہننا شروع کیا تھا۔

اسے ایک بھی لفظ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ بس اسے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی محویت کو نجمہ بیگم نے ایک لمحے میں نوٹ کر لیا تھا۔

''وہاب بیٹا! کام اور کاروبار تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے، یہ وقت لوٹ کر نہیں آنے والا۔ ماہ رخ کا خیال رکھا کرو، آخر کو تمہاری نسل کی امین

ہے۔" وہ جیسے کسی خواب سے جاگا۔

"جج...... جی تائی جان! خیال رکھتا تو ہوں۔"

"دیکھو تو' میری پھول سی بچی کا کیا حال ہو گیا ہے۔"

اس نے دیکھا، صوفے پر نیم دراز ماہ رخ کے سانولے گالوں پر سیاہ دھبے بڑے واضح نظر آرہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے بھی سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میلے مسلے کپڑوں میں وہ اسے ماہ رخ لگ ہی نہیں رہی تھی۔ ابھی تین چار دن تو اسے ہوئے تھے نجمہ بیگم کے پاس آئے ہوئے اور تین چار دن میں ایسی حالت ہو نہیں سکتی تھی تو کیا وہ واقعی اس سے غفلت برتتا رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی، ماہ رخ کے حال پر بھی اور اپنی بے خبری پر بھی۔

"جی تائی جان! آئندہ خیال رکھوں گا ان شاء اللہ!" دھیمی آواز میں کہہ کر اس نے سر جھکا لیا۔ ٹی وی پر بولنے والی مالا کی آواز ابھی بھی اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی اور جھکی نظروں میں بھی وہ پوری شان سے اس کے سامنے موجود تھی۔

☆......❁......☆

"آج شائق آیا تھا۔" ایک ٹاک شو بھگتا کر وہ ابھی گھر پہنچی تھی، کپڑے بدل کر وہ بابا کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگی تھی کہ انہوں نے چھوٹتے ہی اسے اطلاع دے ڈالی۔

نکاح کے بعد وہ تین چار مرتبہ آیا تھا لیکن شومئی قسمت ان کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ بے نیازی سے کھانا کھا رہی تھی جب کہ اس کے ہاتھ کی لرزش بابا دیکھ چکے تھے۔ وہ انتظار میں تھی کہ بابا کچھ اور کہیں، شائق کی فرماں برداری اور اس کے سرد رویے پر لیکن اب تو بابا بھی خاموش تھے۔ خاموشی سے کھانا کھا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

برتن کچن میں رکھے اور چہل قدمی کے لیے چھت پر چلی گئی۔ بہت عرصے سے یہ اس کا معمول تھا،

شفاف آسمان پر ستاروں کو دیکھتے دیکھتے اچانک اس کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ ابھری، اس کے چہرے پر حیا کے کسی لمحے کا عکس جھلملا رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے شائق نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ قوس و قزح کے رنگوں سے سجی آنکھیں شائق کو مبہوت کر گئیں۔ وہ کون سا خیال تھا جس نے اس کی کوری آنکھیں سجا دی تھیں؟ اس نے زندگی میں پہلی بار چاندنی میں کلیاں چٹکتی دیکھی تھیں، وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا، ہواؤں کی جانجھریں البیلے نغموں کے ساز بجانے لگی تھیں۔

دفعتاً اس کی نظر شائق پر پڑ گئی، وہ تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر جانا چاہتی تھی، شائق اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ وہ جب اس کے پاس پہنچی تو بے خودی میں اس نے اس کی کلائی پکڑلی۔

وہ اس کے اتنے قریب کھڑی تھی، اس کی آنکھیں مالا کے چہرے کا ایک ایک نقش دل پر تصویر کر رہی تھیں۔ بہت نرمی سے اس نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ شاخ گل کی طرح لچکی اور بازو چھڑوا کر تیزی سے نیچے بھاگ گئی۔

اپنی بے خودی پر وہ خود حیران اور شرمندہ تھا، وہ کیا سوچتی ہوگی۔ اس کے باوجود ان قیامت خیز لمحات نے اسے اس خوب صورت رشتے کو بہت پیارا سا احساس بھی دیا تھا جو اُن دونوں کے درمیان تھا۔ چند گہری سانسیں بھر کر وہ نیچے بابا کے پاس چلا گیا، وہ بھی وہیں تھی' اندر جانے کے لیے پر تولتی ہوئی۔

"بابا آپ مجھے رخصتی کی تاریخ دے دیں۔" اس کے جاتے ہی وہ بابا سے بولا۔

"کیا ہوا...... کچھ الٹا سیدھا بول گئی؟ یار اتنا تو حوصلہ اب رکھنا ہی پڑے گا۔" اسے بابا نے ہی اوپر بھیجا تھا اور اب انہیں لگ رہا تھا کہ مالا نے کوئی بدتمیزی کر دی ہے۔

"جو وہ کہہ گئی ہے نا، بار بار سہنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا میں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا اور وہ جو پانی لینے کے لیے کچن کی طرف جانے لگی تھی، اس بات پر سکڑتے دل کے ساتھ ایک لمحے میں واپس مڑ گئی۔

"آپ یقین کریں ہم آپ کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے، میں اسے یہیں آپ کی نظروں کے سامنے اسی گھر میں رکھوں گا، میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"کیسے؟" بابا حیران ہوئے۔

"میں یہ گھر اس سے خرید کر اسے شادی کا تحفہ دینا چاہتا ہوں اور شادی کے بعد میرا ارادہ مستقل یہیں شفٹ ہونے کا ہے۔" اس نے انہیں مزید حیران کیا تھا۔

"اور تمہارے گھر والے؟ مطلب انہیں اعتراض نہیں ہوگا؟"

"ہوتا رہے، جب ایک لڑکی شادی کے بعد لڑکے کو کراچی لے جا سکتی ہے تو دوسری لڑکی ان کے بیٹے کو لاہور کیوں نہیں لا سکتی؟" اس نے شگفتگی سے جواب دیا۔

"میں خود پاپا کا بزنس جوائن کر چکا ہوں، اب لاہور میں ان کے آفس کو میں دیکھوں گا، ان سے میں بات کر چکا ہوں، کسی کو کوئی بھی اعتراض نہیں۔"

"یار بس کرو اور کتنی خوشیاں دو گے؟" فرط جذبات سے بابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ یہ سچ تھا کہ انہیں مالا سے دوری کا خوف تھا پھر بھی اس کی رخصتی تو کرنا ہی تھی اور اب تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ وہ مرتے دم تک مالا کے ساتھ رہیں گے، اس خیال نے ان کا دل سکون سے بھر دیا تھا۔

"ان شاء اللہ ہمیشہ، جب تک میری سانس چلے گی۔" بہت محبت سے کہتے ہوئے وہ ان کے سینے سے جا لگا۔

"اللہ لمبی خوشیوں بھری زندگی' میری مالا کے ساتھ عطا کرے، آمین۔" اسے اپنی ناتواں بانہوں میں بھرتے ہوئے انہوں نے صدق دل سے دعا دی۔

☆......❁......☆

جن حالات میں مالا کا نکاح ہوا تھا' اس کے بعد بابا ہی نہیں' ظہور صاحب بھی یہ چاہتے تھے کہ اس کی رخصتی دھوم دھام سے کریں پھر ظہور صاحب کی تو بہت سی خواہشیں تشنہ ہی رہ گئی تھیں، نہ شہاب کی شادی پر ارمان نکلے، نہ وہاب کی شادی پر چاؤ پورے کیے۔ سحاب کی شادی پر وہ ویسے ہی تنہائی کے احساس تلے دبے ہوئے تھے اور اب مالا کہہ رہی تھی اسے کوئی ہنگامہ نہیں چاہیے۔

اس کی ضد کے آگے بابا اور ظہور صاحب کو ہار ماننی ہی پڑی، باقی کسی کو کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ ماہ رخ البتہ بے زار ہو رہی تھی، ایک تو پورے دن' اوپر سے اب مالا کی رخصتی۔ دبے دبے لفظوں میں اس نے احتجاج بھی کیا تھا لیکن نجمہ بیگم نے خود ہی اسے چپ کروا دیا۔

"ہمیں کون سا پہاڑ توڑنے ہیں، اپنی اپنی تیاری کرنی ہے۔ بس ایک دن کی تو بات ہے پھر ولیمہ بھی ہفتہ بعد ہے، جو معاملہ نمٹتا ہے، نمٹ جانے دو، اچھا ہے' جان چھوٹ جائے گی۔"

اختلاف رکھنے کے باوجود ماہ رخ نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ بارات کے لیے ہال کا انتظام کیا گیا۔ مالا کی طرف سے گنے چنے قریبی رشتہ داروں کے علاوہ چند اہم سیاسی شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا جب کہ شائق کی طرف سے اچھی خاصی بارات متوقع تھی۔ ظہور صاحب بھاگ بھاگ کر مہمانوں کو دیکھ رہے تھے، اظہار صاحب کو تو نجمہ نے پلو میں باندھ کر رکھ چھوڑا تھا۔ ماہ رخ بھی بے زاری ایک کونے میں بیٹھی تھی، سحاب بھی اسی کے ساتھ تھی۔ اسے بھی ماہ رخ کی طرح اس تقریب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اگر ظہور صاحب کو مالا اتنی پیاری نہ ہوتی تو وہ آج یہاں آتی بھی نہ لیکن وہ اپنے پاپا کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی وہ بھی اس مالا کی وجہ سے۔

بابا وہیل چیئر پر بیٹھے دبے دبے جوش سے ہر طرف دیکھ رہے تھے، انہیں تو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ زندگی میں یہ وقت دیکھنا نصیب ہوگا بھی یا نہیں۔

"وہاب......" نام کی پکار اس نے پلٹ کر دیکھا۔ جانے کتنے عرصے بعد ظہور صاحب نے اسے مخاطب کیا تھا۔

’’جی پاپا!‘‘

’’بیٹا! مالا کو ذرا پارلر سے لے آنا، میں ادھر مہمانوں کو ریسیو کر رہا ہوں پھر بارات بھی آنے والی ہے۔‘‘ ان کے لہجے میں حقیقی باپ والی فکر مندی تھی۔ وہاب کے لیے تو یہی کافی تھا کہ انہوں نے اسے کسی کام کے قابل سمجھا۔

’’جی میں ابھی چلا جاتا ہوں۔‘‘ اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

’’گاڑی آرام سے چلا کر لانا۔‘‘ پارلر کا ایڈریس دینے کے بعد انہوں نے جاتے ہوئے اس سے کہا تو سر ہلا کر وہ باہر نکل آیا۔

روایتی دلہنوں والے سرخ لہنگے میں مالا اسے کسی دور دیس کی رانی لگی تھی، دلہناپے کا روپ ٹوٹ کر برسا تھا اس پر، میک اپ کے نام پر اس نے کبھی کاجل کی سیاہ لکیر بھی آنکھوں میں نہیں کھینچی تھی اور آج سر کے بال سے پاؤں کے ناخن تک وہ پور پور سجی ہوئی تھی، سنہری بالوں میں گجرے مہک رہے تھے۔

نظر بھر کر دیکھ لینے کے بعد اس نے سر جھکا دیا، گاڑی میں اسے بٹھاتے ہوئے اس کا بھاری دوپٹا اس نے سمیٹ کر اندر کیا تو صرف ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ مالا کے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ مالا آگے جھک کر لہنگا سمیٹنے لگی تھی، اس کے حنائی ہاتھوں میں سرخ گلاب مہک رہے تھے، اس کے بالوں کے گجرے صرف ایک ساعت کو اس کے چہرے کے پاس، بہت پاس سے لہرا کر گزرے تھے۔ اس کی سانسیں تک معطر ہو گئی تھیں۔

بنا کچھ کہے گاڑی کا دروازہ بند کر کے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

’’یہ خوشبوؤں میں بسا وجود کسی اور کے لیے سجا ہے۔‘‘ یہ سوچ اس کے دل پر کند چھری کی طرح بار بار وار کر رہی تھی۔ ’’لیکن مجھے اس سے کیا؟‘‘ اس نے اس سوچ کو جھٹکنا چاہا۔

’’بہت خوب، بچپن سے جس لڑکی نے اسیر کیے رکھا، آج وہ کسی اور کا من مہکانے چلی ہے اور مجھے کیا؟‘‘ اس نے اپنے اندر طنزیہ قہقہے ابھرتے سنے۔

’’کبھی بھی نہیں...... اگر ایسا ہوتا تو مجھے پتا ہوتا۔‘‘

’’تمہیں تو ابھی بھی پتا ہے، اعتراف وہ بھی خود کے سامنے کرنے میں کیا جاتا ہے؟‘‘ وہ چپ رہا۔

’’صرف ایک بار......‘‘ اس نے سر جھکا، سارے راستے اس کے اندر یہ بے وجہ کی جنگ چلتی رہی۔ ہال میں پہنچ کر اس نے گاڑی پارک کی اور سر گاڑی کی سیٹ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

’’میں اعتراف کرتا ہوں خود سے، میں نے انجانے میں صرف مالا کو چاہا ہے، صرف مالا کو......‘‘ وہ خود فراموشی کی کیفیت میں بولا تھا۔

اس کے تھکن زدہ لہجے میں کہے گئے یہ چند الفاظ مالا کو بری طرح جھنجوڑ گئے تھے، غم و غصے کی ایک شدید لہر اس کے اندر سنسنا اٹھی تھی۔

’’جس لڑکی کی نفی ہمیشہ کرتے رہے جسے بونا سمجھتے رہے آج تمہیں اچانک اس سے محبت ہو گئی۔‘‘ خود ہی باہر نکل آئی تھی۔ دور کھڑی سارہ نے اسے دیکھ لیا تھا سو اب تیزی سے اس کی طرف آئی تھی۔

’’اللہ...... مالا! اتنی پیاری لگ رہی ہو، اللہ نظر بد سے بچائے۔‘‘ اس کا ہاتھ تھام کر اس کا دوپٹا سنبھالتے ہوئے وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

’’آپ بھی آئی ہیں؟ مجھے تو لگا تھا......‘‘

’’آج تو میں پوری دنیا سے بھی لڑ سکتی تھی۔‘‘ وہ مسکرائی۔

’’ماما......‘‘ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی، اس وقت وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک دلہن ہے۔

’’ماشاء اللہ میری گڑیا! بالکل پری لگ رہی ہے ماما کی جان۔‘‘ انہوں نے بہت محبت سے اسے پہلو سے لگایا۔

’’مجھے لگا آپ نہیں آئیں گی بلکہ...... میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ آپ آئیں گی۔‘‘

’’کیوں نہ آتی؟ کم از کم اپنی جان کو زندگی شروع کرنے کے لیے اپنی طرف سے ایک چھوٹی سی خوشی کا تحفہ تو دے سکتی ہوں ناں۔‘‘

اسے ساتھ لیے وہ اسٹیج پر آ گئیں، بابا نے بھی اس کی خوب بلائیں لی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں بارات آ گئی، دولہا بنا شائق واقعی اس کے جوڑ کا لگ رہا تھا۔

اس کی والہانہ نظریں جس طرح مالا کا طواف کر رہی تھیں، اس سے نجمہ بیگم کے دل و دماغ میں آگ لگ رہی تھی۔ انہیں تو لگا تھا بابا کی طبیعت کی خرابی پر ان کا بھانجا قربان کیا گیا تھا لیکن آج انہیں پتا چل رہا تھا کہ وہ تو مالا کے ہاتھوں گھائل تھا۔ جس طرح وہ محبت بھری نظروں سے مالا کو تک رہا تھا ماہ رخ کو بھی کھل رہا تھا۔ شادی کے نو یاہ میں اسے وہاب کی ایک بھی ایسی نظر میسر نہیں آئی تھی۔ اپنی ازدواجی زندگی کے کھوکھلے پن کا اندازہ اسے آج اس جگہ ہوا تھا، کوکھ کے سیپ میں زندگی کا گہر ہوتے ہوئے بھی اسے اپنا وجود بالکل خالی لگ رہا تھا۔

پر خلوص دعاؤں کے سائے تلے مالا رخصت ہو کر کراچی چلی گئی تھی۔ شائق کی ماں کی خواہش تھی کہ شائق اپنی بیوی کو رخصت کروا کر کراچی لے آئے۔ پہلی بار اس کی ذات کو ثبات ملا تھا تو وہ خوش کیوں نہ ہوتی۔

کل انہیں ولیمہ کے لیے لاہور جانا تھا، بابا سفر نہیں کر سکتے تھے اور شائق یہ بات جانتا تھا۔ کسی سے بھی کہے بنا اس نے ماں باپ کے سامنے ولیمہ لاہور میں کرنے کی فرمائش کر ڈالی تھی جو تھوڑے سے پس و پیش کے بعد مان لی گئی تھی۔

آج شائق اسے ساحل سمندر پر لایا تھا، وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

’’میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے حقیقت میں سمندر دیکھ سکوں گی۔‘‘ تم ریت میں ننگے پاؤں دھنسا دھنسا کر چلتی مالا نے اتنی معصومیت سے کہا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

’’اگر تم چاہتیں تو پہلے بھی آ سکتی تھی لیکن وہ جو اوپر ہے ناں، اس نے ہم دونوں کے قدم اس زمین پر ایک ساتھ لکھے تھے۔‘‘

چلتے چلتے وہ ساحل کے نسبتاً کم رش والے حصے میں آ گئے تھے۔

’’ایک بات پوچھوں؟‘‘

’’ہوں۔‘‘

’’سچ بتاؤ گی ناں؟‘‘ وہ رک گیا تو وہ بھی ٹھہر گئی۔

’’بالکل سچ۔‘‘

’’اس رات چھت پر تم اکیلی تھی، تب تم مسکرائی تھیں، کیوں؟‘‘ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

’’کوئی نہیں بتا رہی میں۔‘‘

’’بتانا تو پڑے گا۔‘‘

’’بالکل بھی نہیں۔‘‘ شرارت سے کہتے اس کا بازو چھوڑ کر وہ بھاگی، شائق بھی اس کے پیچھے لپکا، کچھ دور جا کر وہ رک گئی، اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔

’’اب بتاؤ۔‘‘ وہ دونوں وہیں پتھر پر بیٹھ گئے۔

’’وہ...... جیسے کہانیوں، ڈراموں میں ہوتا ہے ناں، لڑکی پھسلتی ہے، لڑکھڑاتی ہے اور ہیرو اسے تھام کر گرنے سے بچا لیتا ہے تو میں نے سوچا اگر میں...... بلکہ میں نے سوچا نہیں، میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ......‘‘ اس نے جھینپ کر بات ادھوری چھوڑ دی، اس کی چہرے پر اب بھی ویسے ہی رنگ تھے، وہ شوق سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

’’مطلب میں لیٹ ہو گیا، چانس مس ہو گیا۔‘‘ مصنوعی تاسف سے اس نے ہتھیلی پر مکا مارا۔

’’ویسے اگر مناسب سمجھو تو بتاؤ مالا سے ملیحہ مبشر زیدی کیسے بن گئیں تم؟‘‘

’’میں......‘‘ ڈوبتے سورج کو دیکھتے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

☆......❁......☆

لاہور شہر کے مضافات میں بسے پوش علاقے میں مقیم مبشر زیدی نے اپنی زندگی کو خود بنایا تھا، انہیں وراثت میں کوئی لمبی چوڑی جائیداد یا بینک بیلنس نہیں

ملا تھا۔ ان کے پاس جو بھی تھا وہ اللہ کی رحمت کے بعد ان کی اپنی محنت کا ثمر تھا۔ اللہ کی ذات نے انہیں بیٹی کی علاوہ ہر خوشی سے نوازا تھا، اظہار کے بعد ظہور اور پھر وقار ان کے تین بیٹے تھے۔

اظہار فطرتاً صلح جو کم گو اور قناعت پسند تھا جب کہ ظہور میں آگے بڑھنے کی لگن، کچھ کر گزرنے کا جنون تھا، ان دونوں کے برعکس وقار طبیعتاً شوخ تھا۔ مبشر زیدی کی طرح ان کی شریک سفر بھی متوسط خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب بچوں کے رشتوں کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے خاندان کو ترجیح دی۔ اظہار کے لیے مبشر صاحب اپنے دوست کی بیٹی بیاہ لائے تھے اگرچہ کچھ ہی عرصے میں انہیں اپنے فیصلے کے غلط ہونے کا احساس ہو گیا تھا، بنیاد ان کے ہاتھوں ہی غلط رکھی گئی تھی۔

نجمہ تیز مزاج، اور گرم طبیعت کی تھیں، بات بات پر رونا واویلا مچانا ان کا محبوب مشغلہ تھا، ذرا ذرا سی بات پر وہ طوفان مچاتیں کہ تنگ آ کر سب نے زبان پر تالے ڈال لیے تھے، واحد ایک ظہور تھا جس سے وہ بدکتی تھیں پھر ظہور کے لیے اس کے ننھیال سے زاہدہ کا رشتہ منظور کر لیا گیا۔ زاہدہ اس کی ماموں زاد بہن تھی۔ نجمہ کے برعکس زاہدہ۔ فطرتاً نرم اور قدرے بزدل تھیں، اسی وجہ سے وہ نجمہ کے آگے دب کر رہ گئیں اور کبھی جائز حق کے لیے بھی آواز نہ اٹھا سکیں۔

وقار کے لیے ماں باپ کو تردد نہیں کرنا پڑا، وہ اپنی مرضی سے اندرون لاہور مقیم اپنی کلاس فیلو کا رشتہ خود لے آئے تھے۔ منزہ بھی سادہ مزاج اور حلیم الطبع تھیں جو چند سال وہ اس گھر میں گزار کر گئی تھیں اس میں انہوں نے کبھی کسی سے زبان درازی نہیں کی تھی ۔ نجمہ کی طبیعت وہ شروع میں ہی بھانپ گئی تھیں اس لیے کبھی تو تکار کا موقع ہی نہیں آیا دیا پھر وہ حادثہ پیش آیا جس نے مبشر زیدی کو اندر سے توڑ دیا۔ وقار کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا اور ستم یہ کہ عدت کے لیے گئی منزہ کو نئی جگہ بیاہ کر بچی کو واپس بھیج دیا گیا۔

مالا نے صرف محبت دیکھی تھی، باپ کی بے پناہ چاہت اور ماں کی نرم آغوش کے علاوہ اسے کسی چیز کا علم تھا ہی نہیں۔ زندگی اس کے لیے خوشیوں کا نام تھا، جو بات زبان پر آتی دوسری بار کہنے سے پہلے پوری ہو جاتی۔ بے انتہا خوب صورت گڑیا کی طرح مالا وہاب کو بہت اچھی لگی تھی۔ اسکول سے واپسی پر وہاب مالا کے کمرے میں یا مالا وہاب کے کمرے میں پائی جاتی تھی۔ ایک ساتھ اسکول جانا پھر بریک میں ساتھ رہنا، واپسی پر گھر میں بھی ساتھ کھیلنا، ساتھ کھانا پینا، دونوں جیسے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔

مالا کی شوخ و شنگ طبیعت یقیناً باپ سے ہی ملی ہوئی تھی، ایسے میں ماہ رخ جو رنگ روپ میں اپنی ماں کا پرتو تھی اور طبیعت میں باپ کا۔ سانولی سلونی چپ چاپ رہنے والی، مالا کے سامنے پس پشت چلی جاتی۔ اس کا دل چاہتا تھا وہاب اس کے ساتھ بھی کھیلے' باتیں کرے لیکن مالا کے آگے ماہ رخ دکھائی کے دیتی اور خود آگے آنے کی ہمت ماہ رخ کہاں سے لاتی؟

نجمہ اپنی اکلوتی بچی کو اس طرح گم صم رنجیدہ دیکھتیں تو ان کا خون کھولتا، دو ایک بار انہوں نے ماہ رخ کو پیار سے سمجھایا، ڈانٹا لیکن وہ بزدل تھی وہ کبھی ان کے کھیل میں شریک نہیں ہو سکی۔ جب وقار کی موت کے بعد مالا ان کے ہتھے چڑھی تو انہوں نے سارے بدلے چکا لیے، انہیں بہت دور کی سوجھی تھی اگر ماہ رخ اور وہاب کی شادی ہو جائے تو ماہ رخ دہری جائیداد کی مالکن ہوتی، انہوں نے ایک معصوم بچی کو تختہ مشق بنا لیا۔

سب سے پہلے تو وہ اس کے رونے اور چلانے سے عاجز تھیں، انہوں نے سب کے سامنے محبت اور ڈر سے اسے بہلایا، جب وہ نہیں بہلی تو پھر اکیلے میں اس کے منہ پر تھپڑ مارے۔ وہ نازوں پلی نازک سی گڑیا سن ہو کر رہ گئی۔

"کسی کو بتایا یا اب شور مچایا تو اس سے بھی برا سلوک کروں گی۔" مالا ڈر گئی تھی پھر اسی روز ماہ رخ سے کرسٹل ڈیکوریشن پیس ٹوٹ گیا۔

"مالا نے توڑا ہے۔"

اس ایک جملے کو سن کر اندر آتے وہاب نے کہا۔ "مالا بری بات ہے، اس طرح بدتمیزی کرتے ہیں؟" اور مالا اس دن سے بدتمیز ہو گئی۔

وہاب نے پوچھا نہیں صرف ایک جملے پر اسے بدتمیز کہہ ڈالا، مالا کے لیے یہ اتنی بڑی گالی تھی۔ وہاب اس کا دوست تھا اس پوچھتا تو سہی۔ وہ کچھ کہنے لگی تھی لیکن نجمہ بیگم نے بڑی خوب صورتی سے بات بنالی۔

"غصے میں اسی طرح چیزیں توڑتی ہے، اب کیا کریں بچی ہے، نہ ماں سر پر نہ باپ۔ کچھ کہیں گے تو ظالم کہلائیں گے۔"

"ارے نہیں تائی! آپ اس کو منع کریں رک جائے گی، اتنی اچھی تھی یہ تو۔" اور یہ "تھی" بھی مالا کے دل میں گڑ گیا، اگلی صبح وہ جب اپنا بیگ ڈھونڈ رہی تھی نجمہ بیگم آ گئیں۔

"مہارانی چل کر ناشتا کر لو۔" اکیلے میں ان کا طرز تخاطب اسی طرح اہانت بھرا ہوتا تھا۔

"میں اپنا بیگ ڈھونڈ رہی ہوں۔" اس نے بے نیازی سے کہا تو اگلے ہی لمحے ایک تھپڑ اس کا گال دہکا گیا۔

"میرے سامنے بکواس کرنے کی ہمت کیسے کی، بول؟" اس کے سنہری بال نجمہ بیگم کی مٹھی میں تھے۔

"اسکول کا ڈرامہ ختم سمجھی...... تیرا باپ نہیں کما کر لا رہا جو اتنے مہنگے اسکول کے خرچے اٹھائے جائیں اور سن اگر کسی کے سامنے اسکول جانے کا نام لیا تو جان سے مار دوں گی۔ اسی اندھیری قبر میں ڈال آؤں گی جس میں تیرا باپ دفن ہے۔" ہاتھ میں پکڑا گرم چمٹا اس بری طرح اس کے کندھے پر لگا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

سب کے سامنے نجمہ نے اس سے اسکول کا کہا تو خوف زدہ ہو کر نہیں نہیں کرتی وہ کمرے میں بھاگ گئی۔ مالا کا یہ رویہ مبشر زیدی کا خون جلا رہا تھا، انہوں نے بہت محبت سے مالا کو پوچھا، پچکارا لیکن وہ کیا بتاتی۔ دادا کا ہاتھ اچانک کندھا چھو گیا تو وہ سسک اٹھی، انہوں نے قمیص ہٹا کر دیکھا، گہرا سبز و سرخ نشان ان کا دل ہلا گیا۔ ہزار بار پوچھنے پر بھی مالا نے نہیں بتایا۔ ان ہی دنوں بیٹے کی وفات کا غم لیے ان کی ہم سفر بھی قبر میں جا سوئیں اب تو پورے گھر پر نجمہ بیگم کا راج تھا، وہ جو چاہتی کرتیں اور اختلاف کرنے کو تھا ہی کون۔ اظہار صاحب بھی اپنی ذات سے باہر نکلتے تو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے، زاہدہ بیگم آنکھیں رکھتے ہوئے بھی نابینا بنی ہوئی تھیں۔ ظہور صاحب زیادہ تر گھر سے باہر ہوتے تھے۔ کبھی دوسرے شہر تو کبھی دوسرے ملک، رہے بابا تو وہ کچھ کہنے یا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نجمہ سے بات کر کے وہ مالا کی زندگی میں مزید مشکلیں پیدا کریں، سو نجمہ بیگم کے لیے میدان صاف تھا، وہ اپنی مرضی سے حالات کو اپنے حق میں موڑتی جا رہی تھیں۔

مالا منظر سے ہٹی تو وہاب کو بھی ماہ رخ نظر آنے لگی، اب اس کا زیادہ وقت ماہ رخ کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ یہ اور بات کہ اس سارے وقت میں مالا ہی موضوع گفتگو ہوتی تھی، مالا کھلی آنکھوں سے یہ سب دیکھتی تھی، دوستی کے خوب صورت رشتے پر جو مان تھا وہ اس طرح ٹوٹا تھا کہ مالا کرچی کرچی ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں نہ حسد کا پتا تھا نہ جلن کی خبر تھی، دل میں بس اک الاؤ دہکتا تھا۔

جب وہاب سے آمنا سامنا ہوتا تو اس کا لہجہ از خود تلخ ہو جاتا، وہ چاہ کر بھی خود پر قابو نہ رکھ پاتی جس کی وجہ سے وہاب اس سے برگشتہ ہو چلا تھا اور اب اسے پروا بھی کم ہونے لگی تھی۔

قصے گھڑ گھڑ کر وہ وہاب کو سناتی، سحاب بھی اسی کی آنکھوں سے مالا کو دیکھتی تھی، شہاب من موجی بندہ تھا۔ کچھ عمر میں وہ ان سے بڑا تھا اس لیے وہ ان

معاملات سے یکسر بے پروا اور لاعلم تھا۔

مالا بچی تھی، نادان اور کم عمر...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات سے کس طرح فرار حاصل کیا جائے۔ اسے لگنے لگا تھا اس کا کوئی ہے ہی نہیں۔ پاپا کا اسے پتا نہیں تھا کہاں گئے اور ماما...... وہ بھی پتا نہیں کہاں چلی گئی تھیں۔ وہ چپکے چپکے روتی، اپنے زخم سہلاتی اور ماہ رخ کو وہاب کے ساتھ کھیلتے دیکھ کر خون جلاتی۔

پھر ان دنوں ظہور تایا غیر ملکی دورے سے گھر لوٹے تھے، انہوں نے اس کا چپ چپ رہنا اور سوچنا بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ ظہور صاحب ہی کی وجہ سے وہ نجمہ بیگم کے عتاب سے فی الحال بچی ہوئی تھی۔ ظہور صاحب میں اسے اپنے پاپا کی جھلک نظر آتی تھی حالانکہ ان کی عادات و اطوار میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن اسے عادتوں کا کیا پتا۔ اسے تو بس محبت و انسیت میں ظہور تایا میں اپنے پاپا نظر آتے تھے۔ اسے محبت سے اپنے ساتھ باہر لے کر جاتے، آئس کریم کھلاتے اور واپسی پر ڈھیر ساری چاکلیٹس لے کر دیتے۔ ظہور تایا اسے بولنے پر مجبور کرتے، اس سے باتیں کرتے، اسے پڑھنے پر آمادہ کرتے لیکن کندھے کی پشت پر ہونے والی تکلیف ازخود اس کا سر نفی میں ہلا دیتی۔

پھر انہوں نے اسے ایک راہ سمجھائی، اگر بولنے کو بتانے کو دل نہیں کرتا تو پھر لکھ دیا کرو، مجھے لکھ کر بتایا کرو کس نے میری گڑیا کو ڈانٹا، کس نے لڑائی کی، کس نے رلایا اور یہ بھی لکھنا کہ میری بیٹی کو کیا چاہیے کوئی کھلونا، کپڑے، چاکلیٹس جو دل چاہے وہ لکھ دینا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی اسے ٹھیک سے لکھنا بھی نہیں آتا تھا پھر بھی اس نے بات مان لی تھی۔

بابا کے پاس رکھے کاغذ لے کر اس نے ان ہی کے پین سے لکھنا شروع کیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ لکھا کیا جائے، اسے بہت شرم آ رہی تھی کہ وہ یہ لکھے کہ وہاب میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔ یا یہ کہ تائی نجمہ اسے مارتی ہیں، ویسے بھی اسے ڈر تھا کہ اگر وہ یہ بتا دے گی تو اسے اور مار پڑے گی۔

مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ ظہور تایا کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، پورے گھر میں بابا کے علاوہ وہی تو تھے جو اسے اس طرح پیار کرتے تھے۔ وہ روز کچھ دیر پین اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتی لیکن سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ لکھے کیا۔ اسی طرح ایک شام وہ پین اور کاغذ لیے بیٹھی تھی، بابا ٹی وی پر خبرنامہ دیکھ رہے تھے، اس نے نیوز کاسٹر کے منہ سے نکلنے والے چند جملے من و عن لکھ لیے، کچھ الفاظ اسے لکھنے نہیں آئے تھے پھر بھی اس نے جیسے تیسے لکھ لیے تھے' اتفاق وہ کاغذ بابا کے ہاتھ لگ گئے۔

"مالا یہ تم نے لکھا ہے؟"

"جی بابا۔" اسے بے حد شرمندگی ہو رہی تھی۔

"شاباش میرا بچہ! لیکن یہ جو ہے ناں......" انہوں نے ایک لفظ پر انگلی رکھی۔ "یہ ایسے نہیں لکھتے، پین لاؤ میں لکھ کر بتاتا ہوں۔" کوئی سوال جواب کیے بغیر انہوں نے اس کے اس عمل کو سراہا تھا جس سے مالا کا حوصلہ بڑھا تھا۔

"مالا میں تمہیں کتابیں لا دوں؟ اسکول نہیں جانا تو مرضی، گھر میں میرے پاس بیٹھ کر پڑھ لیا کرو۔"

"نن...... نہیں بابا...... مجھے نہیں پڑھنا، وہ تو بس......"

"مالا......" بابا نے بات کاٹی۔ "دل چاہتا ہے تو پڑھو میرے بچے، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سب ہو سکتا ہے میرے بچے! بس تھوڑی ہمت اور محنت کرو تو"...... اگر بابا اسے لکھنا سکھا دیں تو وہ تایا کو خط لکھ سکتی ہے۔ پھر ظہور تایا اس سے ناراض نہیں ہوں گے۔ یہ سوچ کر اس نے ہامی بھر لی تھی پھر بابا نے اسے سب سے چھپ کر کتابیں لا دی تھیں فارغ وقت میں بابا اسے خود پڑھاتے تھے، پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ روزانہ خبریں دیکھتے ہوئے کاغذ، قلم لے کر بیٹھتی' جو سمجھ میں آتا وہ لکھ لیتی جو نہ لکھنا آتا

پوچھ لیتی۔

جب پہلی بار ظہور صاحب نے اس کا خط پڑھا تو حیران رہ گئے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں لکھی تحریر...... ایک بھی شکوہ شکایت نہیں بلکہ اپنے متعلق تو کچھ تھا ہی نہیں۔ گزرے دنوں میں ملک میں ہونے والے کچھ واقعات، موسم کا حال اور کھیلوں کے بارے میں۔ انہیں یہ اندازہ کرنے میں مشکل پیش نہیں آئی کہ یہ خط خبرنامے کا ایک حصہ ہے، انہوں نے مالا سے کچھ نہیں پوچھا بس اسے سینے سے لگا لیا۔ مالا کو لگا ظہور صاحب کو اس کا خط اچھا لگا ہے، اس نے سوچ لیا تھا اگلی بار اس سے بھی اچھا خط لکھے گی، اسی طرح سال گزر گیا۔

مالا دن میں تائی نجمہ کے ساتھ گھر کے کام کرواتی اور دوپہر میں جب سب سو جاتے یا رات کو فارغ ہوتی تو بابا کے پاس بیٹھ کر پڑھ لیتی۔ مگر اسکول جانے کے لیے کسی طور راضی نہ ہوتی۔

اب ماہ رخ، وہاب، سحاب کو اکٹھا دیکھ کر اس کا دل نہیں کڑھتا تھا بلکہ اسے مزہ آتا تھا انہیں بے وقوف سمجھ کر۔ وہ انہیں بے وقوف ہی سمجھنے لگی تھی، وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ مالا پڑھتی ہے۔ اب تو وہ خط بھی اچھے لکھنے لگی تھی۔

آہستہ آہستہ اس نے خبریں لکھنے کے بجائے سننا اور سمجھنا شروع کر دیں اور پھر اس کے بعد وہ اپنے الفاظ میں خلاصہ کرنے لگی۔ کچھ اور وقت گزرا تو اس نے پچھلے واقعات کے تناظر میں کسی ایک خبر کو دیکھتے ہوئے اس پر اپنے الفاظ میں تبصرہ بھی شروع کر دیا۔ ازخود اس نے واقعات سیاق و سباق کے ساتھ یاد رکھنے شروع کر دیے تھے۔

یہ اس کا نواں تعلیمی سال تھا جب ظہور صاحب کو اس کے خط نے چونکا دیا تھا، اتنی کم عمر میں اتنا جامع اور موثر اظہار انہیں حیران کر گیا تھا۔ انہوں نے ایک جاننے والے کے اخبار میں وہ خط دے دیا، ذاتی طور پر دلچسپی دکھاتے انہوں نے بذات خود اخبار کے ایڈیٹر سے بات کی اور یوں معمولی سی ترامیم کے بعد اس کے خط کو ایک مضمون کی شکل میں شائع کر دیا گیا۔

بابا نے اخبار میں اس کا مضمون دیکھا تو بے حد خوش ہوئے تھے۔ خود وہ حیران رہ گئی تھی اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح سے اس کے لیے کوئی راستہ بن سکتا ہے۔ اب اس نے خط کے بجائے کالم لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ظہور تایا نے کمپیوٹر انٹرنیٹ کی سہولت مہیا کر دی تھی تاکہ وہ کالم برقی میل کے ذریعے بھیج سکے۔ وہ اس کام میں پوری طرح مگن ہو چکی تھی، وہ پوری دلجمعی سے مضمون لکھتی اور بابا کے سپرد کر دیتی۔ بابا اسے اپنے مطابق ایڈجسٹ کر کے میل کر دیتے اور باقی ایڈیٹر دیکھ لیتا۔

ان ہی دنوں اس کے نویں کے پیپرز آ گئے، اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہاں سے پیپر دینے نہیں جانا چاہتی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو اس کی پڑھائی کے حوالے سے بھنک بھی پڑے سو بابا نے اسے اس کے ننھیال بھیج دیا، حسب توقع تائی نجمہ نے خوب واویلا مچایا، انہوں نے پورے گھر میں مشہور کر رکھا تھا کہ کام میں ماہ رخ ان کا ہاتھ بٹاتی ہے اور ان کا یہ جھوٹ اس لیے چل گیا کہ زاہدہ بیگم نے کبھی ان کے معاملات میں دخل نہیں دیا تھا بلکہ وہ تو بس اپنے حصے تک محدود تھیں۔ وہاب، سحاب پڑھنے جاتے اور دیکھنے سے زیادہ وہ سننے پر اعتبار کرتے تھے۔ زاہدہ بیگم جانتے ہوئے بھی چپ رہنے پر مجبور تھیں۔ وہ نجمہ بیگم کے ہاتھوں بے عزت نہیں ہونا چاہتی تھیں، انہوں نے اپنے طور پر سحاب، وہاب کو سمجھانا چاہا تھا لیکن اب وہ سمجھنے سمجھانے کے مراحل سے نکل گئے تھے۔ مالا لاہور چلی گئی تو انہوں نے نیا ہنگامہ شروع کر دیا، اب یہ الزام انہوں نے ہی لگایا تھا کہ مالا کو علم تھا۔ ماہ رخ کے پیپرز ہیں اور اسے کام کرنا پڑے گا سو وہ لاہور چلی گئی لیکن ان کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا پھر اگلے سال بھی یہی ہوا اور ہر سال ہونے لگا تو وہاب کو بھی یقین آ گیا کہ مالا کام کی وجہ سے چلی جاتی ہے۔

جب میٹرک میں مالا کی لاہور بورڈ میں پوزیشن آئی تو بابا سب کو بتانا چاہتے تھے لیکن مالا نہیں مانی۔ وہ

چاہتی تھی زندگی میں کچھ بن جائے پھر ان لوگوں کے سامنے پورے قد سے کھڑی ہو کر ان کا حال دیکھے۔

وہ جب لاہور جاتی تو ماما بھی اس سے ملنے آجاتیں، وہ ماما سے ملنے ان کے گھر نہیں جاسکتی تھی۔ ان کے دوسرے شوہر کو اس کا وجود گوارہ نہیں تھا اگرچہ اس شوہر کی پہلی بیوی سے ایک بیٹی سارہ تھی جو عمر میں تقریباً اسی کے جتنی تھی۔ وہ ان دونوں کے ساتھ رہتی تھی، کبھی کبھی مالا دنیا کی اس منافقت پر حیران ہوتی تھی، شوہر کی پہلی اولاد تو ساتھ رہے اور بیوی کی پہلی اولاد ملنے بھی نہیں جاسکتی۔

سارہ فطرتاً نرم خو اور محبت کرنے والی تھی، ماما کے ساتھ وہ بھی آتی تھی۔ مالا سے مل کر وہ بہت خوش ہوتی تھی، جتنے دن مالا لاہور میں رہتی سارہ بھی وہیں رہتی۔ جب مالا پڑھ پڑھ کر تھک جاتی تو وہ اسے اپنے ساتھ کچن میں لے جاتی اور اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلاتی۔

اصل میں سارہ کی پوری فیملی اچھے کھانے کی شوقین تھی، ان کے گھر کی خواتین اچھے کھانے پکانے میں بھی ماہر تھیں۔ خود سارہ نے اتنی سی عمر میں جانے کس کس ادارے سے کوکنگ کورس کر رکھے تھے، وہ نہ صرف بدیسی بلکہ روایتی کھانے بھی بہت اچھے سے بناتی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر مالا کو بھی شوق ہو چلا تھا، جب وہ کچھ پکاتی تو مالا اس کے پاس رہتی۔ اس سے پوچھتی بھی اور غور سے دیکھتی بھی، سارہ کی طرح سب تو نہیں لیکن بہت کچھ وہ بنانا سیکھ گئی تھی۔

ایک بار جب گھر میں کوئی نہیں تھا۔ آدھی لائٹ غائب، بابا بے حد خوش ہوئے تھے۔ باقی بچا کھانا اس نے سلیقے سے نکال کر فریج میں رکھ دیا جب سب کی واپسی ہوئی تو فریج میں دھرا کھانا دیکھ کر تائی نجمہ فوراً اس کے پاس آگئیں تب اس نے بتایا کہ یہ کھانا اس نے خود بنایا ہے۔ کتنی دیر حیرت کے مارے وہ بول ہی نہ سکیں، انہوں نے اتنی کوشش کی تھی کہ وہ کوئی ڈھنگ کا کام نہ سیکھ سکے، کھانا بناتیں تو اسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے ادھر اُدھر بھگائے رکھتیں اسے چولہے کے پاس بھی نہ بھٹکنے دیتیں اور جب ماہ رخ کو کھانا بنانا سکھانا شروع کیا تب تو اسے کچن کے اندر بھی نہ آنے دیتیں کہ کہیں کچھ سیکھ نہ جائے اور وہ...... اتنا کچھ کب کیسے سیکھ گئی انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔

پھر انہوں نے ایک اور ڈرامہ شروع کرلیا۔ اب کھانا مالا سے پکوائیں اور لیبل اس پر ماہ رخ کے نام کا لگا دیتیں۔

مالا کو ان کی سیاست سمجھ میں آرہی تھی لیکن اب اسے فرق نہیں پڑتا تھا، اسے پتا تھا وہ کیا ہے پھر ساری دنیا اسے اپنی مرضی کی عینک لگا کر دیکھتی رہے کیا فرق پڑتا ہے۔

سردیوں کی طویل راتوں میں کسی وقت اس کی آنکھ کھل جاتی اور پھر نیند نہ آتی تو وہ ماں کو سوچنے لگتی۔ اس کا جی چاہتا تھا وہ ماما سے فرمائش کرے، ان سے لاڈ اٹھوائے، باپ کی کمی کو اس نے فراموش نہیں کیا تھا لیکن ماں کا وجود ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے نہ ہونے جیسا تھا، یہ چیز اسے اندر سے مارتی جارہی تھی۔

ماں باپ کے ساتھ چھننے والی چیزوں میں سے ایک چیز اس کا چھوٹا سا دوپٹا بھی تھا۔ وہاب نے ایک بار اس کے دوپٹے کی تعریف کی تھی، شاید وہی بات تائی نجمہ کے دل پر لگی تھی، انہوں نے اس کا دوپٹا لیا تھا پھر بڑے ہونے تک وہ اسے کپڑے، سستے اور گھٹیا ہی سہی پہلے دیتیں اور دوپٹا اپنے پاس رکھ لیتیں اور پھر آئے گئے کے سامنے اس کی بے حیائی کا رونا بھی روتیں۔

”آئے ہائے دیدوں کا پانی مرگیا، گھر میں جوان جہان لڑکے ہیں۔ مجال ہے جو دوپٹا گلے میں بھی ڈالا ہو، ایک میری ماہ رخ کبھی دوپٹا ڈھلکنے نہیں دیا۔“

”دوپٹا اگر شرم و حیا کی علامت ہے تو کبھی کسی مجبوری کے عوض کسی کی شرم و حیا کسی کے پاس گروی پڑی ہوتی ہے اور بعض اوقات گروی بھی نہیں ہوتی بلکہ اس پر زبردستی قبضہ ہوا ہوتا ہے۔“ اس نے بے لہجے میں کہا۔

بات تو ان کی سمجھ میں نہ آئی البتہ اس پر زبان درازی کا ٹھپہ لگ گیا، اسی طرح کی چھوٹی موٹی باتوں اس کے بے ضرر ردعمل کو اس کی بدتمیزی کا جامہ پہنا دیا گیا۔

وقت گزرتا رہا، زاہدہ بیگم اس کی خاموش حمایتی چشم دید گواہ راہی عدم ہوئیں۔ ان کی علالت کے دنوں میں ظہور تایا نے گھر پر وقت دینا شروع کیا تو وہاب اور سحاب کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران رہ گئے، وہ تو ان کے بچے لگ ہی نہیں رہے تھے۔ سحاب تو چلو بیاہ کر دوسرے گھر چلی جاتی لیکن وہاب کے لیے تو انہوں نے بہت پہلے مالا کا سوچ لیا تھا اور وہاب تو مالا کا نام سننے کا بھی روادار نہیں تھا، بلکہ وہ تو ماہ رخ...... ماہ رخ کی گردان کیے جارہا تھا۔

اپنی زندگی کے خوب صورت ترین خواب سے دست بردار ہونا انہیں کسی طرح منظور نہیں تھا۔ سو وہ بابا کے پاس جا پہنچے۔ وہ چاہتے تھے وہاب کو بتایا جائے کہ وہ مالا کو جو سمجھتا ہے، مالا وہ نہیں ہے۔ لیکن بابا نے انہیں منع کر دیا تھا۔

زاہدہ بیگم کی وفات کے بعد ان کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ سحاب کی شادی کے بعد گھر ان کے لیے صرف مالا اور بابا کا نام تھا۔ وہاب شروع سے ہی ان کی خصوصی توجہ حاصل کرتا رہا تھا، سو اب اسے ان دیکھے فاصلے زیادہ محسوس ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن فاصلوں کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

دوبارہ سے پاپا کا منظور نظر بننے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا؟ ان کی تقلید میں کاروبار کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ خود کو اتنا مصروف کرلیا تھا کہ اب وہ چاہتا بھی تو اپنے لیے وقت نہیں نکال پاتا تھا۔ کچھ وقت رکنے اور سوچنے کے لیے بھی اس کے پاس فرصت نہیں تھی۔ اس کے باوجود آفس میں، میٹنگ میں، راستے میں، گھر میں...... اس کے ذہن میں صرف پاپا ہوتے تھے۔ اس نے پاپا کی بے لوث محبتوں کا ذائقہ چکھ رکھا تھا۔ اسی لیے ان کی لاتعلقی اس کے لیے وبال جان بنی ہوئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر اتنا الجھا ہوا تھا کہ آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

تائی نجمہ جو بولتی تھیں، وہ سن لیتا تھا، لیکن اس کے اندر کہیں وجہ بے وجہ اختلاف موجود رہتا۔ کبھی احترام کی وجہ سے وہ چپ کر جاتا اور کبھی الجھے ذہن کے ساتھ دیکھ سن کر گونگا، بہرا بن جاتا۔ کاروبار میں دن دگنی، رات چوگنی ترقی کرنے والے کا دماغ جانے گھریلو معاملات میں کہاں چلا جاتا تھا۔ اس سب کے باوجود ایک بات اسے اچھی طرح سمجھ میں آگئی۔ پاپا، تائی نجمہ اور ماہ رخ کو پسند نہیں کرتے۔

لیکن جب پاپا نے ماہ رخ کے لیے ناپسندیدگی کے باوجود نہیں کی تو اسے احساس ہوا پاپا کے لیے اس کا وجود بھی بے معنی ہے۔ پاپا کو کوئی فرق نہیں پڑتا وہ جو مرضی کرلے یا اس کے ساتھ جو مرضی ہو۔ وہ پاپا کی خاطر ماہ رخ کے لیے انکار کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ وہ پاپا کو راضی کرنا چاہتا تھا۔ ماہ رخ کے لیے اس کے دل میں کبھی کوئی جذبہ جاگا ہی نہیں تھا اور اگر اس کے دل میں ماہ رخ کے لیے کچھ ہوتا بھی تو وہ اسے پاپا کی خوشی کے لیے دل سے ختم کر دیتا۔ لیکن پاپا کے رویے نے اسے اندر سے توڑ ڈالا تھا۔

شادی سے صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ ماہ رخ اپنے گھر سے اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ بس...... کوئی خوشی، کوئی جذبہ اسے محسوس ہی نہیں ہوا تھا۔ ہر صبح، ہر شام نجمہ بیگم کے پاس جا کر کھانا کھالیتا۔ آفس میں خود کو اتنا تھکا لیتا کہ رات بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا۔

پھر مالا کی رخصتی پر اسے ادراک ہوا کہ وہ اس کی محبت میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا ہے۔ وہ نہ پڑھی لکھی ہوتی، تب بھی...... تب بھی اسے اس لڑکی کی چاہت تھی، جسے نہ اس کی پروا تھی، نہ چاہ......

اسے پروا ہوتی بھی کیوں...... حالات کے برزخ میں وہ تنہا جلی تھی۔ اس نے جذباتی تنہائی کاٹی تھی۔ زندگی کے کھیل میں تماشا دیکھنے والا شخص اس کے لیے کیوں اہم ہوتا؟

شائق...... جب وہ ماسٹرز کے پیپرز کے بعد ظہور صاحب کے ساتھ گھر واپس آئی تو اسے پتا تھا گھر میں تائی نجمہ کا بھانجا آیا ہوا ہے، لیکن پہلی بار اسے دیکھ کر وہ حیران ضرور ہوئی تھی۔ بظاہر لاپروا، لاابالی سا وہ لڑکا جیسے زبردستی آنکھوں کے راستے اس کی ذات تک پہنچنے کی کوشش میں تھا۔ وہ ایکسپوز ہونے سے ڈر گئی تھی۔ پھر اس کی بے تکلفی...... مستزاد بابا کی شہ...... ہمیشہ کی طرح اس کی بے نیبی، اس کی نخی بن گئی، لیکن جانے کیا بات تھی، اب اس نخی میں ایک لچک تھی جو بابا نے فوراً محسوس کرلی تھی۔ جب اس کا ماسٹرز کا رزلٹ آیا تو بابا نے اس کے سامنے شائق کا رشتہ رکھا۔ وہ حیران ہوئی، جی بھر کر حیران...... بھلا ایک پڑھا لکھا خوش شکل انسان اپنے لیے ایک ان پڑھ، بدزبان لڑکی کو کیوں پسند کرنے لگا۔

کامیابی کا سن کر ہمیشہ کی طرح اسے ماما، پاپا یاد آگئے تھے۔ کیا فائدہ ایسی کامیابیوں کا جسے بندہ اپنوں سے بانٹ کر خوش نہ ہوسکے۔ اسی بات پر وہ رنجیدہ تھی، جب بابا نے شائق کے رشتے کی بات کی تھی۔ الجھی الجھی پتا نہیں کیا کچھ بول کر وہ باہر نکل گئی، لیکن شائق کا نام ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں گڑ گیا تھا۔ زندگی میں اس نے دوغلے چہروں کے علاوہ دیکھا ہی کیا تھا، جو دل میں ارمان جگاتی۔

ہاں نکاح اس نے پور رضامندی سے کیا تھا۔ زندگی جیسی بھی گزرتی، بابا تو خوش تھے نا...... تو یہ ہی کافی تھا۔ لیکن نکاح کے بعد عجیب بات ہوئی۔ شائق کراچی چلا گیا تو اسے یقین تھا وہ لوٹ آئے گا، لیکن دن پر دن گزرتے گئے، وہ نہیں آیا۔ وہ آیا تو اس سے ملاقات نہیں ہو پائی۔ دل کو عجیب سی بے چینی تھی۔ جس شخص کا وہ چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی، دل میں اس کا انتظار کروٹیں لے رہا تھا۔

وہ تو کالم بھی پڑھتا تو کیا خبریں نہیں دیکھتا ہوگا؟ تقریباً ہر ہفتے وہ کسی نہ کسی چینل پر دو ایک پروگرامز اٹینڈ کررہی تھی، تو کیا وہ دیکھ کر بھی ان دیکھا کررہا تھا؟ وہ انتظار کرتی، جھنجلاتی، غصہ کرتی اور پھر نئے سرے سے مفروضات قائم کرنے لگتی۔ تب اس پر انکشاف ہوا۔ نکاح کے چند بولوں نے اسے شائق کی محبت کا قیدی کردیا تھا اور وہ اس قید میں خوش تھی، کیوں کہ اس کا صیاد بھی اسی قفس میں تھا۔

☆......❁......☆

وہ کل ہی کراچی سے واپس آئے تھے۔ کراچی میں گزرنے والا یہ ایک ہفتہ اس کی زندگی کے سب سے خوب صورت دنوں پر مشتمل تھا۔ اس نے زندگی میں محبت اور چاہت کے رنگ محسوس کیے تھے۔ وہ جو زندگی کو یک رنگی تصویر سمجھی بیٹھی تھی، اتنے انوکھے اور خوب صورت رنگوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ شائق کو تو اس کا اقرار ہی مالا مال کرگیا تھا۔ اب کل ان کی ریسپشن کی تقریب تھی اور آج ماہ رخ نے ایک بچی کو جنم دیا تھا۔ وہ اسپتال جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن بابا کے مجبور کرنے پر اسے جانا پڑا۔ یوں بھی شائق کے ناتے اس کا ایک اور رشتہ بن گیا تھا۔ کچھ سوچ کر اچھے سے تیار ہوکر وہ شائق کے ساتھ اسپتال چلی گئی۔

شائق باہر وہاب کے ساتھ کھڑا تھا، وہ اندر چلی گئی۔ نجمہ بیگم ایک طرف بیڈ پر نیم دراز اونگھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر ماہ رخ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ جیسے اسے اس کی یہاں موجودگی کا یقین نہ ہوا اور اس کا اظہار بھی اس نے کردیا۔

''مجھے نہیں لگا تھا کہ تم آؤ گی۔''

''کیوں؟ میرا آنا منع ہے؟'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ یہ ہی لاپروائی تو اس کی ذات کا خاصہ تھی۔

''نہیں...... تمہارے ساتھ بھی کچھ اچھا کیا جو نہیں جو امید رکھتی۔'' شکست اس کے لہجے، اس کی باتوں سے عیاں تھی۔ چاہ کر بھی مالا کوئی جواب نہیں دے سکی۔

''بہت خوش ہونا؟''

''ہوں......''

''ہونا بھی چاہیے۔ بھلا حق دار کو اگر اللہ کی ذات حق دے تو کون چھین سکتا ہے؟''

مالا کو اس کی باتیں عجیب لگ رہی تھیں۔ انسان کے ناتے وہ اپنی بڑائی، احساس برتری ظاہر کرنے آئی تھی، جب کہ اب اسے سب فضول لگ رہا تھا، بلکہ اسے ماہ رخ کی باتوں سے الجھن ہورہی تھی۔

''مجھے محبت کا نہیں پتا تھا۔ بس وہاب کو تمہارے ساتھ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔ میں عام سے خدوخال کی مالک تم جیسی پری کے سامنے وہاب کو کیا نظر آتی؟ میں خود کو اونچا نہیں کرسکتی تھی، اس لیے جب موقع ملا تمہیں نیچا کر کے اونچی ہوگئی۔ وہاب کی نظروں کے سامنے...... میں نے ہر طرح سے اپنا ظاہر سنوارا، تاکہ اس کی نظر کچھ اور نہ دیکھ سکے۔

آج اتنے سالوں بعد مجھے یہ قبول کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں کبھی اسے نظر ہی نہیں آئی۔ جس طرح میں ناسمجھی میں اس کی محبت میں مبتلا تھی۔ اسی طرح ناسمجھی میں وہ بھی بدتمیز، بدزبان، بے حیا اور جاہل مالا کی محبت میں مبتلا ہے۔ ہاں ہے۔'' ہے پر اس نے خاصا زور دیا۔

''امی کی کوئی چال، میری کوئی ادا اسے میرا نہیں کرسکی۔ تمہارے پکائے کھانوں پر واہ...... واہ سمیٹتے میں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ مجھے نہیں تمہارے ہنر کو، تمہیں سراہ رہا ہے۔ یقین کرو میں نے بہت کچھ سیکھا اور بنایا، لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ ثابت ہوا یہاں بھی بنا سامنے آئے، تم جیت گئیں مالا۔ زندگی کا ہر کھیل تم جیت گئیں۔''

''جس کھیل کی تم بات کررہی ہو، میں نے کبھی اس میں حصہ نہیں لیا۔ یہ یک طرفہ مقابلہ تھا۔ تم نے خود ہی اپنے آپ کو ہلکان کرلیا۔'' اس نے بات کاٹی۔

''میں وہاب سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرا اور اس کا جو بے نام تعلق تھا، میں اسی میں خوش رہ لیتی کہ میری اچھائی کا کچھ بھرم رہ جاتا، لیکن میں پھر دھوکا کھا گئی۔ شائق نے تمہیں چن لیا۔ آج نہ وہاب میرا ہے، اور نہ...... لیکن ایک بات کہوں مالا......! میں نے وہاب کو بہت چاہا ہے، بہت زیادہ...... تکلیف یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ وہ تمہیں چاہتا ہے۔ اس کی

چاہت کے آگے میری چاہت بالکل بونی سی ہو گئی ہے۔ میں جانتی ہوں، محبت بھیک یا خیرات نہیں، لیکن پھر بھی میں مانگ رہی ہوں۔ مالا مجھے وہاب کی محبت، توجہ دلا دو۔ اب وہ میرا محبوب نہیں، میرا شوہر، میری بچی کا باپ ہے۔" وہ رونے لگی۔

مالا کے دل پر بوجھ آن گرا۔ تب ہی نجمہ بیگم کی آنکھ کھل گئی۔

"کیا کہہ دیا میری بچی کو؟ رو، رو کر ہلکان ہو رہی ہے؟ تیرا تو سایہ بھی منحوس ہے۔" اٹھتے ہی انہوں نے مالا کو کوسنا شروع کر دیا۔

"اپنی بیٹی کا نام مالا رکھ لینا۔" کہہ کر ہینڈ بیگ اٹھا کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ پیچھے نجمہ بیگم کے تیز تیز بولنے کی آواز آتی رہی۔

کوریڈور میں وہاب اکیلا کھڑا تھا۔ اس نے فون نکال کر شائق کا نمبر ڈائل کیا۔

"آ گئی ہوں باہر چلیں۔" مختصر بات کر کے فون اس نے بیگ میں ڈال دیا اور وہاب کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"اللہ نے تمہیں بیٹی کے روپ میں دوبارہ مالا عطا کی ہے۔ ہو سکے تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کرنا۔ بچے اکثر بلاوجہ ماں، باپ کی سزائیں وراثت میں پا کر دکھوں کے حصے دار بن جاتے ہیں۔" شائق کو سامنے گاڑی میں دیکھ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔

وہاب نے گہرا سانس بھرا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے فضا میں سے آکسیجن کھینچ لی ہو۔ وہ ماہ رخ سے کھانے کا پوچھنے گیا تھا۔ جب ماہ رخ کے اعتراف نے اسے پستیوں میں دھکیل دیا تھا۔ وہ مہرہ بنا رہا اتنے سال۔

☆......❁......☆

"یہ آپ کو خبر نامہ، ٹاک شوز دیکھنے کا کب سے شوق ہوا؟"

صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے حماد نے ریموٹ سے آواز کم کی۔

منزہ بیگم کی آنکھوں میں عجیب سا اطمینان اور ہونٹوں پر بڑی بھلی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ کیا بتاتیں کہ ان کی جس بیٹی کا انہیں اس گھر کی چار دیواری میں ذکر کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ جس کا یہاں نام لینا گناہ...... اسی ٹی وی اور نیوز چینل ٹاک شوز کی بدولت ان کی بیٹی کی آواز پورے گھر میں گونجتی ہے۔ وہ اپنے ذاتی بیڈ روم میں ہوں، لاؤنج میں یا کچن میں...... ہر جگہ اسے سن سکتی ہیں۔ دیکھ سکتی ہیں۔ اس کی موجودگی اپنے آس پاس محسوس کر سکتی ہیں۔ ان کی آرزو اس طرح پوری ہو رہی تھی۔ وہ کیا بتاتیں۔ خاموشی سے مسکراتی چلی گئیں۔

پانی کا گلاس ان کے ہاتھ میں دے کر وہ سبزی کی ٹوکری گود میں لے کر بیٹھ گئیں۔

"سارہ کہاں ہے؟"

"پارلر تک گئی ہے۔ جا نہیں رہی تھی، زبردستی بھیجا ہے۔" اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

"میں فرنیچر دیکھ آیا ہوں، باقی عورتوں کی اپنی پسند ہوتی ہے، پھر سارہ تو ہے بھی کافی سلیکٹو نیچر کی، آپ اسے ساتھ لے جائیں، تاکہ وہ خود بھی پسند کر لے۔"

"جی بہتر۔" آج کل میں برائیڈل ڈریس کے لیے جانا ہے تو فرنیچر بھی دیکھ آئیں گے۔"

"چلو جیسے مناسب سمجھو۔" کہہ کر وہ پھر شو میں مصروف ہو گئے۔

سارہ کے لیے انہوں نے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک قریبی دوست کے بیٹے کا رشتہ منظور کر لیا تھا۔ وہ چونکہ بیرون ملک ہوتا تھا تو شادی اس کے آنے پر طے پائی تھی۔ اب وہ آ چکا تھا اور شادی ٹالنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی، سو انہوں نے اللہ کا نام لے کر ہامی بھر لی تھی۔ اکلوتی بیٹی کی شادی تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی کمی، کوئی ارمان رہ جائے، اس لیے زور و شور سے تیاریاں جاری تھیں۔

"ایک بات تو بتائیں منزہ بیگم۔"

"جی پوچھیں۔"

"اپنی بیٹیاں، اپنی جان کے ٹکڑے کسی کو سونپ دینا کتنا مشکل ہوتا ہے؟" ان کی بات پر منزہ بیگم مسکرائیں۔ سارہ میں ان کی جان تھی، وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

"کتنا بھی مشکل ہو، والدین کو حوصلہ تو کرنا پڑتا ہے، ہے نا۔"

"مجھ سے نہیں ہو رہا یہ حوصلہ۔"

"کسی سے بھی نہیں ہوتا۔ ساری دنیا کے والدین اپنی بیٹیوں سے اسی طرح بے محبت کرتے ہیں، سوائے چند نامرادوں کے، لیکن پھر بھی یہ حوصلہ کرنا پڑتا ہے۔"

"تو بتائیں، آپ نے یہ حوصلہ کیسے کیا تھا؟"

غیر متوقع بات تھی۔ چھری منزہ بیگم کی انگلی کاٹ گئی۔ اس زخم سے زیادہ تکلیف ان کے دل میں جاگی تھی۔ سلوٹ مائل ہاتھوں پر آج بھی معصوم بچی کے ہاتھوں کا لمس زندہ تھا۔ وہ اسے روتے بلکتے ہوئے چھوڑ آئی تھیں۔ جب بھی امی کے گھر میں اسے دیکھتیں، ان کا دل جلتا۔ اس کا پہناوا اس کا رنگ روپ، اس کی ایک ایک بات اس کے حالات کا بتا دیتی۔ کوئی اس بچی کا درد نہیں جان سکتا تھا۔ سوائے ان کے۔ پہلے پہل وہ ان کے چھوڑ آنے پر روتی تھی۔ پھر اس نے سمجھوتا کر لیا۔ اپنی ماں کی مجبوریاں وہ اتنی چھوٹی سی عمر میں سمجھنے لگ گئی۔ یہاں تک کہ سارہ کو ان کے ساتھ دیکھ کر بھی اس نے شکایت نہیں کی، بلکہ سارہ کی طرف محبت کا پہلا قدم بھی اسی نے بڑھایا تھا۔

اپنی اس صابر بچی کے لیے ان کا دل اتنا جلا تھا کہ باقی کا کوئی دکھ انہیں دکھ لگا ہی نہیں اور آج اس دوری کی وجہ بننے والا، وہ شخص ان سے پوچھ رہا تھا، حوصلہ کیسے کیا جائے؟

ان کی آنکھوں سے دل کا لہو بہنے لگا تھا۔ شادی کی رات ان کی کہی چند باتیں انہیں عمر بھر کے لیے کافی تھیں۔

"میرے جیسے مرد کے لیے کسی دوسرے مرد کی عورت کو قبول کرنا آسان نہیں، لیکن میں اپنی بیٹی کی وجہ سے مجبور ہوا ہوں۔ چاہتا تو کنواری بیاہ لاتا، لیکن میں سارہ کے علاوہ مزید اولاد نہیں چاہتا اور ایک کنواری لڑکی کے ارمان روندنے کا، اس کے ماں بننے کے حق کا استحصال کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔ میں بے وجہ بددعائیں نہیں لینا چاہتا۔ آپ سے صرف ایک گزارش ہے کہ سارہ کے سامنے اپنی اولاد کا ذکر بھی نہیں کرنا اور خود مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں، نہ میں یہ دردِ سر پالنا چاہتا ہوں۔ باقی آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

منزہ بیگم کے آنسو آنکھوں میں ہی جم گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی زبان پر مالا کا نام حرام کر لیا تھا۔ امی کے گھر اگر مالا سے ملتیں بھی تو اس کا نام نہ پکار پاتیں۔ سارہ جانے کب ان کی محرم راز بنی۔ انہیں کچھ معلوم نہیں، انہیں بس اتنا پتا تھا کہ سارہ نے حماد کے سامنے کبھی مالا کا ذکر نہیں کیا۔ اس گھر میں مالا کا نام لینا حرام تھا اور آج حرام کرنے والا خود اس کا ذکر چھیڑ رہا تھا، ان کے آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔

☆......❁......☆

"اچھا بابا! چلتی ہوں، دعا کیجیے گا۔" جھک کر اس نے بابا کے ہاتھوں پر بوسہ دیا۔

"اب صرف دعا ہی تو کرتا ہوں۔" خوش دلی

سے جواب دے کر انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ جانے کے لیے مڑی اور وہیں پتھر بن گئی۔ چہرے پر حقیقی خوشیوں کا عکس لیے منزہ بیگم اس کے مقابل کھڑی تھیں۔ اس نے بابا کی طرف دیکھا اور آہستہ سے چلتے ہوئے فاصلہ سمیٹا۔

”ماما! آپ سچ میں آئی ہیں۔“ ان سے لپٹی وہ خوشی سے کہہ رہی تھی۔ ان کے پیچھے سارہ کھڑی تھی۔ مالا نے بڑی محبت سے اسے گلے لگایا تھا۔ ان کے ساتھ موجود تیسرے فرد کو دیکھ کر اسے لگا شاید وہ واقعی خواب دیکھ رہی ہے۔ حماد اور اس گھر میں؟ خواب میں ہی ہو سکتا تھا۔

”اپنے پاپا کو دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی؟“ انہوں نے بانہیں پھیلائیں تو جھجکتی وہ ان کے گلے جا لگی۔ وہ اس کے پاپا نہیں تھے، پاپا کی جگہ تھے اور جگہ پر ہونے کا مطلب وہ جانتی تھی۔ اسے حماد کی ویسے ہی عزت کرنی تھی جیسے وہ اپنے پاپا کی کرتی تھی لیکن کبھی اظہار کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

حماد نے محبت سے اس کے سر پر بوسا دیا۔ اب انہیں منزہ بیگم کی خبروں اور ٹاک شوز سے دلچسپی سمجھ آرہی تھی۔ اس چھوٹی سی لڑکی کو اس کے حالات نے وقت سے پہلے بڑا کر دیا تھا ورنہ جس طرح وہ باوقار گیٹ اپ میں ان کے سامنے کھڑی تھی، سارہ اس عمر میں بھی رنگوں اور تتلیوں سے کھیلتی تھی۔ وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ بن ماں، باپ کی بچی نے کیسا بچپن گزارا ہوگا۔ انہوں نے سوتیلی ماؤں کے بچوں سے سلوک کے قصے سن رکھے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں آنے والی منزہ اپنی پہلی اولاد کے لیے ان کی اولاد سے زیادتی کریں، سو انہوں نے پہلی رات ہی ان کی حدود متعین کر دی تھیں اور آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ظلم اگر سارہ کے ساتھ انہوں نے ہونے نہیں دیا تو مالا کے ساتھ ظلم کرنے والے وہ خود تھے۔ وہ خود کو مجرم تصور کر رہے تھے، ایک ماں کا، ایک بیٹی کا اور اسی وجہ سے انہوں نے نہ صرف منزہ بیگم سے معافی مانگی تھی بلکہ انہیں خود یہاں لے کر آئے تھے۔

”مجھے معاف کر دینا بیٹی۔“ ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں پاپا۔“ وہ جلدی سے ان سے الگ ہوئی۔ ”جو ہوا سو ہوا، اب بھول جائیں اور دل پر بوجھ نہ لیں۔“ بڑے مان سے اس نے پاپا کہا تھا۔

”مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ میڈیا کے آسمان پر ایک دم سے چمکنے والا روشن درخشاں ستارہ میری اپنی بیٹی ہے۔“ کمرے میں موجود تمام افراد اس بات پر مسکرائے تھے۔

تھوڑی دیر میں بابا کے علاوہ وہ سب شائق اور مالا سمیت منزہ کے گھر کے لیے نکل گئے تھے۔ خوشی سے تمتماتے چہرے لیے انہیں جاتا دیکھ کر وہاب ایک پتھر کے بت کی مانند کھڑکی میں کھڑا رہ گیا تھا۔ جن کا ہونا بہت عام اور معمولی بات ہو، ان کی غیر موجودگی اکثر غیر معمولی ہوتی ہے۔ اسے بھی اپنا آپ خالی لگنے لگا تھا، سود و زیاں کے حساب سے تھک کر وہ پلٹا تو پاس ظہور صاحب کھڑے تھے جانے کب سے...... جب مالا جا رہی تھی شاید تب سے......

”وہ چلی گئی پاپا۔“ اس نے شکستگی سے کہا۔

پاپا سمجھ گئے تھے، وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔“ انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بے ساختہ ان کے گلے جا لگا۔ ان کی اپنی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا تھا، اگر انہیں خبر ہوتی تو وہ مالا کو شائق کو نہ سونپتے۔ خود وہاب پر اس کی محبت دیر سے کھلی تھی۔ دیر تک ان کے سینے سے لگے رہنے کے بعد وہ اندر پلٹ گیا۔ یہ ہی اس کا نصیب، یہ ہی اس کی زندگی تھی۔

ماہ رخ سامنے بیٹھی بچی کو فیڈر پلا رہی تھی۔ پاس جا کر اس نے نرمی سے اس گڑیا کو اٹھا لیا۔ ماہ رخ حیران ہوئی تھی تو کیا اس کا دل واقعی پھر گیا۔ کمرے سے بچی کو باہر لے کر نکلتے اس نے محبت سے سرگوشی کی۔ ”میری مالا۔“

☆



ماریہ یاسر

کھٹاس

”آخر کب لے کر دیں گے نیا صوفہ سیٹ اور فریج۔ کب سے آپ کو بول رہی ہوں کہ پرانا صوفہ اتنا خراب ہو گیا ہے، سارا کلر اترتا جا رہا ہے اور جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا ہے۔ فریج بھی اتنا پرانا ہو گیا ہے۔ بابا آدم کے زمانے کا لگتا ہے صوفہ اور فریج، کوئی مہمان آجائے تو اتنی شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ آپ کو کیا فکر آپ تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔“

زرتاج بیگم نے آج امجد صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا۔

”بس بیگم!“ ”بس!“ ”اگلے ہفتے کمیٹی کھلے گی سب سے پہلا کام یہ فریج اور صوفہ کا کروں گا پکا۔“ امجد صاحب نے ڈھیلے انداز میں بیگم کو تسلی کروائی۔

”ایک مہینے سے یہ ہی کہہ رہے ہیں اگلا ہفتہ، اگلا ہفتہ پر وہ اگلا ہفتہ آ ہی نہیں رہا۔ ارے میں کہتی ہوں کہ کیا ضرورت تھی وفا کو سترہ ہزار کا موبائل اور اناتیس ہزار کا ٹیبلیٹ دلانے کی وہ کون سی بزنس وومین ہے کہ ان سب چونچلوں کے بغیر گزارا نہ ہوتا۔ اتنے پیسوں میں فریج، صوفہ آرام سے آجاتا۔“ زرتاج بیگم نے دہائی دی۔

”ارے بس بھی کرو، بیگم! خوامخواہ پیچھے مت پڑ جایا کرو۔ اکلوتی بیٹی ہے میری اگر کوئی فرمائش کرتی ہے تو اس کو پورا کرنا میرا فرض ہے۔ اگر موبائل اور ٹیبلٹ لے کر دے دیا تو کیا حرج ہے، اٹھارہ سال کی ہو گئی ہے ماشاءاللہ۔ دوستوں کے پاس ایسی چیزیں

دیکھتی ہوگی تو اس کا دل بھی کرتا ہوگا اور میں نے تمہیں کہا ہے ناں کہ اگلا ہفتہ پکا۔" امجد صاحب نے کہہ کر بات ہی ختم کردی۔

☆☆☆

"صفدر! تم آدھے گھنٹے تک میرے یہاں آجاؤ مل کر بازار جاتے ہیں۔" میں نے صوفہ اور فریج خریدنا ہے۔" زرتاج بیگم نے اپنے چھوٹے بھائی کو فون کرکے آنے کا کہا۔

اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد صفدر وہاں موجود تھا۔

"باجی! آپ تو اگلے ہفتہ کا کہہ رہی تھیں کہ امجد بھائی کی کمیٹی کھلے گی۔ یہ آج اچانک کیسے مل گئی بھائی کو کمیٹی۔" صفدر نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"ارے کہاں امجد نے تو لٹکا رکھا۔ یہ تو جو میں نے تھوڑا بہت بچا کر رکھا تھا خرچے سے، اس میں اپنی کمیٹی کے پیسے ڈال کر لا رہی ہوں دونوں چیزیں۔"

زرتاج بیگم نے چادر اوڑھتے ہوئے کہا "وفا آکر دروازہ بند کرلو، ہم نکل رہے ہیں اور سارا ٹائم موبائل میں مت گھسی رہنا، کھانے کا بھی انتظام کرلینا۔"

زرتاج بیگم کے پکارنے پر وفا جو موبائل پر چیٹنگ میں مصروف تھی بے دلی سی اٹھی۔

☆☆☆

چار گھنٹوں کی خواری کے بعد زرتاج بیگم جب صوفے اور فریج کے ساتھ گھر واپس آئیں تب تک امجد صاحب بھی آفس سے واپس آچکے تھے۔ بیگم کو سامان کے ساتھ دیکھ کر حیرانی سے بولے۔

"ارے بیگم! تم یہ کیسے خرید لائیں تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے۔"

"خرید کے نہ لاتی تو کیا کرتی، پتا بھی ہے کہ پرانا کتنا خراب ہوگیا ہے، کسی آئے گئے کے سامنے کتنی شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے مجھے اور آپ خوش مت ہوں کہ میں سامان لے آئی تو آپ کی کمیٹی بچ گئی۔ یہ تو جو میں نے تھوڑا بہت بچا کر رکھا تھا وہ کام آیا۔ اب آپ کی کمیٹی سے میں نے اپنے لیے کنگن بنوانے ہیں۔ آخر سمعیہ بھابھی کو بھی پتا چلے کہ میں اتنی گئی گزری بھی نہیں۔ اگر وہ چوڑیاں پہن کر مجھے جلا سکتی ہیں تو میں ان کو جلانے کے لیے کنگن بنواؤں گی۔"

زرتاج بیگم نے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے وفا کو آواز لگائی۔

"کب سے کہہ رہی ہوں وفا! مجھے ٹھنڈا پانی پلادو اور ماموں کے لیے چائے بناؤ کب سے صوفہ سیٹ کرنے میں لگا ہے بے چارہ پر تمہیں اس موبائل سے فرصت ملے گی تو ہی اٹھو گی۔"

"بیگم میں نے سوچا کہ چلو صوفہ فریج تو آگیا اب میں کمیٹی سے قربانی کرلوں گا پر تم نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔ آخر قربانی بھی تو کرنی ہے۔ بقرعید میں صرف بیس دن رہ گئے ہیں۔" امجد صاحب نے رسان سے سمجھایا۔

"امجد صاحب! میں نے کہہ دیا کہ اب میرے ساتھ دھوکا مت کیجیے گا۔ کمیٹی میں سے تو میں کنگن ہی بنواؤں گی۔ اور قربانی کا بعد میں دیکھا جائے گا۔ ابھی سے فکر مت کریں۔" زرتاج بیگم نے ٹھنڈے شربت کا گھونٹ بھر کر شوہر کو ٹوکا۔

☆☆☆

"زرتاج! بہت مبارک ہو آپ کو فریج اور صوفہ سیٹ تو بہت پیارے لے کر آئی ہیں آپ فریج تو بہت ہی کشادہ ہے۔ اچھا ہے آپ کو سہولت رہے گی۔ قربانی کا گوشت بانٹنے کے بعد آرام سے اپنے لیے سنبھال کر ایک آدھ مہینہ استعمال کرسکیں گی۔ ورنہ اس گرمی میں تو گوشت ایک دن میں خراب ہوجائے۔"

راحیلہ جو زرتاج کی پڑوسن تھی کھلے دل سے مبارک دیتے ہوئے کہنے لگی۔ زرتاج بیگم جو چائے منہ لگانے ہی والی تھیں فوراً بول اٹھیں۔

"ارے کہاں یار، قربانی کی گنجائش کہاں ہے اب، اتنا خرچا ہوگیا ہے صوفہ اور فریج پر، اس سے پہلے امجد صاحب نے تقریباً چالیس، پچاس ہزار کا موبائل اور ٹیبلٹ وفا کو دلا دیا۔ بس امجد صاحب کی کمیٹی ہی تھی جس سے میں کل یہ کنگن خرید لائی۔"

زرتاج بیگم نے اپنے دونوں ہاتھ لہرائے جن میں دو خوب صورت کنگن لشکارے مار رہے تھے۔

"بہت خوبصورت کنگن ہیں زرتاج، پر آپ یہ قربانی کے بعد بھی لے لیتیں۔ قربانی تو فرض ہے۔ ہمارا دینی فریضہ ہے۔ ان سب چیزوں کے بغیر تو گزارا ہو ہی جاتا ہے پر قربانی تو ضروری تھی۔" راحیلہ نے نیک نیتی کے ساتھ پڑوسن کو سمجھایا۔

"ارے یار! قربانی بھی کرلیتے اگر یہ خرچے نہ آجاتے اور کنگن کا تم جو کہہ رہی ہو کہ بعد میں بھی لے لیتی تو اس کے پیچھے بھی کوئی بات ہے۔ یار وہ میری سمعیہ بھابھی کو تم جانتی ہو ناں۔ وہ اپنی بارہ عدد سونے کی چوڑیوں پر بڑا اتراتی ہیں۔ میں جب بھی امی سے ملنے جاتی ہوں تو بہانے بہانے سے مجھے چوڑیاں دکھاتی ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ کنگن لے لوں تاکہ میرا پلڑا بھاری ہوجائے۔ پرسوں جب میں امی کے گھر گئی تو میں نے بھی خوب جلایا سمعیہ بھابھی کو، وہ تو جیسے جل کر کوئلہ ہی ہوگئیں۔"

"اور قربانی کا کیا ہے اس سال نہ کرسکے تو اگلے سال کرلیں گے۔ اور یار قربانی کس نے دیکھنی ہے۔ پر یہ سب چیزیں تو ضروری ہیں ناں، قربانی کرنے کے لیے زندگی پڑی ہے۔ رہی بات گوشت کی تو وہ امی کے گھر سے ہی اتنا آجاتا ہے کہ یہ فریج بھر جائے گا۔"

زرتاج بیگم نے پرجوش لہجے میں کہتے ہوئے نئے فل سائز فریج کی طرف دیکھا۔

"اچھا زرتاج! میں چلتی ہوں مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے پھر آؤں گی۔" راحیلہ زرتاج کی سوچ سن کر بے دلی سے چائے ادھوری چھوڑ کر اٹھ گئی۔

"ارے ایسے کیسے چائے تو پی لو اور جاتے ہوئے فش بریانی لیتی جانا میں نے ابھی نئی ریسپی ٹرائی کی ہے۔" زرتاج بیگم کے پکارنے کے باوجود راحیلہ پھر کبھی سہی کہہ کر تیزی سے نکل گئی۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر بھی راحیلہ کا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسی خود ساختہ ضروریات ہیں جنہوں نے فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالی ہوئی ہے۔ زندگی کی ضروریات تو کبھی نہ ختم ہونے والی ہیں۔ ہر انسان ان کو پورا کرنے میں ہلکان ہوئے جارہا ہے اور فرائض کی ادائیگی سے غافل۔

ایک انسان جو ہر لحاظ سے پرآسائش زندگی گزار رہا ہے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، اچھا اوڑھنا، بہتر سے بہترین کی تلاش میں سرگرداں، لیکن جب بات آتی ہے دینی فرائض کی ادائیگی کی تو دل کو بہلانے کے لیے سو بہانے تراش لیتا ہے۔

☆

تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگاہ سے محبت ہوجاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگاہ کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہوجاتی ہے۔

طلال اور مہر ماہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہر ماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کرلیا جاتا ہے۔

مبین آفندی، آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کردیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلالیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا خان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کردیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں۔ تائی جان، مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیتے ہیں، ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگاہ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

عفت سحر طاہر

زرنگار کی کہانی جان کر مہر ماہ آفندی ہاؤس والوں کی بے حسی اور تکبر پر دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ موحد کو بلا کر اس سے بات کرتی ہے۔

موحد ملاحہ کے لیے رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔ تو ملاحہ بہت افسردہ ہوتی ہے۔ وہ کبیر کو چاہتی ہے۔ موحد اسے بتاتا ہے کہ کبیر گھر چھوڑ گیا ہے اور اس نے آفس سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات بھی چرالیے ہیں۔

نمیر آفندی مہر ماہ کو راستے میں ملتا ہے۔ وہ اسے جھڑک کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

موحد ملاحہ کے لیے جو رشتہ لاتا ہے۔ ان کی شان وشوکت دیکھ کر سائرہ چچی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ جبکہ ملاحہ شدید پریشان ہے۔

کبیر کے گھر میں ملاحہ کا شان دار استقبال ہوا۔ کبیر کی بہنوں نے کبیر کے منع کرنے کے باوجود اس سے مختلف نیگ کی رقم بٹوری۔

صدیقہ بیگم کا صدمہ کسی طور پر کم نہیں ہورہا تھا اگلی صبح مہر ماہ حیران رہ جاتی ہے جب موحد، ملاحہ کے گھر لے جانے کے لیے ناشتہ کا بہت سا سامان لے کر آتا ہے۔ صدیقہ بیگم کو جب پتا چلتا ہے کہ وہ بہت ناراض ہوتی ہیں اور ناشتے کا منع کرتے ہوئے ـــــ ولیمے میں بھی شرکت کا منع کردیتی ہیں جس پر موحد انہیں بتاتا ہے کہ پورا خاندان ولیمے میں مدعو ہے۔

مہر ماہ موحد کے ساتھ ناشتہ لے کر جب ملاحہ کے گھر پہنچتی تو ملاحہ کو خوش دیکھ کر مطمئن ہو جاتی ہے۔ خاندان کے خوف سے سب ولیمے میں شرکت کرتے ہیں۔

طلال اور تزئین میں صلح ہو جاتی ہے۔ مہر ماہ کے پاس نمیر آفندی کا خون آتا ہے۔

آغا جان صدیقہ بیگم سے کہتے ہیں کہ ملاحہ کو بلاؤ وہ کئی دن سے میری خیریت پوچھنے نہیں آئی۔

موحد، ملاحہ کو آغا جان سے ملنے کے لیے بلا لیتا ہے اور آغا جان کو ڈرائنگ روم میں لے آتا ہے۔

اٹھائیسویں اور آخری قسط

اے میرے دل!!!
درد کی لے دھیمی رکھ
آج پھر رقصاں ہیں سلگتی یادیں
سر دشت جاں، کسی وحشت کی طرح
پھر ٹکرایا ہے فصیل جاں سے
کسی گم گشتہ محبت کا جنوں
دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے
انا کا بے جان وجود
ایک ہارے ہوئے لشکر کے سپاہی کی طرح
میں چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا ہوں
پھیلے ہوئے ہر طرف تباہی کے مناظر
اے میرے دل! درد کی لے دھیمی رکھ
اے میرے دشمن جاں!!!
مجھے جینے دے

(شاہین کاظمی)

"مہر"...... وہ جو اس پر بھڑک رہا تھا مہرو کے بے سدھ وجود کو ہاتھوں میں پھسلتے دیکھ کر اس کا سارا غصہ پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ فوراً اسے سنبھال کر پاس پڑے اسٹول پر بٹھایا۔

"مہر...... ہوش کرو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" وہ اس کا سر سہلاتے ہوئے اس کے شانوں کے گرد دوسرا بازو دراز کیے تھوڑا سا جھک کر تشویش بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مہرو کراہی، چکراتا ہوا سر نمیر کے شانے سے ٹکا ہوا تھا۔

"آئی ایم سوری...... ریئلی سوری" اس کا غصہ مکمل طور پر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مہر ماہ کی حالت نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھی۔ اتنے دنوں کا ذہنی دباؤ اس نازک سی لڑکی کے اعصاب کا امتحان ہی تو تھا۔ اس کی طبیعت ذرا سنبھلتی دیکھ کر نمیر نے پانی کا گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ لو پانی پیو۔"

"زہر بھی ڈال دو اس میں تھوڑا سا۔" اس کے ہاتھ کو پرے جھٹکا تو پانی چھلک گیا۔ اس کا لہجہ کمزور مگر تلخ اور بھرایا ہوا تھا۔ نمیر نے لب بھینچے پھر گلاس میز پر رکھتے ہوئے اسٹول گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھا۔

"تم تو ایسے مت کرو!"

"ہاں! دنیا بھر کو اجازت ہے کہ وہ مہر ماہ آفندی کو ٹھوکروں میں اڑا دے اور وہ اف بھی نہ کرے۔" مہر ماہ کو رونا آرہا تھا اور وہ رو بھی پڑی۔

"ٹھوکروں میں اڑا کر دنیا ازالہ کرنے کی فکر میں دبلی نہیں ہوتی۔ مگر مجھے اپنی زیادتیوں کا اعتراف ہے۔ کہو تو معافی نامہ لکھ دیتا ہوں تمہارا دل دکھایا۔ لیکن اس نکاح پر معافی نہیں مانگوں گا۔"

"معافی مانگنا بھی مت.... کیونکہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرنے والی۔" وہ غرائی تھی۔

"کہا تو تھا مت معاف کرنا.... ساری عمر میرے ساتھ رہ کر سزا دیتی رہنا۔" وہ ترنت بولا

"اب جو بھی فیصلہ ہوگا وہ آغا جان کریں گے۔ میں تمہارا مقدمہ لڑ کر فیصلہ ان پر چھوڑ آئی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دماغ ابھی بھی سنسنا رہا تھا۔ یہ شخص سامنے آتا تو اس کی تمام زیادتیاں یاد آنے لگتیں۔ آنکھ سے اوجھل ہوتا تو ایک وہی سب سے زیادہ مظلوم اور قابل ہمدردی لگتا تھا۔

"گولی مار دوں گا تمہیں مہر ماہ! مگر طلاق نہیں دوں گا یہ بات اپنے آغا جان کو بھی بتا دینا اور تم بھی یاد رکھنا۔" وہ اس کے مقابل کھڑا ہوا اور دانت پیس کر سرد مہری سے بولا۔

"جاؤ نا...... جا کر آغا جان کے سامنے اپنا مقدمہ لڑو۔ اتنا ہی شوق ہے اس نکاح کو نبھانے کا تو بڑوں کی رضامندی لے کر آؤ۔ ایسا کون سا اچھا سلوک کیا ہے تم نے میرے ساتھ کہ میں کہانی کے اینڈ میں ہنسی خوشی تمہارے ساتھ چل پڑوں۔" اس کی رنگت غصے سے لال ہو رہی تھی۔ نمیر نے بے اختیار اسے شانوں سے تھام لیا تو ایک دم اس کی زبان کو بریک لگے۔

"ہاں...... بہت شوق ہو رہا ہے اس نکاح کو نبھانے کا۔ کبھی یہ بھی سوچو کہ میں اس قدر تمہارے قابل تھا کہ اللہ نے دو بار تمہیں میرے ہی نکاح میں دیا۔ میرا طریقہ غلط سہی مگر نیت صاف ہے مہرو! تم سے علیحدگی...... ناممکن..... کبھی نہیں۔ دنیا کی کسی بھی عدالت میں مقدمہ چلے میں تمہیں جیت لاؤں گا۔" وہ ہٹیلے سرد لہجے میں بولا تو نجانے مہر ماہ کو کیوں لگا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا۔

"خدا کے لیے۔" اس نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں پر سے ہٹائے اور بدقت تمام چلائی۔

"بخش دو مجھے.... رحم کرو۔ سامنے آتے ہو تو سود و زیاں کا حساب یاد آجاتا ہے مجھے۔" چلے جاؤ یہاں سے"

"سود کے ساتھ سارے حساب چکاؤں گا مگر جدائی کی بات کرو گی تو پہلی گولی تمہیں اور دوسری خود کو ماروں گا مہر! یہ بات یاد رکھنا۔"

وہ تو چلا گیا مگر اس کا مدھم پر شدت سرد لہجہ وہیں مہرو کے آس پاس ہی ٹھہر گیا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

"یا اللہ۔" تزئین ساری کہانی سن کر دنگ تھی۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں مہرو بھی اس سارے ڈرامے میں شامل ہوگی۔" وہ تیقن سے بولی تو سائرہ چچی نے اس کی نفی کی۔

"اسے کیا ملنا تھا نمیر سے مل کر۔ لعنتیں ملامتیں۔"

"بہر حال امی! اب ہاتھ آئی دولت چھوڑیے گا مت۔ ابو سے کہیں بیٹا نہیں ہے تو کیا ہوا... داماد تو ہے نا۔ اپنا حق وصول کریں۔" تزئین نے بے رخی سے کہا۔

"تم فکر مت کرو۔ ساری عمر لگائی ہے اس کاروبار کے پھلنے پھولنے اور تمہاری تائی اور آغا جان کی جوتیاں

سیدھی کرنے میں-اب موقع ملا ہے تو چھوڑیں گے ہم بھی نہیں۔" وہ مطمئن تھیں اور ان کے کمرے کے دروازے تک آئی تائی جان کے قدم جیسے دہلیز پر گڑے رہ گئے۔

انسانیت اونچے حسب ونسب کی میراث نہیں ہوا کرتی یہ فطرت میں بستی اور تربیت کے ساتھ لہو میں دوڑتی ہے. ثمرہ کی آواز نے سماعتوں میں گونج کر ان کی روح کو جیسے کوڑا رسید کیا تھا۔

"بھابی صاحبہ کا تو سارا تھوکا ان ہی کے منہ پر آ گرا ہے.... ساری عمر انہوں نے جس طوائف کو گھر میں گھسنے نہیں دیا وہ آج ان کی سمدھن بنی ہوئی ہے اور جس کی ولدیت کو مشکوک کہہ کے انہوں نے آغا جان کو متنفر کیا تھا وہ ان کا بڑا داماد بن بیٹھا.... اور تو اور ڈرائیور بھی گھر کا ہی مل گیا دامادی میں۔" انہوں نے بیٹی کے ساتھ مل کر ٹھٹھا لگایا. صدیقہ بیگم کا دل جیسے کسی نے چیر دیا ہو. تمام عمر کی بنائی عزت سب کے قدموں میں پڑی تھی آج۔ وہ بے جان ہوتی ٹانگوں کو گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں آکر بستر پر گریں۔ ان کی آنکھوں سے سیل رواں تھا۔ مگر کیوں...... کس لیے؟

سائرہ بیگم کا اصلی چہرہ سامنے آنے پر یا قدرت کے اس زوردار تھپڑ پر......؟

اللہ آپ کے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے زمین پر نہیں آیا کرتا...... آپ کے مال اور اولاد کو آپ کی آزمائش بنا کر ہی سارے بدلے چکتا کر دیتا ہے۔ آپ دنیا کو حقارت سے دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو ٹھوکریں لگوا کر اسی دنیا کا سہارا لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ انہیں آج احساس ہوا کہ وہ اپنے آس پاس نام نہاد دولت اور مرتبے کا کتنا کمزور اور بودا مینار بنائے بیٹھی تھیں۔ آج ہلکا سا مخالف ہوا کا جھونکا آیا تو یہ مینار بھربھری ریت کی طرح ڈھے گیا تھا۔ یہ تھی حقیقت... دنیاوی اور ظاہری حسب ونسب کی۔ مہرماہ خود نڈھال سی کمرے میں داخل ہوئی تھی مگر ماں کو اس قدر ٹوٹی ہوئی حالت میں دیکھ کر ہراساں ہو کر ان کی طرف لپکی۔

"امی! کیا ہوا ہے؟"

انہوں نے ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا اور بے اختیار اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد انہوں نے مہرو سے اس قدر التفات کا مظاہرہ کیا تھا۔

"میرا سارا مان، سارا غرور جل کر راکھ ہو گیا مہرو! ساری عمر کے اعمال میرے منہ پر دے مارے گئے آج۔" وہ بے قرار ہو کر رو رہی تھیں۔ مہرو کا دل بھر آیا۔ وہ ان کی بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔

"کسی کی عزت اور انا کو قدموں تلے روند کر.. کسی کی عزت کی بے داغ چادر کو غرور و تکبر کی مٹی میں روند کر میں نے کتنا خسارہ کمایا ہے اس کا اندازہ آج ہوا ہے مجھے۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھیں.

"جنہیں میں نے راندہ درگاہ بنائے رکھا! اللہ نے بتا دیا کہ میں ان ہی کے قابل تھی"۔ مہرماہ کی توجہ بھٹکی. آج یہی الفاظ اسے بھی کسی نے کہے تھے۔

"اپنا دل صاف کر لیں امی! اللہ غفور الرحیم ہے وہ ضرور معاف کر دے گا۔" مہرماہ ذہن سے سب کچھ جھٹکتے ہوئے نرمی سے بولی.

"اللہ تو معاف کر ہی دیا کرتا ہے اس کے بندے ہی تھڑدلے بن جاتے ہیں۔" انہیں اپنی ہر زیادتی یاد آ رہی تھی. ان کا دل کٹ رہا تھا اور آنکھیں برس رہی تھیں۔ آج جو تھپڑ قدرت کی طرف سے ان کے منہ پر پڑا تھا اس نے ان کے دل و دماغ کے سارے نہیں تو بہت سے جالے اتار دیئے تھے اور وہ حق اور سچ کی تمیز کرنے لائق ہو گئی تھیں۔

"وقت مہربان ہے تو ظالم بھی ہے امی! رک کر کسی کا انتظار نہیں کرتا کہ کوئی اپنی غلطیاں سدھار لے. ہاں مگر

زندگی میں بارہا آپ کو مواقع ضرور دیتا ہے اپنی غلطیوں کو سدھارنے کے۔ خوش نصیب وہ ہوتے ہیں جو ان موقعوں کو جانے نہیں دیتے۔" وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے کہہ رہی تھی. اور صدیقہ بیگم ندامت کے آنسو بہا رہی تھیں. اور ندامت کے آنسو بھی بڑی توفیق کی بات ہوا کرتے ہیں....

☆☆☆

"تمہارا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا سہیل! آغا جان زندہ سلامت ہیں۔ اللہ ان کو زندگی تندرستی عطا کرے۔ ان کی زندگی میں ان کی مرضی کے بنا تم یہ بزنس اور پراپرٹی کیسے ٹیک اوور (قبضہ) کر سکتے ہو"۔ مبین آفندی ان کے آفس میں آئے تو ان کا لیا دیا سا انداز انہیں کوئی اور ہی سہیل آفندی بتا رہا تھا۔

"ساری عمر کوئی کسی کے سر پر نہیں بیٹھا رہتا بھائی صاحب! اور پھر آغا جان نے پاور آف اٹارنی اپنی مرضی سے دی تھی مجھے. آپ کا داماد ناجائز فائدہ اٹھا سکتا ہے.. میں تو پھر اس سارے بزنس کے مالکوں میں سے ہوں" وہ شانے اچکا کر بہت رکھائی سے بولے تو مبین صاحب سن رہ گئے۔

تمام عمر خود کو بے ضرر اور غیر جانب دار بنا کر پیش کرنے والے سہیل آفندی اور ان کی بیوی نے ایک دم سے ایسا چولا اتارا تھا کہ ان کا اصل روپ دیکھ کر سب شاک میں تھے۔ وقت کا چکر ان کے سامنے ایک موقع لایا تھا تو انہوں نے رنگ بدلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"شرم کرو سہیل!" وہ بدقت کہہ پائے.

"شرم... یا عقل؟" وہ مطمئن تھے.

"وقت پر صحیح فیصلے نہ کرنے والوں کو وقت بہت ٹھوک پیٹ کر سیدھی راہ پر لایا کرتا ہے سہیل! ہم سب کی مثال تمہارے سامنے ہے" وہ دکھ سے بولے۔ سہیل آفندی کے ارادے انہیں صاف دکھائی دے رہے تھے. مگر جب کوئی سمجھنا نہ چاہے تو آپ کے لاکھ دلائل بھی اسے سمجھا نہیں سکتے۔

"جب سب کچھ ہاتھوں سے نکل رہا ہو تو ایسی ہی نصیحتیں یاد آیا کرتی ہیں"۔ انہوں نے تمسخر اڑایا.

"بات وہ نہیں ہے سہیل! میں تمہیں اس گڑھے میں گرنے سے بچانا چاہتا ہوں جس میں ہم برسوں تک گرے رہے ہیں۔" انہوں نے تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ مگر کوئی نیکی کا چراغ تھام کر سیدھا راستہ دیکھنے کو راضی بھی تو ہو......

"آپ آغا جان کو خود سنبھالیں گے تو انہیں دکھ کم ہو گا بھائی صاحب! ان کی عمر نہیں ہے اب بزنس کے بکھیڑوں سے نمٹنے کی. اور جہاں تک بات ہے وراثت کی تو طلال ہمارا داماد بھی ہے اور بیٹا بھی۔ اسے ساتھ رکھیں گے ہم"۔ وہ ساری جمع تفریق کرکے بیٹھے ہوئے تھے۔ مبین صاحب کو احساس ہوا کہ آج جس پوزیشن پر سہیل بیٹھ کر ناخدا بننے کی کوشش کر رہے تھے...... وہ واقعی انسان کے لیے کتنا بڑا امتحان تھی.

"آپ کی رشتوں میں برابری رکھنا، حسن سلوک اور ایمان داری ایسے مقام پر بیٹھ کر ہی امتحان میں پڑا کرتی ہے". وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں اس مقام سے گزر چکا ہوں سہیل! اور نہیں چاہتا کہ تم بھی ویسی ٹھوکریں کھا کر سنبھلو جیسی میں نے کھائی ہیں"..... انہوں نے رنجیدگی سے آخری کوشش کی۔

"کہیں آپ کا ارادہ تو بدل نہیں گیا نمیر کو موحد کے روپ میں دیکھ کر۔" وہ معنی خیز نظروں سے انہیں دیکھ کر بولے تو مبین صاحب نے جبڑے بھینچے۔

"اس نے تو جو کیا ہے اس کی سزا پائے گا ہی۔ مگر تم بھی یہ وقت یاد رکھنا سہیل! جب میں تمہیں اس قدر خود

سری سے روک رہا تھا. اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" وہ آزردگی سے کہہ کر ان کے آفس سے نکل آئے۔ سہیل آفندی نے سر جھکا تھا۔

☆☆☆

"اللہ اکبر"........ ملاحہ تو مہرو کی زبانی سارا ماجرا سن کر دنگ ہی رہ گئی۔

"آپی! یہ کسی فلم کی کہانی سنا رہی ہو کیا؟"

"فلم ہی سمجھ لو..... اور اب پتا کر کے یہ بھی بتا دو کہ کون کون شامل تھا اس فلم کی کاسٹ میں؟" مہرماہ نے ٹرے میں فریش جوس کے تین گلاس رکھ کر لاتے کبیر خان کو تیکھی نظروں سے دیکھا وہ خجل سا ہوا۔ ٹرے مہرماہ کے سامنے کی تو اس نے خفا خفا سی صورت کے ساتھ گلاس اٹھا لیا۔ کبیر نے ایک گلاس اپنی ہک دک بیٹھی بیوی کو تھمایا اور اپنا گلاس لیے سامنے صوفے میں دھنس گیا وہ آڑو کا فریش جوس بنا کر لایا تھا۔

"یعنی کہ آپی! تمہارا نکاح نمیر بھائی یعنی کہ موحد بھائی ہی سے ہوا ہے۔" ملاحہ کی بے انتہا خوشی کو مہرو نے ناپسندیدگی سے دیکھا تو وہ دبک کر رہ گئی۔

"جھوٹ نہیں بولوں گا".... ذرا دیر کے توقف کے بعد کبیر نے ان دونوں کی گھورتی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

"مجھے ملاحہ سے شادی کے بعد اس بات کا پتا چلا تھا. وہ بھی شاید انہیں مجھ پر اعتماد ہو گیا تھا اس لیے۔"

"اور تم نے ہم میں سے کسی کو بتایا کیوں نہیں آ کر..... ذرا تو وفاداری کا ثبوت دیتے۔" مہرو بگڑی تو ملاحہ نے کبیر کو "جاؤ میں نہیں بولتی" والی نظروں سے دیکھا. ساتھ ہی زبان سے بھی شکوہ کر دیا۔

"مجھے بھی نہیں بتایا۔"

"ان کو سب سے پہلے.... بلکہ ہماری شادی سے بھی پہلے پتا چل چکا تھا کہ موحد ہی نمیر ہے..... انہوں نے بتایا تمہیں؟" کبیر نے مہرماہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الٹا اس سے پوچھا تو ملاحہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تحیر سے مہرو کو دیکھا۔ مہرماہ کو پتا چل گیا کہ کبیر کو یہ ساری معلومات کس نے فراہم کی تھیں. اس کے دل میں نمیر کو ـــ گالیوں سے نوازا. چہرہ خفت اور غصے سے لال ہوا۔

"میں صرف تم لوگوں کی خاطر چپ رہ گئی. وہ نہ ہوتا تو پتا نہیں تمہاری شادی ہو بھی پاتی یا نہیں۔"

"یا اللہ! مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا ری ایکشن دوں..... غم کا یا خوشی کا۔" ملاحہ ڈبل مائنڈ ڈ ہو رہی تھی.

"نام بدل جانے سے بھائی کا رشتہ تو نہیں بدل گیا... اور نہ ہی اس کے احسانات" کبیر نے اسے تادیبی انداز میں کہا تو شرمساری ملاحہ جلدی سے بولی۔

"بالکل.... واقعی. مجھے تو بس اس انکشاف پر حیرت ہو رہی ہے کبیر! ورنہ میرے لیے تو نمیر ہونے کے باوجود انہوں نے ایک بھائی ہی کی طرح سوچا۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو... ذرا امی ابو سے پوچھو۔" مہرماہ نے طنز کیا پھر صاف گوئی سے بولی۔

"ہمارا سگا بھائی ہوتا تو تمہاری ٹانگیں توڑ کر اندر ڈال دیتا مگر کبیر سے تمہاری شادی نہ ہونے دیتا کجا کہ خود شادی کروا لیا..... ہونہہ. اس نے یہ سب صرف آغا جان اور ہمارے گھر والوں کو نیچا دکھانے کے لیے کیا تھا۔" مہرماہ تلخی سے بولی. ملاحہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا جبکہ کبیر متاسفانہ سر ہلا کر جوس پینے لگا۔

"اب کیا ہوگا آپی! آغا جان تو ایک طرف رہے ہمارے گھر والے بھی نمیر بھائی کے سخت دشمن ہیں. میں تو

ویسے بہت خوش ہوں کیونکہ تمہارے نکاح والا مسلہ تو حل ہو گیا. اب کسی نمیر نامی بندے کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ گھر ہی سے برآمد ہو گئے نمیر بھائی۔" ملاحہ کے فوراً نمیر کے ساتھ بھائی کا لاحقہ لگا لینے پر مہرماہ نے اسے گھورا.

"تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا اس دھوکے باز کے موحد یا نمیر ہونے سے؟"

"میرے لیے تو وہ صرف میرا بھائی ہے آپی! اگر میں اس گزرے ایک سال کو دیکھوں تو انہوں نے صرف اور صرف محبت ہی نبھائی ہے ہم سے. نفرت کرنا تو آیا ہی نہیں انہیں۔" ملاحہ باوجود کوشش کے اپنی آنکھ نم ہونے سے روک نہیں پائی تھی.

"امی کے بقول "سنپولیا" تھے وہ..... مگر محبتوں کے زہر ہی کیوں اتارتے رہے ہماری رگوں میں؟ اگر میری اور کبیر کی شادی کروا کر محض آفندیز کو نیچا دکھانا ہوتا تو سارا روپیہ اور بزنس واپس نہ کرتے وہ اور نہ ہی اتنی عزت سے مجھے رخصت کرواتے۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی.

"واہ..... بہت خوب۔" مہرماہ جو بے یقینی سے اس کی باتیں سن رہی تھی اس کے رکتے ہی جیسے چونک کر حواس میں آئی. طنز سے بولی۔ امید واثق تھی ہاتھ میں جوس کا گلاس نہ ہوتا تو باقاعدہ تالی بجا کر داد دیتی.

"یعنی تمہارے ساتھ اچھا کیا تو وہ سارے زمانے سے اچھا ہو گیا... تو پھر مجھے بتاؤ میں اسے کس کیٹگری میں کھڑا کروں؟" تلخی سے پوچھا تو کبیر اپنا خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا.

"مانا کہ شروع میں ان کا مطمع نظر صرف بدلہ ہی تھا مگر ان کے اندر کے اچھے انسان پر برائی غالب نہیں آسکی. تبھی تو سب کے ساتھ اچھائی ہی کرتے رہے..... باوجود آفندیز سے علی الاعلان نفرت کا دعویٰ کرنے کے۔"

"میرے جذبات اور احساسات کے بارے میں سوچو کبیر! ایک اغوا شدہ لڑکی کے کیا احساسات ہو سکتے ہیں.... جسے اس کی شادی کے روز اغوا کر لیا جائے نکاح کروا دیا جائے اور اس نے کبھی اپنے شوہر کو دیکھا ہی نہ ہو..... پھر موحد بن کر دوبارہ سے نکاح کرنا..... تم سوچ سکتے ہو میں جس تکلیف میں تھی یہ سوچ کر کہ میرے والدین میرا نکاح پر نکاح کر کے خود بھی گناہ گار ہو رہے ہیں اور مجھے بھی کر رہے ہیں..... میں ان لمحات کو سوچنا بھی نہیں چاہتی"

"کیا وہ اپنی غلطی نہیں مانتے؟" کبیر نے پوچھا.

"مانتا ہے..... صاف لفظوں میں مانتا ہے۔" مہرو تیزی سے بولی.

"ہاں تو پھر کیا مسلہ ہے جب وہ اپنی غلطی مان رہے ہیں تو؟" کبیر نے رسان سے پوچھا.

"بہت اچھے..... یعنی کسی کی پوری زندگی برباد کر کے اپنی غلطی مان لو اور بس معاملہ ختم۔" مہرماہ نے ہاتھ جھاڑ کر طنز کیا۔

"وہ اپنی اس غلطی کو نبھانا چاہتے ہیں۔" کبیر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور وہ بول کر پچھتایا بھی۔ مہرماہ کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر بے یقینی اتر آئی۔

"غلطیوں کو نبھایا نہیں سدھارا جاتا ہے..... اور اب اپنے نمیر سر کو بتا دینا کہ یہ غلطی کی اس نے تھی مگر اسے سدھاروں گی میں۔" وہ دانت پیس کر کہتی گلاس تپائی پر پٹخ کر اٹھ گئی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" وہ بھی فوراً کھڑا ہوا۔

"آپی! ایک غلطی انہوں نے کی تھی دوسری تم مت کرو۔" ملاحہ نے لجاجت سے کہا۔

"نمیر نہ سہی موحد کے بارے میں تو سوچا ہی ہوگا تم نے؟" وہ ایک دم سے اندر آتے ہوئے بولا۔ نجانے کب سے کھڑا تھا۔ اور کس قدر گھٹیا بات کی تھی اس نے۔ مہر ماہ کو لگا اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا ہو۔

"تم سے اس سے بھی زیادہ فضول بات کی توقع تھی مجھے" مہر ماہ نے بمشکل خود پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ کبیر نے ملاحہ کو آنکھ کا اشارہ کیا تو نا چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے ساتھ اندر چلی گئی۔ نیلی جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ مضمحل سا دکھائی دیتا تھا مگر مہر ماہ کو سامنے پا کر بہت فریش ہو گیا۔ اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

"چلو خیر.... تم نے مجھ سے توقعات تو وابستہ کرنا شروع کیں۔ اٹ از آ گڈ سائن (یہ اچھی علامت ہے)"

"میں موقع پرستوں سے کوئی توقعات نہیں رکھتی۔" وہ جلبلا کر بولی۔

"موحد سمجھ کر تو رکھ سکتی ہو۔" اس نے ایک دم کھلے دل سے کہا۔

"جب دنیا آپ کو گرائے تو ہمیشہ دوست اٹھاتے ہیں لیکن جب دوست دھکا دیں تو ساری عمر لگ جاتی ہے اٹھ کر کھڑے ہونے میں نمیر آفندی! تم نے اس روپ میں بھی کم نہیں کیا میرے ساتھ۔ کاش..... تم موحد ہی رہتے میرے سب سے اچھے دوست" مہر ماہ نے اسے شرم دلائی۔ ملاحہ باہر آ گئی اور گھور کر نمیر کو دیکھا۔

"کیا ہوا...؟" اس نے پوچھا تو ملاحہ نے سر تا پا اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ نمیر آفندی بن کر آپ کیسے لگتے ہیں۔" وہ آزردگی سے مسکرا دیا۔

"نا قابل قبول"... اس کا جواب مختصر مگر جامع تھا۔ ملاحہ نے بے اختیار مہر ماہ کو دیکھا جس کے چہرے پر سخت تاثرات تھے۔ پھر اس کی ناراضی کی پرواہ کیے بنا نمیر سے بہت تیقن سے بولی۔

"آپ ہمارے لیے اب بھی وہی انسان ہیں جنھوں نے ہماری خوشیوں کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔" مہر ماہ ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے شولڈر بیگ شانے پر ڈالتی اللہ حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی تو نمیر نے بے چارگی سے ملاحہ کو دیکھا۔

"یہ ماؤنٹ ایورسٹ تو آپ ہی کو سر کرنا ہے بھائی! اس کا دل صاف ہو گیا تو اللہ کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنے فیصلے سے ہلا نہیں سکے گی۔" ملاحہ نے اسے راز کی بات بتائی تو وہ گہری سانس بھرتا مہر ماہ کے پیچھے لپکا۔

"مہر!...... مہرو..... سنو تو..... رکو۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں تمہیں۔"

"میرا پیچھا مت کرو۔" وہ گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ خفگی سے نمیر کو دیکھا تو اس نے مہر ماہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"گاڑی میں بیٹھو۔"

"ہاتھ چھوڑو میرا، تم ایسا کوئی حق نہیں رکھتے مجھ پر" مہر ماہ نے تیہا دکھایا۔

"جب تک نکاح میں ہو میرے تب تک تو یہ حق میرے پاس موجود ہے..... اب آرام سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ ورنہ اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے کے حقوق بھی رکھتا ہوں میں۔" وہ سنجیدہ تھا۔ سخت گرفت میں مہرو کا ہاتھ چرمرا کر رہ گیا جھٹک کر ہاتھ چھڑاتے ہوئے مزید کسی تماشے سے بچنے کی خاطر سخت غصے کے عالم میں وہ اس کی گاڑی میں بیٹھی مگر دروازہ زور سے مار کر غصے کا اظہار بھی کیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"کیا خیال ہے یہاں سے ہنی مون پر نہ نکل جائیں۔ آپس کے اختلافات دور کرنے کا اچھا موقع ہے۔ تمہارا موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا اور ہماری پہلے والی دوستی بھی واپس آ جائے گی۔" سفر خاموشی سے جاری تھا

مہرو کا دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے گھر آ جائے اور اس کی جان چھوٹے تبھی ایک دم سے نمیر نے کہا تو مہر ماہ کا دل لرز گیا۔ بے اختیار نمیر کو دیکھا تو اس کی مسکراہٹ نے دل جلا کر خاک کر دیا۔

"مجھے گھر پہ اتار دو اور اپنی کسی ہوتی سوتی کو لے جاؤ ساتھ.. بنیہ" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے جلبلا کر بولی تو وہ اس کی بات پر ہنسا۔

"اپنی قائم مقام ہوتی سوتی کو ہی آفر کر رہا ہوں۔"

"چپ کر کے گاڑی چلاؤ۔ سر میں درد مت کرو۔" وہ ساری دنیا سے بے زار تھی ان دنوں۔ نہ جانے آگے قسمت کیا رنگ دکھانے والی تھی اور جو سارے بگاڑ کی وجہ تھا اسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی چلائے گیا۔

"تم نے سومیہ سے ایک بار کہا تھا کہ اگر نمیر یا موحد میں سے میں نے موحد کو چنا تو تم میری زندگی سے نکل جاؤ گے؟" گھر کے سامنے اترنے سے پہلے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ کچھ سوچ کر چہرہ موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے رسان سے بولی تو نمیر کے تاثرات بدلے۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ کیا باور کروانے والی ہے۔

"مبارک ہو..... میں نے موحد کو چنا تھا۔ وہ میرا بہترین دوست تھا۔" مہر ماہ اس سے سارے بدلے لینا چاہتی تھی اس کے دل کو کچوکے لگا کر۔ نمیر نے خود کو سنبھالتے ہوئے گہری سانس لی۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے یاد دلاتے ہوئے بولا۔

"اور تم نے موحد سے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری کہانی میں موحد کا کوئی کردار ہی نہیں....... اصل حقیقت تو نمیر ہی تھا۔ میں اب آغا جان کے سامنے کھڑا ہو چکا ہوں۔ اتنی ہی زبان کی پکی ہو تو قول نبھاؤ اب اپنا"..... اس کے برجستہ جواب پر مہر ماہ کو تپ چڑھی۔ دھاڑ سے دروازہ بند کرتی پیر پٹختی وہ گیٹ کھول کر اندر چلی گئی تھی۔ نمیر کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔

"ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی
تم مانگتے پھرو گے اپنا غرور ہم سے.....!!"

سر جھٹک کر وہ دوبارہ اگنیشن میں چابی گھما رہا تھا۔

☆☆☆

آغا جان تک مبین صاحب کی زبانی سہیل آفندی کی بدزبانی اور ہٹ دھرمی کا سارا قصہ پہنچ چکا تھا اور وہ انگشت بدنداں تھے۔

"کیسا خون سفید ہوا ہے سہیل کا..... اسے اس بات کا بھی احساس نہیں رہا کہ اس کا باپ ابھی زندہ ہے.... بلاؤ اس ناہنجار کو۔" ہوش میں آئے تو جوش بھی آیا۔ مگر سہیل آفندی کا وہی ہٹیلا انداز...

"جان ماری ہے اس کاروبار کے پیچھے آغا جان! اس لیے نہیں کہ آپ ادھر ادھر مسکینوں اور یتیموں میں بانٹ دیں" آغا جان نے سدا کے گپ چپ رہنے والے بیٹے کو بے یقینی سے دیکھا۔ اسے تو کبھی ان کی بات سے انحراف کرنے کی جرات ہی نہ ہوئی تھی۔

"جس کا جو حق بنتا ہے اسے وہی ملے گا۔" آغا جان نے بمشکل لہجے کو قابو میں رکھا۔ اولاد کے بدلتے انداز اور اپنی کم زوری کا احساس انہیں مصالحت آمیز رویہ اپنانے پر مجبور کر رہا تھا۔

"یہاں حق داروں کو نہیں بلکہ ساری عمر اس بزنس کے پیچھے جان مارنے والوں کو سب کچھ ملے گا آغا جان! بنے بنائے پر آ کر بیٹھنے والوں کا کوئی حصہ نہیں ہے اس میں۔ کہاں گئے نمیر کو دیکھتے ہی گولی مار دینے

کے آپ کے دعوے؟ مہرو کے اغوا اور زبردستی کے نکاح تک کو بھلا دیا ہے آپ لوگوں نے؟" وہ رکھائی سے بولے۔

زندگی اسی طرح چلتی رہتی ہے..... ایک صدیقہ بیگم غرور و تکبر کی مسند سے اترتی ہے تو اس پر کوئی سائرہ بیگم براجمان ہو جاتی ہے۔ کوئی مبین آفندی ٹھوکر کھا کر نصیحت پکڑتا ہے تو وہیں کوئی سہیل آفندی اسی راہ پر اندھا دھند بھاگ نکلتا ہے۔ کوئی کسی کی ٹھوکر سے نصیحت نہیں پکڑتا۔ سب کو اپنی ٹھوکر کے بعد ہی نصیحت ملتی ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے..... چکر در چکر..... لوٹ کے آنے والے حالات اور دھوکے۔

"میں کسی کے بھی ساتھ زیادتی نہیں کروں گا سہیل! تم فکر مت کرو۔ بس میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہی سارے بزنس اور جائیداد کا بٹوارہ کر دوں۔" وہ غیر معمولی تحمل کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں آغا جان! آپ اس خبیث انسان کی جھوٹے آنسوؤں بھری کہانی سے متاثر ہو گئے ہیں" سہیل آفندی نے طنز کیا تھا۔ مبین صاحب نے بے اختیار آغا جان کی جانب دیکھا۔

(تو کیا سبھی کے دلوں کو اللہ کی طرف سے پلٹ دیا گیا تھا؟)

"بکواس مت کرو۔" آغا جان تلملا اٹھے..... بھلا سر عام شکست ان سے برداشت ہو سکتی تھی۔ وہ ہار گئے..... وہ موحد کا بچھڑنا سہہ نہ پائے..... یا وقار کے بیٹے کو پا کر دل بدل گیا..... وہ کچھ بھی اعتراف نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"ہو گا وہی جو میں چاہتا ہوں۔ اور اس سلسلے میں اب تم کوئی وورائے مت رکھنا۔ وہ جو لینے آیا ہے اسے لے کر جانے دو۔ یہ نہ ہو کہ میں تمہیں ہی عاق کر دوں۔" انہوں نے سختی سے کہا تو سہیل آفندی کا چہرہ دیکھنے لائق ہو گیا۔

"بحث مت کرو سہیل! کال پڑا ہے ہمارے گھر پر۔ سخت بد دعا لگی ہے کسی کی جو یوں شیرازہ بکھر رہا ہے دلوں سے لحاظ اور مروت ختم ہو رہی ہے" مبین آفندی کو حالات نے تھکا مارا تھا تو اب احساس ہوا کہ کسی یتیم اور کسی بیوہ کی آہ عرش خداوندی تک جا سکتی ہے اور کسی کے بھی غرور کو پیروں تلے روند کر خس و خاشاک بنا سکتی ہے۔ سہیل آفندی مزید بحث کیے بنا تنتناتے ہوئے چلے گئے مگر ان کا ہر انداز پکار پکار کر یہی کہہ رہا تھا کہ وہ ان دونوں سے قطعی متفق نہیں۔

"اسے سمجھاؤ مبین! آگ میں ہاتھ مت ڈالے۔ ہم جلے ہیں..... ہمیں ہی دیکھ کر نصیحت پکڑ لے۔" آغا جان کے لب و لہجے میں اتری تھکاوٹ مبین صاحب کو بے چین کر گئی۔

"آغا جان! آپ نے وقار کے بیٹے کو تسلیم کر لیا ہے؟" بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"مجھے موحد کی موت کی خبر نے ہلا کر رکھ دیا ہے مبین! میری نسل بے نام و نشان ہو رہی تھی اور مجھے پتا بھی نہیں چلا..... وہ میرا لاڈلا..... میرے باپ دادا کی نسل کا امین..... کب سسک سسک کر چل بسا مجھے خبر ہی نہ ہوئی اور میں اس دولت اور انا کے نشے میں چور..... زمینی خدا بن کر بیٹھا رہا۔" ان کی آنکھیں نم ہوئیں اور آواز بھرا گئی۔ مبین صاحب دم بخود ان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"وہ..... نمیر ہے آغا جان! موحد نہیں۔"

"جانتا ہوں"..... وہ پھیکا سا مسکرائے۔ "مگر یہ دل نہیں مانتا جس نے اول روز سے اسے موحد کے روپ میں دیکھا ہے..... میں سوچتا تھا کہ فاران کے بیٹے میں وقار کی بے پناہ جھلک آتی ہے تبھی میں نے اس کے وجود سے دونوں بیٹوں کی کمی کو دور کر لیا۔ اس روز اس کی حقیقت پتا چلی تو خیال آیا کہ وہ تو بنا بنایا وقار ہے۔"

مبین آفندی نے گہری سانس بھری پھر دبے لفظوں میں پوچھا۔

"اب مہرو والے معاملے کا کیا بنے گا آغا جان! وہ بھی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بھلا نہیں پائے گی"

"اس بات کا فیصلہ اسی کو کرنے دو مبین! جو مہرو کا دل چاہتا ہے وہی قدم اٹھائے تا کہ کل کو کسی اور کو مورد الزام نہ ٹھہرا سکے۔" وہ تھک کر لیٹ گئے تھے مبین صاحب انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

انہوں نے اپنی پوری زندگی میں آغا جان کا اس قدر ہارا ہوا انداز نہیں دیکھا تھا۔

"یہ سب چال ہے بھائی صاحب اور بھابی کی..... اب تھوکا ہوا چاٹنے کی تیاری میں ہیں یہ لوگ۔ جانتے ہیں نا کہ آغا جان کو پوتے کی کتنی چاہ ہے۔ اب تو وہ بے نام و نشان شخص انہیں دامادی میں بھی قبول ہو گا۔" سائرہ چچی تلملا رہی تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں وراثت میں حصہ دار تھیں کل کو داماد بیٹے بن کر سب سنبھال لیتے۔ اس نمیر آفندی کا بھلا کیا کردار تھا اس سارے معاملے میں۔

"میں بھی دیکھتا ہوں کہ کیسے یہاں ان سب کی من مانی چلتی ہے۔ برسوں کی محنت کو ایسے ہی ٹھکانے لگا دوں اتنا پاگل نہیں ہوں میں۔ موحد ہوتا تو چلو خیر تھی..... مگر یہ تو کہانی ہی اور نکلی۔" سہیل آفندی کو بھولتا ہی نہیں تھا کہ کیسے موحد آفندی بن کر وہ انہیں انگلی کا ناچ نچائے رکھتا تھا۔

"آپ دیکھ لیجیے گا۔ دامادی میں بھی قبول ہو گا ان سب کو وقار کا بیٹا..... اور وہ طوائف بھی۔" سائرہ چچی نے منہ بگاڑ کر کہا تو انہوں نے ہنکارہ بھرا۔

"بھائی صاحب کی بیٹیوں کے پیچھے جتنی بے عزتی سہنی تھی خاندان میں سہہ لی۔ اب اور نہیں۔ اور نہ ہی میں اس عورت کو خاندان کے سر کا تاج بنانے کی اجازت دوں گا۔ ہماری بھی بچیاں ہیں ان کا مستقبل ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ اب کیا ہر ایک کو موحد ہی نمیر ہے والی کہانی سناتے پھریں ہم..... جگ ہنسائی ہی ہے نا۔ مہرو کا تو نکاح ہی فاسد ہو گیا شاید" سائرہ بیگم نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

وہ خوش تھیں کہ بڑی کامیابی سے وہ اپنے شوہر کی برین واشنگ کر چکی تھیں۔

☆☆☆

قدم قدم پہ جہنم سہارتا ہوا میں ...!!!
تمہارے ہجر سے خود کو گزارتا ہوا میں
یہ پور پور اذیت میں ڈالتے ہوئے تم
یہ سانس سانس محبت پکارتا ہوا میں
پھر ایک رات اذیت سے مر گیا تھا کہیں
تمہارے عشق کو اندر سے مارتا ہوا میں
عجب نہیں ہے کسی روز قتل ہو جاؤں
تمہاری جان کا صدقہ اتارتا ہوا میں
معاف کرنا ترا ساتھ دے نہیں پایا
پلٹ رہا ہوں محبت میں ہارتا ہوا میں

ان ساحر لفظوں کو پڑھ کر اپنے دل کو جیسے نرمی سے کسی کی مٹھی میں بھنچتا محسوس کرتے ہوئے مہر ماہ نے لب بھینچ کر موبائل سے میسج ڈیلیٹ کیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اسے جواب دیا۔

"واقعی نا قابل معافی ہو تم نمیر آفندی!"

دوسری طرف سے چند لمحوں بعد جواب آیا۔

"اور معافی کے ساتھ ساتھ تمہارا طلب گار بھی۔" مہرماہ کے چہرے پر خون جمع ہوگیا. دوبارہ اس کے جواب کو پڑھا اور پھر سہ بار.

"بدلہ لے لیا تم نے طلب پوری ہوئی۔" مہرماہ کا جواب بہت کڑا تھا. اور چہرے پر اذیت زدہ تاثرات۔

"لیکن محبت تو اب شروع ہوئی نا۔"

"نام مت لو محبت کا تم جھوٹے آدمی.... دشمن بنے ہو تو مردوں کی طرح دشمنی نبھاؤ" وہ بھڑکی۔

"دشمن اتنا حسین ہو تو پھر دشمنی کی ایسی کی تیسی ہو ہی جاتی ہے" وہ پٹڑی سے اتر رہا تھا۔

"اپنا حصہ لو اور چلتے بنو. تمہارا مطمع نظر صرف آغاجان کی جائیداد تھی۔"

"تب تک ان کی پوتی کو نہیں دیکھا تھا۔" ترنت جواب آیا۔

"تم اول روز سے میرے ساتھ دشمنی نبھا رہے ہو۔"

"محبت ہوئے چلی جا رہی تھی تم سے۔ سوچا تم ہی کو بدلے کے لیے چن لوں کل کو بدلہ تو اچھا ملے۔" مسکراتے ہوئے ایموجی کے ساتھ جواب آیا تو مہرماہ ساکت ہوئی۔

"م ح ب ت...... بدلے کے چار حروف پر محبت کے چار حروف کیسے حاوی ہوئے میں نہیں جانتا مہرو! مگر آج بس اتنا جان لو کہ تم سے بچھڑنا اب سوہان روح ہے۔" اس کے الفاظ اس کے جذبات کی شدت بیان کر رہے تھے. مہرماہ کا دل گہرائی میں غوطہ کھا گیا.

"اور میری طرف سے ایسی محبت پر لعنت کے چار حروف۔"... بدقت تمام لکھ کر اس نے موبائل بند کر کے ایک طرف ڈال دیا۔

یہ کوئی مذاق تھا بھلا.... کبھی اتنا غصہ کہ بدلے کے لیے چن لیا اور اب اتنی محبت کے دعوے کہ جان نثار کرنے کو تیار... ہنہ

مگر یہ دل..... مہرو ذرا تھمی... اسے یاد آیا موحد کے روپ میں یہ بندہ اسے اپنا بہت اچھا دوست لگا کرتا تھا۔ مگر پھر وہ نمیر بن کر سامنے آیا تو یکلخت ہی جیسے پرایا ہوگیا.... اس کا دشمن نکل آیا تھا وہ۔ اس کی زندگی سے خوشیوں کے سارے رنگ چرا کر زندگی میں اذیتیں بھر دینے والا۔

اب تمہیں پتا چلے گا کہ محبت سے بچھڑنا کیسا لگتا ہے نمیر آفندی۔

وہ وارڈروب کھول کر کپڑے نکالتے ہوئے تلخی سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

آغاجان نے وکیل کو مبین صاحب کے ذریعے بلوایا تو گھر میں جیسے ایک ہنگامہ برپا ہوگیا.

" آپ اپنی وصیت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کریں گے آغاجان!" سہیل آفندی کی آواز پورے لاؤنج میں گونجی تو ڈائننگ پر ناشتا کرتے نمیر نے بے اختیار ثمرہ کی طرف دیکھا۔

"مرا نہیں ہوں ابھی میں۔ اور جب تک زندہ ہوں جتنی بار چاہوں وصیت تبدیل کر سکتا ہوں۔" آغاجان نے گرج دار لہجے میں کہا۔

" مگر کیوں کس لیے؟ اس کل کے بچے کے لیئے جو چھپا دشمن بن کر اس گھر میں داخل ہوا تھا؟" وہ تلملائے۔

" مگر آستین میں چھپا دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے سہیل! آج تمہیں دیکھ کر یقین ہوگیا ہے۔" آغاجان کا

طنز بھرپور تھا. سائرہ چچی نے بے آرامی سے پہلو بدلا.

" آغاجان آپ جو بھی کہیں۔۔ مگر میں نمیر کو ایک پھوٹی کوڑی بھی دینے کے حق میں نہیں ہوں اس کے کہہ دینے سے وہ وقار کا بیٹا نہیں بن گیا!" وہ تنفر سے بولے تو نمیر کی بس ہوگئی پھر تو وہ ثمرہ کے روکنے پر بھی ڈائننگ میں نہیں رکا تھا۔

" آپ..... آپ ثبوت لائیے کہ آپ آغا ذوالفقار کی اولاد ہیں۔"... وہ آکر لاؤنج میں دھاڑا تھا. ایک دم وہاں خاموشی طاری ہوگئی۔ مہرماہ کمرے سے ننگے پاؤں ہی بھاگتی ہوئی چلی آئی. غصے سے لال چہرہ اور آنکھیں لیے وہ سہیل آفندی کے سامنے کھڑا تھا. وہ برافروختہ ہوئی۔

"اس طرح کے ثبوت کی تمہیں ضرورت ہے برخوردار مجھے نہیں"۔ سہیل رسانیت سے بولے۔

" بکواس مت کرو سہیل! اب اگر تم نے ایک بھی لفظ مزید کہا اس بارے میں تو زبان کاٹ دوں گا تمہاری۔" آغاجان کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔

" ساری عمر ہوگئی ہمیں بھابی اور آپ سے یہی سنتے۔ آج ہم نے کہا تو جرم ہوگیا۔" سائرہ بڑبڑائی بھی اس طرح تھیں کہ سب کو سنائی دے جائے۔

" دفع ہو جاؤ تم اپنے کمرے میں۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی ہماری بات میں دخل اندازی کرنے کی۔" آغاجان کو سائرہ چچی سے اس قدر رنڈر رویے کی امید نہ تھی۔

" آغاجان! میں زرنگار نہیں ہوں جو چپ چاپ اپنا گھر لٹتا دیکھتی رہوں، اس گھر اور بزنس کے لیے جان ماری ہوئی ہے۔ ایروں غیروں میں بٹتا دیکھ کر چپ نہیں رہ سکتے ہم۔"

"میری ایک بات کان کھول کر سن لو تم دونوں.... وقار کا بیٹا جو لینے آیا ہے وہ اسے ضرور ملے گا۔" آغاجان نے صاف اور مضبوط آواز میں کہا باقی سب تو ششدر ہوئے ہی تھے نمیر بھی سن رہ گیا۔ آج اسے وقار آفندی کا بیٹا مان لیا گیا تھا... آغاجان اس دنیا کے آخری انسان ہوتے جن سے وہ یہ توقع کرتا کہ وہ اسے وقار کی جائز اولاد مانیں گے۔

"اگر آپ کو اس دھوکے باز سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو آپ بھی اس کے ساتھ ہی چلے جائیں لیکن میں اس کو بزنس اور جائیداد میں حصہ دار ماننے پر راضی نہیں۔" سہیل آفندی تو جیسے لالچ کی اندھی پٹی باندھ بیٹھے تھے آنکھوں پر۔ آغاجان دم بخود رہ گئے۔

" سہیل! ہوش میں ہو.... کیا فضول اور گھٹیا بات کر رہے ہو۔" مبین آفندی نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا مگر آغاجان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

" رہنے دو مبین! اسے مت روکو. آج اچھی طرح خون کے رشتوں کی اصل شکل سامنے آجانے دو۔"

"اس سے کہیں کہ یہ اپنا سامان سمیٹے اور اپنی ماں کو لے کر اس گھر سے نکل جائے" وہ اب بہت تنفر کے ساتھ نمیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے.

"اس گھر سے یہ نہیں تم جاؤ گے۔" آغاجان کا لہجہ پتھریلا تھا۔

"میرا اس گھر پر حق ہے آغاجان!" وہ غصے سے بولے۔

"وقار کا بھی اتنا ہی حق تھا اور اب...... اس کے بیٹے کا"۔ سردمہری سے کہتے وہ ایک لمحے کو تھمے اور پھر سختی سے وہ جملہ کہہ ہی دیا جو موحد کو نمیر کے روپ میں پا کر ان کے سینے میں تو گڑ چکا تھا مگر زبان پر نہیں آ رہا تھا۔ نمیر ششدر رہ گیا۔ وہ ایک مضبوط اعصاب کا مالک مرد نہ ہوتا تو شاید رو ہی پڑتا۔ مگر ثمرہ چچی پر تو کوئی پابندی نہیں

جاتے، جھک کر باپ کے پیروں کو چھو لیا تو وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گئے۔

☆☆☆

"آپی! اللہ کا واسطہ ہے اب یہ فضول کی ضد چھوڑ دو..... سب کا دل موم ہو گیا... سب ان سے معافی مانگتے پھر رہے ہیں اور تم ان سے معافی منگوانے کے چکر میں ہو۔" ملاحہ اور کبیر آج ڈنر پر آغا جان کی طرف سے انوائیٹڈ تھے۔ کبیر کو کھلے دل سے گلے لگاتے ہوئے تمام گلے شکوے دلوں ہی میں دبا ڈالے گئے۔ بہت اچھے ماحول میں کھانا کھایا گیا ماسوائے مہر ماہ کے سب ہی کے چہرے خوشی سے معمور اور دل چین سے مزین تھے۔ ایک وہی تھی جو بے چینی اور ذہنی پژمردگی کا شکار تھی۔ ہر کوئی نمیر آفندی کو پروٹوکول دینے کے چکر میں تھا۔ تائی جان نے زبان سے تو معذرت کا اظہار نہیں کیا تھا مگر ان کا تمتمایا چہرہ اور متنوع کھانوں سے بھری میز ان کے دل کی اندرونی حالت بتا رہی تھی۔ مہر ماہ کا سرد اور لیا دیا رویہ ملاحہ کو بہت اچھی طرح محسوس ہو رہا تھا اس نے کھانے کے بعد کمرے میں اسے جا لیا۔

"اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے وہ تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔"

"آپی! وہ تم ہی تھیں نا جو نمیر بھائی کو مشورے دیا کرتی تھیں کہ ان سب کی طرح مت بنو۔" ملاحہ نے اسے یاد دلایا۔

"مگر پھر بھی اس نے مجھ سے بدلہ لیا ہے۔"

"معاف کرنا سب سے افضل عمل ہے آپی! نمیر بھائی کو دیکھو... کیا کچھ نہیں سنا اور سہا انہوں نے۔ مگر وقت آیا تو ایک ہی بار میں معاف کر دیا سب کو۔ کسی کے منہ پر کوئی بات نہیں ماری۔"

"اچھا میرا دماغ مت کھاؤ اب۔" مہرو نے اسے جھڑک دیا۔

"اب یہ مت کہنا آپی کہ تم ابھی تک طلال بھائی کو نہیں بھولیں۔" اچانک سوچ کے زیر اثر ملاحہ نے بے اختیار کہا تو مہر ماہ کو غصہ آیا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ طلال کا کیا ذکر ہے یہاں۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ آپی! کہاں تو آغا جان کے سامنے ان کا مقدمہ لڑ رہی تھیں اور اب جبکہ سب نے ان کی حیثیت کو قبول کر لیا ہے تو تم اپنی الگ سے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھ گئی ہو۔" ملاحہ تپی۔

"تو کیا کروں..... چپ چاپ رخصتی کروا لوں۔" وہ اس سے بڑھ کر تپی تھی۔

"مجھے یقین ہے آپی! اگر عام حالات ہوتے تو تم نمیر بھائی کے پروپوزل پر خوشی سے مر ہی جاتیں۔" ملاحہ نے تیقن سے کہا۔

"شٹ اپ۔" مہرو نے اسے گھورا۔

"کوئی اور وجہ بھی تو ہو آپی..... نکاح تو ہو چکا وہ شرمندہ ہیں ازالہ کرنا چاہتے ہیں اپنی غلطی کا۔" ملاحہ زچ آئی۔

"اور یہی میں نہیں چاہتی۔" وہ تڑخ کر کہتی سلیپنگ سوٹ لیے واش روم میں گھس گئی تو ملاحہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

آغا جان کے سامنے وہ خفا سی رہی۔

"مجھے تو بڑی نصیحتیں کر رہی تھیں تم... اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟" آج کل وہ بہت اچھے موڈ میں رہتے تھے۔ وہ پرانے آغا جان تو لگتے ہی نہ تھے۔

"آپ لوگ تو غلطی پر تھے اس لیے سمجھاتی تھی۔ میں تو بے قصور پسی ہوں اس معاملے میں۔" مہر ماہ نے صاف گوئی سے کہا۔

تھی۔ انہوں نے دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا۔ آج وہ سرخرو ہوئی تھیں۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جان!" مبین آفندی سے نمیر سے نگاہ ملانا مشکل تھا تو صدیقہ بیگم....... وہ تو بس زرد رنگت لیے فرش کو گھور رہی تھیں۔ اب کس ہمت سے نظر ملاتیں اس شخص سے جسے وہ ساری عمر ناجائز اولاد ہونے کا طعنہ دیتی آئی تھیں۔

"میں اپنی ماؤں کے ساتھ چلا جاؤں گا یہاں سے۔ آپ کی یہ دولت اور جاہ و حشمت آپ کو ہی مبارک ہو۔ جس کی وجہ سے آپ کا خون سفید ہو رہا ہے۔" نمیر نے سہیل کو مخاطب کر کے سرد لہجے میں کہا اور پھر آغا جان کی طرف پلٹا۔

"میں اس جائیداد کے لالچ میں آیا ہوتا تو جب سب کچھ میرے ہاتھ میں تھا تبھی یہاں سے چلا جاتا۔ مگر میں اس گھر میں اپنا نام اور مقام لینے آیا تھا۔ جو آج مجھے مل گیا..... بہت شکریہ آغا جان!"

اس کی بات نے آغا جان کے اعصاب پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کے بازو بے اختیار ہی وا ہو کر اس کی طرف اٹھے۔ تو اس نے بھی لمحہ بھر کو نہیں سوچا.... نہ ان کے ماضی کے رویے کو اور نہ ہی اپنے ساتھ ہوئی زیادتیوں کو، گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ ان کے بازوؤں میں سمٹا اور پھر وہ مضبوط مرد بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ آغا جان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے.... ندامت کے پچھتاووں کے.... وقار کے بچھڑنے اور موحد کی ناگہانی موت کے..... مگر وہ نمیر وقار آفندی کو اپنے لیے بچا لینا چاہتے تھے اسے ضائع کرنا وہ "افورڈ" نہیں کر سکتے تھے۔ مہر ماہ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی بے اختیار آنسو بہا رہی تھی۔

"ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا بچے! اپنے بوڑھے دادا کو معاف کر دینا۔" آغا جان کے پورے وجود پر لرزہ طاری تھا۔

اناؤں کو کچلنا آسان نہیں ہوا کرتا..... پہلا قدم دل و ذہن پر اور دوسرا انا کے سر پر رکھا جاتا ہے تب کہیں جا کر انسان دوسروں کو بھی انسان سمجھتا ہے۔ نمیر کے مضبوط بازوؤں کا گھیرا ان کے گرد اور تنگ ہوا۔ تو ان کے دل میں سکون کی لہر دوڑتی چلی گئی۔ وہ جان گئے تھے کہ اللہ ہی نہیں اس کے اس بندے نے بھی اسے معاف کر دیا تھا۔ جب بندے معاف کر دیں تو اللہ بھی معاف کر دیا کرتا ہے صدیقہ بیگم چپ چاپ بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ ان کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ اپنی زبان سے نکلے زہر آلود تیروں کی اس سے معافی مانگ پاتیں مگر جب وہ مبین صاحب سے گلے ملنے کے بعد تائی جان کے آگے جھکا تو وہ اس کے سامنے بے اختیار روتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ بیٹھیں نمیر نے فی الفور ان کے دونوں ہاتھ الگ کر کے انہیں شانے سے لگا لیا اور وہ بس ندامت کے آنسو بہائے چلی گئیں۔ ثمرہ کا دل اللہ کے حضور سجدہ ریز تھا۔

آغا جان نے اگلے چند دنوں میں پاور آف اٹارنی واپس لے کر سہیل آفندی کو ان کا بزنس اور جائیداد میں سے حصہ دے کر آفندی ہاؤس سے چلے جانے کا حکم سنایا تو وہ جیسے ہڑبڑا کر حواس میں لوٹے۔

"معاف کر دیں آغا جان! کہاں ٹھوکریں کھاتا پھروں گا۔" وقار آفندی کا احوال ان کے سامنے تھا وہ کہاں اس عمر میں نئے سرے سے اپنا بزنس شروع کر کے اکیلے چلاتے۔ انہیں احساس ہوا کہ بیوی کی پڑھائی ہوئی پٹیاں ان کے پاؤں زمین سے اکھاڑنے والی تھیں۔ وہ بہت وقت پر سنبھلے تھے۔

"ہم سے نصیحت پکڑو سہیل! یہ زمین و جائیداد جاہ و حشمت رشتوں سے بڑھ کر نہیں ہے۔" آغا جان نے ہنکارا بھرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو انہوں نے ندامت سے سر جھکا دیا۔ بیوی کی باتوں میں آ کر وہ جو حماقت کرنے چلے تھے اللہ کا شکر ہے کہ بنا ٹھوکر کھائے ہی نصیحت مل گئی۔ ورنہ شاید وہ بھی وقار کی طرح برباد ہو

"وہ بھی بے قصور ہی تھا مگر سب کی زیادتیاں برداشت کرتا رہا. اور اب سب کو معاف کر دیا۔ خیر......اب تم چاہتی کیا ہو؟" انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

"میں۔" مہر ماہ کا دل لرزا۔

"اسے کہیں اس کا جو دل چاہتا ہے وہ وہی فیصلہ کرے آغا جان! میں اس کی ہمدردی کی بھیک نہیں لینا چاہتی۔"

"ہوں"..... انہوں نے گہری سانس بھری. تو یہ بات تھی۔

"اگر وہ اس رشتے کو نبھا کر اپنی غلطی کا مداوا کرنا چاہتا ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"میں ایک زبردستی کے بوجھ کی طرح کسی کی زندگی میں گھسنا نہیں چاہتی آغا جان! خود کو برداشت کروانا مجھے میری ہتک محسوس ہوتا ہے۔ اس نے جو کیا میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسے کہیں وہ اپنی من مرضی کا آزادانہ فیصلہ کرے۔" مہر ماہ نے لہجے کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے بمشکل اپنے دل کی بات کہی۔

"ٹھیک ہے.... میں بات کرتا ہوں نمیر سے۔" آغا جان شاید اس کا مطمع نظر جان گئے تھے۔ وہ ان سے اجازت لے کر باہر نکلی تو کوریڈور کے ساتھ موڑ پر ہی کسی نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹ لیا اس کے منہ سے چیخ نکلتے ہوئے رہ گئی۔

"یہ کیا پراپیگنڈہ شروع کیا ہوا ہے تم نے میرے خلاف؟" وہ اسے گھور رہا تھا اور مہر ماہ اپنے بازو کو مسلتی شرم دلانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی.

"مجھے تمہارے ترس اور رحم کی بھیک نہیں چاہیے سمجھے تم۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"بھیک......" وہ لمبا سا کھینچ کر بولا۔ "یہ کس عقل مند نے کہا ہے تم سے؟"

"میں بے وقوف نہیں ہوں" وہ ناراضی سے بولی. نمیر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اچھا... تو یہ تم نے سوچا ہے کہ میں تم پر ترس کھا رہا ہوں کیوں کہ تم لنگڑی ہو سنائی اور دکھائی نہیں دیتا تمہیں۔" وہ مسکراہٹ چھپاتا طنزیہ بولا تو وہ ہول اٹھی۔

"اللہ نہ کرے۔"

پھر اسے جتاتے ہوئے بولی۔

"تم نے ہر بار مجھے یہی کہا ہے کہ تم اپنی غلطی کو سدھارنا چاہتے ہو اپنی غلطی کا مداوا کرنا چاہتے ہو......یعنی میں تمہاری ایک غلطی ہوں جسے تم سدھارنا چاہتے ہو۔"

"کچھ خوب صورت غلطیاں بھی تو ہوتی ہیں۔"

نمیر جو حیران و پریشان اسے دیکھ رہا تھا جلدی سے بولا۔

"میں کسی۔ کہانی کی ہیروئن نہیں ہوں جو تمہارے چکنے چپڑے ڈائیلاگز اور شاعری پر مرتے ہوئے تمہیں معاف کر کے اپنا ہیرو مان لوں گی آزادانہ فیصلہ کرو جو بھی کرنا ہے۔" دیوار کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے وہ تخی سے بولی۔

"آزادانہ......؟" نمیر نے کہتے ہوئے گہری سانس بھری اور اس کے دائیں بائیں دیوار پر ہاتھ جمائے ذرا سا جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"یہ پور پور اذیت میں ڈالتے ہوئے تم
سانس سانس محبت پکارتا ہوا میں"

مہر ماہ کی سانس تھم سی گئی۔

"آزاد چھوڑا ہی کہاں ہے تم نے.... نہ مجھے نہ اس کمبخت دل کو. اب اس دل سے تمہاری محبت کو نکالتے نکالتے مر جاؤں گا تب یقین کرو گی میرا؟" مدھم لہجے میں شدت سمو کر کہا تو اس کے رہے سہے حواس بھی گم ہونے لگے۔ پلکیں یوں بوجھل ہوئیں جیسے ان پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔

"اُف... فضول باتیں مت کرو..... پیچھے ہٹو اور راستہ چھوڑو میرا۔"

"ایسے کیسے.... معافی تو مانگ لوں اپنے کیے اور کہے کی۔" وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ نرمی سے بولتا اس کی طرف جھکا تو مہر ماہ نے بوکھلا کر اس کے سینے پر ہاتھ جما کر جلدی سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں میں نے بنا معافی مانگے ہی تمہیں معاف کر دیا ہے۔"

"اتنی جلدی....؟" اس کی ہوائیاں اڑتی دیکھ کر نمیر نے بامشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ "میں چاہتا ہوں کہ اچھی طرح اپنے کیے کا ازالہ کروں پھر تم مجھے معاف کرو۔" اس کے گال پہ آئی بالوں کی لٹ کو اس کے کان کے پیچھے اڑسا تو وہ جیسے جھرجھری لے کر بیدار ہوئی اور جھک کر اس کے بازو کے نیچے سے نکل گئی۔

"مہر...!" وہ بے قرار ہوا۔

"میں اس نکاح کو نہیں مانتی نمیر وقار آفندی!" وہ سنجیدہ تھی. نمیر نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"یوں قسطوں میں جان مت نکالو یار. اللہ کی قسم دل سے چاہنے لگا ہوں تمہیں۔ ایسے ہی تو نمیر وقار ہونے کے باوجود ذلیل نہیں ہوتا رہا تمہارے پیچھے۔" وہ مسکین بنا تو وہ جو اس سے اس پل سارے بدلے لے لینا چاہتی تھی بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تو پھر......" نمیر نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب کرنا چاہا۔

"تیسرا نکاح......" مہر ماہ نے کہا تو وہ ٹھٹکا۔

"کیا مطلب.....؟"

"میں واقعی ہمارے اس نکاح کو مشکوک سمجھتی ہوں نمیر وقار آفندی! جو کسی سرپرست کی موجودگی کے بغیر ہوا تھا۔ دوسرا نکاح موحد کی آئی ڈی کے ساتھ ہوا وہ تو ہے ہی باطل..... اب تیسرا اور فائنل نکاح ہوگا ساری فیملی اور تمہارے رئیل آئی ڈی کارڈ کے ساتھ۔"

"اُف......" نمیر نے بے اختیار دو انگلیوں سے اپنا ماتھا چھوا. تو وہ اپنی ہنسی دباتی جلدی سے بھاگ گئی۔

☆☆☆

مگر پھر آفندی ہاؤس میں وہ شام اتری جس میں سب گھر والوں کی موجودگی میں دوبارہ سے نکاح خواں کو بلا کر نمیر اور مہر ماہ کو نکاح کے بندھن میں باندھا گیا. زرنگار کو پورے ادب و احترام کے ساتھ لا کر دولہا دلہن کے ساتھ بٹھایا گیا۔ ملائکہ اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ شارجہ سے آ پہنچی۔

"نکاح پر نکاح کیے جا رہی ہو کسی ایک نکاح میں تو شریک ہو جاؤں۔" وہ فون پر ہنسی تھی۔

"پہلی بار ایسا دولہا دیکھا ہوگا سب نے جو تیسری بار ایک ہی لڑکی کے ساتھ نکاح کروا رہا ہے۔" خوشی اور بے فکری کی تمتماہٹ چہرے پر لیے وہ نکاح کی مبارکباد وصول کرتا دلہن بنی مہر و کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا تو سبھی اس کی بات پر ہنسنے لگے۔

☆☆☆

اور اب...... وہ مہر ماہ کے سامنے اس کی عدالت میں حاضر تھا.

"میں تو تمہارے رعب حسن سے گھائل ویسے ہی مرنے والا ہوں پھر بھی اگر تم نے میرے لیے کوئی سزا سوچ رکھی ہے تو تم سزا دے کر اپنے دل کو تسکین پہنچا سکتی ہو۔" وہ واقعی دلہن بن کر بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور کچھ بے انتہا چاہے جانے کا خیال..... نمیر کی نگاہ اس کے چہرے سے ہٹتی نہ تھی۔

"ہاں.... سزا سوچی تو ہے۔" وہ ہلکا سا کھنکھار کر گویا ہوئی تو نمیر نے اس کا مہندی والا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کیا....؟" بے چینی سے پوچھا۔

"یہی کہ....... تم تمام عمر اپنی غلطی کی معافی مانگتے رہو گے اور میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ کسی سلطنت کی ملکہ جیسے شاہانہ انداز میں بولی۔

"اف.... ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے بچا ہے۔"

وہ دل پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس لیتا بستر پر گر سا گیا۔ مہر ماہ منہ پر ہاتھ رکھے بے ساختہ ہنسنے لگی۔ نمیر کی ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

اللہ کی رضا کے لیے دوسروں کو معاف کرنے والے یوں ہی نوازے جاتے ہیں ان کے دامن کبھی خوشیوں سے خالی نہیں رہتے۔



السلام علیکم قارئین!

آج خواب شیشے کا تمام ہوا اور سب کرداروں کو ان کے خوابوں کی تعبیریں مل گئیں۔ آپ سب سے تقریبا اڑھائی سال کا ساتھ رہا اس دوران آپ سب کی پسند و ناپسند اور محبتیں ہر ماہ مجھ تک آپ کے خطوط کے ذریعے پہنچتی رہیں۔ اس دوران کئی فیز زندگی میں آئے خوشیاں، پریشانیاں، غم۔ مگر آپ سب کی حوصلہ افزائی ہر ماہ پھر سے اگلی قسط کی لیے تیار کر دیتی تھی۔ احتل کا خصوصی شکریہ جنہوں نے قسط کے سلسلے میں ہونے والی دیر سویر کو اتنے عرصے تک مینج کیے رکھا۔ ناول ختم ہوا مگر زندگی کی کہانیاں ختم نہیں ہوتیں جب تک زندگی باقی ہے ان شاء اللہ دیگر تحریروں کے ذریعے آپ سب سے محبتوں بھرا یہ رابطہ جاری و ساری رہے گا۔ اللہ اس ادارے کو ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رکھے اور آپ سب کو خوش اور آباد رکھے۔ آمین۔

آپ سب کی

عفت سحر طاہر

صائمہ اکرم چوہدری

شہر زاد

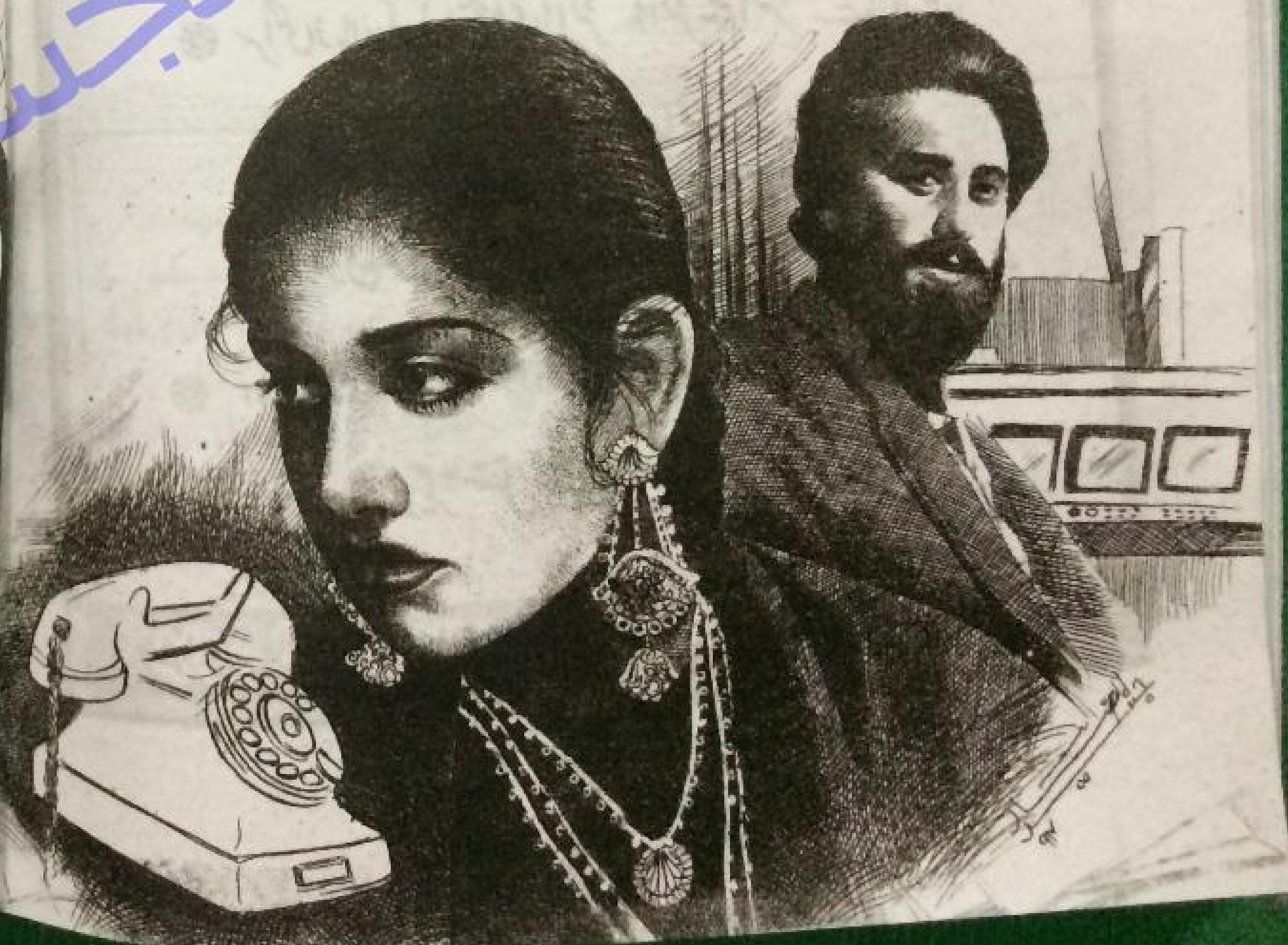
شہر زاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے' ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام درشہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو، تو ان کے دونوں بچے نمیرہ اور



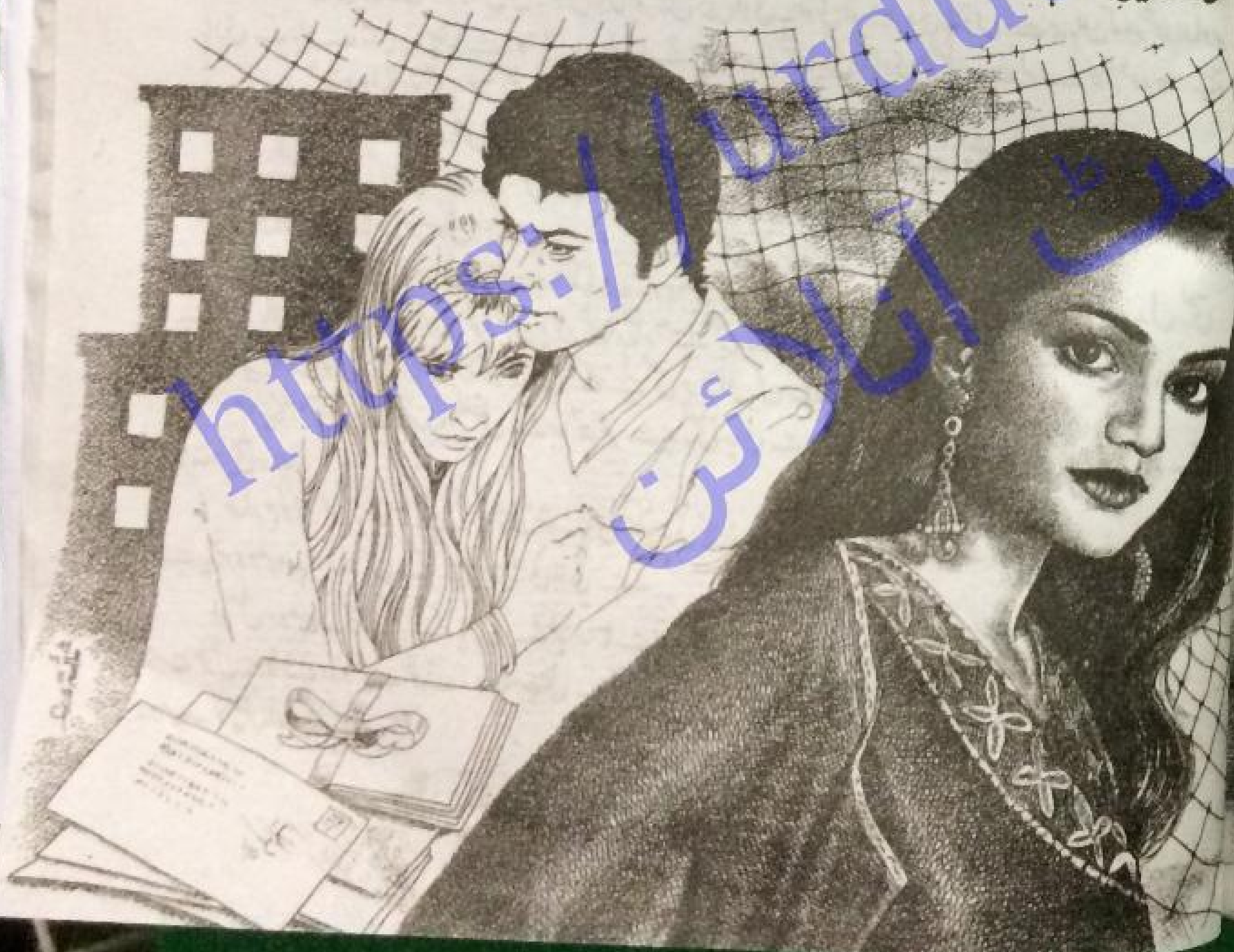
ل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور درشہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر ما گا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔ انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا ردرویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔ پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہر زاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہر زاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہر زاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہر زاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور درشہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہر زاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔ درشہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتے ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔



یہ جان کر کہ مناہل، ہادی کی بہن ہے درشہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ مناہل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے انابیہ کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی، شہزاد کے پاس سمجھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے مشتعل ہو کر ثنا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے، اس بار پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا، ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیصہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے، شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے، ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درشہوار مزید بری لگتی ہے۔

انابیہ، درشہوار اور مناہل کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور درشہوار اور برہان کے ساتھ بے رخی سے پیش آتی ہے جسے وہ دونوں بہت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد کے برابر میں گھر لینے پر مونیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔

صندل کے گھر والے، شہزاد کے چوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی حوالے سے وہ شہزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

مسز قریشی کے ڈنر میں برہان اور درشہوار کو دیکھ کر ہادی کو دھچکا لگتا ہے۔ وہ مناہل کو اشاروں میں برہان سے دور رہنے کا کہتا ہے مگر وہ اس کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ طوبیٰ اور نمیرہ کی باتوں سے برہان کو درشہوار اور ہادی کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ اپنی ماں کو بتاتے ہیں اور درشہوار کی شادی ارسل سے کرانے کا مشورہ دیتے ہیں، اس رشتے پر داجی کو بھی اعتراض نہیں۔

ہم زاد، شہزاد کو اپنی فیملی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارسل کی کوششوں سے روحیل کا دوست صارم خان، رومیصہ کے حق میں گواہی دیتا ہے جس سے کیس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ منال کو یونی ورسٹی میں برہان اور انابیہ کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔

برہان کی شادی کا مناہل کو سخت برا لگتا ہے۔ وہ دبئی جانے لگتی ہے مگر ہادی کے سمجھانے پر اپنا ارادہ بدل لیتی ہے۔ برہان اور تاج دار بیگم کی خواہش پر درشہوار کا رشتہ ارسل سے اور شاہ میر کا رشتہ نمیر سے طے کر دیا جاتا ہے۔ داجی کا یہ فیصلہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی پریشان کن ہے۔

مونیکا امتحان دے کر ذوالکفل کے ساتھ عمرے پر چلی جاتی ہے اور گھر والوں کو شادی اور اسلام قبول کرنے کا بتا دیتی ہے۔

صارم کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ ہم زاد، شہزاد کی سیکیورٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ رومیصہ کو ڈاکٹر خوش خبری سناتا ہے یہ خبر رومیصہ اور ارسل کے لیے پریشانی لاتی ہے۔

ارسل رومیصہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے تو وہاں پتا چلتا ہے کہ رومیصہ ماں بننے والی ہے۔ ارسل بہت خوش ہوتا ہے، رومیصہ خوف زدہ ہو جاتی ہے آگے کا سوچ کر وہ بچہ ختم کرانے کا کہتی ہے۔ ارسل غصے میں رومیصہ کو تھپڑ مار دیتا ہے۔

میر ہاؤس میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں، درشہوار سب سے بدتمیزی کرتی ہے۔

برہان، مناہل کے اچانک غائب ہو جانے پر پریشان ہیں۔ وہ سعد سے ملتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ اسے ان کی شادی کے بارے میں پتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ بات تو ہادی اور مناہل کو بھی پتا ہے۔

سعد کو اچانک مناہل میں دلچسپی ہو جاتی ہے۔

شیری رضا سے میجر توصیف کے بارے میں پوچھتی ہے وہ دراصل ہم زاد کا راز جاننا چاہتی ہے۔ ہم زاد شیری کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کی سیکیورٹی کی جانچ کے لیے آتا ہے اور شیری کے پسندیدہ پرفیوم کی بوتل لے جاتا ہے۔

درشہوار، ارسل کے کمرے میں جا کر بدتمیزی کرتی ہے اور اس کے کمرے کا سامان توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ برہان اور تاجدار بیگم معاملہ سنبھالتے ہیں۔ درشہوار ہادی کو فون کر کے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

شیری، ارتضیٰ کے ساتھ، صارم کے والد سے بات چیت کرنے جاتی ہے۔ راستے میں ہم زاد کی کال آتی ہے کہ ان کی گاڑی کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور ارتضیٰ ان کا نشانہ ہے۔ ہم زاد، شیری کو گاڑی سے اترنے کا کہتا ہے کہ......

ہم زاد شہریار کو فون کرتا ہے کہ ارتضیٰ کی گاڑی سے اتر کر وہ ان کی گاڑی میں آ جائے۔ اسی دوران ان کے پیچھے پڑے لوگ فائر کھول دیتے ہیں اور ارتضیٰ زخمی ہو جاتا ہے۔ شہزاد کے پاؤں پر بھی چوٹ لگتی ہے۔

اٹھارویں قسط

میر ہاؤس — میں آنے والا طوفان اب ہادی کے گھر میں ڈیرا جما کر ان سب کے ہوش اڑا چکا تھا۔

ہادی ماں باپ کے ساتھ ایک طویل بحث کے بعد اکتا کر اپنے کمرے میں آ گیا، اسے اب درشہوار کے ساتھ ساتھ اپنے والدین پر بھی سخت غصہ آ رہا تھا جو اس کے بجائے اس انجان لڑکی کی باتوں پر اعتبار کیے جا رہے تھے۔ جس نے ان سب کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔

ایک بار تو ہادی کا دل چاہا وہ درشہوار کو اٹھائے اور مری کے سب سے اونچے پہاڑ سے دھکا دے دے تاکہ اس کی ہڈیوں کا سرمہ بن جائے، وہ کسی بھی قیمت پر اس سے نکاح کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ اس نکاح کا دوسرا نام ساری زندگی کا سمجھوتا ہے اور اس خود غرض لڑکی کی ویسے ہی اس کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ اس واقعے کے بعد تو اسے شدت سے اس سے نفرت اور بیزاری محسوس ہو رہی تھی۔

”آخر ممی، پاپا میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔“ ہادی کا خون بری طرح سے کھول اٹھا۔

”کیا مجھے ارسل کو کال کر کے یہ ساری صورت حال بتا دینی چاہیے۔“ اس کا سیل فون کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ وہ کوئی جذباتی قدم اٹھا کر اپنے والدین کے لیے مشکلات کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اسے اپنی تو کوئی پروا نہیں تھی لیکن والدین پر کوئی آنچ آئے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے جھنجھلا کر فون بیڈ پر پٹخنے کے انداز میں پھینکا۔

تقدیر کو بھی شاید اس پر رحم آ گیا جو سعد بغیر بتائے گھر واپس لوٹ آیا۔ مسز عالیہ قریشی اور عبداللہ صاحب کی موجودگی نے جہاں اسے خوش گوار حیرت میں مبتلا کیا، وہیں ان کی آمد کا اصل مقصد پتا چلتے ہی اس کے چہرے کے زاویے بگڑے۔

”آئی ایم سوری آنٹی! آپ نے یہ سوچا بھی کیسے کہ ہادی اس لڑکی کے ساتھ کوئی فلرٹ یا کمٹمنٹ کرے گا؟ کیا آپ کو اپنی تربیت پر بھروسا نہیں؟“ سعد کی بات نے مسز عالیہ قریشی کو الجھن میں مبتلا کیا۔ جبکہ سعد ان کے اندرونی جذبات سے بے خبر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔

”ہادی مر جائے گا لیکن درشہوار جیسی لڑکی کو اپنا لائف پارٹنر کبھی نہیں بنائے گا۔“ لاؤنج کی سیڑھیوں کے

پاس کھڑی درشہوار نے یہ جملہ بقائمی ہوش وحواس سنا اور اس کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میں اسے کسی کی بیٹی کے ساتھ ناحق زیادتی کرنے بھی نہیں دوں گا۔'' عبداللہ قریشی صاحب ناراضی سے گویا ہوئے۔

''زیادتی آپ اس لڑکی کے ساتھ نہیں اپنی سگی اولاد کے ساتھ کر رہے ہیں، آپ کو ہادی کی بات کا یقین کرنا چاہیے۔'' سعد اب کھل کر اپنے دوست کا مقدمہ لڑ رہا تھا اور درشہوار کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے کھڑے کھڑے گولی مار دیتی۔

''کوئی لڑکی اتنا بڑا اقدم کیسے اٹھا سکتی ہے۔ یقیناً اس بے وقوف کی طرف سے اسے کوئی نہ کوئی رسپانس تو ملا ہی ہوگا؟'' مسز عالیہ قریشی کا دماغ اب دوسرے نکتے پر چلنا شروع ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اپنی بھرپور تسلی کرنا چاہتی تھیں۔

''درشہوار جیسی لڑکی، جو بن بلائے کسی کے ہاں گھس سکتی ہے، ان کے دروازوں پر لگے لاک میں ایلفی ڈال سکتی ہے، جو عین اپنی شادی والے دن سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے گھر سے بھاگ سکتی ہے، آپ کو اس سے کسی بھی چیز کی توقع کر لینی چاہیے۔'' سعد نے درشہوار کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی۔ درشہوار کا چہرہ ذلت کے احساس سے سرخ ہوا۔

''سعد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں کھل کر اس بات کی تحقیق کرنی چاہیے، ایسا نہ ہو، ہم انجانے میں اپنے بیٹے کے ساتھ کوئی زیادتی کر جائیں۔'' عبداللہ صاحب کو سعد کی باتوں نے کافی حد تک قائل کر لیا تھا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے پھر اس لڑکی کا کیا کریں؟'' مسز عالیہ قریشی کو اگلی پریشانی نے گھیرا۔

''کرنا کیا ہے، اس کے گھر والوں کو بلوائیں یا میں ارسل سے بات کرتا ہوں وہ آ کر لے جائے گا اسے۔''

سعد کی اس بات پر درشہوار کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی ان سب کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''آپ لوگ مجھے کسی دارالامان میں چھوڑ دیں لیکن میں اپنے گھر نہیں جاؤں گی، وہ لوگ زندہ زمین میں گاڑ دیں گے مجھے۔'' درشہوار کے جذباتی انداز پر مسز قریشی نے چونک کر اس لڑکی کی طرف دیکھا اور اس کے باغیانہ انداز نے سعد کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق کر دی۔

''دیکھو بیٹا! جو بھی بات ہے، سچ سچ بتا دو۔'' مسز قریشی نے ذرا نرم انداز اپنایا۔

''جو سچ تھا، میں نے آپ لوگوں کے سامنے کہہ دیا۔'' وہ ابھی بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

''درشہوار جھوٹ مت بولو، مجھے ایک سنگل میسج یا کوئی ایسی چیز دکھا دو جس میں ہادی نے تم سے ایسا کوئی وعدہ کیا ہو۔؟'' سعد ایک دم بھڑک اٹھا۔

''میں آپ کو کیوں دکھاؤں؟'' وہ جھنجلا اٹھی۔

''کچھ ہوگا تو دکھائیں گی ناں۔'' سعد استہزائیہ انداز میں گویا ہوا، اور اس بار تو مسز قریشی کو بھی اس کی بات کا یقین آ گیا۔ جبکہ درشہوار کھا جانے والی نظروں سے سعد کی طرف دیکھ رہی تھی جس نے آ کر رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا۔

''میرا خیال ہے، ہمیں اسلام آباد کے لیے نکلنا ہوگا، وہاں جا کر دیکھتے ہیں کہ اس بچی کا کیا کرنا ہے۔'' عبداللہ صاحب نے اپنی بیگم کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ فوراً جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، مجھے بھی شیری کی دو دفعہ کال آ چکی ہے، آفس سے، ایک ضروری کیس پر ڈسکشن کرنی ہے اس نے۔''

''انکل! آپ لوگ ابھی مری سے مت نکلیں۔''

سعد کی بات پر وہ دونوں چونکے جو اپنی بات کی وضاحت کر رہا تھا۔ ''درشہوار کا اس وقت آپ کے ساتھ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ رات کے اندھیرے میں آپ لوگ یہاں سے جائیں تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکیں۔''

وہ جانتا تھا میر ہاؤس کے لوگ اس وقت پاگلوں کی طرح درشہوار کو تلاش کر رہے ہوں گے اور ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ اس وقت ان کی بغل میں واقع گھر میں موجود لوگوں کا بھی سکون غارت کر چکی ہے۔

''سعد ٹھیک کہہ رہا ہے قریشی صاحب! ہمیں عشاء کی نماز کے بعد نکلنا چاہیے یہاں سے۔'' مسز قریشی نے بھی محتاط ہونے میں ہی عافیت جانی تو عبداللہ صاحب نے بھی اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

''آنٹی! میں ذرا ہادی سے مل کر آتا ہوں۔'' سعد آہستگی سے اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

درشہوار سیڑھیوں کے پاس ہی کھڑی تھی، اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بھنچی ہوئی اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ سعد نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی۔

وہ جانتا تھا، وہ اس وقت کس قسم کی کھولن کی زد میں ہے، لیکن معاملہ اس کے بہترین دوست کے کردار کا تھا۔ وہ اسے کسی بھی قیمت پر درشہوار کی سازش کا شکار ہونے نہیں دے سکتا تھا۔ سعد نے ہادی کے کمرے میں پہنچتے ہی سارا واقعہ تفصیل سے بتایا۔

''خدا کی قسم یار! آج تو تم فرشتہ بن کر آئے ہو میرے لیے، ورنہ اس چھٹانک بھر کی لڑکی نے بگنی کا ناچ نچا رکھا تھا ہم سب کو۔'' ہادی کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوا۔

''اتنی بھی پھنے خان نہیں ہے وہ، جتنا تم سب لوگوں نے اسے سمجھ لیا ہے۔'' سعد کے لہجے میں طنز کی آمیزش شامل ہوئی۔

''بات اس کی پھنے خانی کی نہیں، میرے پیرنٹس کی نیک نامی کی ہے اور اس گھٹیا لڑکی کا کیا پتا، میرے ساتھ ان پر بھی کوئی الزام لگا دے، مجھے اب اس سے ہر چیز کی توقع ہے۔'' ہادی کے ہونٹوں پر زہر آلود مسکراہٹ تھی۔

''بے فکر رہو، آنٹی اور انکل اتنے بھی بچے نہیں، اب وہ اپنے طریقے سے سارا معاملہ نبٹائیں گے، تم شکر کرو وہ زبردستی کا نکاح ٹل گیا اور مجھے دعائیں دو، ورنہ میرے آنے تک تمہاری پوزیشن بدل جانی تھی۔'' سعد شرارت سے ہنسا۔

''خدا کی قسم ایسے لگ رہا ہے جیسے ٹھنڈے پانی کی یخ بستہ بوندیں میرے سلگتے ہوئے اعصاب پر آن گری ہوں۔ تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا میں۔'' ہادی نے ممنون نگاہوں سے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔

''اس احسان کا بدلا تمہیں چکانا ہوگا، میں بخشوں گا نہیں۔'' سعد کے دماغ کی اسکرین پر مناہل کا چہرہ روشن ہوا تو وہ مسکرا دیا۔

''ارے بے فکر رہ میرے دوست۔'' وہ اب پرسکون ہو چکا تھا۔

دوسری طرف مسز قریشی اور عبداللہ صاحب لاؤنج میں بیٹھے ہوئے سعد کی باتوں پر جیسے جیسے غور و فکر کر رہے تھے۔ انہیں درشہوار کی باتوں میں موجود تضاد صاف دکھائی دے رہا تھا، اگر واقعی ہادی اور درشہوار کے درمیان میں ایسا کوئی تعلق ہوتا تو ہادی جتنا بھی اس سے خفا ہوتا، کم از کم نکاح سے انکار نہ کرتا اور اب تو مسز قریشی

کو اس بات کی بھی شرمندگی تھی کہ انہوں نے ایک لڑکی کے کہنے پر اپنے بیٹے کو فوراً کٹہرے میں لا کھڑا کیا، وہ جانتی تھیں کہ یہ مسئلہ کوئی چھوٹا نہیں تھا لیکن اسے عقل مندی سے ہینڈل کرنے میں ہی عافیت تھی۔

اس رات مسز قریشی، عبداللہ صاحب کے ساتھ درشہوار کو خیریت سے قریشی ہاؤس لانے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ درشہوار بظاہر دل ہی دل میں کھول رہی تھی۔ لیکن امید کا دامن اس نے ابھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ اس ستم گر کے گھر میں تو آ ہی چکی ہے اور اس کے دل کے دروازے بھی کبھی نہ کبھی تو اس کے لیے کھل ہی جائیں گے۔

☆☆☆

پریس کلب میں شہر بھر کے جرنلسٹ موجود تھے۔

شہزاد نے مسز قریشی کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد صندل کے کیس کو میڈیا پر لانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے جب مسز قریشی کے ساتھ اس کیس کی تفصیلات کو ڈسکس کیا تو انہوں نے فوراً اسے منظر عام پر لانے کی تلقین کی۔

اس کے پیچھے مسز قریشی کی اپنی بھی تھوڑی سی خود غرضی شامل تھی، انہیں یقین تھا کہ جیسے ہی صندل کیس میڈیا پر آئے گا، میر حاکم علی کے خاندان کی ساری توجہ درشہوار کو چھوڑ کر اس کی جانب مبذول ہو جائے گی اور اس عرصے میں وہ کوئی نہ کوئی راستہ اختیار کرلیں گی، وہ حاکم کے خاندان سے کسی مناسب طریقے کے ساتھ جان چھڑانا چاہ رہی تھیں تاکہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

شہزاد نے رشیدہ مائی، اور اس کے شوہر کو اچھی طرح سے بریفنگ دینے کے بعد اس پریس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا، مسز قریشی بھی اس کے ساتھ موجود تھیں اور اسی وجہ سے میڈیا بھی اسے اچھی خاصی کوریج دے رہا تھا۔

جیسے ہی رشیدہ مائی نے شہزاد کے حفظ کروائے ہوئے بیان کو میڈیا کے سامنے بیان کرنا شروع کیا، اگلے ہی پانچ منٹ میں تمام چینلز پر اس کے ٹکر چلنے لگے، میر حاکم جو کہ انجائنا اٹیک کا بہانا کرکے بیڈ ریسٹ پر تھے، ان کو تو لگا تھا جیسے کسی نے ان کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا ہو، انہیں اس پریس کانفرنس کی اطلاع ایک قریبی دوست نے دی اور جیسے ہی انہوں نے ٹی وی آن کیا، اپنے خاندانی ملازم بہادر علی کو اپنے خلاف بولتے دیکھ کر ایک لمحے کو ان کا بھی دماغ کام کرنا چھوڑ گیا، انہوں نے بامشکل خود کو سنبھالا اور اپنے بیٹے محتشم کا نمبر ملایا۔

"وہاج کہاں ہے محتشم؟ اس سے فوراً بات کرواؤ میری۔۔"

"وہ تو درشہوار کی تلاش میں گیا ہوا ہے کسی قریبی گاؤں میں۔" محتشم صاحب نے گھبرا کر جواب دیا۔

"لعنت بھیجو درشہوار پر۔" وہ حلق کے بل چیخ کر بولے تو محتشم صاحب کے اپنے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔

"سب ٹھیک تو ہے ناں بابا جان؟"

"ذرا ٹی وی چلا کر دیکھو، وہ بے غیرت بہادر علی کیسے ہمارے خاندان کی عزت کی دھجیاں بکھیر رہا ہے، یہ سازش ہوئی ہے ہمارے خلاف۔" میر حاکم نے تو ان کے اچھے خاصے ہاتھ پیر پھلا دیے، وہ تو شکر ہے وہ اس وقت ٹی وی لاؤنج میں ہی تھے، انہوں نے فوراً ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آن کیا اور اس کے ساتھ ہی ان کا دماغ بھی بھک کرکے اڑ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بابا جان؟" ان کے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"یہی تو پوچھنا ہے وہاج سے، فوراً اس سے رابطہ کرو، اور اس سے کہو میڈیا کے کسی بندے کی کال لینے کی

ضرورت نہیں، پہلے مجھ سے بات کرے وہ۔"

وہ اپنے آپ کو سنبھال کر اب اگلے احکامات دے رہے تھے، جبکہ محتشم علی کی نگاہ ٹی وی اسکرین پر رشیدہ مائی کے ساتھ بیٹھی ہوئی شہزاد پر جمی ہوئی تھی، جس کے چہرے پر ایک مبہم سی فاتحانہ مسکراہٹ تھی، جیسے وہ اس وقت دل ہی دل میں ان کے خاندان کی حالت کا اندازہ کرکے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

"یہ لڑکی وہی ہے ناں جس نے پہلے شجاع غنی کیس میں بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔" میر حاکم کا اشارہ شہزاد کی طرف تھا اور محتشم علی کے جسم کا سارا لہو سمٹ کر ان کے چہرے پر آگیا۔ انہیں بھی اندازہ ہوگیا کہ مہرے وہی ہیں لیکن چال بدل چکی ہے۔

میر ہاؤس کی ساری خواتین آہستہ آہستہ ٹی وی لاؤنج میں اکٹھی ہوگئیں جہاں محتشم ایک ہاتھ میں سیل فون پکڑے اور دوسرے سے ریموٹ کنٹرول تھامے ساکت نظروں کے ساتھ اپنے سب سے بڑے بیٹے وہاج کی بے غیرتی کی داستان سن رہے تھے۔

تاج دار بیگم تو صدمے کے مارے سینے پر ہاتھ رکھ کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں جبکہ ندرت بیگم کے چہرے پر پھیلنے والی استہزائیہ مسکراہٹ کو ان کی سوتن شارقہ بیگم نے بڑے غور سے دیکھا۔ نمیرہ کی پھٹی پھٹی نگاہیں بھی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور محتشم صاحب سیل فون کان سے لگائے بمشکل اپنے والد سے بات کر رہے تھے۔

"بابا جان! بھلا کیسے ممکن ہے یہ، جھوٹ بول رہا ہے بہادر علی کا خاندان۔۔۔" میر محتشم تو ابھی تک درشہوار کے صدمے سے ہی نہیں سنبھلے تھے، اس اسکینڈل نے تو ان کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دینی تھی۔ اس لیے ان کے ہاتھوں کے صحیح توتے اڑے تھے۔

"اس کی وکیل کے پاس پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے، تم وہاج کو فوراً بلواؤ، پوچھو اس سے، کیا معاملہ ہے۔" میر حاکم فون بند کرچکے تھے۔ میر محتشم نے پریشان نظروں سے تاجدار بیگم کی طرف دیکھا جو صدمے کی سی کیفیت میں مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔

"آپ کال کریں بہادر علی کو اور پوچھیں کیوں نمک حرامی کر رہا ہے اس کا خاندان۔۔"

"اس سے پہلے میں تمہارے لخت جگر سے تو پوچھ لوں۔" انہوں نے گھبرا کر وہاج کا نمبر ملایا جو آف جا رہا تھا، ان کا ماتھا ٹھنکا۔ ایسے موقعے پر سیل فون بند ہونے کا ایک ہی مطلب تھا، ورنہ اب تک تو وہاج خود فون کرکے ایک طوفان کھڑا کرچکے ہوتے۔ محتشم علی نے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ صوفے پر اچھالا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہال کمرے سے نکل گئے۔

نمیرہ بھاگ کر پانی کا گلاس لے آئی اور زبردستی تاجدار بیگم کے منہ سے لگایا، جن کے چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی۔

"سچ کہتے ہیں سیانے، اولاد بھی نری آزمائش ہی ہوتی ہے۔۔۔" ندرت چچی نے اپنی جیٹھانی کی طرف دیکھ کر طنزیہ آہ بھری۔

"اللہ کا خوف کرو ندرت، یہ کوئی موقع ہے ایسی باتیں کرنے کا۔" شارقہ بیگم کی تمام تر ہمدردیاں تاجدار بیگم کے ساتھ تھیں جو اب ان کی سمدھن بھی تھیں۔ اسی وقت محتشم علی گاڑی کی چابی لے کر اپنے کمرے سے نکلے اور ایک سرد نگاہ تاجدار بیگم پر ڈالی۔

"میرا وہاج ایسا نہیں ہے، اس کے خلاف سازش ہوئی ہے یہ۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر جذباتی انداز میں کھڑی ہوئیں۔

''بکواس بند کرو، تمہیں تو اپنی بے حیا بیٹی بھی ایسی نہیں لگتی تھی، جو زمانے بھر کی خاک ہمارے سروں میں ڈال کر چلی گئی۔ قصور تمہاری اولاد کا نہیں تمہاری تربیت کا ہے۔'' انہوں نے کسی کا بھی لحاظ کیے بغیر اپنی بیوی کو جھاڑ دیا اور ہال کمرے سے نکل گئے۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں بھابھی! کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے، ایسے ہی تو بہادر علی کا خاندان راتوں رات گھر چھوڑ کر نہیں چلا گیا تھا۔'' ندرت بیگم نے بھی آج ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

''وہ منحوس صندل کہیں اور سے بھی تو منہ کالا کر کے آسکتی ہے۔''

شارقہ بیگم نے اپنی سوتن کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا، جبکہ سیڑھیاں اترتی ہوئی طوبیٰ کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ دوڑی۔ اسے بھی اس سانحے کی خبر ہو چکی تھی اور اس کی تمام تر ہمدردیاں صندل کے خاندان کے ساتھ تھیں کیونکہ میر ہاؤس میں صرف وہی اس بات کی گواہ تھی کہ وہاج نے حقیقتاً صندل کے ساتھ زیادتی کی تھی۔

''میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے، نمیرہ! نمبر ملاؤ وہاج کا۔''

''ممانی جان نمبر بند جا رہا ہے۔'' اس نے پریشانی سے جواب دیا۔

''ایسے ہی تو کوئی اپنا نمبر بند کر کے نہیں بیٹھتا۔'' ندرت بیگم کی بڑبڑاہٹ اتنی بھی مدھم نہیں تھی کہ وہ تاجدار بیگم کی سماعتوں تک نہ پہنچتی۔ انہوں نے دل ہی دل میں ندرت سے کسی اور موقعے پر بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی۔

☆☆☆

مری کے آسمان پر بکھری ہوئی بیر مئی اور سیاہ بدلیوں کو ایک دم ہی جوش آیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل کا سماں ہو گیا، میر وہاج جو اس وقت اپنے ایک قریبی دوست حیدر کے ڈیرے پر موجود تھے جب انہیں صندل کے والدین کی پریس کانفرنس کی اطلاع ملی۔ ان کو ایسا لگا جیسے ان کو کسی نے گہری کھائی میں دھکا دے دیا ہو۔

ان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سنگ مرمر کا سفید کپ چھوٹا اور سارا قہوہ پتھریلی زمین پر جا گرا۔ وہ لمحہ آچکا تھا جس سے وہ اتنے عرصے سے کسی آسیب کی مانند ڈرتے آئے تھے۔ یہ وہ گناہ تھا، جس کا عذاب اللہ نے دنیا میں ہی ان کے لیے تیار کر لیا تھا۔

وہ جو سمجھتے تھے کہ صندل کی موت کے ساتھ ہی ان کے ظلم پر بھی پردہ پڑ گیا اور ان کے علاوہ بھلا کون یہ حقیقت جانتا تھا لیکن انہیں علم نہیں تھا کہ گناہ گونگے نہیں ہوتے، جب بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ مکافاتِ عمل بن کر ایک دم ہی اس انسان کے سر پر آن برستے ہیں، یہ وہ خدا کی لاٹھی ہوتی ہے جو بے آواز ہوتی ہے لیکن انسان کے ہوش لمحوں میں ٹھکانے لگا دیتی ہے۔

''یہ سب کیا ہے یار! میڈیا پر تو طوفان آیا ہوا ہے۔'' اس سوال نے وہاج کو گڑبڑا دیا، کئی لمحوں تک اسے کوئی لفظ نہ مل سکا۔

''تمہاری تصویر بار بار دکھائی جا رہی ہے ٹی وی پر، تم باہر کیسے نکلو گے۔'' حیدر کو اگلی پریشانی نے گھیر لیا۔

''مجھے کچھ نہیں پتا یار، میں گھر نہیں جاؤں گا۔'' میر وہاج کے حواس باختہ چہرے سے ان کے دوست نے اندازہ لگا لیا کہ، صندل کیس میں یقیناً سچائی تھی، ورنہ وہاج کی حالت اس طرح خراب نہ ہوتی۔ باہر بارش برس رہی تھی اور اندر وہاج کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

''دیکھو وہاج! مجھ سے غلط بیانی مت کرنا۔ سچ، سچ بتا دو۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے۔'' حیدر نے جانچتی اور ٹٹولتی

ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا، جو اس وقت خفت کے گہرے احساس کے زیر اثر سر جھکائے بیٹھے تھے اور انہوں نے محض ہاں میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''کچھ تو اللہ کا خوف کرتے یار۔'' حیدر جھنجھلا اٹھا۔ ''انسان کو کم از کم اپنے اسٹینڈرڈ کا تو خیال رکھنا چاہیے، تمہیں کیا لڑکیوں کی کمی تھی جو اس ملازمہ پر ہاتھ صاف کر بیٹھے، اب خود سوچو، کیسے نبٹو گے اس کیس سے؟''

''خدا کے لیے حیدر! مجھے اس مصیبت سے نکالو، تم سوچ نہیں سکتے، کتنی اذیت میں ہوں میں پچھلے کئی ماہ سے۔'' وہاج کا خوف زدہ لہجہ اس بات کا گواہ تھا کہ وہ سچ بول رہے ہیں۔ حیدر نے تاسف بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''مخالف پارٹی کے پاس سارے ثبوت تمہارے خلاف ہیں اور مجھے نہیں لگتا، تم اتنی آسانی سے اس کیس سے نکل پاؤ گے۔'' حیدر کی اس بات نے ان کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے۔

''ٹھیک ہے۔ میں گھر نہیں جاؤں گا، ورنہ داجی مار ڈالیں گے مجھے۔'' خوف ان کے چہرے سے چھلکنے لگا۔

''گھر نہیں جاؤ گے تو تمہاری گمشدگی اس معاملے کو اور زیادہ خراب کر دے گی، تمہیں جا کر اپنی فیملی اور لوگوں کو فیس کرنا چاہیے، میرا خیال ہے تمہارے داجی اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے، بس جا کر ان کو اصل حقیقت بتا دو۔'' حیدر نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم جانتے نہیں ہو انہیں، اب تو الیکشن میں بھی چند دن رہ گئے ہیں، وہ مجھے گولی مار دیں گے اس حرکت پہ......''

''چھپ جانا کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا وہاج۔''

''تم اگر مجھے یہاں رکھنا نہیں چاہتے تو صاف صاف بتا دو۔ میں ملتان چلا جاتا ہوں۔'' وہاج کی بات پر ان کا دوست جھنجھلا اٹھا۔

”کمال کرتے ہو یار! میں نے ایسا کب کہا، میں تو صرف اس لیے کہہ رہا ہوں۔ الیکشن قریب ہیں اور تم خود ملتان کی سیٹ پر لڑ رہے ہو، ایسے موقعے پر تمہارا غائب ہونا تمہارے مخالفین کے حق میں جائے گا، تمہیں اس بات کا اندازہ ہونا چاہیے۔۔“ حیدر نے ایک دفعہ پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”دیکھتا ہوں یار! ابھی تو جانے دو مجھے۔“ وہاج نے سیکنڈز میں اگلا فیصلہ کیا۔

”تم کہو تو میں چلوں تمہارے ساتھ۔۔؟“

”نن...... نہیں، میں چلا جاؤں گا تم ٹینشن مت لو۔۔“ وہاج نے اپنی گاڑی کی چابی لی اور جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تو ان کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی اور انہوں نے اس واقعے کے بعد سب سے پہلے اپنا سیل فون آف کیا تھا، انہیں یقین تھا کہ داجی اور ان کے گھر والے اس اطلاع کے ملتے ہی ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے اور وہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کسی کے بھی سوالوں کے جوابات دے سکتے۔

☆☆☆

شہرزاد پریس کلب سے نکل رہی تھی جب اسے حمزہ کی کال آئی۔

”آر یو ان یور سینسز۔؟ ایسا کرو، اپنی بار ایٹ لاء کی ڈگری کو اٹھا کر آگ لگا دو، جو تمہیں مصلحت کے کچھ تقاضے بھی نہ سکھا سکی۔“

اس نے جیسے ہی فون کان سے لگایا دوسری طرف سے حمزہ اس پر برس پڑا، اس کے لیے حمزہ کا ردعمل خلاف توقع نہیں تھا تب ہی وہ مسکرادی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس پریس کانفرنس پر تپا ہوا ہوگا کیونکہ وہ ہمیشہ اسے میر حاکم کی فیملی سے فاصلے پر رہنے کا مشورہ دیتا تھا۔

”تم جتنی مرضی بڑی ہو جاؤ لیکن تمہیں عقل کبھی نہیں آسکتی۔“ وہ شدید غصے میں تھا، اس لیے اس نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔

”تم سمجھتی کیا ہو خود کو۔ ساری دکھی انسانیت کی خدمت کرنے اور ان کو انصاف دلانے کا ٹھیکہ کیا تم نے ہی لے رکھا ہے۔“ حمزہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ فون کے اندر سے نکل کر اس کی گردن تو ضرور مروڑ دیتا۔ اسے اس وقت شہرزاد پر بہت زیادہ غصہ تھا جس نے اس قصے کی اسے بھی کانوں کان خبر ہونے نہیں دی ورنہ وہ اسے کوئی ڈھنگ کا مشورہ ضرور دے دیتا۔

”یاد رکھنا، یہ کیس بھی شجاع غنی کی طرح تمہارے گلے کا پھندا بن جائے گا۔“ وہ اس کی خاموشی سے خائف ہو کر مزید گویا ہوا۔

”کچھ اور کہنا ہے آپ نے یا میں فون بند کر دوں۔“ شہرزاد نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا۔

اس وقت بہادر علی اور رشیدہ خاتون بھی اس کے ساتھ تھیں، اور وہ ان کے ساتھ پریس کلب سے گھر کے لیے نکل رہی تھی۔ پریس کانفرنس بہت کامیاب رہی تھی اور ان دونوں میاں بیوی نے صحافیوں کے سوالات کے جوابات بھی تسلی بخش دیے تھے جس کی وجہ سے کم از کم شہرزاد بہت مطمئن تھی۔

”تم نے اگر فون بند کیا تو میں تمہارے گھر پہنچ کر تمہاری مام کو تمہاری ساری حرکتوں کے بارے میں بتا دوں گا۔“ حمزہ خواتین کی طرح دھمکیوں پر اتر آیا اور اس کی اس بات پر نہ چاہتے ہوئے بھی شہرزاد ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کی آواز نے اسے مزید تپا دیا۔

”چلیں آجائیں، اپنی یہ حسرت بھی پوری کر لیں، ویسے کافی بہت مزے کی بناتی ہیں میری مدر۔“ شہرزاد

نے ہنس کر کہا اور فون بند کر دیا۔

اس کا خیال تھا وہ ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ کر اسے تسلی سے کال کرلے گی اور اسے بتا دے گی کہ اس کیس کو اس وقت منظرِ عام پر لانے کا فیصلہ اس کا نہیں بلکہ مسز عالیہ قریشی کا تھا۔ اس نے تو محض مشورے کے لیے فون کیا تھا لیکن دوسری طرف مسز قریشی تو گویا تیار بیٹھی تھیں۔ شہرزاد کو بھی ایک لمحے کے لیے ان کی عجلت پر ہلکی سی حیرانی ہوئی لیکن وہ جانتی تھی وہ یونہی منٹوں میں فیصلہ کر کے اس پر ڈٹ جانے والی خاتون ہیں۔

شہرزاد جیسے ہی گھر پہنچی، پورچ میں کھڑی ایک انجان گاڑی کو اس نے سرسری انداز میں دیکھا، مسز ٹینا سہگل، خاصی سوشل خاتون تھیں اور ان کے گھر میں ہر وقت کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا تھا، لیکن جیسے ہی وہ گلاس ڈور کو دھکیل کر اندر داخل ہوئی، اس کے قدم زمین نے مضبوطی سے جکڑ لیے، وہ دشمنِ جاں عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا بڑی سنجیدگی سے کافی پی رہا تھا۔

شہرزاد کچھ لمحوں کے لیے تو گنگ ہی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اسے اپنے گھر میں دیکھ کر کیسا ری ایکٹ کرے، جب کہ حمزہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے ممی کی طرف متوجہ تھا، جن کے چہرے پر چھائی ہوئی ضرورت سے زیادہ سنجیدگی سے اسے بھی معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ اسی وقت ٹینا بیگم کی بھی اس پر نظر پڑی اور وہ تیر کی طرح لپک کر اس کے پاس آئیں۔۔

”شیری! تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ یہ کیا کہہ رہا ہے حمزہ۔؟ تم نے میر حاکم کی فیملی کے خلاف پھر پنڈورا باکس کھول لیا۔“ وہ سخت غصے اور فکر سے بولیں۔

شہرزاد نے ایک نگاہ اس پر ڈالی جو لاتعلق انداز میں یوں بیٹھا تھا جیسے اسے جانتا ہی نہ ہو، شہرزاد کو اس پر غصہ آیا اسی لیے وہ ہلکا سا تپ کر بولی۔

”اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے مام۔؟ یہ پروفیشن ہے میرا، اب میں بیرسٹری کر کے کیا کروں؟ لوگوں کے کیس نہ لڑوں؟ کیا گھر میں بیٹھ جاؤں؟“ اس نے اپنی بات مکمل کر کے کھا جانے والی نظروں سے حمزہ کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر ایک دل جلاتی مسکراہٹ تھی۔

”کیس بھی تو کوئی ڈھنگ کا ہو، تم ہر تیسرے دن بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیتی ہو؟ کچھ اندازہ ہے، کس قسم کی فیملی ہے وہ؟ اٹھا کر لے جائیں گے اور ساری زندگی سراغ نہیں ملے گا تمہارا؟“ ٹینا بیگم کو اس پر غصہ آئے جا رہا تھا۔

”ایسی بھی کوئی اندھیر نگری چوپٹ راج نہیں ہے۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جھنجلا اٹھی۔

”تم مجھ سے زیادہ نہیں جانتی ہو ان کو۔“ وہ روانی میں تھوڑا غلط بول گئیں۔

”آپ کیسے جانتی ہیں انہیں؟“ شہرزاد نے جانچتی نگاہوں سے اپنی ماں کا سٹپٹایا ہوا چہرہ دیکھا۔

”ان کو کون نہیں جانتا شہرزاد؟ پورا ملک واقف ہے اس خاندان کے ایک ایک بندے سے۔“ حمزہ نے اس کی ماں کی مشکل آسان کی۔

”کم آن حمزہ، کم از کم آپ جس ادارے سے وابستہ ہیں، آپ تو ایسی بزدلی کی باتیں مت سکھائیں کسی کو۔“ اس نے حمزہ کی بھی طبیعت درست کی۔

”تم حمزہ کو چھوڑو اور اس رشیدہ کو بلاؤ، اس نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہ کس خاندان میں جھک مار کے آئی ہے۔“ ٹینا بیگم غصے سے بولیں۔

”مام! آپ اسے کچھ نہیں کہیں گی، اس نے پہلے ہی دن سب کچھ بتا دیا تھا مجھے۔“ اس نے بڑے تحمل سے

جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گی، لیکن اس کی بیٹی کے ساتھ جو ہوا، وہ اس کا ذاتی معاملہ ہے، ہمارا اس سے کچھ بھی لینا دینا نہیں، تم بھی اس کا کیس نہیں لڑو گی۔"

"فار گاڈ سیک مام، کیوں بچوں کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہیں؟ ظلم ہوا ہے ان کے ساتھ، اور میں ان کا ساتھ دوں گی، یہ میرا پروفیشن ہے اور میں اپنے پروفیشن کے ساتھ بددیانتی نہیں کر سکتی۔" وہ ہلکا سا جھنجلا کر گویا ہوئی تو ٹینا بیگم نے شکایتی نظروں سے حمزہ کی طرف دیکھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ ضرورت سے زیادہ اوور کونفیڈنٹ ہو چکی ہے۔ اسے احساس ہی نہیں یہ اپنے ساتھ ہماری زندگیوں کو بھی خطرے میں ڈال رہی ہے۔" ٹینا بیگم کے اس الزام پر شہزاد نے ایک دفعہ پھر تڑپ کر حمزہ کی طرف دیکھا، جو بڑے سکون سے کافی پی رہا تھا جیسے اسی کام کے لیے آیا ہو۔

"کیا کہا ہے آپ نے مام سے؟" اس نے خفا نظروں سے حمزہ کو گھورا۔

"وہی جو فون پر بتایا تھا میں نے۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہا اور شہزاد کو اس کا کندھے اچکانا سلگا کر رکھ گیا۔

"اوکے۔ آپ نے کافی پی لی ہے ناں، چلیں، جائیں اپنے گھر۔" اس کی بدلحاظی پر ٹینا بیگم کو جھٹکا لگا جبکہ وہ مسکرانے لگا۔

"بی ہیو یور سیلف شیری! تمہارا کلاس فیلو اور فرینڈ ہے وہ، ایک تو تم نے اس سے کبھی ملوایا ہی نہیں، اوپر سے اس کے ساتھ ایسا سلوک کر رہی ہو۔ شیم آن یو۔۔۔" ٹینا بیگم نے حمزہ کے سامنے ہی اسے جھاڑ دیا۔

"کوئی بات نہیں آنٹی یہ اس کی بہت پرانی عادت ہے، کونوینٹ میں بھی یہ ایسے ہی سب کے ساتھ روڈ ہو جایا کرتی تھی۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں ٹینا بیگم کی تسلی کے لیے بولا جبکہ شہزاد اب اس سے ٹھیک ٹھاک خفا ہو چکی تھی۔

اسی وقت ٹینا بیگم کے سیل فون کی گھنٹی بجی اور اسکرین پر نمودار ہونے والے سیف الرحمٰن کے نام پر ان کے چہرے کے تاثرات میں تغیر رونما ہوا۔

"تم لوگ بیٹھو۔ میں ذرا سیفی سے بات کر کے آتی ہوں، لگتا ہے۔ ان کو بھی اس معاملے کی اطلاع پہنچ چکی ہے۔" وہ تیزی سے کہتے ہوئے سٹنگ روم سے نکل گئیں تو حمزہ نے پہلی بار بڑی فرصت کے ساتھ اسے دیکھا۔ بلیک ڈریس پینٹ کے ساتھ لائیٹ بلو کلر کی شرٹ میں وہ جیل لگا کر بال سلیقے سے بنائے ہوئے مام سے ملنے آیا تھا۔ ممی کے کمرے سے نکلتے ہی شہزاد نے ناراض نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں آئے ہیں آپ ہمارے گھر؟"

"کھاؤ قسم تم نے نہیں کہا تھا کہ آ جاؤ، میری مام کافی بہت مزے کی بناتی ہیں۔" اس نے شرارتی انداز میں یاد دلایا، اس کا موڈ کافی بہتر ہو چکا تھا۔

"اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ فوراً منہ اٹھا کر آ جائیں۔۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"اس کا یہ مطلب بھی نہیں، میں اپنا سارا غصہ بھلا چکا ہوں، اب خاموشی سے بیٹھ جاؤ اور تمیز سے بتاؤ۔ یہ سب کیا چکر ہے۔ کیا کرتی پھر رہی ہو تم؟" وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوا تو شہزاد بھی خاموشی سے اس کی بات مان کر سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اچھا۔" اس نے طنزیہ انداز میں ناک چڑھائی۔ "پہلے تو ہر بات کی خبر ہوتی تھی بلکہ آنے والے دنوں کا

بھی پتا ہوتا تھا، اب کیا سارے سورسز بھنگ پی کر سو گئے آپ کے۔" اس کے جتاتے ہوئے انداز پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

"جانتا تو ابھی بھی بہت کچھ ہوں۔" اس کی مسکراہٹ پر وہ الجھی۔

"کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے آپ۔" وہ ہنوز سابقہ انداز میں بولی۔

"بات اگر بیچ میں دوستی کی نہ ہوتی تو شاید بتا دیتا لیکن اس وقت مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ میں خاموش رہوں۔"

"تو ٹھیک ہے، آپ خاموش رہیں اور مجھے کام کرنے دیں میرا۔" وہ بُرا مان گئی۔

"پرابلم بھی تو یہ ہی ہے کہ تمہیں تمہارے حال پر نہیں چھوڑ سکتا میں۔" وہ معنی خیز انداز میں گویا ہوا۔

"کیوں؟"

"اپنے دل سے پوچھو، اگر جواب نہ ملے تو میری آنکھوں میں دیکھ لو۔" وہ شوخ ہوا۔

"پلیز حمزہ بی سیریس۔ ویسے بھی ایسی باتیں سوٹ نہیں کرتیں آپ کو۔"

"تمہارے لیے ہی تو سیریس ہوں۔ اتنے سالوں سے یہ بات سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہوں۔" وہ اس کی جھنجلاہٹ پر مسکرایا۔ "اور جہاں تک بات سوٹ کرنے کی ہے تو پہلے بھی کہا تھا میں نے "ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔""

"یہ حلقۂ یاراں میں کس دوست کی دوستی کا ذکر کر رہے تھے آپ؟ جس نے آپ کو زبان بندی پر مجبور کر رکھا ہے۔" شہزاد کی یہی ذہانت تو اسے متاثر کرتی تھی۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح نہیں تھی اور اس بات کا ثبوت وہ پہلے بھی کئی دفعہ دے چکی تھی۔

"میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی، آپ تو خوامخواہ ہی پکڑ کر بیٹھ گئیں اسے۔" وہ صاف مکر گیا۔

"میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں حمزہ! جتنا آپ بعض دفعہ فرض کر لیتے ہیں۔" اس کے لہجے میں ناراضی کا عنصر نمایاں ہوا۔

"آپ اتنی عقل مند بھی نہیں ہیں، جتنا خود کو سمجھتی ہیں۔" اس نے بھی دوبدو جواب دیا تو وہ خفگی سے چپ کر گئی اور اس کی ناراضی کا احساس کر کے وہ محتاط انداز میں گویا ہوا۔

"فی الحال تو میرے سورسز کہتے ہیں، میر وہاج انڈر گراؤنڈ ہو چکا ہے اور وہ کہاں پر ہے۔ اس بات کی خبر اس کے گھر والوں کو بھی نہیں۔"

"ہاں اتنی ہی معصوم ہے ناں میر فیملی، جس کو پتا ہی نہیں، ان کا بیٹا کہاں ہے، یقیناً یہ ان کی کوئی نئی سازش ہو گی۔" اس نے طنزاً کہا۔

"میڈم! اگر یہ ان کی کوئی سازش ہوتی تو میرے سورسز یہ بھی بتا دیتے مجھے ۔۔۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"کون ہے آپ کا سورس۔" شہزاد کی بات پر وہ ہلکا سا ہنسا۔

"خفیہ ادارے کے لوگوں کے سورسز بھی خفیہ ہی ہوتے ہیں مادام! کیوں پوچھ کر بندے کو مشکل میں ڈالتی ہیں۔"

"اس میں مشکل میں ڈالنے والی کیا بات ہے۔" شہزاد نے منہ بنا کر کہا تو وہ اس کے چہرے کے تاثرات پر ایک بار پھر مسکرایا۔

"محترمہ! جب ایک طرف محبت اور دوسری طرف فرض ہو تو مجھ جیسے بندے کو یہی سکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے

فرض کو ادا کرے، آپ کیوں فرض اور محبت کے درمیان جنگ کروانا چاہتی ہیں۔'' وہ ابھی بھی غیر سنجیدہ تھا۔

''مت بتائیں، میں صرف اتنا جانتی ہوں میر خاندان کے لوگ کچی گولیاں نہیں کھیلے، یقیناً ان کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان کا بیٹا گلٹی ہے، اسی لیے انہوں نے اسے انڈر گراؤنڈ کر دیا ہوگا۔'' اس نے بھی کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''وہ ان حالات میں ایسا کر ہی نہیں سکتے، کچھ دن بعد الیکشن ہیں اور وہاج ان کی ملتان والی آبائی سیٹ پر الیکشن لڑ رہا ہے۔'' وہ بھی اپنے پوائنٹ پر ڈٹا ہوا تھا۔

''کم آن حمزہ! آپ کیا یہ نہیں جانتے، ایسے لوگ تو ہمدردی کا ووٹ لینے کے لیے اپنے خونی رشتوں کا بھی سرعام مرڈر کروا دیتے ہیں۔'' اس کے استہزائیہ انداز پر وہ مسکرایا، کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ جو سوچ چکی ہے۔ اب اس سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹے گی۔

اس سے پہلے کہ حمزہ اس کی بات کا کوئی جواب دیتا، رومیصہ عجلت بھرے انداز میں لاؤنج کی سیڑھیاں اتر کر اوپر والے پورشن سے نیچے آئی، حمزہ اور شہزاد کو دیکھ کر وہ ہلکا سا ٹھٹکی، اس نے بہت غور سے حمزہ کی طرف دیکھا اور گڑبڑا کر سلام کیا، اس کی آنکھوں میں شناسائی کے کئی رنگ ابھرے۔

''ارے آپ؟'' وہ خوش گوار حیرت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اس کا مطلب ہے، آپ نے پہچان لیا مجھے۔'' حمزہ کی بے تکلفی پر وہ ہلکا سا مسکرائی۔

''آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں حمزہ! کیسے ہیں آپ؟ بہت سال بعد دیکھا آپ کو۔'' وہ واقعی پہچان چکی تھی۔

''یادداشت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے آپ دونوں بہنوں کی۔'' حمزہ ایک دم متاثر ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید رومیصہ کی یادداشت میں اس کا چہرہ نہ ہو۔

''آپ نے میری خاطر بہت زبردست ٹھکائی لگائی تھی اسامہ کے گروپ کی، اور یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتی۔'' رومیصہ نے اسے اسکول کی اسی بات کا حوالہ دیا، جس کی وجہ سے ان دونوں کی حمزہ کے ساتھ اچھی سلام دعا ہوئی تھی۔

''تم کہیں جا رہی ہو کیا؟'' شہزاد نے اس کے ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابی دیکھ کر اندازہ لگایا۔

''ہاں۔ ایک پرانی کلاس فیلو نے ڈنر پر بلایا ہے، ایک گھنٹے میں آ جاؤں گی۔'' رومیصہ نے گھبرا کر جھوٹ بولا، اسی وقت اس کے سیل فون پر ارسل کی کال آنے لگی، جو اس نے بوکھلا کر فوراً کاٹی۔ حمزہ کی نظریں اس کے سیل فون کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، وہ اس پر ابھرنے والا نام پڑھ چکا تھا۔

''او کے حمزہ اینڈ شیری، سی یو اگین۔'' وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ جیسے ہی وہ لاؤنج سے نکلی، حمزہ نے سنجیدگی سے شہزاد کی طرف دیکھا، جو رومیصہ کے اس عجلت بھرے انداز پر ہلکی سی پریشان ہوئی تھی۔

''شہزاد! رومیصہ جھوٹ بول کر گئی ہے باہر۔'' حمزہ نے اس کی سوچ کو الفاظ دیے تو وہ ششدر رہ گئی۔

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''اس کے سیل فون پر آنے والی کال اس کی کسی فرینڈ کی نہیں کسی ارسل نام کے بندے کی تھی۔'' حمزہ کی عقابی نظریں اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیل فون کی اسکرین پر ابھرنے والا نام بھی پڑھ چکی تھیں۔ ''کون ہے یہ ارسل؟''

''شاید کوئی کلاس فیلو ہو اس کا۔'' اس سے پہلے وہ اس بات پر مزید تبصرہ کرتی، ٹینا بیگم تیز تیز چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ہاتھ میں کارڈلیس فون اٹھایا ہوا تھا۔

''وہی ہوا ناں، سیفی بھی سخت جھنجھلایا ہوا تھا۔''

شہزاد نے سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا، جو اپنی بات کی وضاحت دے رہی تھیں۔ ''سیفی کا کہنا ہے اس موقع پر یہ کانفرنس نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ابھی تو جسٹس محمود کی فیملی کے ساتھ مذاکرات چل رہے تھے ہمارے۔''

''مام! جسٹس محمود کا اس کانفرنس کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے؟'' شہزاد کو حمزہ کے سامنے ہلکی سی کوفت کا احساس ہوا۔

''حمزہ بیٹا! تم سمجھاؤ ناں اسے، دشمنوں کے دشمن ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بن کر ہمارے لیے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔''

''ڈونٹ وری آنٹی، اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ جسٹس محمود واقعی اس قصے سے جان چھڑانا چاہتے ہیں کیونکہ معاملہ اب ان کے اکلوتے بھتیجے کا ہے، اپنے بیٹے سے تو وہ ہاتھ دھو ہی بیٹھے، لیکن بھتیجے کو کسی بھی قیمت پر نہیں گنوائیں گے، ان کی فیملی کا بہت زیادہ پریشر ہے ان پر۔''

''جو بھی ہے تم اسے منع کرو، کوئی ضرورت نہیں ہے اس کو میر فیملی کے خلاف کیس لڑنے کی۔''

''کیس میں نہیں مسز عالیہ قریشی ہینڈل کریں گی۔'' شہزاد کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی در آئی۔

''آئی تھنک آنٹی! شہزاد اتنی بھی بے وقوف نہیں، یقیناً اپنی سیف سائیڈ رکھ کر ہی یہ معاملہ دیکھے گی، آپ ٹینشن مت لیں۔'' حمزہ کی بات پر انہیں کچھ تسلی ہوئی، دوسری طرف وہ اب جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو ٹینا بیگم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو ڈنر کر کے جانا۔'' ٹینا بیگم نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا، انہیں حمزہ خالد اپنے فیملی بیک گراؤنڈ سمیت بہت زیادہ پسند آیا تھا۔ پسندیدگی ان کے چہرے سے عیاں تھی اور ان کی یہی بات شہزاد کے لیے کوفت کا باعث بن رہی تھی۔

''نیکسٹ ٹائم سہی، ابھی ایک دو ضروری کام نبٹانے ہیں مجھے۔ آپ بھی آیئے گا شیری اور رومی کے ساتھ ہمارے ہاں۔'' وہ بہت سلجھے ہوئے انداز میں ان کو اپنے ہاں مدعو کر کے باہر نکل آیا، شہزاد اسے رخصت کرنے کے لیے گیٹ تک آئی۔

''پلیز حمزہ! ایسی حرکت دوبارہ مت کرنا، مام بہت بچی ہیں میرے اور رومی کے معاملے میں۔''

''ہر ماں اتنی ہی بچی ہوتی ہے اپنی اولاد کے لیے لیکن تمہیں بھی ان سب کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔''

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' اس نے حیرانی سے اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

''میں مانتا ہوں تم اپنے پروفیشن کے معاملے میں بہت زیادہ جنونی ہو، لیکن اس سے کہیں زیادہ مخلص تمہیں اپنی ذات کے ساتھ ہونا چاہیے۔'' وہ پورچ کی طرف جاتے ہوئے بہت نرمی اور اپنائیت کے ساتھ اسے سمجھا رہا تھا۔

''میں اپنی ذات کو ہمیشہ آخری نمبر پر رکھتی ہوں حمزہ۔'' جو حقیقت تھی اس نے اسے بتا دی۔

''لیکن میں تمہیں ہمیشہ پہلے نمبر پر رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم خود بھی ایسا کرو، کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔'' اس کے لہجے میں کچھ تھا، شہزاد چلتے چلتے رکی اور سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے شخص کی شفاف آنکھوں میں جھانکا، وہاں اسے اپنے لیے چاہت کا ایک لامحدود سمندر نظر آیا، وہ نظریں چرا کر سامنے دیوار پر لگی بوگن ویلیا کی بیل کو دیکھنے لگی۔

''آپ نے خود ہی تو کہا تھا جب تک آپ میرے ساتھ ہیں، کوئی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ

سکتا۔" وہ اسی کی بات اسے لوٹا رہی تھی۔

"ہاں میری ہی ذمے داریوں میں اضافہ کرنا، خود کسی کو سکون سے مت بیٹھنے دینا۔" اس نے ہلکا سا چڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ دھیمے سے انداز میں ہنس پڑی اور اس کی شفاف ہنسی نے حمزہ کی ساری ناراضی بھاپ کی مانند اڑا دی۔ جیسے ہی وہ اسے سی آف کر کے واپس آئی، ٹینا بیگم نے بے تاب انداز میں اس سے پوچھا۔

"شیری! جنرل خالد کا بیٹا تمہارا کلاس فیلو تھا، تم نے بتایا ہی نہیں؟"

"مام اس میں کیا خاص بات ہے؟" وہ لاپروائی سے گویا ہوئی۔

"بے وقوف لڑکی، اچھا خاصا ہینڈسم اور ویل سیٹلڈ لڑکا ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ اس میں کیا خاص بات ہے۔" ٹینا بیگم کو اس کی سادگی پر غصہ آیا۔

"کم آن مام، ایسا ویسا کچھ نہیں ہے ہمارے درمیان، آپ پلیز اسے چھوڑیں اور تھوڑا رومیصہ پر دھیان رکھیں، ایسا نہ ہو کل کو کوئی نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔" وہ بیزاری سے گویا ہوئی تو ٹینا بیگم نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "خدانخواستہ کچھ اور تو غلط نہیں کر دیا اس نے؟"

"فی الحال تو نہیں کیا، لیکن اس پر چیک رکھنا بہت ضروری ہے۔" اپنی بات کر کے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

"اچھا اچھا، تم نے تو مجھے ڈرا کر ہی رکھ دیا۔ میں بھی پتا نہیں کیا کر دیا ہے اس نے۔"

شہزادہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کچھ یاد آنے پر پلٹی۔ "اور ہاں پلیز آپ رشیدہ اور بہادر علی کو کچھ نہیں کہیں گی، ان کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا ہے اور کم از کم میں نہیں چاہوں گی کہ ہم لوگوں کی طرف سے بھی کوئی زیادتی ان کے ساتھ ہو۔"

"اب اتنی بھی ظالم نہیں ہوں میں۔" ٹینا بیگم اس کی بات کا بُرا مان کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ انہیں رات کے کھانے پر کچھ خاص بنوانا تھا کیونکہ سیف الرحمٰن ایک گھنٹے تک پہنچنے والے تھے۔

☆☆☆

میر فیملی ایک دفعہ پھر تقدیر کے مضبوط شکنجے میں آ چکی تھی۔

وہاج اور صندل کا قصہ گھر کے سب ملازمین کی زبان پر تھا اور ان سب کا خیال تھا بہادر علی کے خاندان نے بے غیرتی کی ہے اور ان کے سیاسی مخالفین سے پیسے لے کر وہاج پر کیچڑ اچھالا ہے۔ اس سارے قصے کے دوران محض طوبیٰ ایسی تھی جو دل سے مطمئن اور خوش تھی۔ اسے مکافاتِ عمل پر یقین آ گیا تھا اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ وہاج کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے، اس کی تمام تر ہمدردیاں صندل کے خاندان کے ساتھ تھیں۔

فارحہ بھابھی کو جیسے ہی اس بات کا علم ہوا، ان کے ہونٹوں پر تو گویا خاموشی کی ایک مہر ثبت ہو گئی، وہ خالی نظروں کے ساتھ ٹی وی اسکرین کو دیکھتی رہیں جس پر صندل کی کہانی کو بڑے چٹ پٹے انداز میں بیان کیا جا رہا تھا۔

کسی رپورٹر کو صندل کی ایک پرانی تصویر بھی مل گئی تھی جسے وہ میر وہاج کی تصویر کے ساتھ جوڑ کر بار بار اسکرین پر دکھا رہے تھے اور فارحہ کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں، پورے خاندان کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ سب جانتے تھے کہ اپنی موت سے پہلے کا کچھ عرصہ صندل نے اسلام آباد میں فارحہ اور وہاج کے گھر میں گزارا تھا۔

"میرا بیٹا، ایسا نہیں ہو سکتا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" تاجدار بیگم صبح سے ایک ہی جملے کی گردان کیے جا رہی

تھیں۔

"فارحہ تم فون کر کے پوچھو ناں اس سے، کہاں ہے وہ۔" انہیں اپنی بہو کی بے حسی پر غصہ آیا، جو صدمے بھرے انداز میں بس ایک طرف بیٹھی ہوئی، پورے گھر والوں کی سرگرمیاں خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

محتشم علی اور خاقان صاحب کے سیل فون پر آنے والی کالز پر ان کی بوکھلاہٹ دیدنی تھی، وہ وہاج سے کھل کر بات کیے بغیر اپنا موقف نہیں دینا چاہتے تھے اور وہاج کو تو لگتا تھا کہ زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا، اس کی کہیں سے بھی کوئی خیر خبر نہیں آ رہی تھی اور سیل فون بھی مسلسل بند جا رہا تھا۔

میر ہاؤس کے مکین اس وقت اسلام آباد والے گھر میں اکٹھے تھے، شاہ میر اور برہان بھی پہنچ گئے یہ واقعہ ہی ایسا تھا جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔

سب بظاہر ایک دوسرے سے نظریں چرائے پھر رہے تھے لیکن سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔

"وہاج بھائی آخر کہاں جا سکتے ہیں اور اس طرح غائب ہونے کی ضرورت کیا تھی انہیں؟" ارسل نے الجھن بھرے انداز میں شاہ میر کا پریشان چہرہ دیکھا، وہ بڑی مشکل سے چھٹی لے کر اسلام آباد پہنچا تھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں یار!" وہ واقعی شدید ٹینشن میں تھا، پورے گھر کی توجہ درشہوار سے ہٹ کر اب صرف اپنی عزت بچانے کی طرف تھی کیونکہ دس دن بعد ہونے والے الیکشن میں یہ اسکینڈل ان کے لیے کافی مسائل کا باعث بن سکتا تھا۔

"عجیب ہی پریشانی میں ڈال دیا ہے انہوں نے، ساری یونیورسٹی جانتی ہے وہ میرے فرسٹ کزن ہیں۔ لوگ عجیب عجیب سے سوالات کر رہے ہیں۔" ارسل نے پریشان نظروں سے شاہ میر کی طرف دیکھا، جس نے ایک دم ہی وہ سوال کر لیا، جس کی اسے بالکل بھی توقع نہیں تھی۔

"یہ بیرسٹر شیری کون ہے ارسل؟"

شاہ میر کے سوال پر ارسل کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں، اس نے کن اکھیوں سے اس کے چہرے کے پریشان تاثرات دیکھے اور نظریں چرائیں۔

"مجھے کیا پتا، کون ہے یہ بیرسٹر شیری۔؟ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"پہلے لینڈ مافیا کیس میں اس نے پورے خاندان کو ٹینشن میں ڈالا اور اب اس سارے قصے کے پیچھے بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ آخر پتا تو چلے اس کو پرابلم کیا ہے ہماری فیملی سے۔" شاہ میر کی اس بات نے ارسل کو مزید پریشان کیا۔

"آئی ڈونٹ نو یار! اللہ بہتر جانتا ہے۔"

لیکن ارسل اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ رومیصہ کی بہن ہے اور صندل کی کانفرنس کے دوران اس نے جس اعتماد کے ساتھ رشیدہ مائی اور بہادر علی کا ساتھ دیا تھا یہ سب دیکھ کر ایک دفعہ تو ارسل کا بھی فشار خون بلند ہوا، کچھ بھی تھا، وہ اس خاندان کا ایک فرد تھا اور اس کی نیک نامی کے بارے میں اتنا ہی حساس تھا جتنا ایک نارمل شخص کو ہونا چاہیے تھا۔

وہ دونوں گفتگو کرتے ہوئے سٹنگ روم میں چل آئے، جہاں فارحہ صدمے بھرے انداز میں اکیلی بیٹھی ہوئی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ان دونوں کو دیکھ کر گھبرا کر ٹی وی بند کیا۔ اسی وقت تاجدار بیگم بھی چلی آئیں اور انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے فارحہ کی طرف دیکھا، جو اس وقت سر جھکائے ایسے بیٹھی تھی جیسے اس

سارے معاملے کی قصوروار وہ ہو۔

"فارحہ تمہیں کچھ احساس ہے کہ تمہارا شوہر ہے کہاں؟ تم اس سے رابطہ کیوں نہیں کر رہی ہو؟" تاجدار بیگم نے اپنی جھنجلاہٹ خاموش بیٹھی ہوئی بہو پر اتاری تو شاہ میر نے تاسف بھری نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"اتفاق سے امی جان! بھابی کے پاس بھی وہاج بھائی کا وہی سیل نمبر ہے، جو آپ سب لوگوں کے پاس ہے، تو بتائیں وہ بیچاری کیسے رابطہ کریں ان سے۔؟ جب نمبر ہی بند جا رہا ہے آپ کے لاڈلے بیٹے کا؟" شاہ میر نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم چپ رہو، ہر موقعے پر تمہارا بولنا ضروری نہیں ہوتا۔"

"آپ بھی تھوڑا سوچ سمجھ کر بولا کریں، ایسے ہی دوسروں پر چڑھائی نہ کر دیا کریں۔" آگے بھی شاہ میر تھا کسی سے بھی نہ دبنے والا۔

اس سے پہلے کہ ماں بیٹے کی بحث شدت اختیار کر لیتی، میر حاکم، اپنے دونوں بیٹوں محتشم، خاقان اور پوتے برہان کے ساتھ سٹنگ روم میں داخل ہوئے، ان کے پیچھے شارقہ بیگم بھی تھیں۔ میر حاکم کے ساتھ ساتھ سب کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ معاملہ بھی تو کوئی چھوٹا نہیں تھا۔

حاکم علی نے اپنے طور پر جو تحقیقات کروائی تھیں اس سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا اور وہاج کے اچانک غائب ہونے پر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے۔ دوسری طرف میڈیا کے لوگوں نے ان سب کا جینا حرام کر رکھا تھا ٹی وی اور اخبارات کی یہ سب سے گرما گرم خبر تھی اور وہ اس بات کو اچھال رہے تھے کہ میر فیملی کا کوئی تسلی بخش مؤقف سامنے کیوں نہیں آ رہا۔

"محتشم علی، سخت مایوس کیا ہے مجھے تمہاری اولاد نے، ایک سے بڑھ کر ایک ناہنجار نکل رہی ہے، اب بتاؤ، ہم الیکشن کے معاملات دیکھیں یا ان گھٹیا قصوں کو نبٹائیں، ہمارے مخالفین ہم پر ٹھٹھے لگا رہے ہیں، اوپر سے وہ بے غیرت وہاج کسی بل میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔"

وہ اپنی چھڑی پر زور ڈال کر غصے سے بولے تو محتشم علی نے خفت زدہ انداز میں اپنا سر مزید جھکا لیا۔ وہاج کے روپوش ہونے پر ان کا کردار مشکوک ہو گیا تھا۔

"بابا جان اس بے چارے کے ساتھ کوئی حادثہ بھی تو ہو سکتا ہے۔" میر خاقان نے تو گویا یہ بات کر کے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال لیا۔

"ہاں رنگین حادثے "تمہارے" اور باقی تم لوگوں کی "بے چاری" آل اولاد کے ساتھ ہی ہو سکتے ہیں۔" ان کے طنزیہ انداز پر خاقان کا چہرہ سرخ ہوا۔

"میں تو ساری زندگی تم لوگوں کے کرتوتوں پر پردے ڈالتا آیا ہوں۔" وہ غصے سے ٹہلنے لگے۔

"ہمارے خاندان کا ایک نام اور مقام تھا، جسے تم سب نے مل کر ڈبو دیا۔ اب بتاؤ لوگوں کو کیا جواب دوں؟ ساری دنیا اوٹ پٹانگ سوالات کر رہی ہے، انہیں لگ رہا ہے ہم نے چھپایا ہے اس بے غیرت وہاج کو۔" حاکم علی شدید قسم کی ذہنی اذیت سے دوچار تھے۔

"اس خاندان کی اوقات ہی کیا ہے بابا جان، جس کے لیے ہم اپنے گھر کے بچے کو چھپا لیں، اور مجھے نہیں لگتا وہاج ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتا ہے۔" خاقان علی نے ایک مرتبہ جھاڑ کھانے کے بعد پھر بولنے کی جسارت کر لی۔

"اس کی اوقات کا تو پتا نہیں لیکن پوری دنیا کے سامنے ہماری اوقات کھل کر ضرور سامنے آ گئی ہے، اور وہ لڑکی، کیا نام ہے اس کا بیرسٹر شیری، کیا وہ بھول گئی ہو گی شجاع غنی والا قصہ۔؟ مجھے تو لگتا ہے اس نے صرف اور صرف اس کا بدلہ لینے کے لیے یہ سارا کھیل رچایا ہے۔" حاکم صاحب کی بات پر ارسل کا رنگ ہلکا سا فق ہوا، اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"یہ لوگ اس کے پاس کیسے پہنچ گئے؟" تاجدار بیگم نے خاصے غلط موقعے پر یہ سوال کر لیا۔

"فی الحال تاجدار تم یہ سوچو، تمہارا بیٹا کہاں پہنچا ہوا ہے؟ ورنہ ملتان والی سیٹ نکل جائے گی ہمارے ہاتھ سے۔" ان کے طنزیہ انداز پر وہ شرمندہ ہوئیں۔

"میں نے شاہ میر کو بھیجا تھا اس کے دوست سے پوچھنے کے لیے۔" ان کے خفت زدہ انداز پر سب کی نظریں شاہ میر کی طرف اٹھ گئیں۔

"حیدر بھائی سے بات ہوئی تھی میری، وہ کہتے ہیں کہ انہیں تو وہ گھر جانے کا ہی کہہ کر نکلے تھے۔ صرف ایک گھنٹے کا تو راستہ تھا ان کے گاؤں سے ہمارے علاقے کا، پتا نہیں کہاں چلے گئے وہ۔" شاہ میر کا انداز تھوڑا دھیما تھا۔

"محتشم علی! تم مانو یا نہ مانو، تمہارے بیٹے کا یوں چوروں کی طرح چھپ کر بیٹھنا کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے مجھے۔" وہ ایک دفعہ پھر سلگ کر بولے۔

"آپ فارحہ سے پوچھیں ناں، ہو سکتا ہے اسے وہاج کے کسی دوست کا پتا ہو۔" تاجدار بیگم ہلکا سا جھجک کر بولیں۔

"اس سے میں کیا پوچھوں؟" انہوں نے مشتعل انداز میں تاجدار بیگم کی طرف دیکھا۔

"اسے تو تمہارے بیٹے نے ہمیشہ جوتے کی نوک پر رکھا، اولاد نہ ہونے کا قصوروار اسے ٹھہرایا جیسے باقی ساری دنیا اندھی ہو، اور اصل بات نہ جانتی ہو۔" حاکم علی نے روانی میں وہ راز بھی اگل دیا جسے فارحہ نے ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا، فارحہ نے سہمی ہوئی نگاہوں سے دادجی کی طرف دیکھا، جو آج کسی کو بھی رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھے۔

سارے خاندان کے سامنے اتنی بڑی بات پر تاجدار بیگم کا ایک دفعہ تو دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ محتشم علی بھی نظریں چرا کر چپ کے چپ رہ گئے، جبکہ شارقہ بیگم نے حیرانی سے فارحہ کی طرف دیکھا، ان پر یہ حقیقت ابھی ابھی کھلی تھی۔

"میرے خیال میں بابا جان یہ موقع جذباتی ہونے کا نہیں ہے، ہم وہاج کی روپوشی کو کوئی اور رنگ بھی تو دے سکتے ہیں۔" خاقان کا دماغ اب کام کرنے لگا تھا، ان کی بات پر حاکم صاحب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ "خیر سے کیا رنگ دینا چاہتے ہو تم؟"

"ہمیں پہلی فرصت میں وہاج کے اغوا کی ایف آئی آر اپنے مخالفین کے خلاف کٹوا دینی چاہیے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے، ایک تو صندل کیس سے لوگوں کی نظریں تھوڑا ہٹیں گی اور دوسرا ہمیں ہمدردی کا ووٹ بھی ملے گا۔"

"خاقان ٹھیک کہہ رہا ہے بابا جان۔ ہمیں اسی پوائنٹ پر ورکنگ کر لینی چاہیے اپنی۔" محتشم علی نے بھی بیچ میں لقمہ دیا۔

خاقان علی کا مشورہ، حاکم علی کو ان حالات میں بالکل ٹھیک لگا تھا اور خاندان کی رہی سہی عزت کو سنبھالنے

کے لیے اس سے بہتر حل کوئی اور نہیں تھا، یہی وجہ تھی کہ اگلے دو گھنٹے کی میٹنگ میں سارے معاملات طے کر لیے گئے۔ یہ خاندان سیاست میں ماہر تھا اور اس کی گواہی تو ان کے مخالفین بھی دیتے تھے، اور اس بات کا ثبوت ایک دفعہ پھر دنیا والوں کو ملنے والا تھا۔

☆☆☆

مارگلہ ہلز کے ٹاپ پر واقع ''منال ریسٹورنٹ'' میں رومیصہ کو ارسل کے ساتھ پہنچے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔

فضا میں ہلکی سی نمی تھی اور خوش گوار ہوائیں اپنے دامن میں ٹھنڈک کا احساس لیے ہوئے جب جسم سے ٹکراتیں تو موسم گرما میں ایک روح افزا سا احساس رگ و پے میں دوڑنے لگتا۔ رومیصہ جب سے وہاں آئی تھی، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا ارسل کچھ الجھا الجھا سا ہے۔

''تمہاری بہن کو کیا ضرورت تھی اس قدر بولڈ پریس کانفرنس کروانے کی؟'' وہ چند رسمی باتیں کرنے کے بعد اس موضوع کی طرف آ چکا تھا، جس کے لیے آج اس نے رومیصہ کو خصوصی طور پر بلوایا تھا۔

''اس میں بولڈنیس کی کیا بات ہے، اور ویسے بھی رشیدہ کے خاندان کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولی۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ ان کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔؟ وہ لوگ جھوٹ بھی تو بول سکتے ہیں۔'' ارسل نے فوراً اعتراض کیا۔

''اس طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ کسی لینڈ لارڈ پولیٹیکل بیک گراؤنڈ والے خاندان کے اوپر اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتے، اور ویسے بھی شیری نے مکمل انویسٹی گیشن کی ہے اس سارے معاملے کی۔''

''کیا انویسٹی گیشن کی ہے؟'' ارسل نے بے چینی سے بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا، اس وقت ویٹر کھانا سرو کر چکا تھا اور رومیصہ کی زیادہ توجہ ڈنر کی طرف تھی۔

''اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں اور اس نے ڈیڈ باڈی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور اس لڑکی کی پریگنینسی رپورٹ بھی حاصل کر لی ہیں۔''

''کم آن رومیصہ، یہ سب تو فیک بھی بن سکتا ہے کھڑے کھڑے۔'' ارسل نے اس بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔

''اچھا یہ سب کچھ فیک ہے تو کیا اس لڑکی کا لکھا ہوا آخری خط بھی جعلی ہے؟'' رومیصہ ایک دم چڑ کر بولی تو ارسل کو اس بار جھٹکا لگا۔

''کیسا خط؟ کیا تم نے پڑھا ہے؟ کیا لکھا ہے اس میں؟'' وہ بے چین ہوا۔

''آئی ڈونٹ نو، میں نے نہیں پڑھا لیکن شیری، ممی کو ہی ڈیٹیل سے بتا رہی تھی کہ اس میں تفصیلاً لکھا ہوا کہ وہاج نے اس کے ساتھ زبردستی کی اور اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں ایسی ہیں جو اس لڑکی کے حق میں جاتی ہیں۔'' اس کی باتوں نے ارسل کو اب پریشان کیا۔

''میر وہاج کو کیا ایک ملازمہ ہی ملی تھی یہ سب کرنے کے لیے۔''

''یہ فیوڈل سسٹم سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو بس عورت چاہیے ہوتی ہے جس کی نبض چل رہی ہو۔'' رومیصہ اپنی ہی بات پر ہنسی۔

''خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، انسان کا کوئی اسٹینڈرڈ بھی تو ہوتا ہے، تمہاری بہن کو نہیں لینا چاہیے تھا یہ

کیس۔'' ارسل کی تان گھوم پھر کر اسی ایک بات پر ٹوٹ رہی تھی اور اب تو رومی بھی ہلکا سا چڑ گئی۔

''کیوں نہیں لینا چاہیے تھا، ملازمین ہیں وہ ہمارے، ان کی ہیلپ کرنا فرض بنتا ہے ہمارا۔''

''وہ لوگ تمہارے سرونٹس ہیں، تم نے بتایا کیوں نہیں۔۔؟'' ارسل کو شاک لگا۔

''اس میں بتانے والی کون سی بات تھی؟ ویسے بھی آپ کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں اس معاملے میں؟'' اس کی بات پر وہ ہلکا سا گھبرا گیا۔

''میرے انٹرسٹ لینے کی ایک مضبوط وجہ ہے رومیصہ۔'' اس کی بات پر اس نے حیرانی سے ارسل کی طرف دیکھا، جو مزید بتا رہا تھا۔

''ایکچوئلی اس کیس میں جس بندے پر الزام لگایا گیا ہے میں ان کو اچھی طرح سے جانتا ہوں، وہ اس ٹائپ کے بندے نہیں ہیں۔''

''آپ کیسے جانتے ہیں انہیں؟'' اب پریشان ہونے کی باری رومیصہ کی تھی۔

''میرے بہت اچھے فرینڈ شاہ میر کے بڑے بھائی ہیں وہ۔۔'' ارسل نے نظریں چرا کر جھوٹ بولا۔

''میری مانیں پہلی فرصت میں اس دوست سے جان چھڑا لیں کیونکہ شیری بتا رہی تھی اس خاندان کی ریپوٹیشن بالکل بھی اچھی نہیں، پہلے بھی لینڈ مافیا کے ایک کیس میں انہوں نے دوسری پارٹی کو پیسے دے کر خرید لیا تھا۔'' رومیصہ کی بات پر ارسل کا دماغ بھک کر کے اڑا۔

''کیا ہوا ہے اس خاندان کی ریپوٹیشن کو۔؟ میں نے تو آج تک ان کے بارے میں ایسا ویسا کچھ نہیں سنا۔'' وہ بحث پر اتر آیا۔

''میں شیری سے ڈیٹیل پوچھ کر بتاؤں گی۔ اس کے پاس باقاعدہ ثبوت ہیں ان کی کرپشن کے بارے میں۔''

''رہنے دو کوئی ضرورت نہیں ہے، اب چپ کر کے کھانا کھاؤ۔'' ارسل کو غصہ آ گیا۔

رومیصہ کی باتوں نے ارسل کو ایک نئی ٹینشن میں ڈال دیا، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کے خاندان کے بارے میں اس قدر منفی رائے رکھتی ہوگی لیکن اب اسے اپنے خاندان کی ریپوٹیشن کے بجائے وہاج اور صندل کیس کی فکر تھی۔ رومیصہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے اتنا تو وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ میر فیملی کے لیے ایک مضبوط قسم کا شکنجہ تیار ہونے جا رہا ہے اور میر حاکم کی پریشانی غلط نہیں تھی۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔

طوبیٰ کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی تو اکتا کر اٹھ بیٹھی، دیوار گیر گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی، وہ کچھ لمحے تو میز پر رکھی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتی رہی اور پھر تنگ آ کر کمرے سے نکل آئی۔ باہر آ کر اس نے کھل کر سانس لیا، پورے گھر پر ایک ہولناک سناٹے کا راج تھا۔

طوبیٰ ننگے پاؤں ادھر ادھر ٹہلتی رہی، اور ایک چکر ہال کمرے کا بھی لگا آئی، جیسے ہی وہ اوپر آئی، درشہوار کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم رک گئے۔ اس کے لبوں سے ایک سرد آہ نکلی، درشہوار کی پسندیدہ ٹیڈی بیئر والی کی چین دروازے کے ساتھ لگے ہوئے ہک پر ٹنگی ہوئی تھی۔ طوبیٰ کو ایک دم ہی وہ پوری شدت سے یاد آئی تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''پتا نہیں کہاں کی خاک چھان رہی ہوگی اور کیا ملا ہوگا اسے یہ سب کر کے؟'' طوبیٰ نے افسردگی سے سوچا

اور آہستہ سے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا، یہ جگہ ان سب لڑکیوں کی پسندیدہ تھی، سب شرارتوں کے پلان یہیں پر بنتے تھے۔ طوبیٰ کا دل بھر آیا، کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ اس نے دیوار پر ٹٹول کر ٹیوب لائٹ کا سوئچ آن کیا کمرا روشنی سے بھر گیا اور سامنے کا منظر دیکھ کر طوبیٰ کو دھچکا لگا۔

دیوار کے ساتھ رکھے کاؤچ پر شاہ میر ایک چھوٹا کشن آنکھوں پر رکھے نیم دراز تھا، کمرے میں ہونے والی روشنی پر اس نے کشن ہٹایا تو طوبیٰ اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر گھبرا گئی۔ اسے بھی شاید رات کے اس پہر طوبیٰ کی موجودگی کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔

''شاہ میر تم یہاں کیا کر رہے ہو در شہوار کے کمرے میں؟'' وہ گھبرا کر اس کے پاس پہنچی۔

''تم کیا کرنے آئی تھیں یہاں؟'' اس کا سارا الہوسٹ کر اس کے چہرے پر آ چکا تھا، نہ جانے طوبیٰ کو کیوں لگا جیسے وہ روتا رہا ہو۔

''ایسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی اور......'' طوبیٰ نے بات ادھوری چھوڑی۔

''اور کیا؟'' وہ بے زاری سے گویا ہوا۔

''در شہوار کی یاد آ رہی تھی۔'' اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

''مر چکی ہے وہ ہم سب کے لیے، مت لیا کرو اس کا نام میرے سامنے۔'' وہ ایک دم بھڑک کر بولا تو طوبیٰ سہم کر ایک فٹ دور جا کھڑی ہوئی۔ شاہ میر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ کاؤچ سے اٹھ کر نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا اور کاؤچ سے ٹیک لگالی، طوبیٰ کو ایسے لگا جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو۔

''آئی ایم سوری یار! پتا نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''کیوں اتنی ٹینشن لے رہے ہو میرو؟'' وہ آہستہ سے چلتے ہوئے اس کے پیچھے رکھے کاؤچ پر بیٹھ گئی، شاہ میر کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

''ابھی در شہوار کا لگایا ہوا زخم نہیں بھرا تھا، اوپر سے دہاج بھائی۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑی۔ طوبیٰ اس کے جذبات کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

طوبیٰ نے آہستہ سے اپنی نرم انگلیاں اس کے سر کے گھنے بالوں میں پھیریں، شاہ میر کو تھوڑا سکون کا احساس ہوا، وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا اور کاؤچ سے پشت ٹکالی۔ وہ عین اس کے پیچھے کاؤچ پر بیٹھی تھی جبکہ وہ کارپٹ پر ٹانگیں پھیلائے تھکے تھکے انداز سے براجمان تھا، طوبیٰ اپنی انگلیوں سے اس کے سر کا آہستگی سے مساج کرنے لگی۔ شاہ میر کو اپنی اذیت میں تھوڑی کمی کا احساس ہوا۔

''ایک بات سچ سچ بتاؤ طوبیٰ۔'' اس کے لہجے کی سنجیدگی پر طوبیٰ کا ہاتھ تھما۔ ''ہاں پوچھو شاہ میر۔''

''کیا تمہیں بھی لگتا ہے کہ دہاج بھائی نے ایسا کچھ کیا ہو گا صندل کے ساتھ؟'' اس کے لہجے میں عجیب سی بے بسی تھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے میرو؟'' طوبیٰ نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''میرا دل نہیں مانتا، وہ گھر کی ایک ملازمہ کے ساتھ ایسی گھٹیا حرکت کر سکتے ہیں۔ تم کیا کہتی ہو۔'' شاہ میر کے افسردہ انداز پر طوبیٰ کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ نے احاطہ کیا۔

''تمہارا دل صرف میرے ہی معاملے میں سچ بولتا ہے شاہ میر۔'' وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ فوراً پلٹا، اور اپنی سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورنے لگا، وہ بوکھلا گئی، شاہ میر کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔

''ویسے ہی ایک بات کی ہے میں نے۔'' اس کی بوکھلاہٹ نے شاہ میر کو مشکوک کیا۔

''دیکھو طوبیٰ تمہارے اور میرے تعلق میں جھوٹ کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی، تم اگر کوئی بات مجھ سے چھپاؤ گی تو یہ میرے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہو گی۔'' وہ اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑے اسے گہری آزمائش میں ڈال چکا تھا۔

''تم یہ سوال مجھ سے کیوں کر رہے ہو؟'' وہ پریشان ہوئی۔

''اس لیے کہ مجھے لگ رہا ہے جیسے درمیان میں کوئی بات ہے، کوئی ایسی چیز ہے جو میں نہیں جانتا۔''

''میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کوئی اچھی چیز نہیں ہے میرو۔'' طوبیٰ نے دانستہ اس سے نظریں چرائیں۔

''فار گاڈ سیک بتا دو، کون سی ایسی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو، میرے دل میں طرح طرح کے وہم آ رہے ہیں۔'' وہ بے قرار و مضطرب لہجے میں گویا ہوا تو طوبیٰ کو لگا کہ وہ زیادہ دیر تک اس سے یہ بات نہیں چھپا پائے گی، ویسے بھی وہ یہ راز اکیلے سنبھالتے سنبھالتے تھک چکی تھی۔

''بات چھوٹی نہیں ہے شاہ میر۔۔۔'' اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم اب ایک لفظ بھی کچھ نہ بولیں تو میں ساری زندگی تم سے بات نہیں کروں گا۔۔'' شاہ میر کی دھمکی پر اس کا دل گہری کھائی میں گر گیا۔ اس نے ہمت کر کے اس سے سچ بولنے کا ارادہ کر ہی لیا۔

''صندل کا خاندان بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے، دہاج بھائی نے بہت غلط کیا تھا اس کے ساتھ۔'' طوبیٰ کے انکشاف پر شاہ میر کو لگا جیسے کسی نے خنجر اس کی پیٹھ میں اتار دیا ہو۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ ''تم کیسے کہہ سکتی ہو یہ بات؟''

''میں نے خود صندل کے ہاتھ کا لکھا ہوا آخری خط پڑھا تھا جو اس دن مجھے اس کمرے سے ملا جہاں اس نے خودکشی کی تھی۔'' طوبیٰ کی آواز لڑکھڑا سی گئی۔

''تمہیں یاد ہے ناں صندل والے واقعے کے بعد میں سب مردوں سے کتنا ڈر گئی تھی اور تم پر بھی شک کرنے لگی تھی۔'' وہ اسے یاد دلانے لگی اور یہ واقعہ کوئی اتنا پرانا نہیں تھا جو شاہ میر کو یاد نہ آتا۔ طوبیٰ کی تو ایک ایک حرکت اس کے دل پر نقش تھی۔

''مجھے دہاج بھائی سمیت اس گھر کے سبھی مردوں سے نفرت ہو گئی تھی، انہوں نے بہت ظلم کمایا۔۔'' ایک طوفان تھا جو شاہ میر کے وجود کے پرخچے اڑاتا ہوا گزر گیا، اس نے دہل کر طوبیٰ کی زرد ہوتی ہوئی رنگت کی طرف دیکھا، وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس سے زیادہ ضبط کا مظاہرہ وہ نہیں کر سکتی تھی۔

''دہاج بھائی نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' وہ رو رہی تھی اور شاہ میر کا دل پھٹ رہا تھا۔

''صندل کی آہ لگی ہے ہمارے خاندان کو، تبھی تو ہر طرف سے ذلت ہی ذلت لکھ دی گئی ہے ہمارے مقدر میں۔ تم مانو یا نہ مانو شاہ میر، یہ مکافات عمل ہے، ہم سب کو اس ظلم کا حساب دینا ہو گا۔'' ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے حواس کھو رہی ہو۔

''کہاں ہے وہ خط؟ تم دکھا سکتی ہو مجھے؟'' شاہ میر کی آنکھوں سے بھی جیسے لہو ٹپکنے کو بے تاب تھا۔

''وہ کھو گیا ہے مجھ سے، شاید کسی کتاب میں رکھا تھا، بعد میں بھی کافی ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن نہیں ملا۔'' اس نے اپنی نم آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا، شاہ میر کا سارا وجود لرز رہا تھا اور آنکھیں گرم آنسوؤں کی

شدت سے جل رہی تھیں۔

درحقیقت شاہ میر کے اعصاب بھی تھک گئے تھے اور اس انکشاف نے اس کے جوڑ جوڑ کو ہلا دیا۔ وہ ایک دم پلٹا اور کاؤچ پر بیٹھی ہوئی طوبیٰ کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، وہ اس معصوم بچے کی مانند لگ رہا تھا جو کسی چیز سے ڈر کر اپنی ماں کی آغوش میں چھپ کر بیٹھ جانا چاہتا ہو۔

طوبیٰ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فولاد جیسے اعصاب رکھنے والا یہ پاک فوج کا جوان اپنے خونی رشتوں کے دیئے ہوئے زخموں پر اس طرح بری طرح سے ٹوٹ کر بکھر سکتا ہے۔ درشہوار کے بعد وہاج بھائی کی اس حرکت نے حقیقتاً اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" نمیرہ جو کہ طوبیٰ کی تلاش میں پورے گھر میں بولائی ہوئی پھر رہی تھی، درشہوار کے کمرے کی لائٹ جلتی ہوئی دیکھ کر بے ساختہ انداز میں ادھر چلی آئی، سامنے کا منظر دیکھ کر اس کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کلیجے میں ہاتھ ڈال دیا ہو، شاہ میر اس کا تو کبھی بھی نہیں تھا لیکن اس وقت اسے کسی معصوم بچے کی طرح طوبیٰ کے سامنے بیٹھے دیکھ کر اس کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ٹرین پوری قوت کے ساتھ ملتان کی طرف گامزن تھی۔

مونیکا اور ذوالکفل نے عمرہ سے آنے کے فوراً بعد اپنے آبائی گھر جانے کا فیصلہ کیا، مونیکا بظاہر اندر سے کافی ڈری ہوئی تھی لیکن ذوالکفل نے اسے کافی حوصلہ دیا تھا، وہ اس کے ساتھ جا کر لبرٹی سے اپنے سسرال والوں کے لیے کافی سارے گفٹس بھی خرید کر لے آئی۔

"کیا وہ لوگ مجھے قبول کر لیں گے؟" یہ سوال اس نے کوئی چوتھی دفعہ کیا تو ذوالکفل اس کی معصومیت پر مسکرا دیا۔

"تمہیں میں قبول کر چکا ہوں اور تمہارے لیے اب یہ ہی بات اہم ہونی چاہیے۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں اس کے کان میں سرگوشی کی، وہ دونوں اس وقت بزنس کلاس کی ایک بوگی میں تھے۔ مونیکا نے عمرہ کرنے کے بعد عبایہ پہننا شروع کر دیا تھا، اس وقت وہ اسکارف کے ساتھ اچھی طرح اپنا سر ڈھانپے اپنے شوہر کے ساتھ ملتان جا رہی تھی۔

"اپنے خاندان کا تو میں تمہیں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن یہ بتاؤ کیا تمہاری فیملی قبول کر لے گی مجھے؟" اس نے اچانک مونیکا سے پوچھا۔

"میرے خیال میں نہیں۔" مونیکا کی صاف گوئی نے اسے تھوڑا مایوس کیا۔

"آخر کیا کمی ہے مجھ میں؟ کم از کم تمہارے اس منگیتر سے تو بہتر ہی ہوں۔" ذوالکفل نے ہلکے پھلکے لہجے میں اسے چھیڑا۔

"تم ہماری ہی کمیونٹی کے ہوتے تو شاید وہ لوگ قبول کر لیتے لیکن ان کے نزدیک میرا مذہب چھوڑنا ایک ناقابل معافی جرم ہوگا اور اس پر وہ شاید کبھی بھی مجھے معاف نہ کریں۔" مونیکا نے اس کی دل آزاری کے خوف سے تھوڑا محتاط انداز اپنایا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں مونیکا، ان شاء اللہ میں ان سب کو منا لوں گا۔" اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ محض اس کا دل رکھنے کے لیے اسے تسلی دے رہا ہے، ورنہ اپنے والدین کو وہ اس سے زیادہ بہتر طریقے سے جانتی تھی۔ ان دونوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ لوگ

ڈائریکٹ ذوالکفل کے گھر جائیں گے، ان کو منانے کے بعد پھر مونیکا کی فیملی کی طرف رجوع کریں گے۔

☆☆☆

برہان اور انابیہ کی ازدواجی زندگی کا یہ کوئی پانچواں دن تھا۔

اور انابیہ کو لگتا تھا۔ اس کی زندگی پر بھی کوئی پانچواں موسم ہی چھایا ہوا تھا اور وہ موسم تھا نحوست اور ناامیدی کا۔

سب بھول چکے تھے کہ اس گھر میں ایک نئی نویلی دلہن کا اضافہ ہو چکا ہے، جس کے کچھ ارمان ہیں۔ سب کو یاد تھے تو صرف اور صرف دو لوگ درشہوار اور وہاج، جو پورے خاندان کے سر پر ذلت کی خاک ڈال کر خود منظرِ عام سے غائب ہو چکے تھے۔

برہان نے اس تمام عرصے میں انابیہ کو گن کر کوئی پانچ دفعہ ہی بحالتِ مجبوری مخاطب کیا تھا، وہ آس بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی، جبکہ وہ اپنے ہی بہن بھائیوں کے مسائل میں بری طرح سے الجھا ہوا تھا، اس نے یونیورسٹی سے بھی ایک ماہ کی مزید چھٹی لے لی تھی۔

درشہوار کے گھر سے بھاگنے کے بعد وہاج کی گمشدگی نے اس گھر کے مکینوں کی زندگیوں میں ایک بھونچال برپا کر دیا تھا۔ سب ہی ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑتے، اندرون خانہ درشہوار کی بھی تلاش جاری تھی اور اس سے زیادہ انہیں وہاج کی ٹینشن تھی، جو ملتان سے صوبائی اسمبلی کی سیٹ پر الیکشن لڑ رہا تھا، ایسے موقعہ پر جب ان کے خاندان کی میڈیا پر مسلسل کردارکشی کی جا رہی تھی، وہاج کا اس طرح غائب ہو جانا بہت سے سوالات کو ابھار رہا تھا اور خاندان کے سارے مرد بری طرح سے زچ ہو چکے تھے۔

"میں نے تمہیں کہا تھا اس شرٹ پر بٹن لگا دینا، لیکن تمہارے پاس دو منٹ نہیں ہیں میرے لیے۔" برہان جو باہر سے اکتایا ہوا آیا تھا، اس وقت وارڈ روب کھولے کہیں اور جانے کی تیاری میں مگن تھا، اس نے ایک شرٹ ہینگر سے نکال کر بے زاری سے انابیہ کی طرف اچھالی۔

"مم...... مجھے تو نہیں کہا آپ نے۔" وہ گھبرا گئی، ویسے بھی یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ برہان کا کہا ہوا کوئی کام بھول جاتی۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں، بکواس کر رہا ہوں۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھا تو وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے نہیں کہہ پائی کہ وہ حقیقتاً بھول رہا ہے اور اس نے ایسا کوئی کام نہیں کہا تھا۔

"زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے، پتا نہیں کس گناہ کی سزا ملی ہے مجھے۔" اس کی بڑبڑاہٹ اتنی مدھم بھی نہیں تھی کہ اس کے کانوں تک نہ پہنچ پاتی۔

"یہ لیں شرٹ۔" انابیہ نے بٹن لگا کر شرٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"اپنے پاس رکھو اسے، اب نہیں پہننی مجھے۔" اس کا مزاج اچھا خاصا برہم تھا۔

انابیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اسی وقت تاجدار بیگم نڈھال انداز کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کا چہرہ زرد اور ماتھا پسینے کی ننھی ننھی بوندوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ دھڑام کر کے اس کے بیڈ پر گر گئیں۔

"امی کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" برہان کے ساتھ ساتھ انابیہ بھی ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔

"بلڈ پریشر بہت زیادہ ہائی ہے بیٹا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگیں، انابیہ کو ان پر ترس آیا۔

"تائی امی! آپ لیٹ جائیں، میں سر دبا دیتی ہوں آپ کا۔" انابیہ نے آہستہ سے ان کا کندھا پکڑ کر

انہیں لٹایا اور نرمی سے ان کا سر دبانے لگی۔

''آپ نے میڈیسن نہیں لی کیا؟'' برہان ماں کی حالت دیکھ کر فکر مند ہوا۔

''میڈیسن کیا خاک اثر کرے گی، ہر کوئی بندوق اٹھائے میرے پیچھے گھوم رہا ہے جیسے میں نے درشہوار کو گھر سے بھگایا ہو اور وہاج کو چھپانے میں بھی میرا ہاتھ ہو۔'' وہ رونے لگیں۔

''وہ اولاد جس کا ساری زندگی مان رہا مجھے، جسے میں اپنا غرور سمجھتی تھی، اسی نے میرا سر جھکا دیا۔'' وہ شدید ڈپریشن میں تھیں۔ ان دونوں نے تاسف بھری نگاہوں سے تاجدار بیگم کی طرف دیکھا۔

''آپ کیوں ٹینشن لے رہی ہیں؟'' وہاج نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

''درشہوار نے کیا کم کلیجہ جلایا تھا میرا، رہی سہی کسر تمہارے بھائی نے پوری کر دی۔'' وہ جذباتی انداز میں گویا ہوئیں۔

''یہ پروپیگنڈا ہے مخالف پارٹی کا، آپ وہاج بھائی کی فکر مت کریں۔'' برہان نے ہلکا سا جھنجھلا کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ بات مجھے نہیں اپنے باپ اور دادا کو سمجھاؤ، انہیں لگتا ہے یقیناً اس قصے میں وہاج کا کوئی نہ کوئی قصور ہے تبھی وہ چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ میرے بیٹے کے ساتھ کوئی حادثہ بھی تو ہو سکتا ہے، یہ لوگ اس طرف کیوں نہیں سوچتے۔'' تاجدار بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''امی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، آپ پلیز خود کو سنبھالیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' برہان نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر دلاسہ دیا، تو انابیہ نے گلہ آمیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا، ایسا لب و لہجہ ان کا چند لوگوں کے لیے مخصوص تھا، اس کے حصے میں تو ہمیشہ تلخ اور زہر آلود جملے ہی آتے تھے۔

''جاؤ بیا، امی کے کمرے سے ان کی میڈیسن لے کر آؤ۔'' برہان کے خلاف توقع نرم لہجے پر انابیہ کا دل بے اختیار دھڑکا۔

وہ جلدی سے کمرے سے نکلی، کوریڈور سے نکل کر وہ جیسے ہی سٹنگ روم میں پہنچی، سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی فارحہ بھابھی پر اسے کسی زندہ لاش کا گمان ہوا، وہ ایک اخبار گود میں رکھے ہوئے خالی نظروں سے اسے گھورے جا رہی تھیں، صندل والی بات کے بعد ان کو چپ سی لگ گئی تھی، گھر کی خواتین نے شروع شروع میں انہیں کریدنے کی کافی کوشش کی، لیکن ان کے سرد رویے کے بعد سب لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے۔

☆☆☆

شہزاد کافی کا مگ پکڑے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

''کیا ہوا شیری، کیا سوچ رہی ہو؟'' رومی نے بے چینی سے پہلو بدل کر اس کو مخاطب کیا۔

وہ دونوں بہنیں اس وقت ٹینا ہاؤس کے خوب صورت لان میں موجود تھیں، اور شہزاد نے بطور خاص رومیصہ کو اس کے کمرے سے بلوایا تھا۔ رومی کو اگرچہ اس کی کھوجتی ہوئی نظروں سے گھبراہٹ ہو رہی تھی لیکن اب اسے خود کو سنبھالنا آ گیا تھا اور اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ شیری نے اسے کسی خاص بات کے لیے ہی بلوایا ہے، لیکن بلی ابھی تک تھیلے سے باہر نہیں آئی تھی۔

''خیریت سے بلوایا تھا تم نے مجھے یہاں؟'' اس نے تنگ آ کر خود ہی پوچھ لیا۔

''ہاں تمہیں گڈ نیوز سنانی تھی، ان شاء اللہ، نیکسٹ پیشی میں کیس کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے گا۔''

شہزاد کی بات پر وہ ایک دم خوش ہوئی۔

''کیا جسٹس محمود سے مذاکرات کامیاب ہو گئے؟'' رومیصہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں وہ مان گئے، وہ کسی بھی قیمت پر اپنے بھتیجے کے مستقبل سے نہیں کھیلنا چاہتے۔'' شہزاد نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مگ میز پر رکھا۔

''لیکن کیا فائدہ ہوا، وہ بے چارہ صارم خان تو اپنی جان سے ہاتھ کھو بیٹھا، اس کی قربانی تو رائیگاں گئی۔'' وہ افسردگی سے گویا ہوئی۔

''بعض دفعہ کسی کی قربانی، کسی اور کے حق میں بہتر ہوتی ہے اور مجھے ذاتی طور پر خود بھی اس کی موت کا دلی افسوس ہے۔''

''کیا صارم خان کی فیملی معاف کر دے گی اس کے قاتل کو؟'' رومیصہ کو ابھی ابھی خیال آیا۔

''سنا ہے ان کے ساتھ بھی مذاکرات چل رہے ہیں ان لوگوں کے۔ یقیناً کوئی نہ کوئی پوزیٹو رزلٹ نکل آئے گا کیونکہ جسٹس محمود کو لوگوں کو رام کرنا آتا ہے۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اچانک موضوع گفتگو بدلا۔

''رومی، یہ ارسل کون ہے؟'' شہزاد کی بات پر رومیصہ کو ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگا۔

''صارم خان کا دوست تھا، لیکن تم کیسے جانتی ہو اسے۔۔؟'' اس نے بوکھلا کر اپنی بہن کا چہرہ دیکھا۔ یہ شہزاد کی بہترین کوالٹی تھی اس کے اندر چاہے جیسا بھی طوفان برپا ہوتا، وہ باہر سے ہمیشہ کسی پرسکون جھیل کی مانند ہی نظر آتی۔

''کیا اس کے کہنے پر صارم نے تمہارے حق میں گواہی دی تھی؟'' شہزاد کے درست اندازے پر وہ کچھ لمحوں کے لیے ہکا بکا ہوئی۔ اسے یقین آ گیا تھا اس کی بہن اپنی فیلڈ میں کیوں اتنی کامیاب ہے۔

''ہاں ارسل کا بہت قریبی دوست تھا صارم۔'' رومیصہ نے ادھورا سچ بتایا۔

''تمہارا کیا تعلق ہے اس کے ساتھ، اور تم کیسے جانتی ہو اسے؟'' شہزاد نے سرسری انداز میں پوچھا، جیسے اس کے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔

''یونیورسٹی فیلو ہے میرا۔'' اس نے جھوٹ بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں کیوں اتنی زیادہ فیور دے رہا ہے وہ؟'' اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''پسند کرتا ہے وہ مجھے، اور شادی کرنا چاہتا ہے مجھ سے۔'' رومیصہ کا خیال تھا یہ بات سنتے ہی شہزاد اچھل پڑے گی یا کم از کم حیرانی کا مظاہرہ ضرور کرے گی لیکن دوسری جانب ہنوز وہی ازلی سکون برپا تھا۔ وہ اپنے سیل فون پر آنے والے کسی ٹیکسٹ کا جواب بھی ساتھ ساتھ لکھ رہی تھی۔ رومی کو اس کے سرد رویے پر اچھی خاصی مایوسی ہوئی وہ اب اپنے اور ارسل کے قصے کو جلد از جلد نبٹانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس زیادہ ٹائم نہیں تھا۔

''کس فیملی سے تعلق ہے اس کا؟ آئی مین کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟'' اس کی نظریں ابھی بھی اپنے سیل فون پر جمی ہوئی تھیں۔

''آئی ڈونٹ نو، میں نے کبھی نہیں پوچھا۔'' اس کی بات پر شہزاد بے ساختہ مسکرائی تو رومیصہ کو عجیب سا احساس ہوا۔

''اس میں مسکرانے والی کیا بات ہے شیری؟'' اس کے لہجے میں موجود ناگواری بھانپ کر شہزاد تھوڑا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"آئی ایم سوری، یونہی میرے ذہن میں ممی کا خیال آ گیا تھا اگر تم یہ جواب ان کے سامنے دیتیں تو وہ کم از کم تمہارا سر تو ضرور پھاڑ دیتیں۔" اس کے ہلکے پھلکے انداز پر رومیصہ کا موڈ کچھ بہتر ہوا۔ ورنہ اسے لگا تھا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

"ممی کو چھوڑو، تم اس موقعے پر کیا کہو گی؟" اس کے طنزیہ لہجے کو شہزاد نے دانستہ نظر انداز کیا۔

"کچھ بھی نہیں، کیونکہ میرے نزدیک فیملی بیک گراؤنڈ اور اسٹیٹس وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں، میں سامنے کھڑے شخص کو امپورٹینس دیتی ہوں کہ وہ انسان کیسا ہے اور سب سے بڑی بات کہ اس کا میرے ساتھ تعلق کیسا ہے۔" اس کی بات پر رومیصہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"وہ ایم ایس کر رہا ہے اور جو اس کا لائف اسٹائل ہے تو اس سے تو یہی لگتا ہے کہ اس کا تعلق ایک ویل سیٹلڈ فیملی سے ہے۔"

"تمہیں یہ ساری باتیں ڈیٹیل سے پوچھ لینی چاہئیں اس سے۔" شہزاد نے مشورہ دیا۔

"میں یہ ضروری نہیں سمجھتی۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر کہا۔

"لیکن ضروری نہیں ممی بھی ایسا ہی سمجھیں، اس لیے بہتر ہو گا تم یہ ساری باتیں اور چیزیں ارسل کے ساتھ کلیئر کر لو اور ہو سکے تو اسے کہو، وہ جلد از جلد اپنے پیرنٹس کو بھجوائے ممی کے پاس۔"

"اس کے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور وہ اپنی ایک بہن کے ساتھ اپنی ننھیال میں رہتا ہے۔" رومیصہ کی بات پر وہ ہلکا سا چونکی، اسے یہ سوچ کر تسلی ہوئی وہ اس کے بارے میں اتنی بھی بے خبر نہیں جتنا خود کو ظاہر کر رہی تھی۔

"وہ جس کے ساتھ بھی رہتا ہو، تم اسے کہو، وہ اپنے گھر کے کسی بھی بڑے کو بھیجے، تاکہ اس معاملے کو نبٹایا جا سکے۔" شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، ممی مان جائیں گی؟" رومیصہ نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو ممی کا چیزوں کو دیکھنے کا اپنا ہی ایک اسٹائل ہے، اس لیے ان کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"اور تم کیا کہتی ہو؟"

"میں ہر صورت میں تمہیں ہی سپورٹ کروں گی۔" شہزاد کے محبت بھرے انداز پر اس بار وہ کھل کر مسکرائی اور اس کے دل میں اطمینان اور سرشاری کی لہریں اٹھنے لگیں، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شیری کو ممی کو کونوینس کرنا آتا ہے، اور یقیناً اب اس کا اور ارسل کا معاملہ حل ہو جائے گا۔

☆☆☆

مسز قریشی پچھلے دو دن سے چیمبر نہیں آ رہی تھیں۔

شہزاد اس دن اپنے آفس میں صندل کیس میں خاصی مصروف تھی اور آج تو اس کی کورٹ میں بھی ایک ہیرنگ تھی، جیسے ہی وہ عدالت سے واپس آئی تو اپنے آفس میں آ کر پھر مصروف ہو گئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کب ارتضیٰ حیدر خاموشی سے اس کے کمرے میں آیا اور اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وہ بال پوائنٹ سے تیزی کے ساتھ کسی فائل پر کچھ نوٹس لکھنے میں مصروف تھی اور اس کے ماتھے کی لٹ اسے بار بار ڈسٹرب کر رہی تھی، وہ کام کرتے کرتے بے دھیانی میں اس لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑس لیتی اور پھر مصروف ہو جاتی، ارتضیٰ یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور اسی وقت شہزاد کو خود پر کسی کی نظروں کی تپش کا احساس ہوا۔

"ارے ارتضیٰ! آپ کب آئے؟" اس نے خوش گوار حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کی دنیا میں تو بہت پہلے آ چکا ہوں، لیکن کمرے میں ابھی ابھی آیا ہوں۔" اس کے معنی خیز جملے پر وہ ہلکا سا چونکی اور اگلے ہی لمحے اس نے دانستہ اسے نظر انداز کر کے پوچھا۔ "کندھے کا زخم کیسا ہے؟"

"کندھے کا زخم تو بہتر ہے لیکن دوسرا گھاؤ خاصا گہرا ہے۔" وہ ہنوز سابقہ لہجے میں بولا تو شہزاد کو الجھن کا احساس ہوا۔

"کس گھاؤ کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"ارے چھوڑیں آپ، یہ بتائیں میجر حمزہ کا کیا حال ہے؟" اس کی اگلی بات سے شہزاد کو فوراً ہی اندازہ ہوا کہ وہ کس گھاؤ کی بات کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہوں گے۔ میرا دو دن سے کوئی رابطہ نہیں۔" اس نے کمال بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

"بائی داوے آپ کیسے جانتی ہیں انہیں؟" ارتضیٰ کا لہجہ اتنا سرسری بھی نہیں تھا، جتنا وہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ بات پوچھنے کے لیے آپ ہاسپٹل سے سیدھے میرے چیمبر میں آئے ہیں۔؟" اس کے طنز پر ارتضیٰ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"ہاسپٹل سے تو میں رات ہی گھر شفٹ ہو گیا تھا، سوچا کہ کام پر جانے سے پہلے آپ کے دربار میں حاضری دے آؤں۔" اس کی غیر سنجیدگی عروج پر تھی۔

"فی الحال تو آپ میرے ساتھ مسز قریشی کے ہاں حاضری دینے چلیں، ایک دو چیزوں پر ضروری ڈسکشن کرنی ہے۔" وہ بڑی ذہانت کے ساتھ حمزہ والے سوال کا جواب گول کر گئی۔

"سنا ہے مسز قریشی کا فشار خون خاصا بلند چل رہا ہے آج کل، خدانخواستہ کوئی ٹینشن تو نہیں کسی کیس کے سلسلے میں؟"

"آپ کو کس نے بتایا ان کی طبیعت کی خرابی کا؟" شہزاد چونک گئی۔

"کل ہاسپٹل میں عبداللہ صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، وہ ان ہی کے چیک اپ کے لیے آئے ہوئے تھے لیکن میں اتفاق سے نہیں مل سکا مسز قریشی سے، وہ ڈاکٹر کے پاس تھیں۔" ارتضیٰ کی بات پر وہ ان کے لیے فکر مند ہوئی۔ اس نے میز پر رکھی فائلز اٹھائیں اور کھڑی ہو گئی، ارتضیٰ نے بھی اس کی پیروی کی۔

"میں بھی حیران تھی وہ تو کبھی چیمبر سے چھٹی نہیں کرتیں۔ چاہے ایک گھنٹے کے لیے سہی لیکن آتی ضرور ہیں۔"

"یہ فائلز مجھے دے دیں، میں اٹھا لیتا ہوں۔"

"کم آن ارتضیٰ، آپ کے کندھے پر ابھی بھی بینڈیج ہے اور آپ کو کسی قسم کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہیے۔"

"لیکن آپ کا بوجھ میں ہر کنڈیشن میں اٹھا سکتا ہوں۔" اس کے معنی خیز انداز پر وہ الجھی اور مزید بحث کرنے کے بجائے فائلز انہیں پکڑا دیں۔ دونوں آفس سے باہر نکل آئے، ایک دو عام سی باتوں کے بعد ارتضیٰ نے ایک دفعہ پھر اسے یاد دلایا۔

"آپ نے بتایا نہیں میجر حمزہ کو کیسے جانتی ہیں آپ۔" ارتضیٰ کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"مجھ سے ایک سال سینئر تھے وہ کونوینٹ میں۔ اچھے دوستوں میں شمار ہوتا ہے ان کا۔" شہزاد کی بات پر ارتضیٰ کا چہرہ ہلکا سا بجھ گیا، وہ دونوں جیسے ہی پارکنگ میں پہنچے، شہزاد کا سیکورٹی گارڈ رضا بڑی سرعت سے اس کی

جانب آیا۔

"رضا آپ گھر جائیں، میں مسز قریشی کی طرف سے ہو کر آتی ہوں، ارتضیٰ مجھے ڈراپ کر دیں گے۔"

"سوری میم، میجر حمزہ کے بہت سختی سے آرڈرز ہیں کہ آپ کے ساتھ رہوں۔" رضا نے ہلکا سا جھجک کر کہا تو ارتضیٰ حیدر کی تیوری کا بل گہرا ہوا۔

"حمزہ صاحب کو بتا دیجیے گا، شیری میرے ساتھ ہیں، اور میری موجودگی میں کسی سیکورٹی گارڈ کی ضرورت نہیں ہوتی ان کو۔" ارتضیٰ کا لہجہ ہلکی سی ناگواری میں ڈوبا ہوا تھا لیکن رضا کی بھی ڈیوٹی کا معاملہ تھا اس نے پریشانی سے شہزاد کی طرف دیکھا۔

"ڈونٹ وری میں ان سے بات کر لوں گی، آپ گھر جائیں۔" شہزاد کی بات پر رضا زبردستی مسکرایا اور پارکنگ کی دوسری طرف کھڑی اس کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا، جبکہ ارتضیٰ کے اعصاب تن چکے تھے۔

☆☆☆

محمد ہادی مری سے گاڑی اڑاتا ہوا اسلام آباد پہنچا۔

اس ویک اینڈ پر درشہوار کی وجہ سے اس کا گھر آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن جیسے ہی اسے مسز قریشی کی خرابی طبیعت کا علم ہوا تو اس سے رہا نہیں گیا وہ دل ہی دل میں اس منحوس لڑکی سے سامنا نہ ہونے کی دعائیں کرتا ہوا گھر آ رہا تھا لیکن شاید آج کل اس کی دعاؤں کی قبولیت کا در بند تھا۔

جیسے ہی اس کی گاڑی قریشی ہاؤس میں داخل ہوئی اس کی نظر داخلی دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی درشہوار پر پڑی، اس کے حلق میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔ اس کا ایک دفعہ تو دل چاہا وہ گاڑی کو واپس موڑ کر مری لے جائے لیکن ایسا ہونا اب ممکن نہیں تھا۔

دوسری طرف درشہوار کو یہاں آئے ہوئے چار دن ہو چکے تھے اور ان چار دنوں میں وہ کوئی سینکڑوں بار سعد کو دل ہی دل میں کوس چکی تھی جس نے اچھی خاصی جیتی ہوئی بازی اس کے ہاتھ سے نکال دی تھی۔ وہ اگر اس دن وہاں نہ آتا تو یقیناً اس کا اور ہادی کا نکاح ہو جاتا۔

درشہوار کو یہاں آ کر احساس ہوا، ہادی کے والدین کی زندگی خاصی مصروف تھی، وہ صبح نو بجے کے نکلے ہوئے مغرب کے بعد ہی واپس لوٹتے اور کھانا کھانے کے بعد واک پر نکل جاتے، ان کا زندگی گزارنے کا ایک لگا بندھا سا شیڈول تھا، جس سے درشہوار تین ہی دنوں میں اکتا گئی تھی، دوسری طرف مسز قریشی بھی اسے کوئی خاص لفٹ نہیں کروا رہی تھیں۔ شاید انہیں بھی درشہوار کی باتوں پر شک ہو چکا تھا۔

گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر درشہوار نے جیسے ہی سر اٹھایا، ہادی کو سامنے دیکھ کر کوفت اور بے زاری کا سارا احساس، بھاپ کی مانند فضا میں تحلیل ہو گیا، اس کے دل کی دھڑکنوں نے اس دشمنِ جان کو دیکھ کر ایک الگ ہی راگ الاپنا شروع کر دیا تھا، وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی، اس کی پرشوق نظریں بلیک جینز پر وائٹ ٹی شرٹ پہنے ہوئے ہادی پر جمی ہوئی تھیں جس کے چہرے پر بے زاری دور ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔

وہ سیل فون پر کوئی ٹیکسٹ کرتا ہوا اسے نظرانداز کر کے جیسے ہی سیڑھیوں پر پہنچا۔ درشہوار نے بے ساختہ اس کا بازو پکڑا، اس کی اس حرکت پر ہادی کے اندر طیش کی ایک لہر بیدار ہوئی اور اس نے بلا ارادہ گھما کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس سے ہو گیا۔ درشہوار کا پورا بدن ایسے لرزا جیسے آندھی کی زد میں آیا ہوا کوئی خشک گھاس کا تنکا لرزتا ہے۔

"دوبارہ میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ

دی۔

ہادی کے جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے جبکہ درشہوار ہونٹ کچلتے ہوئے آنکھوں پر تنی دھند کی چادر کو ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی، اس کا چہرہ ضبط کی کوشش میں لال ہو چکا تھا۔ وہ سخت بے یقینی سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں اس کے لیے سوائے نفرت اور بے زاری کے کچھ نہیں تھا۔

ہادی غصے سے تیز تیز چلتا ہوا اندر کی طرف جا چکا تھا اور درشہوار یوں ساکت کھڑی تھی جیسے اس کے تن سے روح نکل گئی ہو۔

مسز قریشی اسے دیکھ کر ایک دم خوش ہو گئیں ان سے پندرہ منٹ کی گفتگو سے ہی ہادی کو اندازہ ہو گیا وہ درشہوار کی وجہ سے سخت ٹینشن میں تھیں کیونکہ وہ ان سب کے لیے ایسا نوالہ بن چکی تھی جسے وہ نہ تو نگل سکتے تھے اور نہ ہی اگل۔ اسی وجہ سے مسز عالیہ قریشی کا بلڈ پریشر نارمل ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں اس سے بڑے بڑے کیس ہینڈل کر چکی تھیں لیکن اس لڑکی نے تو چار دن میں ان کا دماغ گھما دیا تھا۔

"ممی! میں آپ سے کہہ رہا ہوں، اس کے باپ سے بات کر کے اسے یہاں سے بھجوائیں۔" ہادی کا ضبط جواب دے چکا تھا۔

"تم اس لڑکی کو نہیں جانتے ہو بیٹا، یہ ہماری پشتوں کی عزت کو خاک میں ملا دے گی۔" مسز قریشی کو اس کے باغیانہ مزاج کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنی ضد اور خواہش کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔

"تو کیا اس بات کی وجہ سے ساری زندگی اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہیں گے ہم؟" وہ سلگ کر گویا ہوا۔

"ایسا نہیں ہے میں نے ایک ترپ کا پتا پھینکا تو ہے اور یقیناً اس کا خاندان مجھ سے یا شہزاد سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا تب میں اس معاملے کو بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کروں گی۔" مسز قریشی کا اشارہ صندل کیس کی طرف تھا۔

"کچھ بھی ہو ممی! آپ صندل کی لاش پر کوئی مذاکرات نہیں کریں گی۔ میں آپ کو یہ زیادتی کرنے نہیں دوں گا۔" ہادی ان کی بات سمجھ چکا تھا۔

اس سے پہلے مسز قریشی اس کی بات پر اپنی رائے کا اظہار کرتیں، ملازمہ نے اندر آ کر میجر حمزہ کے آنے کی اطلاع دی، جسے سنتے ہی ہادی کے چہرے کے تاثرات میں تغیر رونما ہوا۔ وہ اس کا بیسٹ فرینڈ تھا۔ دونوں کی ملاقات کافی ماہ بعد ہو رہی تھی، ویسے تو فون اور واٹس ایپ پر ہمیشہ رابطہ رہتا۔ حمزہ کا نام سنتے ہی وہ بے چینی سے کھڑا ہوا۔ اس کا موڈ بہتر ہو چکا تھا۔

"ممی! آپ ریسٹ کریں۔ میں اس ڈفر سے مل کر آتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

ہادی بے تابانہ کمرے سے باہر نکلا، جیسے ہی وہ کوریڈور سے نکل کر سٹنگ روم میں آیا، سامنے درشہوار ایک مومی مجسمے کی مانند صوفے پر براجمان تھی اور اس کا پورا وجود صدمے کی سی کیفیت میں تھا، وہ اسے نظرانداز کر کے لان کی طرف بڑھا جہاں حمزہ بے چینی سے بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہی وہ شرارتی انداز میں دونوں بازو پھیلا کر کھڑا ہوا۔

"بائے گاڈ، دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک بے وفا، بے مروت اور کمینہ بندہ دیکھا، میں نے لیکن آفرین ہے تجھ پر میرے یار! سب تمہارے پیروں کی دھول نکلے، تو اپنے نام کا بس ایک ہی مینٹل پیس ہے۔" ہادی نے لان میں پہنچتے ہی حمزہ کو گرم جوشی سے گلے لگایا۔ اس سے کافی عرصے بعد ملنے کی خوشی اس کے پورے وجود سے

نمایاں ہو رہی تھی۔

''ڈفر انسان! تم نے وفا اور خلوص کی جو مثالیں قائم کر رکھی ہیں اس پر تو کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ باتیں کروالو تم سے جتنی مرضی بڑی بڑی۔۔'' حمزہ بھی کون سا کسی سے کم تھا۔ اس نے بے تکلفی سے ایک مکا اس کے کندھے پر رسید کیا۔

''صرف باتیں ہی نہیں، کام بھی بہت بڑے بڑے کیے ہیں۔ بیرسٹر شیری کو پتا چل جائے تو سر پھاڑ دے گی وہ میرا۔ ساری دنیا میں ایک میں ہی تو جانتا تھا کہ ''ہم زاد'' کے برقعے میں حمزہ خالد ہے۔'' ہادی کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا، اس لڑکی کا ذکر ہمیشہ حمزہ کا موڈ خوش گوار کر دیتا تھا۔

''بے فکر رہو، اس کے ساتھ مذاکرات کامیاب ہو چکے ہیں میرے۔'' حمزہ نے ہنس کر اسے خوش گوار حیرت میں مبتلا کیا۔

''کاش تم سے پہلے میرے مذاکرات کامیاب ہو جاتے، تو اس وقت میں تم پر قہقہے لگا رہا ہوتا۔'' ہادی کے شرارتی انداز پر حمزہ ایک بار پھر دل کھول کر ہنسا۔ دونوں میں مثالی دوستی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف تھے۔ سوائے ایک راز کے جو ہادی نے اپنے دل کے گہرے کنویں میں پھینک کر اپنے ہونٹوں پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا لی تھی، وہ کسی کی دوستی کا مان ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''ہمیشہ اسی چیز پر غلط نگاہ رکھنا جو مجھے پسند ہو۔ زندگی میں میری نقل مارنے کے علاوہ تم نے کیا ہی کیا ہے۔'' حمزہ اب مسکراتے ہوئے اس کی کلاس لے رہا تھا۔

''کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ میں نے کیا کیا ہے۔'' ہادی چاہتے ہوئے بھی یہ جملہ اس سے نہیں کہہ سکا۔

''چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ، کیا حال ہے تمہارے رقیب روسیاہ ارتضٰی حیدر کا۔'' ہادی نے دانستہ موضوع گفتگو بدلا۔

''وہ خبیث کسی دن واقعی میرے ہاتھوں شہید ہو جائے گا۔'' اس نے قہقہہ لگا کر اسے اطلاع دی۔

''مبارک ہو، اللہ نے اسے شہادت کا درجہ دینے کے لیے بھجوایا ہے ہمارے گھر۔ بس بسم اللہ کرو۔'' ہادی کی نگاہیں گیٹ سے اندر داخل ہوتی ہوئی ارتضٰی کی گاڑی پر تھیں اور اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر موجود شہرزاد کو دیکھ کر حمزہ کے چہرے سے مسکراہٹ ایک پل میں غائب ہوئی۔ وہ اس کی محبت کے معاملے میں بہت شدت پسند تھا، اس کا بس چلتا تو وہ اس کے سائے کو بھی اس سے الگ کر دیتا۔

ہادی نے مسکرا کر شہرزاد کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ رہی تھی۔ ارتضٰی کے ہاتھ میں اس کی فائلز کا ڈھیر تھا، جو ہادی نے ملازم کو پکڑنے کا اشارہ کیا۔ وہ ارتضٰی کی کسی بات کے جواب میں مسکراتے ہوئے حمزہ کے دل پر چھریاں چلا گئی۔

''کیسے ہیں ہادی آپ؟ کیا ہوا مسز قریشی کو؟'' وہ حمزہ کو دانستہ نظر انداز کر کے ہادی سے مخاطب ہوئی، جبکہ ارتضٰی ان دونوں سے ہاتھ ملا رہا تھا اور حمزہ نے انتہائی بے دلی سے مصافحہ کیا۔

''کولیسٹرول بڑھا ہوا ہے ان کا اور بی پی بھی کچھ پرابلم کری ایٹ کر رہا ہے۔'' ہادی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کہاں ہیں وہ؟ ملنا تھا مجھے ان سے۔'' وہ حمزہ کو جان بوجھ کر نظر انداز کر کے ہادی سے مخاطب ہوئی۔ اس کے اس انداز پر حمزہ کوفت کا شکار ہوا اور اس نے شکایتی نظروں سے شہرزاد کی طرف دیکھا، جو اسے

انجان بن کر کھڑی تھی جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو اور دل ہی دل میں شہرزاد کو بھی حمزہ کی حالت کا بخوبی اندازہ تھا، لیکن وہ دنیا کے کسی بھی شخص کو اپنے اور اس کے حوالے سے مشکوک کرنا نہیں چاہتی تھی، اس کے لیے سب سے اہم چیز اس کی عزت تھی۔

''آئی تھنک شیری! آپ مسز قریشی سے مل آئیں، میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔'' ارتضٰی کا اشارہ حمزہ اور ہادی کی طرف تھا اور اس کی اس بات پر حمزہ کے چہرے کے زاویے بگڑے، اور ہادی نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کا گلا بمشکل گھونٹا۔

''آپ بیٹھیں، میں شیری کو چھوڑ کر آتا ہوں ممی کے روم میں۔۔۔'' ہادی، اسے اپنے ساتھ لیے اندر کی طرف بڑھا۔

فرسٹ فلور پر اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کے پاس کھڑی درشہوار نے یہ منظر بڑی اذیت سے دیکھا، ہادی اور شہرزاد دونوں اس سے کافی فاصلے پر تھے، ہادی کے چہرے پر پھیلی ہوئی چمک نے اتنی دور کھڑی درشہوار کے اندر تاریکی اور مایوسی کا ایک جہاں بھر دیا۔ ایک تو ہادی کے نفرت سے بھرپور طمانچے نے اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا اور رہی سہی کسر اس منظر نے پوری کر دی۔ درشہوار کو اپنا دماغ ابلتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے غصے سے اسٹیل کا گلدان اٹھایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر مار کر اپنے اندر کے غصے کو کم کرنے کی کوشش کی۔ پورے گھر میں ٹھاہ کر کے شیشہ ٹوٹنے کی آواز گونجی۔

اس کے اندر کا ابال پھر بھی کم نہ ہوا، اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی خالی رہ جانے کا احساس اس کے اندر کی ضدی لڑکی کو جگا چکا تھا۔ وہ جذباتیت کی انتہا پر تھی اور اس نے انتہائی غصے سے ڈریسنگ کا ایک ٹوٹا ہوا نوکیلا شیشہ اٹھایا، فیصلہ کن انداز میں اسے دیکھا اور انتہائی جنونی کیفیت میں اپنے بائیں بازو کی رگ پر پھیر دیا، درشہوار کے حلق سے نکلنے والی بلند و بالا چیخ نے قریشی ہاؤس کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔

☆☆

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

تمہاری ماں

حمیرا عروش

مجھے لگتا ہے تمہاری ماں کے پاس دماغ نہیں ہے۔ ہر آئے گئے کے سامنے اپنی نصیحتوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتی ہیں۔ مانو، ساری دنیا میں ان جیسا عالم فاضل، متقی و پرہیزگار کوئی دوسرا نہیں ہے۔ کل فائزہ کو برملا منہ پر ہاف سلیوز پر ٹوک دیا۔ بھلا اس دور میں کون نہیں پہنتا؟ مگر تمہاری ماں کو تو مجھ سے اور میری دوستوں سے نہ جانے کیا پرخاش ہے؟ آج رواحہ کی بیٹی کو پانی پینے کے آداب سکھانے بیٹھ گئیں۔ بھلا کیا ضرورت تھی؟ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، رواحہ نے کتنی سبکی محسوس کی اور میں نے کتنی خفت اٹھائی...... ان کے ان ہی کارناموں کی بدولت میری کئی دوستوں نے میرے گھر آنا چھوڑ دیا ہے۔''

میں جو سارے دن کا غبار بامشکل اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔ صارم کے اندر آتے ہی پھٹ پڑی۔

میرے مزاج کا حصہ تھا کہ جب تک اپنے جذبات کا بھرپور انداز میں اظہار نہ کر لیتی۔ دلی اطمینان سے محروم رہتی۔ میری منفی و کاٹ دار گفتگو مقابل پر کس طرح اثر انداز ہو گی۔ اس کی پروا کرنا میری ذات کا خاصا نہ تھا۔

حسب معمول جواباً صارم کی جانب سے خاموشی ملی جو کہ اس کی عادت نہیں فطرت تھی لہٰذا وہ گونگے کا گڑ منہ میں دبا کر بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹ گیا۔ گویا نیند میں پوری طرح ڈوبا ہو۔

''تمہاری ماں اگر سامنے موجود ہو تو نیند تمہارے قریب بھٹکتی تک نہیں مگر کمرے میں قدم رکھتے ہی تم پر نیند سوار ہو جاتی۔ میری کوئی بات سننے کے لیے تمہارے پاس ذرا وقت نہیں ہے۔ اگر ان ہی خاموشیوں میں زندگی کے دن تمام کرنے تھے تو شادی کر کے میری زندگی کیوں تباہ کی؟'' یہ الفاظ بھی خاموشی کی دیوار میں ذرا دراڑ نہ پیدا کر پائے، وہ بے حس بنا ساکت و صامت لیٹا رہا۔

محض اتنا فرق رونما ہوا تھا کہ اس کے چہرے پر کئی رنگ ابھرے، ٹھہرے اور گزر گئے مگر کوئی حرف نوک زبان پر لانا محال تھا۔ میں بکتی جھکتی کب نیند کی وادیوں میں اتری۔ کچھ خبر نہ ہوئی۔

☆☆☆

''سنو! تمہاری ماں کے ساتھ رہنا کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔ ہر وقت پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ ایسے کرو، ویسے نہ کرو...... کبھی کبھار مجھے لگتا ہے میں نے اپنی زندگی تمہاری ماں کے پاس گروی رکھ دی ہے۔ وہ میری زندگی بھی خود گزارنا چاہتی ہیں۔ یہی حالات رہے تو عنقریب میں پاگل ہو جاؤں گی یا زہر کھا کر موت کو گلے لگانا پسند کروں گی۔ پتا نہیں کیوں لوگ اپنی زندگی گزار کر دوسروں کی زندگی پر پہرے بٹھانا اپنا فرض گردانتے ہیں۔ ہونہہ نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔ آخر تمہارے دوسرے بھائی انہیں اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتے؟ ان کا بھی فرض بنتا ہے۔ ہاں! مگر وہ تمہاری طرح پاگل تھوڑی ہیں جو خوامخواہ کی بلا کو اپنے گلے کا طوق بنائیں گے...... اور تم! تمہارے پاس میرے علاوہ کسی کے لیے بھی وقت ہو سکتا ہے مگر میرے دکھ، درد کا نہ تو تمہارے پاس مداوا ہے اور نہ ہی ہمدردی کے دو بول...... جیسے اب آنکھیں موندے اور منہ میں گھنگھنیاں ڈالے پڑے ہو۔ سو گئے کیا؟''

جواب ندارد......!

ایسا آج پہلی بار تو نہ ہوا تھا۔ اسے بھلا کیا فرق پڑتا مگر آج کہیں بڑا گہرا شگاف پڑ چکا تھا۔

باہر کھڑا نحیف و نزار وجود ان گوہر افشانیوں پر سہم کر رہ گیا۔ دودھ کا بڑا سا مگ جو بہو دانستہ یا نادانستہ لینا بھول گئی تھی۔ اس کے اتنا زہر اگلنے پر وہ بھی جھریوں بھرے ہاتھ کی ادنیٰ سی گرفت میں کپکپا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''آہ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ یوں میری دعائیں شرف قبولیت کا درجہ پائیں گی۔ تین چار دن ہو گئے ہیں۔ اس کی ماں نے مجال ہے جو بستر چھوڑا ہو۔ ہانیہ! تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ میں کس قدر مسرت و فرحت محسوس کر رہی ہوں۔ ایسا لگتا ہے گویا کسی قید سے رہائی پائی ہو۔ اگر وہ اسی طرح بیمار رہیں تو میری تو دنیا ہی سنور جائے گی۔ اے اللہ! وہ کبھی صحت یاب نہ ہوں۔'' دل کی گہرائی سے آواز آئی۔

''آمین!'' ہانیہ نے با آواز بلند کہا۔ پھر اپنے نادر خیالات پر بھی روشنی ڈالی۔

''یار! یہ ساس تو ہوتی ہی ایسی ہیں۔ جب تک زندہ رہتی ہیں۔ چھری تلے دم نہیں لینے دیتیں۔ اب مجھے دیکھو! پورے تین سال ساس کا عذاب جھیلا ہے۔ اب ان کے انتقال کے بعد سکون کے دن دیکھنا نصیب ہوئے ہیں۔ اب کہیں جا کر بااختیار ہوئی ہوں ورنہ قبل ازیں تمہاری مانند سسرال قید خانہ لگتا تھا۔ تم بھی صبر رکھو کہ کچھ وقت کی پریشانی ہے۔ پھر سب کچھ تمہاری مٹھی میں ہو گا۔ میری پیاری دوست۔''

حالات کے پیش نظر ہانیہ میری تشفی کرانے میں کافی حد تک کامیاب رہی تھی۔

اور آج ایک عرصہ بیت جانے کے بعد ہانیہ کے وہ الفاظ من و عن درست ثابت ہو چکے ہیں۔

وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ زندگی میں اتار چڑھاؤ بھی آتے رہتے ہیں۔ مگر کسی بھی طرح کے حالات میں ساگر حیات کے بیچ لمحات زیست بتانے



کے لیے آزادی کا احساس زندگی کو خوش کن و فرحت بخش بناتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھ سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ذی نفس کر پائے۔ جس نے سانس جیسے عذاب کو جھیلا ہو یا عذاب جیسی سانس کو جھیلا ہو۔

خیر میں تو صرف آپ کو اپنی خوشحال اور ''آزاد'' زندگی سے آگاہ کرانا چاہتی ہوں۔

جس روز سے نصیحتوں کی پٹاری منوں مٹی تلے جا سوئی ہے۔ زندگی اس قدر کیف آگیں ہو چلی ہے کہ شاید کسی حسین خواب کا گمان ہوتا ہے۔

بلاشبہ آزادی کا رنگ زندگی کے ہر رنگ پر حاوی ہے۔

اس چمکتی دمکتی حیات میں میرے راج دلاروں محب اور عالیان نے چار چاند لگا دیے ہیں۔

انہیں دیکھ کر مجھے اپنی گرہستی، اپنی ذات حتیٰ کہ اپنی دنیا تک مکمل لگتی ہے۔

''ممتا کا احساس زندگی کے ہر خوب صورت احساس پر حاوی ہے۔'' یہ میرا نظریہ ہے اور یقیناً صد فیصد درست ہے۔

گو کہ زندگی مصروف تر ہو چلی ہے مگر یہ مصروفیات ہی میری زیست کا کل اثاثہ ہیں۔

اپنی اولاد کو پروان چڑھانے، ان کی بہتر نشوونما اور ان کی زندگی کو خوب صورت و مکمل بنانے کے لیے میں جس قدر یکسوئی، تندہی، مستعدی سے محنت کروں ـــــ تھکتی نہیں ہوں بلکہ انہیں پھلتا پھولتا اور بڑھتا دیکھ کر مزید توانائی مجھ میں بھرتی چلی جاتی ہے۔ جو مجھے مزید چاق و چوبند اور چوکس بنا دیتی ہے۔

میری شبانہ روز محنت کا ثمر، میری زیست کا حاصل کل میرے بچوں کی اعلیٰ تربیت و قابلیت مجھے تھکنے پر مجبور نہیں کرتی۔ انہیں دیکھ دیکھ کر قطرہ قطرہ حیات نوش کرنا کس قدر راحت بخش پر کیف ہے۔

اس کا اندازہ ایک ماں ہی لگا سکتی ہے۔

وقت پر لگا کر یوں اڑا کہ احساس ہی نہ ہو سکا۔ میں اپنی جنت میں کچھ اس طرح کھوئی کہ ارد گرد سے بے نیاز ہو گئی۔ رسم حیات نبھاتے نبھاتے ہوش تب آیا جب آج اپنے دونوں لخت جگروں کے سر پر سہرے سجے دیکھے تو سالہا سال سرک کر نگاہوں میں گھوم گئے۔ ان کی پیدائش سے لے کر اب تک کا لمحہ لمحہ یاد بن کر آنکھ میں سمایا۔ کس طرح میں نے ان کے سکون کے لیے اپنے آرام، چین حتیٰ کہ نیندوں تک کی بازی ہاری تھی اور سامنے وہ کس شان سے کسی کے پہلو میں سجے بیٹھے ان کے نام ہو چکے تھے۔

لمحوں میں میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

ارے...... یہ کیا؟

میں نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں۔ اگر کسی کی نظر پڑ جاتی تو کیا خیال کیا جاتا۔

بیٹوں کی ماں کی چشم نم؟

میں بے وجہ مسکرا دی۔ پھیکی سی غمگین مسکراہٹ، ساتھ ہی ایک خیال دامن گیر تھا کہ بیٹی کی جدائی پر اس کی ماں کا کرب ہر دل پر روز روشن کی مانند عیاں ہوتا ہے۔ کیا کبھی کسی نے بیٹے کی ماں کے احساسات در خور اعتنا جانے ہیں؟ جو لمحوں میں پوری زیست کا ثمر تیاگ دیتی ہے...... میری آنکھیں پھر نم تھیں۔

وہ فیصلہ جو میں نے کئی برس قبل کیا تھا۔ اس پر پوری تندہی کے ساتھ عمل پیرا ہوں۔

اپنی بہوؤں کو شخصی آزادی دینے کا فیصلہ کئی برس قبل میں نے اپنے دل میں باندھا تھا۔ ان کے کسی امر میں دخل اندازی اور روک ٹوک نہ کرنے کا عہد ہنوز قائم تھا۔

اس دوران صارم کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد میں نے خود کو بے حد محدود کر لیا تھا۔

پندرہ دن محب اور پندرہ دن عالیان کے گھر گزارتی کہ زندگی کا تسلسل کسی بھی ہوش مند انسان کو اکتانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ دونوں کے ساتھ پندرہ روز قیام مجھے دونوں سے قریب رکھتا۔ جہاں میرا دل بہلتا۔ وہیں وہ دونوں بھی نہال تھے۔

میری دونوں بہوؤں نے بیٹی کی کمی کا احساس مفقود کر دیا تھا۔ وہی ناز، وہی نخرے جو بیٹی کے

اٹھانے کے لیے دل مچلا کرتا تھا...... ہر ارمان ان پر نکال کر اپنے وقت کو خوب تر بناتی۔

نئے دور کی لڑکیوں کی طرح لاابالی اور کھلنڈرا پن دونوں میں ہی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ پھر میری یا گھر کی جانب سے بھی کسی ذمہ داری کا دباؤ نہ تھا کہ میں خوش دلی سے ہر کام لمحوں میں نمٹانے کے فن میں طاق تھی۔ اگر چہ ایک ماں کی طرح ہر معاملے میں ان کی رہنمائی کرنا اپنا فرض گردانتی تھی۔

در شہوار کھانے کے معاملے میں بڑی چور ثابت ہوئی تھی۔ رات کو دودھ پینا اسے پسند نہ تھا۔ اس امر سے اس کی نہ صرف صحت متاثر ہوتی بلکہ آنے والا ننھا مہمان بھی صحت کے اعتبار سے کمزور ہو سکتا تھا۔ ان باریکیوں کا ان نئی ماؤں کو بھلا کیا اندازہ۔

لہٰذا اس کی متوازن غذا کا خیال رکھنا آج کل میری اولین ترجیح تھی۔

سخت سردی کا راج تھا۔ سرد ہواؤں نے جوڑوں کے درد سے نوازا تھا لہٰذا میرے لیے اٹھنا بیٹھنا محال تھا۔

میں بمشکل تمام بستر چھوڑ کر اٹھی اور سبک روی سے کچن کی جانب بڑھ گئی۔ گرم دودھ سے کپ بھر کر میرا رخ در شہوار کے کمرے کی جانب ہوا۔

روشن دان سے چھن کر باہر آتی دودھیا سیور کی روشنی ان کی بیداری کی غماز تھی۔

میں نے لمحہ بھر کے لیے آسمان کا جائزہ لیا۔ چاند تارے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں جا چھپے تھے اور فلک پر سیاہ بدلیوں کی مکمل راجدھانی تھی۔ بارش جل تھل کے لیے بے تاب کھڑی تھی۔

میں نے دستک کے لیے ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ اندر سے آتی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''مجھے لگتا ہے۔ تمہاری ماں کے پاس دماغ نہیں ہے۔ ہر وقت سائے کی طرح ساتھ رہتی ہے۔ جیسے اس سے بڑھ کر میرا خیال رکھنے والا ساری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' بے حد غم سے چور انداز اور ترش لہجہ۔ میری سماعتیں برق تھیں تو بلاشبہ یہ آواز در شہوار کی تھی۔

''آزادی کا تو احساس ہی ختم ہو گیا ہے۔ ہر وقت نظروں کے حصار میں رہو۔ میں تو جیسے دودھ پیتی بچی ہوں نا۔ ہونہہ! لوگ اپنی زندگی گزار کر دوسروں کی زندگی کو بھی نئے سرے سے گزارنے لگتے ہیں۔''

میرا ایک دم سر چکرایا تو ضبط کی آخری حد کو چھوتا، برداشت کی اذیتیں پھلانگتا، قرب کا مرقع بنا صارم کا چہرہ نگاہ کے سامنے آیا تو دل شرم سے چور ہو گیا۔ مکافات عمل کا بخوبی ادراک لمحوں میں آگہی کا در وا کر گیا۔

قدم تھے کہ زمین پر جکڑے ہوئے تھے۔ دل تھا کہ موہوم سی خوش فہمی کی لپیٹ میں بے حد سہم کر دھڑک رہا تھا۔

مگر...... اگلی چند ساعتوں میں مان بھرا دوسرا بلند قامت و آہن بت بھی پاش پاش ہو گیا۔ جب عالیان کی آواز سماعت میں پگھلے سیسے کی مانند پیوست ہوئی۔

''ریلیکس ڈارلنگ! یو نو پاپا کی ڈیتھ کے بعد مما سائیکو حد تک پوزیسو ہو گئی ہیں۔ ہر معاملے میں اپنی منشا کو قابل جانتی ہیں۔ آئی نو! تمہیں میری خاطر بہت کچھ سہنا پڑ رہا ہے مگر میری جان! تم میری محبت پر بھی تو ـــ نظر ثانی کر کے ذرا اعزاز بخشو، جہاں تک مما کی سائیکو طبیعت کا تعلق ہے تو تم خود ہی ذرا حدود و قیود کا خیال رکھا کرو۔ ہمارے حد سے تجاوز کردہ تعلقات ہی دوسروں کو ہمارے معاملات میں انٹر فیئر کرنے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔''

وہ بہت دلار سے اسے منا رہا تھا۔

بے حد نرم و شیریں لہجے میں گفتار کرتا وہ مجھے انگاروں پر گھسیٹ چکا تھا۔ انداز یکساں مگر الفاظ تو مناسب ہو سکتے تھے۔ مگر نہیں! پھر مجھے سود سمیت میرے اعمال کون لوٹاتا؟

میں پلٹی، من من بھر قدم اٹھاتی بمشکل تمام مگ پر گرفت مضبوط کرتی کسی ہارے جواری کی طرح میں نے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ جہاں تا حد نگاہ حقیقت کا راج تھا، جو بے حد اذیت ناک تھی۔

☆

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

کبھی حسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی نازِ بے نیازی، وہی شانِ خسروانہ

ترے عشق کی کرامت، یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

تری دوری و حضوری کا ہے عجیب عالم
ابھی زندگی حقیقت، ابھی زندگی فسانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو فرق ہے تجھ میں مجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ

ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک! یہ شکستِ فاتحانہ

جگر مراد آبادی

پہلی محبت یاد آتی ہے
دور افق کی تاریکی میں
بجلی جب بھی لہراتی ہے
شمع جلاتے جلتے اکثر
کمرے کے گھپ اندھیارے میں
پہلی محبت یاد آتی ہے
آٹوگراف طلب کرنے جب
کوئی حسینہ گھر آتی ہے
بڑی بڑی آنکھوں سے جب وہ
دیکھ کے مجھ کو شرماتی ہے
ماضی میں کھو جاتا ہوں میں
چھوٹا سا ہو جاتا ہوں میں
پہلی محبت یاد آتی ہے
شامِ خزاں جب تنہا تنہا
باغ میں سیر کو جاتا ہوں میں
کسی اداس سی لڑکی کو جب
بینچ پر تنہا پاتا ہوں میں
جانے کیوں یاد آجاتا ہے
ایک خزاں کی شام کا منظر
جب ہم دونوں جدا ہوئے تھے

اعتبار ساجد



ہم تری بزم سے اے یار چلے جاتے ہیں
لے چلے جاتے ہیں، ناچار چلے جاتے ہیں

حضرتِ دل کی قضا آئی ہے اس کوچے میں
کہ یہ دوڑے ہوئے ہر بار چلے جاتے ہیں

منتظر دیر سے ہیں جلوہ دکھا دے ظالم
ورنہ یہ طالبِ دیدار چلے جاتے ہیں

اس طرح جاتے ہیں اس بزم میں دل کے ہاتھوں
کہ بندھے جیسے گنہگار چلے جاتے ہیں

گرچہ سو سو ہیں تغافل کے نجلانے کوئی
ان نگاہوں کے مگر وار چلے جاتے ہیں

بھول کر راہ چلے آتے ہیں للّٰہ بخشو
ہم خطاوار گنہگار چلے جاتے ہیں

داغ اس ضعف نے اپنی تو منزل کھوئی
ہم رہے جاتے ہیں، سب یار چلے جاتے ہیں

داغ دہلوی

کچھ تجھ کو خبر ہے، ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجیے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے، اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

اسرار الحق مجاز

اِس ماہ کی مسکراہٹیں

سسرال

تیز رفتاری کے جرم میں نثار صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا، انہوں نے صحتِ جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! میں تو صرف بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔''

''کیا ثبوت ہے اس بات کا؟'' مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

''جناب والا! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں اس وقت اپنے سسرال جا رہا تھا۔''

نسرین جمیل۔ گوجرانوالہ

ڈھٹائی

اگر ہے پاس نذرانہ، بلا کھٹکے چلے آنا
ہمارے در پہ روزانہ، بلا کھٹکے چلے آنا
ڈھٹائی تو ضرور ہے شکم کے واسطے چندا
ڈنر ہو یا ہو عصرانہ، بلا کھٹکے چلے آنا

فاطمہ زہرا۔ چونگی

نہلے پہ دہلا

''اگر آپ میرے شوہر ہوتے تو میں آپ کو زہر دے دیتی۔''

''اور محترمہ، اگر میں آپ کا شوہر ہوتا تو میں اسے بخوشی پی لیتا۔''

امشال فاطمہ۔ کراچی

اچھی بیوی

اچھی بیوی دنیا کے ہر کونے میں مل جاتی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ دنیا گول ہے اور کونا نہیں ملتا......!

فاکہہ سہیل۔ کراچی

بے بسی کی انتہا

ایک کار والے نے بہت کوشش کی وہ کسی طرح سامنے چلنے والی موٹی عورت کو بچا لے لیکن جب وہ ناکام رہا تو اس سے ٹکراتے ہوئے گاڑی روک لی۔ موٹی عورت بلبلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور چلانے لگی۔

''کیا تم میرے گرد گھوم کر نہیں جا سکتے تھے۔''

موٹر کار والا بولا۔ ''گھوم کر تو چلا جاتا مگر کیا کروں اتنا پٹرول ہی نہیں تھا۔''

حرمہ واجد۔ لاہور

ترقی

ایک تھانیدار نے دوسرے تھانیدار سے کہا۔ ''کاش ہم بھی آئی جی ہوتے۔''

دوسرا تھانیدار بولا۔ ''میں تو گھر جاتے ہی آئی جی بن جاتا ہوں۔''

''ارے بھئی وہ کیسے؟'' پہلے تھانیدار نے پوچھا۔

''میں جب گھر جا کر بیگم کو بلاتا ہوں، تو وہ کہتی ہے، آئی جی۔'' دوسرے تھانیدار نے جواب دیا۔

نورین ولی۔ مانسہرہ

آرام

ڈاکٹر نے باتونی عورت سے کہا۔ ''آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس آرام کی ضرورت ہے۔''

عورت نے بے بسی سے کہا۔ ''لیکن ڈاکٹر صاحب میری زبان کی تکلیف تو دیکھیے۔''

''اسے بھی آرام کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر نے بے رخی سے جواب دیا۔

منیٰ ریحان۔ کراچی

منافع

ایک چور نے بکری چوری کی اور اسے ذبح کر کے اس کا گوشت غریبوں میں بانٹ دیا۔

اس کے ایک دوست نے پوچھا۔ ''تمہیں کیا ملا؟''

چور نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''کھال۔''

غزلیٰ کاشف۔ لاہور

خوف خدا

لڑکی (دکان دار سے) ''بھائی! ان کپڑوں کے صحیح صحیح دام لگاؤ، ہم ہمیشہ یہیں سے خریداری کرتے ہیں۔''

دکان دار۔ ''کچھ تو خدا کا خوف کریں باجی، کل ہی تو ہم نے دکان کھولی ہے۔''

ریحانہ مرتضیٰ۔ سیالکوٹ

ناقابلِ اشاعت

اسکول میں ایک کلاس کے بچوں کو کسی سواری کے بارے میں تقریباً ڈھائی سو الفاظ پر مشتمل مضمون لکھنے کے لیے کہا گیا۔ ایک بچی نے لکھا۔ ''میرے ابو نے ایک پرانی کار خریدی، پہلی رات وہ ہمیں اس میں بٹھا کر ہائی وے پر بہت دور ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ راستے میں کار خراب ہو گئی ہمیں کوئی سواری نہیں ملی اور کسی نے ہمیں لفٹ بھی نہیں دی۔ ہمیں کئی میل تک پیدل چلنا پڑا۔''

''مس! یہ تقریباً پچاس الفاظ ہو گئے۔ باقی دو سو الفاظ وہ ہیں، جو راستے میں ابو نے کار کی شان میں بولے مگر وہ لکھنے کے قابل نہیں ہیں۔''

فاطمہ کنیز۔ گھوٹکی

ضد

جیل میں ایک قیدی نے دوسرے سے پوچھا۔ ''تمہیں کس جرم میں سزا ہوئی ہے۔''

دوسرا قیدی بولا۔ ''حکومت سے میری ضد چل رہی ہے۔''

پہلا قیدی (حیران ہو کر)۔ ''کیا تم کوئی سیاستدان ہو؟''

دوسرا قیدی۔ ''نہیں، بات یہ ہے کہ حکومت کو یہ پسند نہیں تھا کہ میں بھی اس کی طرح نوٹ چھاپوں۔''

عمیرہ صدیقی۔ ملیر کینٹ

جدید عشق

حسن کو صدمہ شب تنہائی کے ایام کا ہے
ایسے عاشقوں کے لیے نیٹ بہت کام کا ہے
عشق کہتے تھے جسے اک نیا سمجھوتہ ہے
پہلے دل ملتے تھے اب نام کلک ہوتا ہے

سارہ۔ کراچی

اچھی صحت کا راز

دادا جی نے اپنی 100 ویں سالگرہ کا جشن منایا۔ ہر ایک نے اچھی صحت اور چاق و چوبند جسم کا راز جاننا چاہا۔

دادا نے کہا۔ ''میں آپ کو اپنی کامیابی کا راز بتاتا ہوں، میری بیوی اور میں نے 75 سال پہلے شادی کی تھی۔ ہماری شادی کے دن، ہم نے ایک وعدہ کیا تھا کہ ہمارے بیچ جب بھی کوئی جھگڑا ہو گا اور جو غلط ثابت ہو گا وہ سزا کے طور پر 5 کلومیٹر پیدل چلے گا اور میں ان 75 سالوں میں تقریباً روزانہ 5 کلومیٹر چل رہا ہوں۔''

ایک دوست نے مزید پوچھا۔ ''لیکن تمہاری بیوی بھی پتلی اور طاقت ور ہے۔''

دادا نے کہا۔ ''میری بیوی مجھے چیک کرنے کے لیے میرے پیچھے 5 کلومیٹر چلتی ہے کہ چل رہا ہوں یا پارک میں بیٹھا ہوں۔''

حرا نورین۔ سکھر

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبید اللہ بن محصن انصاری خطمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم میں سے جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ وہ اپنے گھر یا قوم میں امن سے ہو، جسمانی لحاظ سے تندرست ہو اور ایک دن کی خوراک اس کے پاس موجود ہو تو گویا اس کے لیے دنیا اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ جمع کر دی گئی۔"

(ترمذی)

اصلاح کی بنیاد،

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ زبان سارے بدن کی اصلاح کی بنیاد ہے۔ جب زبان ٹھیک ہو جائے تو سارے اعضاء ٹھیک ہو جاتے ہیں اور جب زبان بے قابو ہو جاتی ہے تو تمام اعضاء بے قابو ہو جاتے ہیں۔

خاموش رہنا،

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جیسے تم لوگ بات کرنا سیکھتے ہو، ایسے ہی خاموش رہنا بھی سیکھو، کیونکہ خاموش رہنا بہت بڑی بردباری ہے اور تمہیں بولنے سے زیادہ سننے کا شوق ہونا چاہیے اور کبھی لایعنی بول نہ بولو۔ ہنسی کی بات کے بغیر خوا مخواہ مت ہنسو اور بلا ضرورت کسی جگہ مت جاؤ۔

(اخرجہ ابن عساکر کذا فی الکنز 2/159)

اپنے ہاتھ سے مسکین کو دینا،

حضرت عمر دلیثی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں ہم حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کے پاس تھے۔ ان کے پاس ایک مانگنے والا آیا۔ انہوں نے روٹی کا ایک ٹکڑا لیا، اس پر ایک پیسہ رکھا اور خود جا کر روٹی کا وہ ٹکڑا اس کے ہاتھ پر رکھا۔ میں نے ان سے کہا۔
"اے ابوالاسقع! کیا آپ کے گھر میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو آپ کی جگہ یہ کام کر دے؟"
انہوں نے کہا۔ "آدمی تو ہے لیکن جب کوئی آدمی مسکین کو صدقہ دینے کے لیے چل کر جائے تو اس کے ہر قدم کے بدلے میں ایک گناہ معاف کر دیا جاتا ہے اور جب جا کر وہ چیز اس مسکین کے ہاتھ میں رکھ دے تو ہر قدم کے بدلے میں دس گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔"

(اخرجہ ابن عساکر کذا فی الکنز 3/315)

خادم کے ساتھ حسن سلوک،

حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے کبھی کسی خادم کو لعنت نہیں کی، بس ایک مرتبہ ایک خادم کو لعنت کی تھی تو اسے آزاد کر دیا تھا۔
حضرت زہریؒ کہتے ہیں ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ نے اپنے خادم کو لعنت کرنے کا ارادہ کیا اور ابھی اتنا ہی کہا تھا "اے اللہ اس پر لع" یہ کہہ کر رک گئے اور لفظ پورا نہ کیا اور فرمایا میں اس لفظ کو زبان سے کہنا نہیں چاہتا۔

گھر کے کام کرنا،

حضرت عطاء رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آٹا گوندھتیں تو ان کے سر کے بال لگن سے ٹکراتے۔
حضرت مطلب بن عبد اللہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عرب کی بیوہ خاتون یعنی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا شام کو تو سرکار دو عالم (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاں دلہن بن کر آئیں اور رات کے آخری حصے میں آٹا پیسنے لگیں۔

بکھرے موتی،

- کسی انسان کو دکھ دینا اتنا آسان ہے، جتنا سمندر میں پتھر پھینکنا۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ پتھر کتنی گہرائی میں گیا ہے۔
- اگر رزق عقل اور دانش مندی سے ملتا تو جانور اور بے وقوف بھوکے مر جاتے۔
- دنیا نصیب سے ملتی ہے اور آخرت محنت سے۔ لیکن لوگ محنت دنیا کے لیے اور آخرت کو نصیب پر چھوڑ دیتے ہیں۔
- زندگی وہ واحد پودا ہے جس کا بیج زمین کے اوپر لگتا ہے اور اس کا پھل زمین کے نیچے ملتا ہے۔

ثمینہ اکرم - لیاری

بے قدری،

کسی نے ایک دانا سے پوچھا۔
"سورج کی خوبصورتی اور روشنی کے سامنے ساری دنیا کے حسن ماند ہیں۔ اس پر بھی اس سے کسی کو محبت کرتے نہیں دیکھا۔"
دانا نے کہا۔ "اس کا ہر روز بے تلاش آ جانا ہی بے قدری کا سبب ہے۔ مگر جاڑوں میں جب ابر کے پردوں میں چھپا رہتا ہے تو سب کو پیارا معلوم ہوتا ہے۔"

اقصیٰ افضل - للیانی سرگودھا

سنہری اقوال،

- شک کی ۔۔۔ دوا حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں۔ انسان شک کے دائرہ میں جا کر اکیلا اور برباد ہو جاتا ہے۔
- خوبصورتی تو ختم ہو جاتی ہے یا پھر تبدیل ہو جاتی ہے لیکن سیرت نہ تو تبدیل ہوتی ہے اور نہ ہی بدلتی ہے۔
- بدترین اندھا پن دل کا اندھا پن ہے۔
- علم کا بہت بڑا بوجھ اٹھانے کے باوجود انسان خود کو پھول کی پتی کی طرح ہلکا محسوس کرتا ہے۔
- حسد دل کی سب سے بڑی بیماری ہے۔
- کامیاب و کامران انسان وہ ہے، جو دوسروں کی نہیں اپنی غلطیوں اور خامیوں پر نظر رکھے۔
- عزت و احترام کے بغیر کامیابی پانا ایسے ہی ہے جیسے نمک کے بغیر کھانا۔ یہ کھانا بھوک تو ختم کر دیتا ہے مگر بدذائقہ محسوس ہوتا ہے۔
- ایک انسان کے بے عیب ہونے کی نشانی یہ ہے کہ وہ دوسروں کے عیب تلاش نہیں کرتا۔

اقصیٰ ناصر - کراچی

انتقام،

چپ سے بڑی بددعا کوئی نہیں ہوتی۔ جب بندہ بولتا ہے تو قدرت خاموش رہتی ہے۔ اور جب بندہ خاموش ہو جاتا ہے تو... قدرت انتقام لیتی ہے... ! اور اس کا انتقام بہت برا ہوتا ہے۔

مسرت الطاف احمد - کراچی

فرق،

چلنے والے دونوں پیروں میں کتنا فرق ہے۔ ایک آگے اور ایک پیچھے، لیکن نہ تو آگے والے کو غرور ہے نہ پیچھے والے کی توہین کیونکہ انہیں پتا ہے کہ پل بھر میں یہ بدلنے والے ہیں، اسی کو زندگی کہتے ہیں۔

صدف عمران - کے، ڈی، اے

حضرت علیؓ نے فرمایا،

- بدترین دوست وہ ہے جس سے تجھے معذرت اور تکلف کرنے کی ضرورت پڑے۔
- اپنے دشمن کو ہزار مواقع دو کہ وہ تمہارا دوست بن جائے لیکن اپنے دوست کو ایک موقع بھی

ایسا نہ دو کہ وہ تمہارا دشمن بن جائے۔

اقوالِ زریں،

- جب کسی انسان کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ وہ اپنے فرائض بخوبی سرانجام نہیں دے رہا تو وہ اس کام کو چھوڑ دے۔
- جہاں عزتِ نفس اور احترامِ آدمیت کو مجروح کیا جائے وہاں سے چپ چاپ چلے جانا چاہیے۔
- اپنے خیالات اور تجاویز کو اپنی زبان دو۔
- خوش گوار زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تلخ یادوں کو اپنے دل کے نقش سے مٹا دو۔
- ملاوٹ اور منافقانہ رویوں سے خود کو بچاؤ۔

اقرأ، نمرہ۔ کراچی

آدھا سچ،

آدھا سچ پورے سچ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ایک ملاح ایک بحری جہاز پر تین سال سے کام کر رہا تھا۔ ایک رات اس نے شراب پی تو اس پر نشہ طاری ہو گیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ کیپٹن نے لاگ بک میں اس واقعہ کا اندراج کیا۔

"ملاح نے کل رات شراب پی۔"

ملاح نے یہ جملہ پڑھا۔ اسے پتا تھا کہ اس تبصرے سے اس کے کیریئر پر برا اثر پڑے گا۔ وہ کیپٹن کے پاس گیا۔ اس نے کیپٹن سے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور کہا۔

"وہ لاگ بک میں صرف اتنا اضافہ کر دے کہ یہ واقعہ تین سال میں پہلی بار ہوا تھا۔"

یہ پورا سچ ہوتا۔ کیپٹن نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔

"میں نے لاگ بک میں جو کچھ لکھا ہے، سچ لکھا ہے۔"

اگلے دن ملاح نے لاگ بک میں لکھا۔

"کیپٹن آج رات نشے میں نہیں تھا۔"

جب کیپٹن نے یہ جملہ پڑھا تو ملاح سے کہا۔

"یا تو یہ جملہ بدلو یا اس میں اضافہ کرو تاکہ پورا سچ واضح ہو۔ اس جملے سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے کیپٹن ہر دوسری رات نشے میں ہوتا ہے۔"

ملاح نے کیپٹن سے کہا کہ اس نے لاگ بک میں جو لکھا ہے، سچ لکھا ہے۔

دونوں ہی جملے سچے تھے لیکن ان سے گمراہ کن پیغام ملتا تھا۔

عصمہ ندیم۔ کراچی

خود پسندی،

بیان کیا جاتا ہے ایک شخص نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ جس باکمال عالم نے مشہور حکیم شیخ الرئیس بو علی سینا کو تعلیم دی ہے، اس کا شاگرد بنے اور اس سے علم حاصل کرے۔ چنانچہ وہ طویل فاصلہ طے کر کے شیخ کے استاد حکیم کو شیار کے پاس پہنچ گیا۔

یہ شخص علم کے لحاظ سے بالکل معمولی درجہ رکھتا تھا لیکن اسے غلط فہمی یہ تھی کہ وہ بہت بڑا عالم فاضل ہے۔ استاد کو پہلی نظر ہی میں اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص بہت مغرور اور خود پسند ہے اور اسی وجہ سے اس نے اسے یوں نظر انداز کر دیا گویا اس کے وہاں آنے سے باخبر ہی نہ ہو۔

وہ شخص کئی دن وہاں ٹھہرا رہا اور جب استاد کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو وہاں سے چلنے کی ٹھانی۔

جب وہ رخصت ہونے لگا تو استاد کو شیار نے اس سے کہا۔

"تو یہاں سے اس لیے کچھ حاصل کیے بغیر جا رہا ہے کہ تیرے دماغ میں یہ غرور بھرا ہوا تھا کہ تو بہت کچھ جانتا ہے۔ یاد رکھ! اسی پیالے میں کوئی چیز بھری جا سکتی ہے جو خالی ہو۔"

انسان کو چاہیے کہ بڑی سے بڑی حیثیت حاصل کرنے کے باوجود اپنے آپ کو طالب علم خیال کرے۔ جو انسان خود کو کامل خیال کرتا ہے اس کے بارے میں سمجھ لینا چاہیے کہ شیطان نے اسے گمراہ کر دیا ہے۔

(حکایت سعدیؒ)

عائشہ تحریم۔ گوجرہ

بہتر بات سننے والا،

عبیدہ بن رباح غسانی کہتے ہیں کہ عبدالملک جب خلیفہ ہو گیا تو اس سے ام الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

"میں نے جب تجھے دیکھا تھا تو پہلی نظر میں ہی یہ یقین کر لیا تھا کہ تو بادشاہ بنے گا۔"

عبدالملک نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

ام الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"میں نے تجھ سے بہتر بات کرنے والا اور بات کو سننے والا کوئی نہیں دیکھا۔"

استغفار کا اثر،

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے عراق کے کسی گاؤں میں رات ہو گئی۔ میں ایک مسجد میں گیا مگر چوکیدار نے نکال دیا۔ میں مسجد کے باہر فرش پر سو گیا۔ چوکیدار نے مجھے پاؤں سے گھسیٹ کر دور کر دیا۔ اسی دوران ایک آدمی مجھے اپنے گھر لے آیا۔ وہ شخص چلتے پھرتے ہر کام کے دوران استغفار پڑھتا تھا۔

صبح میں نے پوچھا "آپ کو استغفار پڑھنے کا کچھ فائدہ ہوا؟"

اس نے کہا "جی! میری ہر دعا قبول ہوئی سوائے اس کے کہ میری ملاقات امام احمد بن حنبل سے ہو جائے۔"

میں نے کہا "میں ہی احمد بن حنبل ہوں اور تم دیکھو کہ مجھے کیسے گھسیٹ کر تمہارے پاس لایا گیا ہے۔"

ارم کمال۔ فیصل آباد

روشنی بن جائیں،

- "اللہ بہتر کرے گا" یہ وہ الفاظ ہیں، جن سے انسان کی آدھی پریشانی دور ہو جاتی ہے۔
- جہاں سبب اور نتیجے کی سائنس ختم ہو جاتی ہے وہاں سے رضا اور نصیب کی مدد شروع ہوتی ہے۔
- جب انسان اپنی غلطیوں کا وکیل اور دوسروں کی غلطیوں کا جج بن جائے تو پھر فیصلے نہیں ہوتے، فاصلے ہوتے ہیں۔
- عشق کرنے والوں میں اور کچھ نہ ہو لیکن ایک بات ہوتی ہے۔ بے ادب نہیں ہوتے۔
- اپنے وہ نہیں ہوتے جو تصویر میں سامنے کھڑے ہوتے ہیں بلکہ اپنے وہ ہوتے ہیں جو تکلیف میں ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔
- اگر تم ہارو گے نہیں تو تم کبھی جیت کا مزا نہیں لے سکتے۔ نو بار گرنا اور دسویں بار اٹھ کھڑے ہونا ہی کامیابی ہے۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

مشکلات کا حل،

ڈاکٹر نیوسین ہل نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"مجھے زندگی میں اس عجیب و غریب حقیقت کا احساس ہوا کہ اگر آپ اپنی مشکلات پر قابو پانا چاہتے ہیں تو ایک ایسے شخص کو تلاش کیجیے جو آپ سے زیادہ مسائل میں الجھ گیا ہو۔ اس کا ہاتھ بٹائیے اور معاوضے سے بے نیاز کام کیجیے۔ آپ کے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ یہ ایک سیدھا سادا طریقہ ہے لیکن اس میں بلا کی قوت اور قدرت ہے اور انسان اس عمل میں کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ بظاہر یہ ایک ناقابلِ عمل فارمولا نظر آتا ہے لیکن اگر آپ اس پر عمل کرنا شروع کر دیں تو اس کی حقیقت آپ پر خود بخود ظاہر ہو جائے گی۔ آپ دوسروں کی مدد کیجیے پھر دیکھیے کہ کتنے لاتعداد مواقع آپ کو حاصل ہو جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر نیوسین ہل کی یہ بات اس طرح بھی درست ہو سکتی ہے کہ کسی کی دعائیں ہماری مشکلات میں کمی کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس کے لیے ہمارے ہاں ایک مثل بھی ہے کہ کر بھلا ہو بھلا۔

ارم کمال۔ فیصل آباد

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ندا، فضہ ــــــــ کراچی
تھا کبھی جو رابطہ
اگر ہو سکے تو بحال کر

اقرا عزیز ــــــــ گاؤں دیا خان جلبانی
زنجیر جنوں کچھ اور کھنک ہم رقص تمنا دیکھیں گے
دنیا کا تماشا دیکھ چکے اب اپنا تماشا دیکھیں گے

خزیمہ ریاض ــــــــ گاؤں سدو کی گجرات
مرنے کی خواہش بے وجہ نہیں ہے دل کو !
زندگی سے تیرے عشق کے ناز اب اٹھائے نہیں جاتے

فائزہ بھٹی ــــــــ پتوکی
یہ سکوت ناز، یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکست ساز کی باتیں کرو
کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے
کچھ فضا، کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

آمنہ اُجالا ــــــــ ڈہرکی
مجھے لہجوں کے بدلنے سے ہمیشہ خوف آتا ہے
کہ لہجے جب بدلتے ہیں کوئی اپنا نہیں رہتا

عابدہ عزوری ــــــــ راجن پور
رقص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنور باندھ لیے پاؤں میں
وہ خدا ہے کسی ٹوٹے ہوئے دل میں ہوگا
مسجدوں میں اسے ڈھونڈ نہ کلیساؤں میں

صائمہ سلیم سندھو ــــــــ گرین سٹی
سیاہ رات میں جلتے ہیں جگنو کی طرح
دلوں کے زخم بھی محسن کمال ہوتے ہیں

رضوانہ شکیل راؤ ــــــــ لودھراں
سی کے لب ایک قیامت اٹھا دی جائے
رہ کے خاموش ذرا دھوم مچا دی جائے

رضوانہ شکیل راؤ ــــــــ لودھراں
حال دل کہنے سے خودداری نے روکا ہم کو
اس نے پوچھا تو بہت ہم نے بتایا ہی نہیں

نمرہ شیرازی ــــــــ جہلم
جو رویا آسماں تو آسماں کا
ہر اک آنسو ستارہ ہو گیا ہے

سحر بدر ــــــــ خانیوال
بچھڑ کے تجھ سے چلے ہم تو اب کے یوں بھی ہوا
کہ تیری یاد کہیں راستوں میں چھوڑ آئے
سدا سسکتی رہیں چہرے وہ ہم جنہیں محسن
بجھے گھروں کی کھلی کھڑکیوں میں چھوڑ آئے

مدیحہ نورین مہک ــــــــ گجرات
بچی باتوں سے بھی ہو جاتے ہیں برہم احباب
دوستی اک بڑا نازک سا ہنر ہوتی ہے

افضال کرامت ــــــــ شاہ کوٹ
نشاط و عیش و طرب کی کمی نہیں پھر بھی
بڑی اُداس ہے دنیا، ملول ہے دنیا

فائزہ بھٹی ــــــــ پتوکی
ہم شکایتیں اپنی کھولتے بہت کم ہیں
سوچتے بہت کچھ ہیں بولتے بہت کم ہیں
درگزر کے قابل ہے دوستوں کا ہلکا پن
دیکھتے برابر ہیں تولتے بہت کم ہیں

نمرہ، اقرا ــــــــ کراچی
مدتوں بعد صیاد نے چھوڑا بھی تو کیا
تاب پرواز نہیں، راہِ سفر یاد نہیں

توقیر ہاشمی ــــــــ منڈی بہاؤالدین
ان کی طرف سے ہو گزر تو کہہ دینا اے صبا
کرتا ہے انتظار کوئی سوگوار عید

سدرہ بتول ــــــــ ملتان
مقتل کھلے ہوئے ہیں مقفل خدا کا گھر
مذہب شکم پرست اناؤں کی زد میں ہے
حیرت سے تک رہی ہیں عقیدت کی بستیاں
اک کائنات کتنے خداؤں کی زد میں ہے

اقصیٰ ناصر ــــــــ کراچی
وہ جن کی ذات کے اندر بھی اک قفس ہے میاں
وہ ہم سے زیادہ ہواؤں کی بات کرتے ہیں
یہ میر جعفر و صادق سے لوگ بھی دیکھو
ہمارے ساتھ وفاؤں کی بات کرتے ہیں

حسنیٰ اقبال ــــــــ منڈی فیض آباد
تیز بارش کبھی سرد ہواؤں میں رہا
اک ذکر تھا جو میری صداؤں میں رہا
کتنے لوگوں سے میرے گہرے مراسم تھے مگر
تیرا چہرہ ہی فقط میری دعاؤں میں رہا

اقصیٰ بابیگل ــــــــ کمالیہ
میری نظریں کریں کیسے تیرے چہرے کا طواف
میری آنکھوں نے تو باندھے نہیں احرام ابھی
یاد کے ابر سے آنکھیں میری بھیگی ہیں عدیم
اک دھندلکا سا ہے بھیگی تو نہیں شام ابھی

زوبیا افشین ــــــــ سی ایس شاہ
مرگ جاں گر نہ سہی، مرگ محبت ہی سہی
زندگی کچھ تو ترا قرض اتارے جائیں

عظمیٰ شفیق ــــــــ جڑانوالہ
محسن تماش بین ہیں سارے یہ غم گسار
کھیچے نہ اپنے غم کی وضاحت کسی سے بھی

آسیہ فرید ــــــــ ملتان
کچھ عجب طرح سے کی اپنی وکالت میں نے
لب پہ رکھا نہ حرف وضاحت میں نے
ہاتھ تھک جائیں گے زخموں پہ نمک رکھ رکھ کے
درد سہنے کی بہت کی ہے ریاضت میں نے

مسرت الطاف احمد ــــــــ کراچی
سوکھے پتوں کی طرح بکھرے ہیں ہم تو
کسی نے سمیٹا بھی تو صرف جلانے کے لیے

شازیہ سعید ــــــــ شاہ نکڈر
بالمشافہ مل کے حیرانی ہوئی
تھا تعارف غائبانہ دوسرا
جو بنا تا تھا ہمارے ڈھب کے لوگ
تھا وہ کوئی کارخانہ دوسرا

تاجی کھرل ــــــــ جڑانوالہ
عشق سچا ہو تو اس طرح امر ہوتا ہے
جس طرح مر نہیں سکتا کسی فن کار کا حسن

یاسمین زہرا ــــــــ کراچی
خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی

شبنم حنیف ــــــــ لاہور
ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

آصفہ خرم ــــــــ ڈسکہ
آج کی بارش بھی تیرے درد کی طرح ہے
ہلکی ہلکی ہے پر ہوتی جا رہی ہے !

فاطمہ زہرا ــــــــ حیدرآباد
یہ کیسے کہیں کہ جان سے پیارا نہیں رہا
یہ اور بات کہ اب وہ ہمارا نہیں رہا

منیبہ صفدر ــــــــ لاہور
یہ حرف و لفظ ہیں دنیا سے گفتگو کے لیے
کسی سے ہم سخنی کے مکالمے تھے الگ
خیال ان کا بھی آیا کبھی تجھے جاناں
جو تجھ سے دور بہت دور جی رہے تھے الگ

سحر افشین ــــــــ کراچی
برابر سے بچ کر گزر جانے والے
یہ نالے نہیں بے اثر جانے والے
نہیں جانتے کچھ کہ جانا کہاں ہے
چلے جا رہے ہیں مگر جانے والے





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خطوط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں آپ کی سلامتی۔ عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ رب العزت آپ کو بے حساب رزق، خوشیاں اور آسانیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

پہلا خط بورے والا سے نورے محمد کا ہے

بڑی بڑی آنکھوں والی گرل اچھی لگی۔ سب سے پہلے "خواب شیشے کا" پڑھا۔ میرا دل کہتا ہے کہ موحد ہی نمیر ہے۔ اور یہ دونوں الگ الگ بھی ہوئے تو مہر ماہ کی شادی موحد سے ہی کروادیے گا۔ "بن پاکھی" فرح بخاری نے کمال لکھا ہے۔ بن پاکھی کو پڑھتے ہوئے نمرہ کی "بیلی راجپوتاں کی ملکہ" یاد آ گئی۔ "یار دل دار" کا پورے مہینے انتظار کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ عرصہ بعد افشیں بھی غائب ہو جائیں۔ پھر ہم "ثمرہ" اور عفت" کی طرح آپ کو بھی آوازیں دیتے رہیں گے۔ "ام طیفور" بے شک آپ کا مزاح لاجواب ہے۔

نورے محمد۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی طرح ہمیں بھی ہم زاد راز کھلنے کا انتظار تھا۔ صائمہ نے بالآخر ہماری قارئین کی خواہش پوری کردی اور ہم زاد کا راز کھول دیا۔ اتنے عرصے بعد خط اور وہ بھی اتنا مختصر۔

جمیلہ شاہ نے کھگہ سے لکھا ہے

اس دفعہ شعاع 5 تاریخ کو ملا۔ حمد و نعت پڑھنے کے بعد پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں حقوق العباد پر بھی حدیث لکھیں۔ روشن لمحوں کا سفر میں سب کے جواب مزے کے تھے۔ کاش میں یہاں ہوتی تو میں بھی لکھتی۔ انٹرویو بھی اچھے تھے۔ میں نے آپ سے کاشف عباسی کے فیملی انٹرویو کی فرمائش کی تھی۔ افسانے مجھے پسند آئے۔ سمیرا احمید کی کہانی بہت اچھی تھی زندگی سے مایوس لوگوں کے لیے اچھا سبق۔ فاخرہ جبیں لکھیں اور اچھا نہ ہوا ایسا ہو سکتا ہے۔ پلیز فاخرہ میرے مقدر کا چاند جیسا کوئی مکمل ناول دیکھیں۔ ڈھیر سارے کزنز اور دادی کے ساتھ دو قدم جنت بہت اچھا افسانہ جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے ثوبیہ عمران کا سبق ایک ایک حرف سچ بہت سال پہلے جب میں زہرہ ممتاز کی شریک سفر پڑھ رہی تھی تو سوچتی ایسا تھوڑی ہوتا ہے مگر اب میں کہہ سکتی ہوں کہ ایسا ہوتا ہے۔ افسانوں کی دنیا میں 80 فیصد سچ ہوتا ہے۔ ثوبیہ آپ نے بہت اچھا لکھا ایسے لوگ ہیں اللہ ان کو ہدایت دے اور سب کو تکبر سے بچائے۔ عفت سحر پلیز خواب شیشے کے بعد گم نہ ہو جانا نبیلہ عزیز کدھر گم ہو گئی ہیں۔ ان سے کوئی رومانٹک ناول لکھوائیں راشدہ رفعت اور مریم عزیز آپ بھی گم ہو گئی ہیں فرزانہ کھرل مجھے بہت پسند آئی ہیں پلیز ہر ماہ لکھا کریں باقی سب سلسلے اچھے تھے آئینہ خانے میں واصفہ سہیل کے بریکٹ میں لکھے جواب بہت اچھے لگتے ہیں۔

مہناز رانی، رمشا شہزادی مانانوالہ سے لکھتی ہیں

اس ماہ تو شعاع نے بہت انتظار کروایا۔ 2 تاریخ سے مسلسل پانچ تک روز بازار کا چکر لگانا پڑا۔ عفت جی آپ نے اتنا انتظار کروانے کے بعد اگر انتظار کی سولی سے اتارا ہی تو ساتھ ہی آخری قسط چلیں۔ جیسا آپ کو بہتر لگے ہم بے چارے کیا کر سکتے ہیں۔

"بن پاکھی" فرح بخاری کی تحریر نے تو پورا مہینہ بے چین رکھا۔ بہت متاثر کن تحریر ہے سالوں ذہن میں رہنے والی۔

جواب: رانی اور شہزادی امید ہے پریکٹیکل اچھا ہوا ہوگا شعاع سے محبت کا شکریہ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے رائٹر تک پہنچ گئی ہے۔ آپ کے بھائی آپ کو شعاع لا کر دیتے ہیں بدلے میں آپ سے تھوڑی خدمت لیتے ہیں تو سودا برا نہیں۔

شاہدہ مغل نے بھیر کھنڈ مانسہرہ سے لکھا ہے

پہلی بار شعاع میں شرکت کی ہے۔ سب سے پہلے تو جی "خواب شیشے کا" پڑھا۔ شہرزاد میں تو ٹینا بیگم خاقان صاحب کی ہی بیوی لگتی ہیں۔ محمد ہادی ذوالکفل کا بیٹا لگتا ہے۔ اب یقیناً ہادی اور شہوار کی شادی ہو جائے گی۔ ذوالکفل میر حاکم کے بھتیجے ہوں گے۔

بن پاکھی بہت ہی اعلا اور نمبر ون ناول تھا اس مہینے کا لڑکی اگر مسلمان ہوتی تو کیا ہی بات تھی۔ رافع کی ذہانت، بہادری اور سندر بن کے جنگلات پڑھ کر ایک سماں سا بندھ گیا۔ "یار دلدار" بہت ہی پیارا سلسلہ ہے جاری رکھیے گا۔ عادل کا اور احسن کا ڈراما بہت ہی پیارا لگا۔ "خط آپ کے تاریخ کے جھروکوں سے" تو ہمارے ہارٹ فیورٹ ہیں۔ شعاع کے ساتھ ساتھ بھی شامل تھا اچھا لگا۔ حمد اور نعت دونوں ہی میرے پسندیدہ شاعر کی تھیں۔ ٹائٹل پر ذرا توجہ فرمائیں۔ اب تو یہ چہرے بدل دیں۔ اور نمرہ احمد سے انٹرویو لے ہی لیں۔

پیاری عابدہ! خواب شیشے کا کی آخری قسط میں عفت نے سب کچھ واضح کر دیا ہے۔ پڑھ کر بتائیے گا کیسی لگی آخری قسط۔ افشین نعیم کا یار دل دار اس ماہ بھی شامل اشاعت ہے۔ نمرہ احمد انٹرویو دینے پر تیار ہوں تو ہم آج ان کا انٹرویو لے لیں۔

حمیرا لطیف حور نے رائے ونڈ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ٹائٹل پر براجمان عیشا نور بس سو سو تھی۔ "شہرزاد" میں صائمہ جی نے باقی سب کچھ تو ٹھیک کیا لیکن درشہوار کی مکاری زہر لگی۔ خدا کرے ہادی اور درشہوار کی شادی نہ ہو۔ قسم سے بہت غصہ آتا ہے درشہوار جیسی لڑکیوں پر جنہیں والدین کی عزت کا پاس نہیں ہوتا۔ عاصمہ فرحین نے بہت اچھا لکھا۔ آخر میں ہنسایا۔ "سبق" اف! جویریہ کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک پر آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ (نہ جانے کیوں) سب اچھا ہے۔ "ام ایمان جی گریٹ۔ 'وسائی' معشوق کے ساتھ جو ہوا بہت اچھا ہوا۔ وہ یہی ڈیزرو کرتا تھا۔ "بن پاکھی" پہلے ہی پتا تھا کہ اینڈ اچھا ہی ہوگا۔ ویسے ایک فسوں میں جکڑ لیا اس کہانی نے۔

"خواب شیشے کا" یہ اندازہ تو تھا کہ موحد اور نمیر ایک ہی شخص ہے لیکن یہ کیا؟ موحد کا تو سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا گویا۔ قصہ اک دوپہر کا پڑھ کر دل کچھ بوجھل ہو گیا اسٹوری آف دی منتھ کی طرف...... جی درست اندازہ لگایا...... بات ہو رہی ہے۔ 'راہ نور' کی تام سمیرا احمید کا ہو اور کہانی اچھی نہ ہو یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ سمیرا احمید اور نمیرہ احمد کا انداز تحریر ایسا ہے کہ قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔

سمیرا جی میرے پاس آپ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اس کہانی نے کبھی رلایا تو کبھی بے ساختہ کھلکھلانے پر مجبور کر دیا۔ بس یو آر گریٹ سمیرا جی۔ اور آپی! لگتا ہے صفحات کچھ زیادہ ہی نایاب ہو گئے ہیں اور ڈالر کی قیمت آسمانوں کو چیرنے کے درپے ہے کہ آپ نے ایک سلسلہ 'کھلتا کسی پہ کیوں' شعاع سے بے دخل ہی کر دیا۔ خیر جی مرضیاں تو تو اڈیاں۔

پیاری حمیرا! آپ کا طویل خط ملا خوشی ہوئی کہ ہماری قارئین اتنی محبت سے رسالے کے ایک ایک سلسلے کو پڑھتی ہیں اتنے بھرپور تبصرے کا شکریہ۔ کہانیوں کے بارے میں 5 تاریخ کو آفس کے نمبر پر فون کر کے معلوم کر لیں۔

سمیرا احمید تو ہمیں بھی حیران کر دیتی ہیں۔ سمیرا احمید بلاشبہ بہت باکمال مصنفہ ہیں۔ ان کا انداز بیاں، موضوعات اور لکھنے کا انداز سب سے جداگانہ ہے۔ ہم سمیرا احمید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

ماریہ بھٹو، میرپور بھٹو (لاڑکانہ سندھ) سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شعاع کے اگست کا ٹائٹل کچھ زیادہ نہیں پسند آیا بہت جلدی جلدی میں چھلانگ ماری "بن پاکھی" فرح بخاری جی دو اقساط میں جتنا سحر اور سسپنس طاری کیا لاسٹ قسط تک قائم نہ رکھ سکیں بٹ ناٹ بیڈ اسٹوری اچھی تھی۔ رافع محمد کی پرسالٹی نے بہت متاثر کیا۔ اور اف ویلا کے بال کی بالشت گننے والا سین اف، اف اف، سپرب، اخیر، کمال، شاندار"

ہاہاہا‘‘ اور اس کے بعد اپنی پسندیدہ مصنفہ سمیرا حمید صاحبہ کی اسٹوری راہ نور نے اسٹارٹ سے اینڈ تک ــ اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔کمال سمیرا حمید جی کمال بہت لاجواب اسٹوری ،صالحہ اور یوسف کی پاکیزہ محبت نے اپنا اثر بہت دیر تک قائم رکھا اور ہادی بھی بہت پسند آئے طلال کا بہت دکھ ہوا۔ اور ان کے جملوں نے تو بہت بہت زیادہ متاثر کیا۔ جب یہ جان لیا کہ حقیقی محبت کیا ہے۔ تو مجازی محبت کا سوگ ختم کر دیا۔

پیاری ماریہ! آپ نے شعاع کی محفل میں شرکت کی۔ بہت خوشی ہوئی لیکن صرف دو کہانیوں پر تبصرہ کیا۔ یہ اچھا نہیں لگا۔ آئندہ خط لکھیں تو تفصیلی تبصرہ کریں تا کہ ہم آپ کی رائے سے آگاہ ہو سکیں۔

ردا لاڑکانہ سے لکھتی ہیں

آپی میں نے کہانی لکھی ہے وہ میں بھیج رہی ہوں پلیز مجھے اس خط میں بتا دیجیے گا کہ شائع ہونے کے لائق ہے یا نہیں۔ آپ یقین کیجیے میں نے اچھی رائٹنگ کے لیے بہت سارے پیپرز ضائع کیے ہیں آپ کو پڑھنے میں تکلیف تو ہوگی اس لیے پہلے سوری کہہ دیتی ہوں۔ اور ایک مزے کی بات بتاؤں قارئین لکھتی ہیں تا کہ جب وہ اپنے بھائیوں کو ڈائجسٹ لانے کے لیے کہتی ہیں تو وہ ان سے ڈائجسٹ منگوانے کے پیسے لیتے ہیں، پر میرے بھائی کا عجیب لالچ ہے، میں کہتی ہوں بھائی مجھے ڈائجسٹ لا کر دو تو کہتا ہے نہیں تو میں جھٹ سے کہتی ہوں سر کی مالش کروں گی۔ اگر تم نے ڈائجسٹ لا دیا تو وہ جلدی سے راضی ہو جاتا ہے کیونکہ میرا بھائی ہے ہی کیوٹ اور ناظمہ زیدی مجھے تو آپ مستقبل کی رائٹر لگتی ہیں۔ سچ میں آپ کی کہانی بہت اچھی تھی۔ آپ شعاع کے ساتھ ساتھ دے دیا کریں نا آپی۔ یہ مجھے بہت پسند ہے۔ آپی آپ فوزیہ یاسمین سے کہیں نا کہ وہ (دست کوزہ گر) جیسی کہانی لکھیں۔

ردا بہن! آپ نے ہمیں خط لکھا رائٹنگ پڑھنے میں مشکل تو ہوئی مگر ہم قاری بہنوں کا جذبہ دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اتنی محبت سے خط لکھتی ہیں۔ لیکن آپ نے صرف ایک کہانی پر تبصرہ کیا؟ یہ اچھا نہیں لگا فوزیہ یاسمین تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں، اب دیکھتے ہیں کہ وہ کیا جواب دیتی ہیں (اس میں آپ کے ساتھ ہماری فرمائش بھی شامل ہے)

وردہ زبیر نے کیماڑی کراچی سے لکھا ہے

نمل کے بعد جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ (بن پاکھی) ہے بہت عرصے بعد بہت اچھی کہانی پڑھنے کو ملی مگر اینڈ بالکل اچھا نہیں لگا آخر دونوں کا نکاح ہو گیا تھا۔ تھوڑا سا رومانس تو ہونا چاہیے تھا۔ پھر سمیرا حمید کو پڑھا حسب روایت بہترین کہانی تھی۔ (خواب شیشے کا) میرا اندازہ ٹھیک تھا موحد اور نمیر ایک ہی تھے ہماری رائٹر اتنا غلط کام نہیں کر سکتیں (آغا جی کی طرح) کہ ایک ہی لڑکی کا نکاح دو الگ لڑکوں سے کر دیں۔ اب دیکھیں آخری قسط میں کیا ہوتا ہے اور یہ شہزاد میں کیا کر دیا ہادی کو کیوں پھنسا دیا اگر ہادی کی شادی شہوار سے ہو گئی تو پہلی گولی میں ماروں گی ہادی کو پھر شہوار کو۔ سب اچھا ہے اور سر اٹھا کر جینا بھی اچھی لگی صفا بالکل محمل (مصحف والی) جیسی لگی زید اور انگوٹھی بھی مزے کی تھی۔ دو قدم پر جنت حقیقت سے قریب لگی۔ اس خط کے ساتھ میں (ناتا) کے لیے اپنے حالات لکھے ہیں اس امید کے ساتھ کہ آپ شائع کر دیں گی۔

وردہ! ہم آپ کو فون ضرور کریں گے، نمبر نوٹ کر لیا ہے۔

آپ کراچی میں رہتی ہیں تو کہانی خود بھی پہنچا سکتی ہیں اور کسی کے ذریعے بھی بھجوا سکتی ہیں۔

خط شائع نہ ہونے پر بائیکاٹ کی دھمکی تو دے رہی ہیں لیکن خط وقت پہ موصول نہ ہو تو آپ ہی بتائیں ہم کیا کریں۔ آپ کا خط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہ ہو سکا۔

سالگرہ نمبر آپ کو پسند آیا۔ اس کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

عروج عتیق فیصل آباد گیڈری سے شریک محفل ہیں لکھتی ہیں

یہ میرا پہلا خط ہے۔ ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق مجھے مما سے وراثت میں ملا ہے۔ میری مما شعاع کی خاموش قاری ہیں۔ میں پانچویں میں تھی تب میں نے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا تھا۔ اب میں میٹرک میں ہوں۔ مجھے ’’خواب شیشے کا‘‘ ناول میں پہلے ہی پتا تھا کہ موحد ہی نمیر ہے۔ شہر زاد میرا پسندیدہ ناول ہے۔ بندھن پڑھ کے دل افسردہ ہو گیا۔ تاریخ کے جھروکے ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ بیوٹی بکس میں دانتوں کو سفید کرنے کا کوئی طریقہ بتائیے۔ ’’سر اٹھا کے جینا‘‘ ناولٹ میں صفا کا کردار بہت اچھا لگا۔ ’’سب اچھا ہے‘‘ بس ٹھیک ہی تھا۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ شاعری مجھے بہت اچھی لگتی ہے ایمل رضا سے کوئی ناول لکھوائیں پلیز باقی سب مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔

ج: پیاری عروج عتیق! شعاع کی پسندیدگی کے لیے کا شکریہ ہم بھی چاہتے ہیں کہ ایمل رضا رقص بسمل اور پیال ساز جیسا کوئی ناول لکھیں۔

ملائکہ کوثر بسم اللہ پور سے شرکت کر رہی ہیں لکھا ہے

کتنے عرصے سے آپ سے رابطہ نہیں۔ لگتا ہے زمانے ہو گئے۔ پچھلے گزرے سال سے اس سال کے جولائی تک موت تو گویا ہمارے خاندان میں رقص کرتی رہی۔ میرے خاندان میں میری منجھلی ممانی کا انتقال ہوا پھر چھوٹی آپا (نند) اور ان کے داماد کے اکٹھے جنازے ۔منجھلی آپا (نند) کے دو جوان بیٹے اور بہو آگے پیچھے چل بسے۔ آپا کے گھر پانچ پانچ یتیم بچے، آپا کا بوڑھا نحیف ونزار سا وجود۔ سب سے چھوٹا لاڈلا بیٹا یار دوستوں کا بیلی ہر کسی کے کام آنے والا ابھی کنوارا تھا۔ اس کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی۔ دوست کے ساتھ پنکھا لگانے چلا گیا۔ سیڑھی سے گرا تو کومے میں چلا گیا۔ تین دن بعد موت کی وادی میں اتر گیا۔ پھر بھی آپا کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ جس عورت کے تین جوان بیٹے ایک بہو، بیٹی (اس کے چار بچے تھے) جوانی میں داغ مفارقت دے جائیں۔ اس ماں کا حال بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی وہ کلمے منہ سے کہے۔ ’’اللہ کی رضا‘‘۔

اب آتے ہیں شمارے کی طرف یعنی راج دلارے ’’شعاع‘‘ کی طرف جو ملال بھرے دنوں میں بھی مجھے تسلی اور ڈھارس دیتا رہا۔ میں نے سروے میں شامل ہونے کے لیے قلم اٹھایا مگر دل گیر تھا ایک حرف بھی نہ لکھا گیا۔ ’’بن پاکھی‘‘ فرح بخاری کا بہت دلکش اور سحر انگیز ناول تھا مجھے ویسے بھی جنگل پر کشش لگتے ہیں۔ رافع کا دلدل میں اترنا۔ بھئی دل کی دھڑکن اچھی خاصی تیز ہو گئی۔ گھنے جنگلوں، اس میں ہوتی تڑاتڑ بارش کی وجہ سے مجھے اے حمید صاحب کا ’’بارش، سماوار، خوشبو،‘‘ بہت پسند تھا۔ صائمہ اکرم ’’شہرزاد‘‘ کا ہم زاد آخر سامنے آہی گیا۔ آخر کب تک چھپا تمیں اے صائمہ جی میرے اور ثمرہ کے ہم زاد کے بارے میں اندازے زمین بوس ہوئے۔ ویلڈن عفت جی۔ معذرت کے ساتھ ’’نہ جائے ماندن‘‘ بھی ام طیفور اتنا مزہ نہیں آیا جتنا کہ پہلی دفعہ پڑھنے پر آیا تھا۔ پچھلے ماہ ’’چھوٹی‘‘ حمیرا عروش کا بہت سبق آموز تھا۔ فتنہ چھوٹی کو دو دو چھوٹیوں سے پالا پڑ گیا۔ اسے کہتے ہیں جیسے کو تیسا پچھلے ماہ ’’ایک نگاہ کے اسیر‘‘ نادیہ احمد کی ونی کے بارے میں تھی۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ’’ونی‘‘ قبیح رسم اسلامی معاشرے میں کیسے آئی۔ ’’خط آپ کے‘‘ جواب بڑی اپنائیت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ’’ناتا‘‘ بھی پسند آرہا ہے۔ ’’تاریخ کے جھروکوں سے‘‘ امت الصبور اچھی نالج دیتی ہیں۔ ابا میاں میرے پاس ہیں اور بالکل ٹھیک ہیں۔ اب تو کبھی کبھار میرا ہاتھ پکڑ کر رونے لگتے ہیں کہ میری بیٹی نے میری بڑی خدمت کی اور کوئی نہیں کر سکتا۔ جب کہ میرا خیال ہے کہ میرے سب بہن بھائی ان کی خدمت کرنے والے ہی ہیں۔

پیاری ملائکہ! آپ کی غیر حاضری کی وجہ جان کر دل بہت دکھی ہو گیا۔ موت سے کس کو ــــ رستگاری ہے۔ ایک دن سب ہی کو جانا ہے لیکن ایک ماں کے لیے اتنی آزمائشیں۔ اللہ ہی صبر دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانے والوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پیچھے رہ جانے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

ونی کی رسم جاگیرداروں اور وڈیروں کی وجہ سے شروع ہوئی تا کہ جائیداد کی تقسیم نہ ہو۔

آپ ہم سے فون پر بات کر سکتی ہیں۔ آئندہ خط لکھیں تو اپنا فون نمبر لکھ دیں۔ ہم آپ کو فون کر لیں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

کراچی سے ناہید اسماعیل شریک محفل ہیں لکھا ہے

سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر کی ہدایت اجازت نہیں دے رہی (آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے) کہ ہم رسالے کو ہاتھ بھی لگائیں لیکن اپنی پسندیدہ مصنفین کے نام دیکھ کر ہم سے رہا نہیں گیا سو اس کا ایک حل نکالا لیکن ابھی کچھ ہی

تحریریں پڑھی ہیں۔ سوان ہی پر تبصرہ کر رہے ہیں۔

پہلی تحریر ”خواب شیشے“ کا جو مدت بعد سے پڑھی جی جناب یہی حل نکالا ہم نے رسالہ پڑھنے کے لیے، دیکھیں آپ ہنسیے گا نہیں۔ واہ عفت سحر! زبردست، آغاز سے ہی اس ناول نے اپنے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ سمیرا حمید کی تعریف کرنا چاہیں تو الفاظ ہی گم ہونے لگتے ہیں کہ وہ ہماری سوچ سے کہیں آگے ہیں۔ ”راہ نور“ کا ایک ایک لفظ دل میں اتر گیا۔ ہمیں تو یہ کہانی نہیں حقیقت لگی۔ فرح بخاری ”بن پاکھی“ وہ زبردست تحریر ہے جو طویل بھی ہوتی تو بہت مزہ آتا۔ نہ غیر ضروری کرداروں کی بھرمار، نہ فضول چھچھورا رومانس، ہلکا پھلکا رومانس ہے تو وہ بھی اتنا ڈیسنٹ، ایک طرف زبان والفاظ کا چناؤ، انداز بیان اور منظر کشی باکمال تھی تو دوسری طرف ”رافع محمد“ اب تک کی ہماری پڑھی گئی تمام تحریروں کے سب ہیروز میں منفرد قرار پایا۔ ”ام ایمان قاضی“ کے ناولٹ میں صفا کی ہمت وجرأت آگے بڑھنے کی جدوجہد اور پھر کامیابی۔ سر اٹھا کے جینے کا درس دیتی ایسی تحریریں حوصلہ دینے کے ساتھ ساتھ دل میں ایک سکون سا بھر دیتی ہیں۔ لیکن یہ اچھا نہیں لگ رہا کہ اب شہوار کی شادی ہادی سے ہو جائے گی پھر کچھ عرصے کی ناراضی کے بعد ہادی صاحب بھی شہوار کی محبت کے آگے ہتھیار ڈال دیں گے۔ صائمہ! پلیز آپ شہوار کا کومیاب نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔

شاید آپ یقین نہ کریں کہ ہم نے ایک محترمہ سے یہ سنا کہ اپنی پسند حاصل کرنے کا طریقہ تو بڑا زبردست بتایا ہے اور یہ بھی کہ جب ہی والدین اپنی بچیوں کو ڈائجسٹ پڑھنے نہیں دیتے۔ افشین نعیم نے ”سب اچھا ہے۔“ اتنے ہلکے پھلکے انداز میں لکھا کہ واقعی بہت اچھا لگا۔

پیاری ناہید! ہم اور ہماری رائٹر پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہم اسے سمجھتے ہیں۔ کسی تحریر کے مثبت یا منفی جو اثرات ہوسکتے ہیں اس کا بھی ہمیں پتا ہے اور ہماری رائٹر بھی اس کا خیال رکھتی ہیں۔ صائمہ اکرم نے در شہوار کے لیے کیا یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلے گا۔

بنت مریم نے دنیا پور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سروے کے سوال دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن وہی بات پچھلے سروے کے سوالات بڑی عرق ریزی اور محنت کے بعد دور کا سفر طے کر کے یعنی شہر جا کر پوسٹ کیے اور جب دھڑکتے دل کے ساتھ شمارہ کھولا تو دل نے دھڑکنا ہی بند کر دیا اور غصے سے دماغ کھولنے لگا لیکن کیا کریں

مجبوری ہے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے کیونکہ آپ سے پرانا اور دل کا رشتہ بندھا ہوا ہے۔ اگر نہیں چھاپا گیا ہمارا خط تو ہوگا دھرنا شعاع کے دفتر کے باہر یا سامنے نہیں بلکہ اندر اور ہوں گے ساتھ میرے کزن جب تین ٹائم کھانا دیں گے اور روز ہم پنجاب والے ہوں گے تو لگ پتا جائے ویسے تو ساری رائٹر بہت اچھا اور محنت سے لکھتی ہیں اور ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی سبق ہوتا ہے لیکن جو رومانس سوا نیزے پر پہنچ جاتا ہے اس کی مجھے سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ لڑکیاں بالیاں نازک دل کی ہوتی ہیں ایسے ڈائیلاگ پڑھ کے خواب دیکھنا شروع ہو جاتی ہیں اور جب خواب..... ٹوٹیں تو دل بہت دکھتا ہے۔ دوسری بات ہر کہانی کی ہیروئن کا نام مریخ سے آتا ہے پاپلوٹو سے نام پڑھ کے ایسے لگتا ہے جیسے کسی کمپنی کی نئی دوا کا نام ہوا (دست بدستہ معافی کے خواستگار ہیں)

شازیہ الطاف کا خط پڑھ کے تو بچپن یاد آ گیا کیونکہ ہمارا بچپن شجاع آباد میں ہی گزرا ہے۔ وہ صبح صبح اٹھ کے سب نے ماموں کے ساتھ جا کر نہر میں نہانا ریس لگانا درختوں پر بندروں کی طرح اچھل کود کرنا ویسے بھی شجاع آبادی ام سوادی، تو سب نے سنا ہوگا۔

اب بھی بچپن کی یاد تازہ کرنے کے لیے پچھلے سال ایک افطاری نہر کے کنارے کی' واہ جی واہ سواد آ گیا روانی سے چلتا نہر کا پانی، قطار جھومتے درخت، مکمل خاموشی میں ہم نے چادر بچھائی اور افطاری کی۔ آپ لوگوں نے مصدقہ احادیث کا سلسلہ شروع کر کے بہت بڑا اجر حاصل کیا ہے کیونکہ آج کل خود ساختہ اذکار وظائف اور ضعیف احادیث کا لوگ بہت پرچار کرتے ہیں اور ان ہی کو جنت کا ضامن سمجھتے ہیں۔

پیاری مریم بہت مزے دار خط لکھا ہے آپ نے اتنا اچھا خط تو ویسے بھی شائع ہو جاتا ہے۔ خواہ مخواہ اتنی دھمکیاں دیں۔ 126 دن کا دھرنا دیکھ چکے ہیں۔ آپ کے معصوم دھرنے سے ڈرنے والے نہیں آپ تو ہماری مہمان ہوں گی۔ شوق سے آئیں۔

پچھلے سروے کے جواب کیوں نہ شائع ہوسکے۔ یہ تو ہمیں یاد نہیں یقیناً تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل نہ ہوسکے ہوں گے۔

فائزہ مریم شوکت نے گجرات سے لکھا ہے

شعاع، خواتین، کرن ڈائجسٹ آپ کے تینوں شمارے لاجواب ہوتے ہیں۔ آٹھ سال ہوگئے ہیں مجھے پڑھتے ہوئے اب میں نے مجبور ہو کے قلم اٹھایا ہے۔ اللہ پاک کے فضل وکرم سے کم عمر نادان، ہر عمر کی خواتین کے لیے راہ ہدایت ہے۔ میرے ابو ناول رسالوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ امی کو بھی ناپسند تھا لیکن جب حدیثیں، مسئلے، پکوان، بیوٹی ٹپس وغیرہ سنایا تو اب وہ پڑھنے سے روکتی نہیں تمام رائٹر ابہت اچھا لکھتی ہیں۔

پیاری فائزہ! بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے لیکن کہانیوں پر تبصرہ نہیں کیا۔ آئندہ خط لکھیں تو کہانیوں کے بارے میں بھی لکھیں۔ اپنی امی کو تو آپ نے قائل کر لیا۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کے ابو بھی ایک دن مان جائیں گے۔

یہ خط عروج یوسف کا ہے، لکھتی ہیں

کافی لمبی غیر حاضری کے بعد آج خط لکھنے کا سوچا۔ آپ کو فرق تو یقیناً نہیں پڑتا مگر مجھے کافی فرق پڑا۔ اچھا جی اب ان وجوہات کی طرف آتی ہوں جو کاغذ قلم سنبھالنے کی وجہ بنیں۔ نمبر ایک تنقید، نمبر دو تعریف، نمبر تین سوال۔

(1) آپ نے احادیث میں تصویر کے بارے میں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پاک بیان کی اور ٹائٹل پر پھر تصویر کیا یہ کھلا تضاد نہیں۔ اکثر گھروں میں اسی تصویر کی وجہ سے لڑکیوں کو ڈائجسٹ پڑھنے سے روکا جاتا ہے بے پردہ، میک اپ سے لت پت بغیر دوپٹے کے لڑکی چاہے آپ کچھ کہیں، ناپسندیدہ ہی ہے۔ اللہ کے حکم کی صریح نافرمانی۔

(2) تعریف، مگر آپ کی نہیں۔ آپ کے سروے میں زیادہ تر بہنوں نے کہا کہ شادی سے پہلے حسرت سے دیکھتے تھے، کچھ نے کہا، مانگ کر پڑھتے تھے۔ کچھ نے کہا کہ ردی والے سے لیتے تھے تو میں بھی ان میں سے ہی ہوں۔ مطلب تھری ان ون بس اضافہ یہ ہے کہ میں نے بیلن، جوتوں اور تھپڑوں سے مار کھائی ہے آپ کے رسالوں کے پیچھے اور آپ کی پچھتر فیصد قارئین کی طرح شادی کے بعد اپنے شوہر کی اتنی جان کھائی کہ انہوں نے ہاکر سے لگوا کر جان چھڑائی اور اب تقریباً انیس سال میں ہم نے تقریباً دس گیارہ مکان بدل لیے ہیں مگر وہی ہم ہیں وہی ہاکر اور وہی آپ کے ڈائجسٹ، تو تعریف مجھے کرنی تھی ان شوہروں کی جن کی فراخ دلی پر آپ کا ادارہ چل رہا ہے۔ (اللہ کے کرم کے بعد) ورنہ امیوں، اباؤں اور بھائیوں نے تو آپ کا کاروبار ٹھپ کرنے میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔ تو آپ کا فرض بنتا ہے کہ آپ ٹریبوٹ پیش کریں ان تمام شوہروں کو جن کی اپنی بیویاں ان کی کمائی سے اتنے سال رسالوں کی عیاشی کر کے سروے کے آخر میں لکھتی ہیں کہ ”میرے شوہر بہت ظالم ہیں“ اف ظلم (افسوس ہے تم پر)۔

(3) یہ بتایئے کہ اگر موحد، نمیر ہی تھا تو نمیر نے موحد کے آفس میں کال کر کے بات —— کس سے کی تھی؟

عید کے تیسرے دن میرے بھائی کا نکاح ہے۔

ج: پیاری عروج! سب سے پہلے بھائی کی شادی پر مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے بھائی کو شاد و آباد رکھے۔

ہم شوہروں کو خراج تحسین تو پیش کرتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ خراج تحسین کی اصل مستحق تو ہماری وہ قارئین ہیں جو گھر اور بچوں کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ہمارے رسالے پڑھنے کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔ بے شک وہ رسالے لا کر دیتے ہیں لیکن اگر شوہر صاحبان کے کسی کام میں کمی یا کوتاہی ہو تو پھر آپ دیکھیے گا کہ یہ شوہر صاحبان کس طرح آنکھیں ماتھے پر رکھتے ہیں۔

ٹائٹل کے سلسلے میں پرچے کے آغاز سے ہی یہ ٹرینڈ چلا آ رہا ہے۔ ہم نے جب بھی قارئین سے رائے لی۔ ہمیں ملی جلی آراء ملیں۔ بلکہ ہماری بیشتر قارئین تو کہتی ہیں کہ ٹائٹل پر پوری تصویر دیں۔ تا کہ ماڈل کے کپڑوں کا ڈیزائن بھی نظر آئے۔

اور یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ اتنے طویل عرصے سے

کہاں غائب تھیں؟ اور یہ بھی آپ نے خود ہی فرض کرلیا کہ ہم نے کمی نہیں محسوس کی۔ آپ خود ہی بتائیں، اپنوں کی کمی کے محسوس نہیں ہوتی۔ پرچا آنے کے بعد ہی قارئین کی رائے کا انتظار شروع ہوجاتا ہے۔ ہماری اصل کسوٹی تو قارئین ہی ہیں۔

ایف بی ایریا کراچی سے تسنیم کوثر نے لکھا ہے

کیا بات ہے آج کل آپ نے ہمارا مکمل بائیکاٹ کیا ہوا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ کسی قاری بہن سے یہ کہا تھا کہ بعض دفعہ آپ اکثر خاموشی اختیار کرلیتی ہیں اور اس خاموشی کو قلم کے ذریعے توڑیں۔ یقین جانیے یہ بات بہت دل کو لگی تو اب آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ہم آپ کی چپ کو یا خاموشی کو کیسے توڑیں کیونکہ ہمارے قلم میں وہ تاثیر نہیں ہے۔ بہرحال اب بات ہوجائے "خواب شیشے کا" ماشاء اللہ نہایت عمدہ ناول رہا۔ مصنفہ عفت سحر طاہر مبارک باد کی مستحق ہیں اور "شہرزاد" تو ہے لاجواب دل سے پسند آرہا ہے۔ ناول "روشن لمحوں کا سفر" بہت اچھا لگا بلکہ سب سے اچھا کوثر خالد سودا کا انداز بیاں نہایت دلچسپ اور پیارا لگا۔

ج: پیاری تسنیم! نہ ہم نے بائیکاٹ کیا ہے کہ آپ کو اگنور کررہے ہیں۔ بات وہی ہے جو ہم پہلے کئی بار لکھ چکے ہیں۔ صفحات کی مجبوری کی وجہ سے بہت سارے خط شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ رہی خاموشی توڑنے اور قلم میں تاثیر کی بات تو آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ خاموشی۔ کیسے توڑی جاتی ہے۔ آپ کی تعریف ان صفحات کے ذریعے مصنفین تک پہنچ گئی ہے۔

چتو کی سے فائزہ بھٹی شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے

دل جو پہلے ہی خرابی طبیعت کی وجہ سے ڈوبا جارہا تھا۔ اس وقت دھڑام سے گہرے کنویں میں گر گیا جب آگے پیچھے کافی تلاش کے بعد بھی ہمارا خط نہ نظر آیا۔

سرورق نارمل لگا۔ میک اپ کچھ زیادہ لگ رہا تھا۔ اس گرمی میں میک اپ چہرے پر ٹک کیسے جاتا ہے۔ بتایئے گا ضرور۔ بہن کی شادی ہے ہم بھی مستفید ہوجائیں گے۔

فہرست میں اچھے اچھے نام دیکھنے کو ملے۔ شہرزاد میں درشہوار ہمارے دل سے اترتی جارہی ہے۔

"بن پاکھی" لگتا ہے فرح نے فوزیہ ثمر بٹ کی دہائی پر کان دھرلیا تھا۔ اسی لیے اچھا اور ہلکا پھلکا رومانس بھی پڑھنے کو ملا...... "راہ نور" سمیرا احمید پڑھ کر مزہ آیا۔

وسائی کافی دیدہ دلیر لڑکی تھی۔ حالانکہ ہمارا معاشرہ ایسی دیدہ دلیر لڑکی کو پسند نہیں کرتا۔ "زید اور ہیرے کی انگوٹھی"۔ واہ واہ ہیرو صاحب تو محبت میں قصائی بھی بن گئے۔ "قصہ ایک دوپہر کا" فاخرہ جبیں کا انداز مجھے شروع سے ہی بڑا پسند ہے۔

افشین کی کہانی ٹھیک تھی۔ ام ایمان بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ کوثر خالد صاحبہ میرا ایک کام کردیں۔ آپ نے ضبط عشق کا نام لیا۔ ہمارے پاس اس ناول کی صرف پہلی قسط ہے۔ کوثر خالد! کیا آپ ہمیں اس کی بقیہ اقساط دیں گی!

ج: فائزہ! خط نہ پاکر دل کنویں میں گر گیا بھئی دل سنبھال کر لکھا کریں اتنی قیمتی چیز سے لاپرواہی نہیں کرتے۔ آپ کا خط حسب روایت شان دار ہے۔ سب کہانیوں پر جامع تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ ضبط عشق کی صرف دو ہی اقساط ہیں۔

روبینہ منظور سیالکوٹ سے شریک محفل ہیں، لکھتی ہیں

ڈائجسٹ سے میرا تعلق پچھلے اٹھارہ سال سے ہے۔

میٹرک کے بعد میں نے 2000ء سے شعاع اور خواتین سے دوستی کی ہوئی ہے۔

جب ٹین ایج میں تھی تب دادی اماں کے ڈائجسٹ پھاڑنے سے بھی یہ دوستی نہ ٹوٹی۔ پھر امی کی ڈانٹ، ڈائجسٹ میرے ہاتھ سے کھینچ کر صحن میں پھینکنا، یہ بھی میری لگن نہ کم کرسکا۔ ہاں البتہ ماسٹر کرنے پھر ایم۔ ایڈ یعنی یونیورسٹی لیول تک آتے آتے مصروفیت بہت بڑھ گئی۔ 2007ء اکتوبر میں شادی، تین بیٹے ان سب نے زندگی بہت بدل دی۔ ڈائجسٹ پکڑتے ہی ساری یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔

ج: پیاری روبینہ! آپ نے عمر کی مختلف منازل طے کیں۔ زندگی کے بہت سے مراحل سے گزریں۔ اتنی طویل رفاقت آپ کے ساتھ۔ سچ کبھی کبھی تو شعاع سے آپ لوگوں کی محبت پر فخر کا احساس ہوتا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے دیرینہ وابستگیوں سے بہت سی سہانی یادیں وابستہ ہوتی ہیں جنہیں گزرتا وقت مزید شیریں بنادیتا ہے۔

عالیہ بتول نے گوجر خان سے لکھا ہے

آج آخر ہم نے اس انقلابی قلم کو اٹھانے کا کشٹ کر ہی لیا کیونکہ ہمیں سندر بن کے ایک آوارہ پاکھی نے مجبور کردیا کہ آج ہم چپ کو توڑیں شاباش فرح جی شاباش واہ! واہ! کیا خوب لکھا۔ ہم بے چارے تو نمرہ احمد، سمیرا احمید کی مشکل اور پیچیدہ فلاسفیوں کے اسیر، بری طرح قید تھے کہ اچانک 'بن پاکھی' نے آکر ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ فرح جی آپ نے تین اقساط میں ختم بھی کردیا دو تین ماہ اور سندر بن کا پاکھی محو پرواز اور محو سفر رہتا تو ہم کھوئے رہتے۔ زبردست منظر نگاری، تسلسل بیان، کہیں قلم چوکا نہیں، روٹین سے ہٹ کر خوب صورت کہانی۔ نہ جانے کتنے مہینے یا مدتوں ہمیں یاد رہے گی۔ شہرزاد کی بھی بات کرتے چلیں۔ درشہوار کو زبردستی ہادی کے سر تھوپا جارہا ہے یہ ٹھیک بات نہیں۔ رمیصہ اور ارسل کا رشتہ ہمیں اس قدر اچھا لگتا ہے کہ ساری خطائیں معاف۔

ج: پیاری عالیہ! خوش ہوجائیں۔ صائمہ اکرم نے کم از کم اس ماہ تو ہادی کو درشہوار سے بچالیا ہے۔ اب آگے ان کے ہاتھ میں ہے، دیکھیے کیا کرتی ہیں۔ ویسے ہماری بہت سی قارئین کو یہ زبردستی کی محبت اچھی نہیں لگی ہے۔

فرح بخاری تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ وہ آپ کے لیے ایک اور ناول لکھ رہی ہیں ہمیں یقین ہے، وہ بھی اتنا ہی اچھا ہوگا۔

مہدیہ ممتاز نے اٹک کینٹ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

فرح بخاری کا ناول "بن پاکھی" بہت زبردست تھا بالکل ایکشن مووی جیسا لگا لیکن احساسات و جذبات سے بھرپور، حالات و واقعات میں مکمل ربط لیے ہوئے تھے۔ دیملا نے اسلام قبول کرنا تھا، اس کا اندازہ تو تھا لیکن جو اسلامی نام رکھا وہ اچھا نہیں لگا۔ بہرحال اتنے سنجیدہ حالات سے گزرنے کے بعد اختتام بہت زبردست تھا۔ بہت عرصہ بعد کوئی ناول اتنے شوق سے پڑھا ہے اور یہ تحریر واقعی ایسی تھی کہ جس کے پڑھنے کے دوران چولہے پر رکھا سالن بے پروائی کی نذر ہوکر کالا ہوجائے۔ ہاہاہا...... فرح بخاری صاحبہ سے گزارش ہے کہ مزید اسی طرح کی تحریریں لکھیں۔

افشین نعیم کے "یار دل دار" کا انتظار رہتا ہے اب تو بہت مختصر تحریر میں تفریح کے ساتھ سیکھنے کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔ کہانی بھی جاندار ہوتی ہے۔ اس دفعہ سب اچھا ہے 'بہت اچھی تحریر تھی اور حقیقت کی عکاسی بھی کرتی ہوئی۔ ہمارے اردگرد ایسے ہی کردار رہتے ہیں۔

سمیرا احمید صاحبہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ الفاظ کا چناؤ، جملوں میں ربط، روانی اور حالات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے پیراگراف۔ سمیرا احمید جیسی رائٹر بننا میرا خواب ہے۔ لیکن جیسے ہی قلم ہاتھ میں آتا ہے۔ یہ خواب پانی کے بلبلے کی طرح ہوا میں تحلیل ہوجاتا ہے۔ شعاع کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ تاریخ کے جھروکے میں ماضی میں گزری نامور خواتین کو ضرور جگہ دیا کریں جی۔ یہ میری فرمائش ہے۔

ج: مہدیہ! آپ نے دل کھول کر تعریف کی اور ہم پوری ایمان داری کے ساتھ آپ کی تعریف مصنفین تک پہنچا رہے ہیں لیکن شکایت یہ ہے کہ سالگرہ نمبر میں دیگر مصنفین کی کہانیاں بھی شامل تھیں۔ ان کا ذکر تک نہیں۔

فرح بخاری جلد ہی نیا ناول لکھیں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اقصیٰ ناز اور رافعہ صداقت ڈھوک اعوان سکھر سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ٹائٹل گرل اس بار اتنی زیادہ اچھی نہیں لگی۔ حمد اور نعت کے بعد انٹرویو پڑھے۔ بندھن میں زارا نور عباس اور اسد صدیقی سے ملاقات کی۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" نورین حفیظ پڑھ کے رونا آگیا۔ اس کے بعد اپنی فیورٹ کہانی "شہرزاد" پڑھی، بہت بہت اچھی کہانی ہے۔ مکمل ناول بھی اچھے تھے۔ ناولٹ پڑھ کے بہت ہنسی آئی شیخ جی کی باتوں پر۔ افسانے بھی سارے اچھے تھے۔ پلیز پلیز آپی دانش تیمور اور عائزہ جی کا انٹرویو لیں۔

ج: پیاری اقصیٰ اور رافعہ! شعاع کی محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ کتابوں کے بارے میں آپ درج ذیل نمبر پر فون کرکے معلوم کرسکتی ہیں۔ 021-32735021 شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس نے گجرات سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

اگست کا شعاع ٹائٹل اے ون لگا۔ پہلی شعاع کی باتیں پُر اثر ہیں۔ روشن لمحوں کا سفر میں سب کے جوابات بہت مزے کے لگے۔ اے کاش ہم بھی شرکت کریں۔ کوثر خالد سودا اپنے منفرد انداز سے منفرد نظر آئیں۔ دستک میں دونوں سپرہٹ ہیروئینز۔ صنم سعید کو بندھن میں بھی لائیں ناں۔

سب سے پہلے تو ''شہزاد'' پڑھا۔ در شہوار نے جو بم دھما کہ کیا۔ ہادی کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے در شہوار نے۔ لگتا ہی نہیں ہادی کبھی بھی درے کو اپنے دل میں جگہ دے۔ برہان سے یہی امید تھی کہ وہ انابیہ سے یہ سلوک کرے گا۔ بے حس انسان اور ہاں شہزاد اور حمزہ خالد کی بھی ویڈنگ جلدی لائیں۔

''خواب شیشے کا''۔ یہ کیا موحد کا کہیں وجود ہی نہیں اور نمیر ہی موحد تھا، لگتا ہے آغاجی مہرماہ کے حق میں ہی فیصلہ کریں گے۔ تو ہمارا ساتھ یہاں تک تھا عفت جی سے۔ خیر کسی اچھے سے ناول کی ابھی سے امید لگا رہے ہیں آپ سے، زیادہ انتظار مت کروائیے گا۔ ورنہ میں نے آپ کے گھر آ جانا ہے۔

سمیرا حمید کا راہ نور ذہن کی کئی بند گرہیں کھول گیا۔ پتا نہیں کسی جادو بھرے قلم سے لکھتی ہیں کہ بندہ سانس لینا بھول جاتا ہے۔ اتنا غم اتنی مایوسی پھر امید خوشی، روشنی، سکھ، چین، رب سے محبت رب کے قریب ہو جاتا ہے۔ تسی گریٹ ہو۔

میں نے اپنی (بہن) فرخندہ رئیس کو خاص طور پر یہ تحریر دی کہ اسے غور سے پڑھو اور عمل کرو۔ (ڈپریشن کی میڈیسن کھاتی ہے پورا سال ہو گیا ہے۔)

بن پاکھی کا اینڈ اچھا لگا، فرح جی نے تمام گلے شکوے دور کر دیے۔

سب اچھا ہے، مزاحیہ تحریر بہت پسند آئی۔ صنوبر خاتون کیا دلچسپ خاتون تھیں۔ ہر ماہ ایک دو تحریریں ایسی لازمی شامل کریں۔

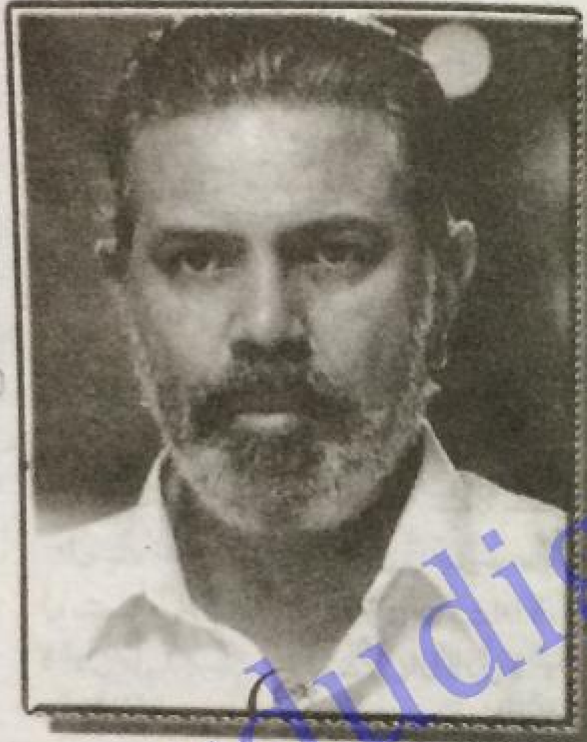
سر اٹھا کے جینا ہے۔ یہ تحریر بھی اچھا سبق دے رہی تھی۔ افسانے سبھی حقیقت کے قریب تر تھے۔ زید اور انگوٹھی بقر عید کے حوالے سے خوب تھی۔ سبق بھی خوب تھا۔ کسی کو اتنا تنگ یا زچ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ آپ کے سارے داؤ آپ پر آزمانا شروع کر دے۔

غزل میں عظمیٰ جون پسند آئی۔ باتوں سے خوشبو آئے۔ لاجواب اسلامی قصے زیادہ شامل کیا کریں۔

ج: پیاری فوزیہ! آمنہ اور ہانیہ! سب سے پہلے تو آمنہ کو اور عمران کو سالگرہ کی مبارک۔ اس کے بعد آپ نے بہت اچھا اور تفصیلی تبصرہ کیا۔ آپ کی تعریف مصنفین تک ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ صنم سعید کی بندھن کے لیے آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی ہے۔

کوثر خالد سودا نے جڑانوالہ سے محفل کو رونق بخشی ہے۔ لکھتی ہیں ہزاروں مصروفیتیں ایسی کہ ہر مصروفیت میں دم اٹکا۔ سات رسالے ہر ماہ پڑھنا۔ اسلامی بکس الگ اور قرآن لکھنا بھی شروع کیا ہے۔ ایک سپارہ ہو گیا ہے ماشاءاللہ۔ تو فیصلہ یہ کیا ہے کہ فی الحال قرآن اور 2019ء میں شائع ہونے والی کتاب تیار کروں اور بڑے رسالے صرف مستقل سلسلے یا خطوں سے پڑھ کر کوئی وہ کہانی جو سپرہٹ ہو جائے اسے پڑھوں۔ لیکن نہ پڑھنے کے دکھ کا ازالہ بھی قدرت نے خود ہی کر دیا۔ شمع کی شاگرد آمنہ (آمنہ زریں کہاں اور کیسی ہیں سلام) کہانیاں پڑھا کرے گی۔ اور اس کا تبصرہ میں کیا کروں گی۔ میرا تبصرہ تو سو فیصد مثبت ہوتا ہے۔ اس کا دیکھیں۔ فی الحال پچھلی بار انیلا طالب اور صائمہ اکرم پسند آئیں۔ یعنی ایک افسانوں سے دوسری ناول سے...... ابھی وہ پڑھ رہی ہے اس بار کا۔ مگر میرا تبصرہ یوں ہے کہ واقعی 'بن پاکھی' پُراسرار، خوب صورت اور جان دار تھی بقول قارئین۔ 'شہزاد' بھی اچھی جا رہی ہے، اور 'گھر شیشے کا' آخری قسط مزے دار ہو گی۔ باقی رسالہ بچی سے سنوں گی۔ اور تبصرہ اگلی بار۔ فوزیہ سے لے کر ارم تک سب کو سلام محبت۔ اٹل کو سلام عقیدت، بکرا عید مبارک ہو جناب۔

واصفہ سہیل





ہوتے رہیں گے۔ (عاشر عظیم صاحب لوگ اس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔ یہاں سنتا کون ہے لوگوں کی جو وہ بولیں۔) عاشر عظیم کینیڈا چلے گئے ہیں اور وہاں جا کر ٹرک چلا کر گزر بسر کر رہے ہیں۔ (عاشر عظیم جب آپ جیسے لوگ ہمت ہار دیں تو......؟)

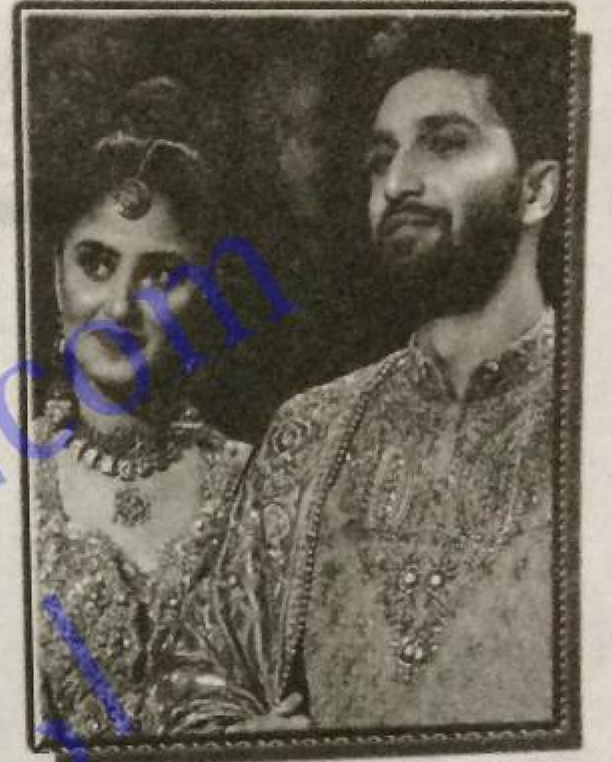
فخر

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی بیٹی نے ہالی وڈ فلموں میں ویژول ایفیکشن آرٹسٹ کے طور پہ کام کیا ہے۔ لاریب نے 2006ء میں انیس سال کی عمر میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ لاریب نے اس بارے میں کہا کہ جب میں نے اس کورس کا آغاز کیا تو مجھے اس کی کوئی سمجھ نہیں تھی۔ مجھے صرف یہ پتا تھا کہ یہ فلم کے لیے جادو ہے۔ پہلے مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ کیسے ہوتا ہو گا۔ لیکن چونکہ یہ فن اور ٹیکنالوجی پر مشتمل تھا جسے میں

مایوسی

ڈراما سیریل دھواں سے شہرت حاصل کرنے والے عاشر عظیم کی فلم ''مالک کے'' ذریعے شوبز میں واپسی ہوئی تھی لیکن فلم کو بہت زیادہ سنسر کا سامنا کرنا پڑا۔ عدالت کے ذریعے کیس جیتنے کے بعد فلم ریلیز بھی ہو گئی لیکن اس میں عاشر عظیم کو مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

ان حالات سے مایوس ہو کر عاشر عظیم نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ عاشر عظیم اس بارے میں کہتے ہیں۔ ''میں نے ملک چھوڑ دیا ہے کیونکہ میں مایوس ہو گیا ہوں' حکمرانوں کی وجہ سے نہیں' کیوں کہ یہ تو ہمیشہ سے ایسے ہی تھے' مجھے یہاں کے لوگوں نے مایوس کیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ لوگ اصول کی بات نہیں کرتے، اصول پر ہنستے ہیں۔ انہیں ایسے ہی حکمران ملیں گے جیسے آج اور کل تھے۔ بس نام تبدیل



کرنا چاہتی تھی۔

لاریب کا کہنا ہے کہ ان کا مقصد پاکستانی خواتین کو متاثر کرنا ہے۔ (متاثر' پاکستانی خواتین اور ان باتوں سے متاثر' ارے نہیں بھئی) وہ چاہتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خواتین ـ اور نوجوان اس شعبے میں آئیں۔ (مطلب خواتین اور نوجوان یعنی ......آپ خواتین کو......؟) لاریب عطا نے بطور ویژول آرٹسٹ ہالی وڈ میں اپنے قدم جما کر ملک کا نام روشن کیا ہے۔ جس پر ان کے والد اور قوم کو فخر ہے۔

پسند

احد رضا میر، اپنی ساتھی اداکارہ سجل علی کے متعلق کہتے ہیں کہ انہیں حقیقی زندگی میں بھی سجل علی پسند ہیں (یہ تو کوئی اہم بات نہیں......؟) اور احد رضا میر نے سجل علی کو نہ صرف بہترین اداکارہ اور خوب صورت خاتون (خا......تون۔ اف بے چاری لڑکی!!) قرار دیا۔ بلکہ ان کے مطابق ان کے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ وہ سجل علی کی تعریف کر سکیں (اردو کمزور ہے یا والدہ کا ڈر......جو تعریف......الفاظ......بھئی کم پڑ گئے ناں)

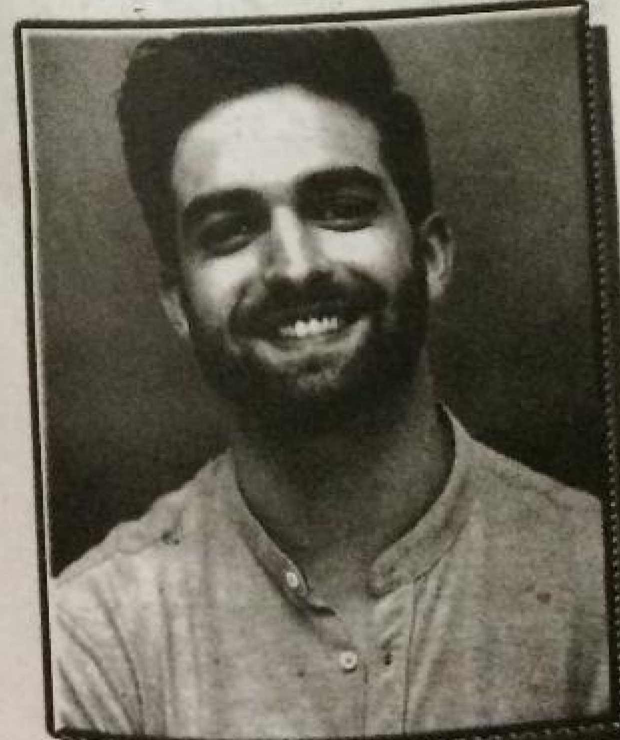
احد رضا نے کہا ہے کہ "یقین کا سفر میں ان کی جوڑی کو بہت سراہا گیا ہے (آپ کو یقین نہیں ہے کیا؟"

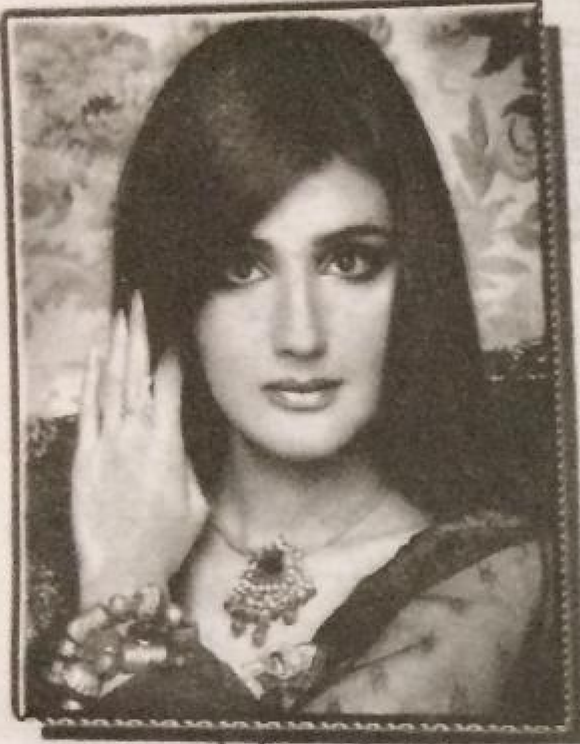
اور اس کا سبب یہ ہے کہ دونوں ایک ہی طریقے سے کام کرتے اور چیزوں کو دیکھتے ہیں (اور باقی لوگ کیا......؟) انہیں سجل کے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا ہے (تو برا کسے لگتا ہے سجل جیسی فنکارہ کے ساتھ کام کرنا......؟)

شادی سے متعلق احد کہتے ہیں کہ ان کی شادی کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ (مطلب والدین نہیں کریں گے یا چانس پر ہے۔)

سیڑھی

علمدار حسین شوبز انڈسٹری میں ایک نیا اضافہ ہیں۔ آپ انہیں آج کل "میں خیال ہوں کسی اور کا" میں دیکھ رہے ہیں۔ علمدار لندن میں پلے بڑھے اور انہوں نے لندن سے ہی اداکاری کی تربیت حاصل کی ہے۔ علمدار کا کہنا ہے مجھے بچپن ہی سے اداکاری کا شوق تھا۔ (ہر بچے کو ہوتا ہے بھئی اداکاری کا شوق اور کیا؟") انہوں نے مزید کہا کہ اس سے پہلے انہیں





فلم "جاناں" میں اداکاری کی آفر آچکی تھی (آہم۔) مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ (آہم آہم) کہ اتنی بڑی آفر قبول کرنے سے پہلے انہیں اداکاری سیکھ لینا چاہیے (کس سے بھئی......؟)

انہوں نے مزید کہا کہ جب وہ پاکستان آ رہے تھے تو انہیں لوگوں نے کہا (کن لوگوں نے؟) پاکستان یو کے کے مقابلے میں نسبتاً ایک چھوٹی انڈسٹری ہے۔ مگر انہوں نے سوچا کہ پاکستان ان کا اپنا ملک ہے۔ (ہیں اچھا!) اور یہاں کام کر کے انہیں ذاتی طور پر بہت فخر محسوس ہو رہا ہے اگر یہاں سے کیریئر کی ابتدا کی جائے تو دنیا بھر میں جہاں بھی کام کریں گے ان کے اندر ایک اعتماد ہو گا اور انہیں احساس ہو گا کہ وہ اپنے ملک سے ترقی پا کر کہیں اور کام کر رہے ہیں۔ (یعنی اپنا ملک سیڑھی ہے ترقی کی)

تقاضا

زارا شیخ نے اپنے تازہ ترین انٹرویو میں کہا ہے کہ اب فلمیں نہیں بلکہ ٹی وی ڈرامے بنا کر بڑی اسکرین پر پیش کر دیے جاتے ہیں اور اب کہانی ہیروئن نہیں بلکہ ہیرو کے گرد زیادہ گھومتی ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ ویسے تو یہ رجحان غلط ہے کہ فلم کو مرد اور عورت کے گرد گھومتی کہانیوں کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ (یہ کھلا تضاد نہیں ہے کیا زارا؟)

اداکارہ زارا کہتی ہیں کہ اداکار کے لیے عمر کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ (جی......اداکار یا ہیروئن......؟) اگر فلم کی کہانی، پروڈکشن ٹیم، میوزک اور دیگر مالی تقاضے پورے ہوں تو میں آج بھی کسی بھی فلم میں پہلے کی طرح کام کر سکتی ہوں (ان ڈیمانڈز کے ساتھ آپ فلم مانگ رہی ہیں۔ وہ بھی اس عمر میں' بھئی اس وقت جب نوجوان اداکاراؤں کی کمی نہیں ہے۔)

ادھر ادھر سے

☆ خدا لگتی بات یہ ہے کہ فوج یا اس کے کسی ذیلی ادارے نے کسی حکومت کو ترقیاتی کاموں سے نہیں روکا۔ نواز شریف کے ساتھ ان کے معاملات البتہ اور تھے' اگر ایسا ہوتا تو شہباز شریف پنجاب میں اتنے حیران کن ترقیاتی کام نہ کر پاتے۔

(وقائع نگار......امت)

☆ جب آپ کسی کو دبانے کے لیے دفن کرتے ہیں تو وہ بیج بن کر ابھر آتا ہے۔ انگریزی میں کسی نے شہرہ آفاق فقرہ لکھا تھا۔

ترجمہ: انہوں نے ہمیں دفن کر دیا۔ انہیں پتا نہیں تھا، ہم بیج ہیں۔

(اعزاز سید، سیاسی افق)

☆ متحدہ پاکستان کی قسمت کا فیصلہ 16 دسمبر کو پلٹن میدان میں نہیں ہوا۔ 25 مارچ 71 کو جگن ناتھ پال اور اقبال ہال میں ہو گیا تھا۔ پرویز مشرف نے 12 اکتوبر 99 کو چیف ایگزیکٹو ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ انہوں نے 17 مئی 99 کو وزیراعظم کو اطلاع دی تھی کہ انہوں نے لائن آف کنٹرول پار کرنے کا فیصلہ از خود کیا ہے۔

(وجاہت مسعود، تیشہ نظر)

☆ لوگوں کا کہنا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد 71 سال میں پہلا موقع ہے کہ وزیراعظم نے عید کی نماز نہیں پڑھی۔

(آؤٹ لائن ڈاٹ کام)

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

فلسطین کا تنازعہ

پس منظر کیا ہے؟

فلسطین کا قضیہ برطانیہ اور فرانس کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ اب تک سترہ کمیشن تحقیقات کر چکے ہیں۔ ملک کے باشندے ترکی حکومت کے ایام کو یاد کر کے کفِ افسوس ملتے ہیں مگر خود کردہ را علاج نیست۔ اے کاش کہ وہ سمجھتے غداری کی سزا تو اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں تو سخت گرفت یقینی ہے۔ ان کی ہر قسم کی چیخ و پکار بے کار ثابت ہو رہی ہے۔ کیا ہوگا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مگر بظاہر یا تو 1877ء کی تکرار ہوگی۔ جس میں صلاح الدین ایوبی کو پورے یورپ پر فتح ہوئی تھی اور اس کی صورت اتنی مہیب ہوگی کہ ممکن ہے۔ فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ زمینیں چھرہ جائیں اور آسمان آٹھ بن جائیں یا ایٹم بموں سے تختہ ہی الٹ جائے اور ارضِ فلسطین کا بحیرہ فلسطین بن جائے اور نہ معلوم کتنے ملک اور کتنی قوموں کے کروڑہا انسان اس کی روندن میں آ کر صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائیں۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔

جنگِ عظیم اول 18-1914ء کے دوران جب برطانیہ نے ترکوں کو شکست دینا چاہی تو شریف مکہ کے ذریعہ عربوں کو بغاوت پر یہ وعدہ کر کے ابھارا گیا کہ اگر اتحادی جنگ میں کامیاب ہو گئے تو عرب ممالک کی آزادی اور وفاق تسلیم کر لیا جائے گا۔

اس کے تھوڑے دن بعد برطانیہ نے یہودیوں سے وعدہ کر لیا کہ "اگر تم جنگ جیتنے میں ہماری مدد کرو تو ہم فلسطین کو تمہارا وطن مان لیں گے۔"

دونوں کی مدد سے برطانیہ نے جنگ میں کامیابی حاصل کر لی۔

ہوشیاری یہ کی کہ ان وعدوں کا ایک دوسرے کو بروقت علم نہیں ہونے دیا گیا۔ اسی طرح سے خفیہ طور پر باہم تقسیم ممالک کا بھی معاہدہ کر لیا۔ جن کے پیشِ نظر صلح کانفرنس میں من مانی کر لی۔

یہودیوں نے اپنا وطن بنانے کی غرض سے چند جماعتیں قائم کر لیں۔ انہیں چندہ فراہم کیا گیا۔ فلسطین میں زمینیں خریدنا شروع کر دیں اور مختلف ممالک سے آ کر بسنا شروع کر دیا۔

ادھر برطانیہ نے ان سے ایفائے وعدہ کی بنا پر ہر طرح کی سہولتیں اور آسانیاں بہم پہنچائیں۔ عربوں کے ہاتھ سے بہت سی زمین نکل گئی اور یہودیوں کی آبادی میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ عربوں کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا۔ اور انہوں نے سمجھ لیا کہ برطانیہ نے ان کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ اس پر عربوں اور یہودیوں میں تصادم ہونے لگے۔

حکومت نے حالات کا جائزہ لینے، مسئلہ کو حل کرنے اور تھپکنے کے لیے وقتاً فوقتاً کمیشن کے بعد سترھویں مرتبہ امریکہ بھی دخیل کار ہو گیا اور چھ چھ مدبروں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر ہوا جس نے اپنی سفارشیں مئی 1946ء میں شائع کر دیں۔ اب تک کسی کمیشن کی کوئی سفارش اہلِ فلسطین نے تسلیم نہیں کی اور ہر مرتبہ جھگڑے، قضیے،

لوٹ مار، قتل و غارت، آتش زدگی وغیرہ کی وارداتیں اور ہڑتالیں ہوئیں۔

اب فلسطین دوزخ کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ یہود کی درآمد ہر بہانے جاری ہے۔ اب ان کی امداد کے لیے عرب ممالک میں بھی اتحاد ہو گیا ہے اور دیگر ممالک میں بھی عربوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا جا رہا ہے۔

یہودی اپنے مقصد میں منہمک ہیں۔ آبادی بڑھ رہی ہے۔ مکان بن رہے ہیں۔ زمینیں درست ہو رہی ہیں، تعلیم جاری ہے۔ کھدائی کی جا رہی ہے۔ تجارت اور صنعت و حرفت میں ترقی ہو رہی ہے اور دنیا میں ہر یہودی کا دماغ اپنی قوم کی بہبود کے لیے کوشاں ہے۔ اس امر کے لیے پریشان ہیں کہ اتحادی اعلان کر دیں کہ فلسطین، وطنِ یہود بن چکا ہے۔

ادھر فلسطینی مجاہدین کی عزم و ہمت اور ان کی جان فشانی و جان نثاری دیکھیے کہ امریکہ، برطانیہ اور دیگر اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے دیے گئے جدید ترین اسلحے کے اندھا دھند استعمال کے باوجود مجاہدین اسلام نے ان سفاک یہودیوں اور ظالم و جابر امریکیوں/برطانوی سامراجیوں کا مقابلہ ایمانی قوت و طاقت اور سڑکوں پر پڑے اینٹ روڑوں سے کیا ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ مظلوم فلسطینی چھوٹے چھوٹے لڑکے شوقِ شہادت کے ساتھ کس طرح مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ضرور ان کو غیبی نصرت اور فتح و کامرانی سے ہم کنار کرے گا۔

(ان شاء اللہ)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام امن عالم

از۔ مجاہد الحسینی صاحب)

انتخاب: صبا خان، ٹوبہ ٹیک سنگھ

معتمد اور ملکہ رمیکیہ

اشبیلیہ کا امیر معتمد ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ لیکن ایک قوم کی بدقسمتی نے اسے حکمران بنا دیا۔ معتمد کے وزیر عہدے دار اور قومی افسران کی بیگمات اور لونڈیاں اور اس کے خواجہ سرا سب شاعر تھے۔ معتمد کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے لیے شاعری پہلا اور آخری زینہ تھا۔ اس لیے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر شاعروں کا قبضہ تھا۔ جب قسطلہ کے اسلحہ خانوں میں دشمنانِ اسلام اپنی تلواریں تیز کر رہے تھے۔ تو اس وقت اشبیلیہ کے حکمران اور اس کے امراء کئی کئی گھنٹے ایک شعر کی نوک پلک درست کرنے میں صرف کر دیا کرتے تھے۔

شاعری کے بعد امیر معتمد کو سب سے زیادہ ایک عورت سے محبت تھی۔ جو کہ ایک لونڈی تھی۔ اس کا اصلی نام اعتماد تھا۔ مگر رمیک کی لونڈی ہونے کے باعث اسے رمیکیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

دل کے ہاتھوں مجبور اشبیلیہ کے ولی عہد معتمد نے رمیکیہ کو اپنے تاج کا ہیرا بنایا۔ رمیکیہ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد معتمد کے لیے ہر صبح "صبحِ مسرت" ہر شب "شبِ نشاط" تھی۔ رمیکیہ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں اپنی مثال آپ تھی۔ رمیکیہ نے معتمد کو عیش و نشاط اور لہو و لعب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ حرم کے عیش و نشاط کو رمیکیہ نے اوجِ کمال تک پہنچایا۔ مفکر سیاست دان اور علوم و فنون کے ماہرین شاہی محل کے خانساموں، باورچیوں، اور سازندوں کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

ایک دن رمیکیہ معتمد کے ساتھ دریا کی سیر کا لطف اٹھا رہی تھی۔ دریا کے کنارے چند غریب عورتیں اینٹیں بنانے کے لیے مٹی گوندھ رہی تھیں۔ شاہی محل واپس پہنچ کر رمیکیہ نے معتمد سے شکایت کی۔

"تم نے مجھے ایک قیدی کی طرح اس محل کی چار دیواری میں قید کر رکھا ہے۔ زندگی کی ہزاروں نعمتیں ایسی ہیں جو مجھے میسر نہیں۔"

معتمد نے اس کی خواہش پوچھی تو اس نے کہا کہ "مجھے ان عورتوں کی قسمت پر رشک آتا ہے، میں چاہتی ہوں کہ مجھے بھی ان کی طرح مٹی گوندھنے کی آزادی حاصل ہو۔"

معتمد نے چند دنوں کے اندر محل میں مشک عنبر اور کافور کے ڈھیر لگوا دیے پھر ان اشیاء کو کوٹ کر یک جان کیا گیا۔ اور گلاب کے عرق سے نمی دی گئی۔

جب یہ تیاریاں مکمل ہوگئیں تو رمیکیہ اپنی سہیلیوں اور خادماؤں کے جلوس میں تشریف لائی اور ننگے پاؤں اس مشک وعنبر اور کافور کے ڈھیر میں کود پڑی جسے جمع کرنے کے لیے معتمد نے لاکھوں روپے صرف کر دیے تھے۔

معتمد کے قریب ایک لونڈی موتیوں سے بھرا طشت اٹھائے کھڑی تھی اور معتمد مٹھی بھر بھر کے قیمتی موتی اس کیچڑ میں موجود رمیکیہ پر نچھاور کر رہا تھا۔

یہ سچ ہے ہر عروج کو زوال ہے۔ اسی طرح معتمد کا زوال بھی شروع ہوا۔

سیر بن ابوبکر نے اشبیلیہ کی فصیل کو توڑ کر معتمد کے محل پر حملہ کر دیا۔ معتمد نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر ناکام ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ سیر بن ابوبکر نے معتمد، ملکہ رمیکیہ کو گرفتار کر کے طنجہ بھیج دیا۔ جب قیدیوں کا یہ جہاز وادی الکبیر کے راستے سمندر کی طرف روانہ ہونے کو تھا تو اشبیلیہ کے ہزاروں انسانوں نے کنارے پر کھڑے ہو کر یہ عبرت ناک منظر دیکھا۔ معتمد اور ملکہ رمیکیہ کو ننگی تلواروں کے سائے میں جہاز میں داخل کیا گیا۔ جب جہاز روانہ ہوا تو اشبیلیہ کے ایک بوڑھے شاعر نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا۔

''معتمد فیاض تھا، بہادر تھا۔ بیدار مغز تھا مگر ایک آوارہ مزاج عورت نے اسے ذلت کے گڑھے تک پہنچا دیا۔''

ملکہ رمیکیہ جہاز کے کونے میں کھڑی اپنے عظیم الشان محل کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس نے ڈوبتی آواز میں اپنے شوہر سے کہا۔

''ہم پھر یہاں نہیں آئیں گے؟ کیا اشبیلیہ کے دروازے ہم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں؟''

معتمد نے کہا ''ملکہ! اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ جس چراغ کا تیل ختم ہو چکا ہے۔ وہ آنسوؤں سے نہیں جلا کرتا۔''

دریا کے کنارے عورتیں مٹی گوندھ رہی تھیں۔ رمیکیہ نے کہا۔

''آپ کو وہ دن یاد ہے جب میں نے مٹی گوندھنے کی خواہش کی تھی اور آپ نے مشک وعنبر کے ڈھیر لگا دیے تھے۔''

معتمد نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔ ''خدا کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلو اور ماضی کو بھول جاؤ۔''

''نہیں، میں ماضی کو نہیں بھول سکتی۔''

رمیکیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

معتمد، اشبیلیہ کا حکمران اور عظیم شاعر جس نے جلاوطنی کے زمانے میں بے شمار آلام و مصائب کا سامنا کیا۔ جس کا ذکر اس کے کلام میں موجود ہے۔

رمیکیہ، معتمد کو عیش ونشاط میں مبتلا کر دینے والی ملکہ جو سلطنت کی بیشتر آمدنی اپنی عیاشیوں پر صرف کر دیتی تھی۔ پائی پائی کی محتاج ہو کر بے بسی کے دن گزارنے لگی۔ ملکہ رمیکیہ اور معتمد کے اسیری کے ایام یقیناً اندوہناک تھے مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انہوں نے جو راستہ منتخب کیا تھا۔ اس کی آخری منزل یہی ہو سکتی تھی۔

(نسیم حجازی کی تصنیف ''یوسف بن تاشفین'' سے)

صائمہ بدر، کھلابٹ ہری پور

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

تھائی سوپ

ضروری اشیاء:

مرغی کا ابلا ہوا گوشت	ایک پاؤ
شملہ مرچ بڑی	ایک عدد
مرمرے	آدھا کپ
کارن فلور	چوتھائی کپ
کالی مرچ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لیموں	دو عدد (رس نکال لیں)
یخنی	دس سے بارہ کپ

ترکیب:

شملہ مرچ کے بیج نکال کر گول کاٹ لیں۔ یخنی میں مرمرے، نمک، کالی مرچ اور شملہ مرچ ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ ابال آجائے تو آنچ دھیمی کر کے پندرہ بیس منٹ تک پکنے دیں۔ کارن فلور پانی میں گھول کر اسے تھوڑا تھوڑا کر کے چمچہ چلاتے ہوئے سوپ میں ڈال دیں۔ لیموں کا رس بھی ڈال دیں۔ دو منٹ پکنے دیں پھر مرغی ڈال کر اتار لیں اور گرم گرم پیش کریں۔

اسپائسی فرائیڈ بیف رائس

ضروری اشیاء:

گوشت	ایک کلو
نمک	حسب ذائقہ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	چار عدد
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
چاول	دو کپ (ابلے ہوئے)

ترکیب:

کسی برتن میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر سنہری کرلیں۔ اس کے بعد اس میں گوشت، نمک، ادرک، لہسن پسا ہوا، ڈال کر پانچ سے آٹھ منٹ تک بھونیں۔ لال مرچ پاؤڈر، ٹماٹر، ہلدی، پسا ہوا دھنیا اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر مزید پانچ سے چھ منٹ تک بھونیں۔

گوشت میں پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔

گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو سرونگ ڈش میں ابلے ہوئے چاول ڈالیں۔ اس کے اوپر بھنا ہوا گوشت رکھیں اور پیش کریں۔

مٹن بوٹی

ضروری اشیاء:

بکرے کا گوشت	ایک کلوگرام (چھوٹی بوٹیاں کرلیں)
کارن فلور	چھ بڑے چمچے
تیل	حسب ضرورت
سویا ساس	دو بڑے چمچے
نمک	ایک چھوٹا چمچہ

ترکیب:

سب سے پہلے گوشت میں سویا ساس اور نمک ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد کارن فلور میں اتنا پانی ڈالیں کہ پیسٹ بن جائے۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور جب اچھی طرح گرم ہو جائے تو گوشت کارن فلور کے آمیزہ میں ڈبو ڈبو کر تل لیں۔ سلاد، چلی ساس اور ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

مشروم کے ساتھ چکن

ضروری اشیاء :

مرغی	ایک کلو
زیتون کا تیل	آدھا کپ
لہسن	چار عدد
ٹماٹر	دو عدد
ٹماٹر پیسٹ	چار چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
ثابت دھنیا	چوتھائی چائے کا چمچہ
سفید مرچ	چوتھائی کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا	حسن ضرورت
مکھن	دو سو گرام
مشرومز	ایک کین
ہری مرچ	دو عدد

ترکیب :

کٹے ہوئے لہسن کو زیتون کے تیل میں تل لیں یہاں تک کہ پیاز سنہری ہو جائے۔ مرغی کو دھو کر چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور لہسن سمیت تل لیں۔ ٹماٹر، ٹماٹو پیسٹ، نمک، دھنیا اور سفید مرچ مکس کر کے ایک طرف رکھ دیں۔ دوسرے برتن میں مشرومز اور ہری مرچیں مکھن میں تل لیں۔ اس کے بعد اس کو ٹماٹر اور پیسٹ کے مکسچر میں ڈال دیں۔ اس آمیزے کو مرغی میں ڈال دیں۔ اس میں ہرا دھنیا شامل کریں اور آدھا گھنٹے تک دم پر رکھ دیں۔ مزے دار مشرومز کے ساتھ چکن تیار ہے۔ کسی کھلے برتن میں نکال کر پیش کریں۔

چائنیز ساس چکن ود ھ ویجی

ضروری اشیاء :

بون لیس مرغی	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
لہسن کے جوے	تین سے چار عدد
ٹماٹو پیسٹ	چوتھائی کپ
	دو کھانے کے چمچے
پسی سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
پسی سیاہ مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
مسٹرڈ پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
میدہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

(پیاز، ٹماٹر، شملہ اور مرغی کو کیوب کی شکل میں کاٹ لیں)

ترکیب :

گوشت کو اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں۔ سرخ مرچ، سیاہ مرچ، سویا ساس، مسٹرڈ پیسٹ، سرکہ، چینی، میدہ اور نمک لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد پین میں تیل گرم کر کے اس میں لہسن کو ہلکا سا تل لیں اور پھر مسالا لگا گوشت ڈال کر تھوڑا سنہرا رنگ آنے تک تل لیں۔ آخر میں پیاز، ٹماٹر، شملہ مرچ، ٹماٹو پیسٹ اور ٹماٹو کیچپ ڈال کر دو سے تین منٹ تک تھوڑا سا تیل ڈال کر تل لیں۔ ڈش میں نکال کر ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

نمک گوشت

ضروری اشیاء :

گائے کا گوشت (چکنا، ہڈی والا)	تین کلو
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ	حسب ذائقہ
کٹی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	دس سے بارہ عدد
لیموں	چار عدد
سرکہ	دو سے تین چمچے

ترکیب :

پتیلے میں گوشت ڈال کر اتنا پانی ڈالیں کہ وہ اس میں

ڈوب جائے، پھر تمام مسالا جات ڈال کر گوشت [illegible] پکنے دیں۔ جب پانی اچھی طرح خشک ہو جائے تو گوشت کو پانچ منٹ کے لیے بھونیں پھر لیموں اور ادرک اوپر سے چھڑک کر ڈش میں نکال کر گرما گرم نان یا چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

چکن کباب

ضروری اشیاء :

چکن کا قیمہ	آدھا کلو
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
ہری مرچیں	چار سے چھ عدد
کالی مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

ادرک اور ہری مرچ کو پیس کر قیمے میں ملا دیں۔ ساتھ ہی نمک اور کالی مرچ بھی ملا دیں۔ دو سے تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں ٹکیاں بنا کر تل لیں۔

چانپ کڑاہی

اشیاء :-

چانپیں	ڈیڑھ کلو
دہی	آدھا کپ
پیاز (باریک کاٹ لیں)	دو عدد
ٹماٹر (باریک کاٹ لیں)	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
سونف	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن کے جوئے	چار عدد (کاٹ لیں)
ادرک (کاٹ لیں)	آدھا انچ کا ٹکڑا
ہری مرچیں	چار چھ عدد
گھی	حسب ضرورت
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
قصوری میتھی	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب :-

چانپوں کو دھو کر ایک پتیلی میں ڈالیں اس میں چار سے چھ کپ پانی سونف، ثابت دھنیا، اجوائن، لہسن کے جوے، ادرک اور نمک ڈال کر گلنے تک ابال لیں۔ اس کے بعد چانپوں کو نکال کر پلیٹ میں رکھیں۔

ایک پتیلی میں گھی گرم کریں۔ اس میں پیاز ڈال کر سنہری ہونے تک فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں ٹماٹر، پسا ہوا لہسن، ادرک، دہی، نمک، ہلدی، لال مرچ اور دھنیا ڈال کر بھون لیں۔ ابلی ہوئی چانپیں، پسا ہوا گرم مسالا اور قصوری میتھی ڈال کر دو سے تین منٹ تک درمیانی آنچ پر پکائیں۔ اس کے بعد ہری مرچیں ڈال کر دم پر رکھ دیں، مزے دار چانپ کڑاہی تیار ہے، ڈش میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔



ادارہ

خوب صورتی

خوب صورت اور صحت مند جلد

آج ہم آپ کو اچھی خوب صورت اور صحت مند جلد کے بارے میں بتائیں گے۔ اگر آپ کی جلد اچھی اور چمک دار ہو تو پھر اس کی رنگت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یاد رکھیے کہ چمکتی ہوئی صحت مند جلد سب کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس کا بنیادی اصول ہے اچھی غذا، زیادہ سے زیادہ تازہ سبزیوں اور پھلوں کا استعمال، چکنی اور مسالے دار اشیا سے پرہیز۔

جلد کے لیے کچھ ماسک ایسے ہیں جو آپ چلتے پھرتے گھر میں کام کرتے ہوئے بھی لگا سکتی ہیں۔ صبح کے ناشتے کے لیے انڈے بناتے وقت ذرا سی سفیدی الگ کر کے اپنے چہرے پر لگا لیں اور خشک ہونے پر منہ دھو لیں۔ اسی طرح اکثر گھر میں کیلے پڑے پڑے گل جاتے ہیں، ان کو مسل کر چہرے پر لگائیں اور دس سے پندرہ منٹ کے بعد منہ دھو لیں۔

خشک جلد والی خواتین کسی بھی موائسچرائزر میں زیتون کا تھوڑا سا تیل ملا لیں اور اسے ہاتھ اور چہرے پر سوتے وقت لگائیں۔ صبح اٹھنے پر آپ کی جلد نرم و نازک اور چکنی ہو جائے گی اور چہرے پر جھریاں بھی نہیں پڑیں گی۔۔ خشک جلد والی خواتین صابن کے انتخاب میں بھی گلیسرین ملے صابن یا فیس واش کو مدنظر رکھیں۔

چکنی جلد والی خواتین کے لیے گرمیاں زیادہ مسئلہ کرتی ہیں کہ پسینہ آنے کی وجہ سے جلد کے مسام بھی کھل جاتے ہیں۔ جن پر گرد و غبار کی تہ جم جاتی ہے جو دانوں کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا چکنی جلد والی خواتین

دن میں دو تین بار منہ کو اچھی طرح دھوئیں اور یقیناً ان کے لیے بیسن ایک بہترین انتخاب ہے۔

ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آب و ہوا میں کافی تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ درجہ حرارت بڑھنے کے ساتھ ساتھ سورج کی الٹراوائلٹ شعاعیں بھی ہماری جلد کے لیے نقصان دہ ہیں اور یہ آپ سب کے علم میں ہے کہ سن بلاک کا استعمال دھوپ میں نکلتے وقت کتنا ضروری ہے۔ لہٰذا اس کو بھی اپنا معمول بنائیں گھر سے باہر نکلتے وقت سن بلاک اور سن گلاسز کا استعمال معمول بنا لیں۔

پلکوں کی خوب صورتی

آرائش و زیبائش اور خوب صورت نظر آنا ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے اور چہرے پر نمایاں نظر آنے والی آنکھیں جن کو اگر خوب صورتی سے سجایا سنوارا جائے تو آپ کا چہرہ بے حد دل فریب نظر آئے گا۔ آنکھوں کی خوب صورتی کے لیے پلکوں پر بھی توجہ دینا لازمی ہے۔ اپنی پلکوں کو لمبا اور کشادگی کا تاثر دینے کے لیے آئی لیش کرلر (eye Lash curler) ایک عمدہ ٹول ہے۔ پلکوں پر مسکارا لگانے سے قبل انہیں آئی لیش کرلر سے کرل کر لیں تو آنکھیں بڑی نظر آئیں گی۔

مسکارا لگانے سے قبل پلکوں کے اوپر اور نیچے بے بی پاؤڈر تھپتھپا کر لگائیں تاکہ پلکیں گھنی اور بھری بھری نظر آئیں۔ مسکارا لگاتے وقت اس کے برش کو رول کرتی رہیں اور نیچے جڑ سے اوپر کی طرف لائیں۔ نچلی پلکوں کے لیے مسکارے کی برش کو سیدھا رکھیں مسکارا لگانے کے لیے اس کی نوک استعمال کریں۔ آنکھوں کی دلکشی بڑھانے کے لیے آئی لائنر کی ایک پتلی سی لائن اوپر پلکوں کے ساتھ ساتھ لگائیں تو یہ اچھا تاثر دیتی ہیں۔ تقریبات کے لیے آپ مختلف شیڈز اور رنگ استعمال کر سکتی ہیں۔ اگر آپ آئی پنسل استعمال کر رہی ہیں تو یہ خیال رکھیں کہ لپ پنسل کی نسبت آپ کی آئی پنسل کو نرم ہونا چاہیے۔

☆